مغلیہ سلطنت
کا
عروج وزوال
آر۔ پی۔ ترپاٹھی
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مغلیہ سلطنت کا عروج وزوال

آر. پی. ترپاٹھی

مترجم

ریاض احمد خاں شروانی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی ـ 110025

پہلی اشاعت : 1980
تیسری طباعت : 2010
تعداد : 550
قیمت : -/118 روپے
سلسلۂ مطبوعات : 605

Mughaliya Sultanat ka Urooj-o-Zawal
by
R.P. Tripathi

ISBN :978-81-7587-398-8

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025
فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔کے۔آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور

پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ
ڈائرکٹر

طبع دوم کے بارے میں

موجودہ ایڈیشن ضروری ٹائپ و دیگر خفیف غلطیوں کی اصلاح کے بعد شائع ہو رہا ہے۔ اس کتاب کی تجدید نظر کے کام کا پورا حق شری ایس۔ آر۔ بھر دترا۔ ساگر یونیورسٹی و ڈاکٹر ایس۔ اے۔ اے۔ رضوی محکمۂ تعلیمات یوپی کا ہے اور مصنف ان دونوں حضرات کی اس محبت آمیز محنت کا مشکور ہے۔

★ ★ ★ ★ ★

اس کتاب کے خاتمے پر محمد شاہ کے زمانے تک کی سیاسی تاریخ مکمل ہو جائے گی۔ بہر حال اس کتاب میں ہندوستان میں یوروپیوں کا ذکر محض اس حد تک کیا گیا ہے جہاں تک کہ ان کا وجود مغل سلطنت کی تاریخ کے لیے لازمی سمجھا گیا ہے۔
مصنف کی خواہش ہے کہ جونہی دوسری جلد چھپنا شروع ہو وہ ایک اور کتاب کی تیاری شروع کر دے۔ یہ کتاب ہندوستان کے مغلیہ دور میں ملک کی اقتصادی، مجلسی اور ثقافتی ترقی کا احاطہ کرے گی۔ مصنف گذشتہ پندرہ سال سے بھی زیادہ عرصے سے اس سلسلے میں مواد جمع کر رہا ہے اور اس کا مطالعہ کرتا رہا ہے۔

۵۔ مال ایونیو۔ لکھنؤ

ر۔ پ۔ ت۔

فہرست مندرجات

دیباچہ

عظیم مغلیہ سلاطین کی عمومی تاریخ لکھنے کے لیے شاید مجھے اظہارِ معذرت کرنا چاہیے۔ ان سلاطین کے متعلق بہت سے عالمانہ رسائل چھپ چکے ہیں اور ان کے عہد کے کسی نہ کسی پہلو پر متعدد موقر جرائد میں مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ مناسب سمجھا گیا کہ ان رسائل و مقالات میں جو مواد فراہم کیا گیا ہے اس کے تار و پود کو یکجا کر کے ایک عمومی تاریخ کی شکل میں پیش کیا جائے۔ گذشتہ تیس سال کے عرصے میں مغلوں کی عمومی تاریخ کے بارے میں مشکل سے دو یا تین کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ یہ عمومی تواریخ بالخصوص انڈر گریجویٹ طلبا کے لیے لکھی گئیں اور ان کی تیاری میں بعض ناگزیر یا خود ساختہ قیود عائد ہو گئیں۔ ان کتابوں کے مؤلفین نے اپنے اور طلبا کے مفاد کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس بات کو مفید و مناسب نہ سمجھا کہ عام مروجہ نظریات سے ہٹ کر کچھ لکھا جائے۔ بہر حال اس کتاب کا مقصد یہ نہیں کہ ایک اور نصابی کتاب لکھی جائے بلکہ یہ کوشش کی گئی ہے کہ سلاطین کی تاریخ کو تازہ ترین مطالعات اور تحقیقات کی روشنی میں از سرِ نو مرتب کیا جائے تاکہ ہر وہ شخص جو اس موضوع میں دلچسپی رکھتا ہو اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ گو اس کتاب میں دیگر علما اور فضلا کے نظریات پر پوری اہمیت و توجہ دی گئی ہے۔ تاہم یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کتاب میں ان کے نظریات فوری و بآسانی دستیاب ہو سکتے ہیں۔ مختصراً یہ کتاب ان نتائج کا مجموعہ ہے جو مصنف نے ابتدائی و قدیمی منابع و مآخذ اور جدید مصنفین کے آثار کے مطالعے کے بعد اخذ کیے ہیں۔ ان مصنفین کے نظریات پر جنھوں نے مخصوص رسالے لکھے ہیں پورے احترام سے غور کیا گیا ہے اور مصنف نے محض

اس صورت میں ان کے نظریات سے اختلاف کیا ہے جب کہ ابتدائی منابع کے مطالعے کے نتیجے میں اختلاف نظر ناگزیر ہوا۔ ان میں سے بعض رسائل تو تقویم پارینہ ہو چکے ہیں اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ان پر بہ غور نظر ثانی کی جائے۔

ایک ایسی کتاب میں جس میں عام مباحث موجود ہوں، جس کی ضخامت محدود اور جس کا موضوع وسیع ہو تفصیلی دلائل، انتقادی وسیلوں کو زیر بحث نہیں لایا جاسکتا اور نہ کسی خاص نظریے یا نتیجے کی موافقت یا مخالفت میں بہت سے علما کے نقاط نظر پیش کیے جاسکتے ہیں۔ کہیں کہیں تو تنقیدی وجوہات کی بنا پر معاصرین کے نقطۂ نظر سے بھی اختلاف کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک نازک مرحلہ ہے۔ اور اس کے لیے بڑی ہوشیاری اور دقیق تجسس کی ضرورت ہے۔ مثلاً بابر کی وفات کے بعد تخت نشینی کے سلسلے میں خلیفہ کا برتاؤ یا اتالیقی سے معزولی کے بعد بیرم خاں کے رویے پر اظہارِ نظر، اس قسم کے نازک مسائل کی مثالیں ہیں۔ ان مسائل یا ایسے ہی دیگر موضوعات پر بیسیوں صفحات لکھے جا چکے ہیں اور آئندہ بھی لکھے جائیں گے۔ اس قسم کے مباحث عالمانہ رسالوں یا مخصوص مقالات کے لیے زیادہ موزوں ہیں اور اگر ان مسائل کو ایک عام کتاب میں زیر بحث لایا جائے تو نہ صرف یہ کہ بحث طولانی اور غیر متناسب ہو جائے گی بلکہ کتاب بھی بہت ضخیم اور ناقابل مطالعہ صورت اختیار کرے گی۔ اس کتاب کی پہلی جلد اپنی موجودہ شکل میں پانچ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ ابھی دو جلدیں اور بھی باقی ہیں۔ کیونکہ اس کتاب میں ان جیسے متعدد متنازع فیہ مسائل کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا بلکہ نتائج کا مختصر سا ذکر کر دیا گیا ہے لہٰذا جو حضرات مزید معلومات کے خواستگار ہوں وہ ابتدائی منابع کا مطالعہ کریں۔ ابتدائی منابع کا تفصیلی و تنقیدی مطالعہ اس بات کو واضح کر دے گا کہ اس کتاب کے مصنف نے اپنے نتائج کی بنیاد ان دلائل پر رکھی ہے جو ان منابع میں موجود ہیں اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ اپنی ذمے داری کو پوری ایمان داری اور لیاقت کے ساتھ نبھائے۔ مصنف کا یہ دعویٰ نہیں کہ کسی بھی مسئلے کے بارے میں اُس کی رائے حرفِ آخر ہے۔ یہ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا۔ لیکن مصنف یہ دعویٰ ضرور کرتا ہے کہ اُس نے اُن تمام شواہد کو جو اس کی دسترس میں تھے ایمان داری اور غیر جانبداری سے پرکھا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کے عام پڑھنے والوں اور علمائے کرام سے یہی استدعا

ہے کہ وہ مصنف کے بیانات کے بارے میں فیصلہ صادر کرنے سے قبل ماہرین کے آثار پر بطورِ عموم اور ابتدائی منابع پر بطورِ خصوص دقتِ نظری کے ساتھ توجہ فرمائیں۔

ایک عام اور اتفاقی کتب بین کے لیے تاریخ کا مطالعہ بترتیب موضوع نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ لیکن اس طریقۂ کار میں ہر دفعہ حوالہ جات کا اُلٹ پھیر اور تکرار ہوتی ہے کیونکہ اس کے بغیر حالات کے تغیر و تبدل کو نہ توصحیح طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کا درست تاریخی پس منظر ہی سامنے آسکتا ہے۔ بہرحال افراد، تحریکات اور اقوام کی خصوصیات کردار اور سیاسیات اکثر سلسلہ وار تاریخی وقائع اور مجموعی شواہد و قرائن سے ہی متعین ہوسکتی ہیں۔ تاریخ کے تار و پود میں سے کسی خاص رنگ و جنس کے تاروں کو نکال پھینکنا شدید خطرے سے خالی نہیں اور اس عمل سے اگر تاریخی بافت و ساخت کا ملاً منتشر نہ ہو تو بھی کم از کم خراب ضرور ہو جائے گی۔ تاریخی وقائع ایک دوسرے سے اس قدر منسلک و مربوط ہوتے ہیں کہ ان کی صحیح اہمیت کا اندازہ محض ان کے رنگا رنگ اختلاط کے ذریعے ہی لگایا جا سکتا ہے نہ کہ ان موضوعات کے جداگانہ مطالعہ سے۔ لہٰذا مصنف نے افراط و تفریط کے بجائے درمیانی راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ورنہ یہ کتاب یا تو موضوعاتی مقالات کا مجموعہ بن جاتی یا پھر محض ایک روزنامچے کی شکل اختیار کرلیتی۔ ان وجوہ کی بنا پر دقیق قدر شناسی کی خاطر بہتر یہی سمجھا گیا کہ جہاں تک ہوسکے واقعات کے تاریخی تسلسل، ان کے ارتباط، اور نفسیاتی ردِعمل کو زیادہ سے زیادہ برقرار رکھا جائے۔

واقعات کی صحت و درستی کی خاطر اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ طرزِ بیان چاہے گراں خواہ بے لطف و بے مزہ ہی کیوں نہ ہو، ہر قسم کے استعارے، آراستہ و پیراستہ عبارات، لطائف و ظرائف اور حالات و افراد کے مبہم مقابلوں سے گریز کیا جائے۔ اس بات کا بھی دھیان رکھا گیا ہے کہ مسجع عبارت اقوال و اقتباسات اور جذبات سے حتی الامکان پرہیز کیا جائے۔ مصنف کا خیال ہے کہ صحتِ بیان ہی تاریخ کا جوہر ہے اور اس کی خاطر وقائع کو بغیر کسی آمیزش و رنگینی کے سیدھے سادے واضح اور پُر زور طریقے پر بیان کردینا ضروری ہے۔ تواریخ کی جاذبیت، شخصیتوں کی کش مکش، افراد و تحریکات و قوموں کی نشاۃ ثانیہ و انحطاط اور زندگی کے بدلتے ہوئے حالات کے توازن و تعادل اور حقائق کے انکشاف میں پوشیدہ ہے۔ دراصل تاریخ و تمدن کی قوتِ محرکہ ایک ایسی زبردست

رنگین کمان ہے جو خود پڑھنے والوں کے دلوں میں رعب، جاذبیت، جوش اور رومانس کی مختلف کیفیات پیدا کر دیتی ہے۔ اس بات کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ افراد و تحریکات کے استنباط میں کسی قسم کے مذہبی، فرقہ وارانہ، تجارتی، نسلی یا صوبائی جذبات مانع نہ ہوں۔ ان صفحات میں سولھویں و سترھویں صدی اور اٹھارویں صدی کے ابتدائی چالیس سال کی تاریخ کو اس دور کے سماجی معاشرتی سیاسی اور تمدنی مظاہر کے ایک مجموعے کی شکل میں بیان کیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہر صورت حال یا واقعہ کسی نہ کسی اہمیت کا حامل ہوتا ہے لیکن اس کی موزونیت و افادیت کی پرکھ اس نقطۂ نظر سے کی جاتی ہے کہ وہ کسی مخصوص زیر غور مسئلہ پر کس حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔ مصنف نے یہ کوشش کی ہے کہ ایسے حقائق یا واقعات کو جو کسی زیر بحث مسئلہ سے مربوط نہ ہوں ترک کر دے اور محض ایسے واقعات و حقائق کو مرکز توجہ قرار دے جو اس کے خیال میں کسی مسئلے کے بارے میں مفید ثابت ہو سکیں۔ اگر مصنف نے بے خیالی میں کسی اہم چیز کو فراموش کر دیا ہو تو وہ ان حضرات کا جو از راہ کرم اس کی توجہ اس طرف مبذول فرمائیں گے مشکور و ممنون ہوگا۔ "تاریخ کے ہر سنجیدہ طالب علم کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ فی زمانہ علمی ماحول میں جس قدر بھی ممکن ہو زیادہ سے زیادہ حقائق کا انکشاف کرے۔ اس کام میں جہاں کہیں سے بھی تعمیری کمک و معاونت حاصل ہوگی مصنف اس کی پذیرائی کرے گا۔

اس دور کی سیاسی تاریخ میں یوروپی طاقتوں کا حصہ نسبتاً کم رہا۔ پرتگالیوں نے صوبائی حکمراں خاندانوں سے نزدیکی تعلقات تو قائم کر لیے اور کبھی کبھی سنجیدگی سے اپنے وجود کا احساس بھی دلایا لیکن مغل سلطنت کے ساتھ ان کا تعلق عام طور پر اتفاقی و غیر مؤثر ہی رہا۔ پرتگالیوں کی تاریخ چاہے کتنی ہی اہم کیوں نہ رہی ہو لیکن مغلیہ دور میں ان کا کردار کسی طرح اس قدر اہم نہ تھا کہ ان کو اس دور کی تاریخ کا جزو لاینفک کہا جا سکے۔ دوسری یوروپی طاقتوں کی حالت تو بہت ہی کمزور تھی اور حقیقت یہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے دوسرے چوتھائی حصے تک یہ طاقتیں کچھ زیادہ معروف و شناسا نہ تھیں۔ اس دور میں یوروپینوں کی سرگرمیوں کا بیان سیاسی تاریخ کے آخر میں مغلیہ تاریخ کے ضمیمے کی حیثیت سے دیا جائے گا۔

مغل حکمرانوں کی عمومی تاریخ کے سلسلے میں اس عہد سے متعلق کتابوں کی مکمل فہرست درج کرنا ضروری نہ تھا۔ حوالہ کے لیے ابتدائی اور عہد حاضر کے اہم ماخذ کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ جو حضرات تحقیقی کام کرنا چاہیں وہ ہر بادشاہ یا اُس کے دور سے متعلق حالات کے ابواب کے آخر میں کتابوں کی فہرست دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخی منابع کی متعدد فہرستیں مخصوصاً سی۔ اے۔ سٹوری کی کتاب پرشین لٹریچر سیکشن دُو۔ جز سوم (لوزاک اینڈ کمپنی) سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ اہم حوالہ جات کے علاوہ اہم واقعات کو ہر دور کے خاتمے پر تاریخ وار بیان کیا گیا ہے۔ سرکاری فارسی تواریخ کی کتابوں میں واقعات کی جو تاریخیں درج ہیں وہ عام طور پر قابلِ اعتماد ہیں۔ حالانکہ کہیں کہیں قمری و شمسی سال کے تطابق میں چند دنوں کا فرق پڑ جاتا ہے، قمری سال شمسی سال سے گیارہ دن کم ہوتا ہے۔ بعض بادشاہوں کی تاریخ جلوس ان کی مرضی کے مطابق طے کرنے کے سبب بھی کچھ تفاوت نظر آتا ہے۔ غیر سرکاری فارسی تواریخ میں جو تاریخیں بیان کی گئی ہیں وہ اس قدر قابلِ اعتبار نہیں۔ اور مرہٹہ و سکھ تواریخ کی حالت تو اور بھی بدتر ہے۔ بہرحال مصنف نے جہاں تک ممکن ہو سکا مشہور مؤلفین کے آثار کی پوری طرح چھان بین کرلی ہے اور امید ہے کہ یہ جدولیں ایک عام پڑھنے والے اور طالب علم دونوں کے لیے عملی نقطۂ نظر سے کافی مفید ثابت ہوں گی۔

مصنف اپنی متعدد مصروفیات و فرائض کے سبب اتنی فرصت نہ پا سکا کہ اس کتاب کی نشر و اشاعت کے لیے سارے مواد کو از سر نو ترتیب دے سکتا۔ اس کتاب کے ناشر سینٹرل بک ڈپو اور اس کے طابع نے کتاب کی اشاعت میں جس صبر و حوصلہ سے کام لیا۔ وہ قابلِ تعریف ہے اور مصنف ان کا مشکور ہے۔ ڈاکٹر اے۔ مکرجی اور شری ایس۔ آر۔ مہروترا ایم۔ اے کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے پروف کی تصحیح کی، انڈکس تیار کیے اور جلد اوّل کی چھپائی کے تکنیکی پہلوؤں کو مدِنظر رکھا۔ اگر ان کی بے دریغ محنت و معاونت حاصل نہ ہوتی تو مصنف زبان کی بہت سی بھول چوک اور غلطیوں کا مرتکب ہوتا۔ واقعات کی صحت و تفسیر اور تاریخی واقعات کی ترتیب کی ساری ذمّے داری مصنف پر عائد ہوتی ہے۔

ساگر یونیورسٹی — ر۔ پ۔ ت

30-4-1956

باب 1

بابر

ہندوستان پر حکومت کرنے والے تیمور کے جانشین خود کو چغتائی ترک کہتے۔ وہ مغلوں یا منگولوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کو نیم وحشی سمجھتے۔ یہ چغتائی ترک خود کو چنگیز کی نسل سے کہلانے میں فخر محسوس کرتے اور اُس کی زندگی، اُس کے کارناموں اور اُس کے سیاق یعنی ان قوانین سے جو چنگیز جیسے فاتح اعظم اور دنیا کی ایک وسیع ترین سلطنت کے بانی نے مرتب کیے تھے حوصلہ اور اولوالعزمی حاصل کرتے۔

تیمور امیر طغرائے برلاس کا لڑکا تھا۔ طغرائے برلاس کش کا جو اب شہر سبز کہلاتا ہے ترکی النسل سردار تھا۔ 1370ء کے لگ بھگ وہ اس علاقے کا جس پر چغتائی خاں کے ورثا کی حکومت تھی حاکم بن بیٹھا۔ چغتائی خاں سے وابستہ ترک خود کو چغتائی کہلاتے۔ 1363ء میں تیمور نے مشرقی ترکستان کے منگول حاکم الیاس خواجہ خاں کو جو کہ چنگیز کی اولاد میں سے تھا شکست دی اور کازغان خاں ماوراالنہر کے حاکم بالفعل کی پوتی سے شادی کرلی۔ تیمور نے اپنے سالے امیر حسین کے انتقال کے بعد اس کی بیوہ دلشاد آغا سے بھی شادی کرلی۔ دلشاد آغا چنگیز خاں کے خاندان سے وابستہ تھی۔ اس طرح تیمور نے ماوراالنہر کے نہ صرف حکمرانان بالفعل بلکہ قانونی حکمرانوں سے بھی ازدواجی تعلقات پیدا کرلیے۔ علاوہ ازیں کسی طرح اس بات کا بھی پتہ چل گیا کہ چنگیز کی طرح تیمور بھی کاجولی خاں کے خاندان سے وابستہ ہونے کے سبب مغلوں کی شاہی نسل سے منسلک تھا۔ اس قدر شہرت اور قوت کے باوجود تیمور نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ چنگیزی خاندان

کے ایک سلطان سیور ہا تمش کی طرف سے جو کہ قانوناً مقتدر اعلیٰ مانے جاتے تھے حکومت کرے۔

تیمور نے ایک ایسی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو وانگاٹے سفلی سے لے کر دریائے جمنا تک پھیلی ہوئی تھی اور اس میں ایشیائے صغیر، ایران اور افغانستان بھی شامل تھے۔ ایشیائے مرکزی اس کا وطن اور سمرقند اس کی سلطنت کا پایۂ تخت رہا۔ تیمور نہ صرف ایک زبردست بانیِ سلطنت ہی تھا بلکہ ادب و ہنر کا مربی بھی تھا۔ اس کے سیاسی اور فوجی نظریات چنگیز خاں کے نظریات سے بہت مشابہ تھے۔ اس کو تورائے (قوانین) چنگیزی سے اس قدر لگاؤ تھا کہ اس کے خلاف یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ ان قوانین کے مقابلے میں قرآن کو بھی کم درجے کا سمجھتا تھا۔ تیمور اپنی زندگی ہی میں چنگیز ثانی سمجھا جانے لگا اور چنگیز کی طرح اس کے وارثین اور مشرقِ وسطیٰ و ایشیائے مرکزی کے باشندے اس سے خائف رہتے اور اس کا احترام کرنے لگے۔

1404ء میں تیمور کے انتقال کے بعد اس کی سلطنت جو ابھی مستحکم بھی نہ ہو پائی تھی خانہ جنگی کا شکار ہوگئی۔ اس کا پوتا پیر محمد جس کو تیمور نے اپنی سلطنت کا وارث بنایا تھا 1406ء میں قندھار میں قتل کر دیا گیا۔ اس کا دوسرا پوتا سلطان خلیل جو سمرقند پر قابض ہوگیا تھا اس قدر فضول خرچ اور لاپرواہ ثابت ہوا کہ چند سال کے وقفے میں اس نے سارے علاقے گنوا دیے اور 1409ء میں خراسان میں راہی ملک عدم ہوگیا اس کے بعد سمرقند اور باقی سلطنت شاہ رخ مرزا کو پہنچی۔ شاہ رخ ماوراالنہر میں امن و امان قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے خود ہرات میں قیام کو ترجیح دی اور اپنے بیٹے الغ بیگ مرزا کو سمرقند میں اپنے نمائندے کی حیثیت سے حکومت کرنے کے لیے وہیں رہنے دیا۔ الغ بیگ علوم و فنون بالخصوص نجوم و ریاضیات کا زبردست مربی تھا۔ اس کی گورنری کے طولانی دور میں سمرقند ایشیا کا سب سے خوبصورت شہر بن گیا۔ شاہ رخ مرزا 1448ء میں فوت ہوگیا اور الغ بیگ مرزا سلطنت کا وارث بنا لیکن اس کی قسمت میں زیادہ عرصے تک حکمرانی کرنا لکھا نہ تھا۔ اس کے چہیتے بیٹے عبدالعزیز نے علم بغاوت بلند کر دیا اور 1449ء میں باپ کو شکست دے کر قید کیا اور قتل کر دیا۔ اس بزدلانہ اور شرمناک فعل کا انتقام الغ بیگ کے ایک وفادار غلام نے لیا اور 1450ء میں یہ باپ کا قاتل

ہلاک کردیا گیا۔

اب سمرقند کے تخت پر میران شاہ کے پوتے ابوسعید نے جن سے اُس کا چچا الغ بیگ بہت محبت کرتا تھا اپنا حق جتایا اور ازبک سردار ابوالخیر خاں سے مدد مانگی۔ ابوالخیر خاں ماوراءالنہر کے علاقے میں گھس آیا اور دھمکی دی کہ وہ سمرقند پر خود قبضہ کرلے گا۔ بڑی مشکل سے اس کو واپس جانے پر آمادہ کیا گیا اور 1448ء سے قبل ابوسعید ماوراءالنہر، شمالی ایران اور افغانستان میں مکران تک اپنی حکومت قائم نہ کرسکا۔

ابوسعید مرزا کے تعلقات منگولوں اور ازبکوں کے ساتھ خوشگوار نہ تھے۔ اس کے دادا الغ بیگ اور منگولوں کے خان اعظم سلطان ویس کے درمیان اس وجہ سے رنجش پیدا ہوگئی کہ الغ بیگ نے غداری سے کاشغر پر قبضہ کرلیا تھا۔ ایک اور موقع پر الغ بیگ نے سلطان ویس کے بڑے لڑکے یونس خاں کو پناہ دینے کی پیش کش کے بہانے اُس کے بیشتر سپاہیوں کو قتل کردیا اور اُس کو قید کرکے اپنے باپ شاہ رخ مرزا کے پاس روانہ کردیا۔

جب الغ بیگ مرزا کے قتل کے بعد افراتفری پھیلی تو منگولوں کے خان اعظم ایسان بوغا خاں نے ماوراءالنہر پر حملہ کردیا، خوب لوٹ مار کی اور تاشقند و دریائے سیحون کے بعض شمالی علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اس وقت ابوسعید مرزا نے ایسان بوغا کے بھائی یونس خاں کا ساتھ دیا اور اس کو مغلستان میں اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے اکسایا۔ 1462ء میں ایسان بوغا کا انتقال ہوگیا اور مغلوں نے یونس خاں کو خان اعظم تسلیم کرلیا۔ یہ واقعہ 66-1465ء کا ہے۔ منگول نہ صرف تیموریوں کو انتہائی ناپسند کرتے تھے بلکہ ان سے دلی نفرت کرتے تھے۔ وہ تیموریوں کی مداخلت کی پالیسی اور منگولوں کے درمیان آپس میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کے سبب ان سے سخت نالاں و ناراض تھے۔ جب ابوسعید مرزا نے خود بادشاہت اختیار کرلی اور اس بات کا واضح طور پر اعلان کردیا کہ وہ تیمور اور اُس کے وارثین کی روایت کے برخلاف چغتائی خاں کے شاہی خاندان کی برائے نام اطاعت بھی قبول کرنے کو تیار نہیں تو منگول اس سے بہت برافروختہ ہوگئے۔ اس کے علاوہ یہ بات کہ ابوسعید مرزا نے یونس خاں سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ وہ اپنی لڑکیاں اُس کے تین لڑکوں کو بیاہ دے گا آگے چل کر منگولوں کے درمیان حسد اور نفاق کا بیج بونے کا باعث

ثابت ہوئی۔

تیموریوں کے تعلقات ازبکوں کے ساتھ کچھ اچھے نہ تھے۔ اس اکھڑ قوم کو جس میں ترک و منگول شامل تھے چنگیز خاں کے لڑکے باتو نے دشتِ قپچاق کے چٹیل میدان میں جو کہ بحرِ ارال کے شرق و شمال میں پھیلا ہوا ہے آباد کیا۔ ان کا سردار جوجی کا پانچواں لڑکا شیبانی خان تھا۔ 1320 میں باتو کے ایک جانشین ازبک خان نے اسلام قبول کرلیا اور شیبانی قبیلے کے وہ لوگ جنھوں نے ازبک خاں کی سرداری قبول کرلی تھی ازبک کہلانے لگے۔ تیمور کی سیاست یہ رہی کہ ازبکوں کے مختلف سرداروں کے درمیان نفاق اور پھوٹ کا بیج بوتا رہے اور ان کو آپس میں متحد ہونے سے باز رکھے۔ بہرحال پندرھویں صدی کے وسط میں وہ لوگ ابوالخیر خاں کی قیادت میں جو کہ شیبانی کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا متحد ہوگئے۔

الغ بیگ مرزا کی موت کے بعد تیموریوں میں خانہ جنگی چھڑگئی۔ ابوسعید مرزا نے ابوالخیر سے مدد مانگی۔ اس نے ترکستان و خوارزم کے علاقوں پر قبضہ کرلیا اور مرزا کو سمرقند کے تخت پر بٹھا کر اُس کی ایک لڑکی سے شادی کرلی۔ 1468ء میں وہ معہ اپنے کئی لڑکوں کے ایک باغی سردار کے ہاتھوں مارا گیا۔ اُس کی موت کے بعد ازبکوں کا اتحاد ختم ہوگیا اور مختلف قبیلوں کے سرداروں میں پھوٹ پڑگئی۔ تاہم ان کے بعض سردار ابوالخیر خاں کے لڑکے باروج سلطان کے گرد جمع ہوگئے لیکن وہ بھی زیادہ عرصے تک زندہ نہ رہا۔ خانِ اعظم یونس خاں نے اس پر حملہ کرکے اُس کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اُس کے خاندان کو نیست و نابود کردیا۔ اس کا ایک لڑکا محمد شیبانی جو شاہ بخت کے نام سے معروف تھا اپنے چھوٹے بھائی محمد سلطان بہادر کے ہمراہ جان بچانے کی خاطر ماورا النہر کی طرف فرار ہوگیا۔ ان کو ابوسعید مرزا سے جو اپنے محسن ابوالخیر کے خاندان کو خاموشی سے برباد ہوتے دیکھتا رہا کسی قسم کی مدد نہ ملی۔ محمد شیبانی ابوسعید مرزا کی احسان فراموشی اور بےحسی کو کبھی فراموش نہ کرسکا۔ کیونکہ اُس کے دادا کی مہربانی ہی کے نتیجے میں ابوسعید کو تخت ملا تھا۔ چنانچہ وہ ابوسعید اور اُس کے وارثوں کا اتنا ہی سخت دشمن ہوگیا جتنا کہ یونس خاں منگول اور اس کے خاندان کا۔

شاہ رخ مرزا کے انتقال کے بعد تیموریوں کا اثر تیزی سے کم ہونے لگا۔ ہرات کو ترکمن یا ایرانی ترکوں نے جو کہ بحرِ کیسپین کے جنوب مغرب میں رہتے اور بہت ہی جنگجو اور شرارت پسند

تھے لوٹ لیا۔ یہ لوگ دو حریف دستوں میں منقسم تھے۔ ان میں سے ایک قرہ قوینلو (سیاہ بھیڑ) اور دوسرا قرہ گوزلو (سفید بھیڑ) کہلاتا تھا۔ تیمور نے قرہ قوینلو دستہ کو شکست دی اور اس وقت سے اس کی قوت روز بروز گھٹتی گئی۔ اس طرف قرہ گوزلو دیار بکر اور گیلان میں اپنے سردار اوزون حسن کی سرکردگی میں طاقت پکڑتے گئے۔ اس دستے کی بڑھتی ہوئی طاقت کو توڑنے کے لیے ابو سعید مرزا ان کے مقابلے کے لیے بڑھا لیکن بُری طرح شکست کھائی اور گرفتار ہو گیا۔ ترکمنوں نے ابو سعید مرزا کو دشمنوں کے حوالے کر دیا جنھوں نے اس کو 68-1467ء میں قتل کر دیا۔ تیموری خاندان کے ورثا میں سے صرف سلطان حسین بایقرا ہی شمالی ایران میں بااثر رہا۔ وہ عمر شیخ مرزا کے ورثا میں سے تھا۔ اور اس نے بڑے امتیاز کے ساتھ ہرات میں حکومت کی۔ اس کو عالم اسلام میں فن و ادب کا زبردست مربی مانا جاتا ہے۔

اوزون حسن نے اپنی بہن کی شادی جنید سے کی جو شیعوں کے ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظم کے خاندان سے تھا۔ قرہ گوزلو امام موسیٰ کاظم کے خاندان کی بے حد عزت کرتے تھے کیونکہ اسی خاندان کے اثر سے وہ لوگ تیمور کے خشم و غضب کا شکار ہونے سے محفوظ رہے تھے۔ جنید اور اس کا لڑکا حیدر جس نے اوزون حسن کی لڑکی سے شادی کی تھی ایک مقامی نزاع میں مارے گئے۔ حیدر نے تین لڑکے چھوڑے۔ ان تینوں میں سے بڑا لڑکا سلطان علی، اوزون حسن کے لڑکے کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس طرح صفی الدین کا خاندان جو کہ زہد و تقویٰ کے لیے مشہور تھا سیاست میں اُلجھ کر رہ گیا۔ سلطان علی کے سب سے چھوٹے بھائی اسمٰعیل پر جو تاریخ میں شاہ اسمٰعیل صفوی کے نام سے معروف ہے چودہ سال کی عمر میں سیاسی اور مذہبی ذمے داریاں آ پڑیں۔

اسمٰعیل ایک اولوالعزم اور لائق سردار تھا۔ اُس نے گیلان کی حمایت سے آذر بائیجان پر فتح حاصل کی۔ کچھ عرصے بعد ہی ترکوں کے ساتوں قبیلوں نے جو مشترکہ طور پر قزلباش (یعنی طلائی سروالے کیونکہ وہ لوگ سُرخ رنگ کی ٹوپیاں پہنتے تھے) کہلاتے تھے اُس کی سرداری تسلیم کرلی اور اسمٰعیل قرہ گوزلو سلطنت کا حاکم بن گیا۔ اسمٰعیل نے جب شمال مغرب اور مغربی ایران میں اپنا قبضہ جما لیا تو اُس نے بلخ، خراسان اور ہرات کی طرف نگاہ ڈالی۔ ہمسایہ سلطنتوں میں اسمٰعیل کے عروج کو خوف و ہراس کی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔ اس کی وجہ

صرف یہ نہ تھی کہ وہ ایک اولوالعزم فاتح تھا بلکہ یہ بھی تھی کہ اس نے شیعہ مذہب کو اپنی سلطنت کا سرکاری مذہب ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ اس اعلان کے بعد ایرانیوں کا قومی جذبہ اور شیعوں کا دبا ہوا احساس دشمنی اسمٰعیل کی قیادت میں پوری طرح کھل کر سامنے آ گیا۔ ترکی النسل ایرانیوں کا قومی جذبہ، مذہبی تعصب اور جنگجویانہ جوش جہاد اسمٰعیل کے اختیار میں تھا۔ عالم اسلام کا کوئی حکمران حتیٰ کہ خلیفۂ عثمانی بھی اس بات کا دعویٰ نہ کر سکتا تھا کہ شاہ اسمٰعیل کے برابر جوشیلے، با اثر اور وفادار ساتھی اس کے حلقہ بگوش ہیں۔

تیموریوں کی سلطنت ہر طرف سے حریص اور دشمن قوتوں سے گھری ہوئی تھی۔ اس کے باوجود ابوسعید کے ورثا نے غیر معمولی کوتاہ نظری کا ثبوت دیتے ہوئے سلطنت کو آپس میں تقسیم کر لیا اور اقتدار کے لیے جدوجہد کرنے لگے۔ چنگیز خاں نے جب اپنی وسیع سلطنت کو اپنے بیٹوں میں تقسیم کیا تو اس وقت حالات مختلف تھے اور تقسیم ملک ایک ناگزیر ضرورت کی شکل اختیار کر چکی تھی لہٰذا یہ اقدام بالکل درست تھا۔ کئی نسلوں تک سلطنت خانانِ اعظم کے اقتدار کی وجہ سے متحد رہی یا یوں کہیے کہ جب تک چنگیز خاں اور کورلتائی یعنی منگولوں کی شوریٰ اعلیٰ کا اثر باقی رہا سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا کوئی خدشہ ہی نہ تھا لیکن یہ سلسلہ تیموریوں کے زمانے میں نہ چل سکا۔ ابوسعید مرزا کے پاس اس طریق کار کو جاری رکھنے کا کوئی جواز نہ تھا کیونکہ اب سلطنت نہ صرف بہت زیادہ سکڑ چکی تھی بلکہ ہر طرف سے ہر قسم کے خطرے اس کو دھمکا رہے تھے لیکن چنگیز اور تیموریوں کی قائم شدہ رسوم اور حریص شہزادوں و قبائلی سرداروں کے درمیان حسد اور دشمنی کی بڑھتی ہوئی آگ نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے اور وہ سیاسی حالات کا صحیح اندازہ نہ کر سکے۔

ابوسعید نے اپنی سلطنت اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دی۔ اس کے سب سے بڑے لڑکے سلطان احمد مرزا نے سمرقند اور بخارا پر قبضہ جما لیا۔ محمود مرزا کو حصار، قندز، بدخشاں اور ختلان دیے گئے۔ الغ بیگ کے پاس کابل و غزنہ پہنچے جبکہ عمر شیخ مرزا کو فرغانہ ہاتھ لگا۔ ان میں سے عمر شیخ مرزا بابر کا باپ بہت جھگڑالو تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی حکومت بڑھائے۔ سمرقند پر اس کا سب سے زیادہ دانت تھا۔ بہت ممکن ہے عمر شیخ مرزا کو اس کے

خسر یونس خاں نے جو ہمیشہ اُس کی طلب پر مدد کو پہنچ جاتا تھا اور جس نے سلطان احمد کی فرغانہ حاصل کرنے کی ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا تھا اُس کو یہ لالچ دیا ہو۔ خانانِ منگول فرغانہ پر ہمیشہ اپنا حق جتاتے لیکن ابھی وہ اس حالت میں نہ تھے کہ فرغانہ پر مشکلات کا سامنا کیے بغیر قبضہ کرلیں۔ علاوہ ازیں اس وقت حالات کا تقاضا بھی نہ تھا کہ وہ خود کو مشکلات میں مبتلا کردیں۔

یونس خاں کے زمانے میں منگولوں کی طاقت اور وقار کو بہت دھکا پہنچا۔ وہ ابو سعید مرزا کا زیر بار احسان مند تھا' باروج خان پر اس کو محض اتفاقیہ طور پر فتح حاصل ہوگئی تھی۔ وہ خود یارقند و کاشغر کے جوان حکمران ابابکر کے ہاتھوں تین مرتبہ زک اٹھا چکا تھا۔ اس کا وقار اس وجہ سے قائم تھا کہ وہ منگولوں کا خانِ اعظم تھا لیکن یہ ایک محض جذباتی بات تھی۔ اس کی وفات کے بعد اس کے دوسرے لڑکے سلطان احمد خاں کو خانِ اعظم کا لقب ملا اور اس وجہ سے اس کو مشرقی مغلستان میں ہی رہنا پڑا۔ بڑے لڑکے سلطان محمود خاں کو منگول سلطنت کے مغربی حصے ملے جو فرغانہ کی حدود سے متصل تھے۔ یونس خاں اور اُس کا لڑکا سلطان محمود دونوں اس بات کے خواہش مند تھے کہ فرغانہ کے شمال میں دریائے سیر کے متصل ایک مستحکم قصبہ اخسی پر قبضہ کرلیا جائے یہ قصبہ فرغانہ کا دروازہ سمجھا جاتا جس کی فتح سے منگول سلطنت کو ایک قدرتی سرحد مل جاتی۔ اور فرغانہ کا راستہ جسے فتح کرنے کے لیے منگول اس قدر خواہاں تھے اُن کے ہاتھ آجاتا۔ ایک مرتبہ عمر شیخ مرزا نے یونس خاں سے وعدہ کیا تھا کہ اخسی اس کو منتقل کر دے گا کچھ عرصے تک اخسی پر منگولوں کا قبضہ بھی رہا چونکہ یہ قصبہ فوجی اہمیت کا حامل تھا لہذا اُس نے اس کو دوبارہ واپس لے لیا۔ اس طرح اخسی فرغانہ کے حکمراں اور منگولوں کے درمیان اسی طرح جھگڑے کا باعث بن گیا جس طرح کہ تاشقند اور شاہرخیہ سلطانِ سمرقند اور منگول سلطان کے درمیان باعث نزاع بنے ہوئے تھے۔

ایک خطرہ اور بھی تھا۔ کاشغر وختن کے اکھڑ بے باک اور جنگجو حکمران ابوبکر دوغلات نے اپنی سلطنت تبت کی سرحد تک بڑھا لی۔ اس نے اُزکند کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کیا اور اس کو مرکز بناکر فرغانہ پر حملے شروع کردیے اور آخر کار اس کو فتح کرلیا۔

اس طرح پندرھویں صدی کے آخری دس سالوں میں وسط ایشیا پانچ

ریاستوں میں منقسم ہوگیا جو ہر طرف سے خطرہ میں گھری ہوئی تھیں۔ تیموری حکمرانوں میں سب سے عمر رسیدہ شیخ حسین بایقرا تھا جو اپنے لوچ دار اخلاق عیاشانہ زندگی اور بڑھاپے کی وجہ سے تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہو رہا تھا۔ برخلاف اس کے سب سے چھوٹا شہزادہ عمر شیخ مرزا حاکم فرغانہ، بابر کا باپ عقابی صفات کا حامل تھا ——— اس پر روز افزوں آرزوؤں اور حوصلہ مندیوں کا غلبہ ہوتا گیا۔ وہ اکثر اپنے بھائیوں اور ماموؤں سے لڑتا رہتا۔ باوجودیکہ اس کے پاس کافی سیاسی مادی اور اخلاقی وسائل موجود نہ تھے پھر بھی وہ فردوسی کے شاہنامہ کے پہلوانوں کے کارناموں کی نقل کرنا چاہتا۔ تیز شراب اور نشہ آور معجون کے اثر سے اس کے تخیلات کی پرواز خطرناک حد تک پہنچ گئی تھی اور ہمیشہ وہ کسی نہ کسی ہمسایہ حکمران سے جنگ میں مشغول رہتا۔

1494ء میں منگول سردار سلطان محمود نے شمال کی طرف سے اور سلطان احمد حکمران سمرقند نے مشرق کی جانب سے فرغانہ پر حملہ کر دیا۔ اس نازک موقع پر عمر شیخ جو ابھی چالیس سال کا بھی نہ ہوا تھا اتفاقیہ طور پر گر کر مر گیا۔ اس وقت اس کا سب سے بڑا لڑکا بابر متولد فروری 1483ء جو بعد میں ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا بانی ہوا ابھی اپنے بارھویں سال میں تھا۔ اس مرتبہ فرغانہ کا دشمنوں کی زد سے بچ جانا محض وہاں کے باشندوں کی دفاعی کارکردگی کے سبب نہ تھا بلکہ اس میں کچھ موافق حالات کو بھی دخل تھا۔ سلطان احمد کے گھوڑوں میں ایک جان لیوا وبا پھیل جانے اور دریائے کا بار پر یکایک ایک پل کے گر جانے کے سبب انسانوں اور جانوروں کی ہلاکت اور خود اس کی علالت نے اس کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ صلح کی تجاویز پر غور کرے۔ اس کو شاید یہ اطمینان دلایا گیا کہ وہ جیتے ہوئے علاقوں کو اپنے قبضے میں رکھ سکتا ہے۔ بہرحال ایک قسم کی صلح ہوگئی۔ سلطان محمود منگول نے کاشان اور اخشی کو فتح کر لیا تھا لیکن اخشی کے قلعہ کا بہادرانہ دفاع کیا گیا۔ جب سلطان محمود نے سلطان احمد کی واپسی کا حال سُنا تو اس نے بھی مایوس ہو کر محاصرہ اٹھا لیا اور واپس چلا گیا۔ سلطان احمد سمرقند واپس جاتے ہوئے مر گیا۔ اس کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی جو اس کی وارث ہوتی لہٰذا سمرقند کے تخت کے حصول کے لیے وسط ایشیا کے حکمرانوں اور منگول سلاطین میں حرص و ہوس کے جذبات میں اُبھار آگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے وسط ایشیا میں افراتفری پھیل گئی جس کی وجہ

سے تیموریوں کو پہلے تو وسط ایشیا میں اور پھر ایران میں تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔
بابر ایک ہونہار، مہذب، شجاع اور اولوالعزم نوجوان تھا۔ وہ سمرقند حاصل کرنے کی خواہش کو دبا نہ سکا۔ یہ شہر سیاسی تجارتی اور سب سے بڑھ کر تمدنی حیثیت سے وسط ایشیا کا دل سمجھا جاتا تھا۔ اس کی آب و ہوا، زرخیزی، خوبصورتی، شان و شوکت، خوش حالی اور تاریخی اہمیت نے سب تیموریوں کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ بابر نے فرغانہ کے غیر مطمئن حالات اور جاہ طلب و ناقابل اعتماد اور بے وفا امرار کے باوجود جو ایک مستقل خطرہ بنے ہوئے تھے سمرقند کو فتح کرنے کے لیے 1496ء میں پہلا قدم اٹھایا۔ اس وقت سلطان محمود مرزا حکمران حصار کو جس کو سمرقند و بخارا کے امرا نے سمرقند پر قبضہ کرنے کی دعوت دی تھی، مرے ہوئے ایک ہی سال ہوا تھا۔ محمود کی وفات کے بعد اس کا لڑکا بایسنقر مرزا تخت پر بیٹھا لیکن اس کو امرا کی مکمل حمایت حاصل نہ ہو سکی۔ ان میں سے کچھ نے تو منگول شہزادہ سلطان محمود کو دعوت دی لیکن بایسنقر مرزا نے اس کو شکست دے دی۔ یہ امرا جب اپنی تجاویز میں کامیاب نہ ہوئے تو انھوں نے بایسنقر مرزا کے چھوٹے بھائی سلطان علی کو تخت حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ دونوں بھائیوں کی خانہ جنگی کے سبب بابر کو موقع ہاتھ آگیا۔ وہ سمرقند کی طرف چل پڑا۔ 1496ء میں بابر نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ کارگر ثابت نہ ہوا اور سردی شروع ہو جانے کے باعث اس کو واپس جانا پڑا۔

مئی 1497ء میں سلطان علی اور بابر نے مشترکہ طور پر سمرقند کا محاصرہ کیا۔ محاصرہ ایسا شدید تھا کہ بایسنقر نے انتہائی مایوسی کی حالت میں شاہ بیگ خاں کو جو کہ ازبکوں کی تنظیم نو کا سردار تھا مدد کے لیے طلب کیا۔ چونکہ یہ شیبانی سردار بابر کی فوج کا محاصرہ نہ توڑ سکا اس لیے بایسنقر نے بہت ہی بے دلی سے اس کا استقبال کیا۔ شیبانی سردار اس برتاؤ سے آزردہ ہو کر سمرقند کو اس کی قسمت پر چھوڑ واپس چلا گیا۔ بایسنقر کی ہمت ٹوٹ گئی اور اس طرح نومبر 1497ء میں بابر کی سمرقند پر حکومت کرنے کی آرزو پوری ہو گئی گو یہ قبضہ زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکا۔

بابر کی قسمت میں اپنی اس آرزو سے لطف اندوز ہونا نہ تھا۔ اس لیے اپنے سرداروں کی یہ بات کہ وہ ان کو سمرقند لوٹنے کی اجازت دے دے نہ مانی بلکہ اس کے

برخلاف وہ اس بات پر اڑا رہا کہ سمرقند کے لوگوں کے ساتھ مساوات و برابری کا برتاؤ کرے
اس بات سے بابر کے امرا ناراض ہو گئے اور اس کی شدید بیماری سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے
اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ صرف ایک ہزار آدمی اُس کے ہمراہ رہ گئے۔
اس کے علاوہ فرغانہ کے حالات خراب ہونے شروع ہو گئے۔ کچھ اہم سرداروں نے اس
کو یہ تجویز پیش کی کہ وہ اخشی اور اندیجان کو اپنے بھائی جہانگیر مرزا کے نام منتقل کر دے۔
دوسری تجویز اس کے ماموں منگول سردار سلطان احمد نے پیش کی کہ اندیجان اس کو
دے دیا جائے لیکن بابر اس قسم کی کسی تجویز کو قبول نہ کر سکتا تھا۔ وہ بیماری کی حالت
میں مجبور اور صاحب فراش تھا۔ جب بابر نے سرداروں کی مرضی کے مطابق فیصلہ نہ
کیا تو دو طاقت ور امیر اوزون حسن اور تمبل نے اندیجان کا محاصرہ کر لیا۔ بابر جونہی گھوڑے
کی سواری کے قابل ہوا اس نے سمرقند سے کوچ کیا لیکن اس کو راستے ہی میں یہ خبر
ملی کہ اندیجان پر دشمنوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ ابھی اس بات کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ
اُسے دوسری خبر ملی کہ بعض لوگوں نے بخارا کے حکمران سلطان علی کو بلا بھیجا ہے اور اس
نے سمرقند پر قبضہ کر لیا ہے۔ اندیجان اور سمرقند کے بعد دیگرے ہاتھ سے نکل جانے
کے باعث بابر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے اپنے ماموں محمود خاں سے مدد
مانگی لیکن مدد نہ ملی۔ اس کے باوجود بابر سمرقند جانے کے لیے آمادہ تھا چونکہ اس
کے پاس وسائل نہ تھے وہ تیزی سے خجند کی طرف روانہ ہوا۔ کافی عرصے تک مشکلات
کو حل نہ کر سکا۔ اس کے پاس کوئی اور چارۂ کار بھی نہ تھا لہٰذا وہ تین سو ساتھیوں
کے ہمراہ سردیوں بھر اوری تپہ کے حاکم محمد حسین دوغلات کا مہمان رہا۔

اندیجان والے اوزون اور تمبل کو پسند نہ کرتے تھے۔ وہ لوگ علی بیگ طغائی
کے گرد جمع ہو گئے جو ایک بہادر اور با اثر سردار تھا جس نے دونوں باغی امرا کا بہت
بہادری سے مقابلہ کیا۔ اس نے بابر کو مرغیلان سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ بلا بھیجا۔
بابر نے اس دعوت کو فوراً ہی قبول کر لیا۔ اخشی کے باشندوں نے فوج کے خلاف
علم بغاوت بلند کر دیا اور بابر کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اندیجان اور دوسرے
شہروں میں بھی لوگوں نے اس کی پیروی کی۔ اسی عرصے میں منگول سردار محمود خاں
کی مدد پہنچ گئی جس سے بابر کے حامیوں کی ہمت بندھی۔ فرغانہ دوبارہ بابر کے ہاتھ

آگیا لیکن سرداروں نے یہ اصرار کیا کہ اس کو تقسیم کر دیا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ اندیجان بابر کے پاس رہے لیکن اخشی جہانگیر مرزا کو دے دیا جائے۔ ایک معاہدے کے بموجب یہ قرار پایا کہ یہ انتظام اس وقت تک قائم رہے جب تک کہ سمرقند دوبارہ فتح ہو جائے۔ اس کے بعد بابر سمرقند اپنے قبضے میں رکھ کر فرغانہ کا سارا علاقہ جہانگیر مرزا کو دے دے۔ بابر نے یہ تجویز اس شرط پر مان لی کہ دونوں مل کر سمرقند کو دوبارہ فتح کرنے کی کوشش کریں۔

سمرقند اور بخارا میں سلطان علی اور ترخان سرداروں محمد مزید اور باقی کے درمیان جو دونوں شہروں کی مالگذاری کے ناظم تھے کشیدگی پیدا ہو گئی۔ سلطان علی یہ چاہتا تھا کہ امور مالگذاری اس کے اختیار میں آجائیں لیکن ترخان سردار اس کے لیے تیار نہ تھے۔ جب ترخانیوں کو کہیں سے امداد نہ ملی تو انھوں نے بابر کو بلا بھیجا۔ بابر نے جو کہ اپنے امراء اور سرداروں کے متکبرانہ رویّے سے پریشان ہو چکا تھا اور سمرقند کو جلد از جلد فتح کرنا چاہتا تھا اس دعوت نامے کو بخوشی منظور کر لیا۔ اوشس کا قلعہ تمبل کے بھائی کے ہاتھوں فتح ہونے کی پریشان کن خبر کے باوجود بابر نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ سمرقند فتح کرنے کی تجاویز پر گامزن رہے گا چنانچہ وہ ایک چھوٹی سی فوج لے کر آگے بڑھا۔ ابھی وہ اپنی سلطنت کی سرحد ہی تک پہنچا تھا کہ خبر ملی کہ شیبانی خاں نے باقی ترخاں سے بخارا چھین لیا اور سمرقند کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اب بابر ششں و پنج میں پڑ گیا اور مزید سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اور اُس کے ساتھی اعلانیہ طور پر بابر کی حمایت کا اعلان کریں۔ اُس نے وعدہ کیا کہ جب بابر سمرقند کے قریب پہنچے گا تو وہ ایسا اعلان کر دے گا۔ ابھی بات چیت کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ شیبانی خاں نے سلطان علی مرزا کی مدد سے سمرقند پر بھی قبضہ کر لیا۔ سلطان علی کی ماں نے اس شرط پر شہر کو شیبانی خاں کے حوالے کر دیا کہ وہ اس سے شادی کرے اور اُس کے بیٹے سے اچھا برتاؤ کرے مگر اُس کی آرزو پوری نہ ہوئی اور وہ تمام عمر ایک داشتہ کی حیثیت سے زیادہ مرتبہ نہ پا سکی۔ اُس کا لڑکا بھی سمرقند کی فتح کے تین چار دن بعد شیبانی خاں کے آدمیوں کے ہاتھ مارا گیا۔

بابر نے اپنا منصوبہ بدل ڈالا باوجودیکہ اُس کے ساتھی اس کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہ حصار کی طرف روانہ ہوا۔ یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اُس کو اپنے ساتھیوں کا

اعتماد حاصل نہ تھا اور نہ اس کو یہ امید تھی کہ فرغانہ میں اس کا گرمجوشی سے استقبال کیا جائے گا۔ اس کے ہمراہیوں کی تعداد اس قدر کم ہوگئی تھی کہ اس کو حصار سے منہ موڑ کر منگولوں کے خانِ اعظم سلطان احمد کے پاس پناہ لینی پڑی۔ اس نے راستے میں یہ فیصلہ کیا کہ موقع سے فائدہ اٹھاکر سمرقند پر حملہ کرے کیونکہ اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ وہاں کے لوگ اس اجڈ ازبک فاتح سے سخت نالاں ہیں۔

رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاکر بابر کے حامیوں نے اپنی خوش تدبیری سے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو سمرقند میں داخل کردیا۔ وہاں کے لوگوں نے فوراً ہی ازبکوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ اور بابر کی حمایت کا اعلان کردیا۔ اس وقت شہر میں صرف پانچ سو ازبک تھے اور اُن کی بقیہ فوج باہر خیمہ زن تھی۔ شیبانی کو محل میں نیند سے جگایا گیا۔ وہ بھی گھبراہٹ میں بھاگ کر اپنی فوج سے جاملا۔ بابر کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ اس نے اس فتح کی خوشی میں 1500ء میں اپنے دو چچاؤں کی لڑکیوں سے شادی کرلی۔ یہ وہ چچا تھے جنھوں نے سمرقند پر حکمرانی کی تھی اور اس طرح سمرقند پر حکمرانی کے لیے اپنے حق کو اور بھی مضبوط بنالیا۔

شیبانی انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ بخارا واپس گیا اور وہاں اُس نے اپنی فوج کو ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے از سرِ نو منظم کرنا شروع کردیا۔ بابر نے بھی سارے تیموریوں سے جو کہ اس کی دسترس میں تھے اور خانِ اعظم منگول سے مدد کی درخواست کی لیکن اُسے کہیں سے بھی مدد کا یقینی وعدہ نہ ملا۔ 1501ء میں بابر نے اس خوف سے کہ شیبانی کی طاقت بڑھ رہی تھی اس امید میں کہ اس کا بہادرانہ اقدام تیموریوں کو مدد پر اکسا دے گا سمرقند سے باہر قدم نکالا۔ شیبانی نے اس اقدام کا خیر مقدم کیا اور یہ فیصلہ کرلیا کہ قبل اس کے کہ بابر کو کسی قسم کی مدد مل سکے جنگ چھیڑ دے۔ کوہت میں سرپل کے مقام پر ایک سخت جنگ ہوئی جس میں بابر کو شکست ہوئی۔ شیبانی نے سمرقند کا اس قدر زبردست محاصرہ کیا کہ شہر کے باشندے فاقوں مرنے لگے۔ جب بابر کو شہر کے بچاؤ کی کوئی امید باقی نہ رہی تو اس نے صلح کی درخواست کی۔ بابر کو شہر چھوڑنا پڑا اور اسی دشمن سے جس سے وہ اس قدر نفرت کرتا تھا اپنی بڑی بہن کی شادی کرنا پڑی۔ اس کے بدلے میں بابر کو اس بات کی اجازت مل گئی کہ وہ اپنے خاندان کے ہمراہ

جان بچا کر نکل جائے۔ بابر فرغانہ بھی نہ جا سکتا تھا کیونکہ وہاں اس کے بھائی جہانگیر مرزا کی حکومت تھی۔ کچھ عرصے تک بڑی پریشانی کے عالم میں بے خانماں اور بے یار و مددگار آوارہ گردی کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ اپنے ماموں محمود خاں کے پاس پناہ لے۔

محمود خاں نے بابر کو بڑی شفقت کے ساتھ پناہ دی۔ اب خانِ اعظم بھی آ گیا۔ بابر اور اس کے دونوں چچاؤں نے یہ فیصلہ کیا کہ جہانگیر مرزا کے دست راست تمبل حاکم فرغانہ سے فرغانہ از سرِ نو فتح کر لیا جائے۔ شروع شروع میں تو یہ منصوبہ کامیاب ہوتا نظر آیا۔ لیکن اخشی اور اندیجان مقابلہ میں ڈٹ گئے۔ تمبل نے زبردست مقابلہ کیا۔ اس نے یہ بھی کوشش کی کہ بابر کو اس کے چچاؤں سے علیحدہ کر کے اپنے ساتھ ملا لے۔ جب تمبل فرغانہ کو بچانے کی کوششوں میں ناکام ہو گیا تو اس نے شیبانی خاں سے مدد مانگی۔ شیبانی خاں فوراً ہی فرغانہ پہنچا۔ منگول سردار ایسے خوفناک حملہ آور کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ تھے لہٰذا وہ فرغانہ سے فوراً ہی فرار ہو گئے۔ بابر اکیلا رہ گیا۔ اُس نے تنہا ہی مقابلہ کرنا چاہا لیکن حالات ناسازگار تھے۔ آخرکار اس نے فرار میں ہی نجات سمجھی اور بڑی مشکل سے جان بچا کر خطروں کا سامنا کرتا ہوا اپنے ماموں سے جا ملا۔

1503 ء میں بابر اور اُس کے ماموں دوبارہ فرغانہ فتح کرنے کے لیے روانہ ہوئے شیبانی خاں مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس کی نقل و حرکت اس قدر تیز اور چابک دستانہ تھی کہ منگول سرداروں کو اس نے ارچین کے مقام پر بالکل بے خبری میں جا لیا۔ ان کو زبردست ہزیمت اٹھانی پڑی اور گرفتار کر لیے گئے۔ اس فیصلہ کن جنگ نے تیموریوں کو ہمیشہ کے لیے ماوراءالنہر سے الگ کر دیا۔ گرفتار شدہ منگول سرداروں کو کچھ عرصے بعد رہا کر دیا گیا۔ گو بابر بچ نکلا لیکن اس کا اس قدر زبردست تعاقب کیا گیا کہ وہ مشکل سے خود کو بچا سکا۔ کافی عرصے تک آوارہ گردی کرنے اور ہر قسم کی سختی و مشکلات برداشت کرنے کے بعد اُس نے آخرکار بادل ناخواستہ وسط ایشیا کو خدا حافظ کہا۔ اس دوران میں شیبانی خاں نے حصار اور قندز فتح کر لیے اور اس طرح **1504** ء میں تیموریوں کی تیسری سلطنت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

بابر کافی عرصے بلا مقصد گھوم پھر کر اپنا وقت گزارتا رہا اسی دوران میں جب وہ ترمز پہنچا تو اس کو یہ صلاح دی گئی کہ وسط ایشیا میں اس کا گھومنا پھرنا بیکار ہے۔

اس کے بجائے بہتر یہ ہوگا کہ وہ افغانستان جاکر اپنی قسمت آزمائی کرے کیونکہ وہاں کی حکومت کمزور تھی اور لوگ حکومت سے بیزار ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ اگر وہ افغانستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کرے تو اس کو کافی معاون و مددگار بھی مل جائیں گے۔ کابل کے حالات ایسے حملے کے لیے بہت سازگار تھے۔ الغ بیگ مرزا 1501ء میں مر چکا تھا اور اس کا نابالغ لڑکا عبدالرزاق اس کا جانشین ہوا۔ محمد مقیم ارغون نامی ایک شخص نے ہزارا قوم کے افراد کی مدد سے کابل پر قبضہ جمالیا۔ نابالغ بادشاہ کی بہن سے شادی کرلی اور وہاں کے قدیمی امراء اور سرداروں کے عہدے پر اپنے مقرر کیے ہوئے امیروں و سرداروں کو متعین کرنا شروع کردیا۔ اس کے اس عمل سے ملک میں بے چینی و بغاوت پھیل گئی۔ جب اکتوبر 1504ء میں بابر کابل پہنچا تو اس کو کسی مقاومت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ محمد مقیم کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنے باپ کے پاس گرمسیر واقع قندھار چلا جائے۔ بابر نے غزنی و ننگرہار اپنے دو بھائیوں جہانگیر اور نصیر مرزا کو سونپ دیے۔

افغانستان اور وہاں کے جنگجو قبائل کو مطیع و فرماں بردار بنانے کا کام بڑا دشوار تھا۔ مزید برآں کہ بابر کے منگولی ساتھیوں اور خود اس کے اپنے قبیلے والوں کی بے وفائی نے اس کام کو اور بھی دشوار بنا دیا۔ 1505ء میں بابر نے ہزاراؤں اور بنگش قبیلوں کے خلاف مہم شروع کردی اس نے دریائے سندھ کے مغربی علاقے جمرود، کوہاٹ اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں تک کا معائنہ کیا۔ ناصر مرزا غزنی سے ہٹاکر بدخشاں کا حاکم مقرر کردیا گیا۔ لیکن چند ہی ماہ بعد اس کو وہاں سے بھی ہٹنا پڑا۔ اگلے سال 1506ء میں جہانگیر مرزا نے بغاوت کردی اور غزنی کو لوٹ کر منگول دشمنوں سے جا ملا۔

باوجودیکہ افغانستان کے حالات بے حد غیر یقینی اور پریشان کن تھے پھر بھی بابر نے سلطان حسین بایقرا کی اس دعوت کو لبیک کہا جس میں اس نے سب تیموریوں سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ اس کے پرچم کے نیچے جمع ہوکر ازبک فتنہ کو ختم کرنے کی مشترک کوشش کریں وہ تیزی سے روانہ ہوگیا۔ راستے میں اس کو پتہ چلا کہ سلطان فوت ہوگیا ہے لیکن اس کے دونوں لڑکے جو متحد طور پر اس کے جانشین قرار پائے تھے اپنے باپ کی تجویز کو جامۂ عمل پہنانے کے لیے کوشاں ہیں۔ بابر یہ سن کر اور آگے بڑھا۔ جب وہ اپنے پڑاؤ پر پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ شہزادے بالکل نااہل ہیں۔ ان میں عمل و معاملہ فہمی کی لیاقت نہیں اور نہ وہ اس

لائق ہیں کہ اتنی بڑی مہم کو چلا سکیں۔ چنانچہ بابر واپس لوٹ گیا۔ خوش قسمتی سے وہ کابل اس وقت پہنچا جب ایک خطرناک سازش کے تحت اس کے ایک رشتہ دار بھائی ویس مرزا کو تخت نشین کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس نے پہنچتے ہی اس سازش کو دبا دیا۔

ایران کی سرحدوں پر جو واقعات رونما ہو رہے تھے وہ بابر کے لیے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ شیبانی خاں نے 1507ء میں ہرات فتح کر لیا اور بغیر کسی خاص دشواری کے پورے خراسان پر قابض ہو گیا۔ اس طرح تیموری خاندان کی چوتھی اہم سلطنت بھی ختم ہو گئی۔ اب یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ شیبانی افغانستان کی طرف متوجہ ہو گا کیونکہ صرف یہی ایک ایسی سلطنت باقی رہ گئی تھی جس پر تیموری خاندان ابھی تک حکمراں تھا۔ خیال کیا جاتا تھا کہ شیبانی سب سے پہلے قندھار کی طرف قدم بڑھائے گا۔ قندھار کے ارغونوں نے درخواست کی کہ قبل اس کے کہ شیبانی خاں قبضہ کر لے بابر کو وہاں پہنچ جانا چاہیے چنانچہ وہ تیزی سے قندھار کی طرف روانہ ہو گیا لیکن ارغونوں نے غداری کی اور وہ اس پر حملہ آور ہو گیا۔ اس جنگ میں بابر فتح یاب ہوا اور قندھار کچھ عرصے کے لیے بابر کے اقتدار میں آ گیا۔ اس طرح اس نے قندھار پر بھی حق جما لیا لیکن 1507ء میں شیبانی خاں کی آمد پر اس کو قندھار خالی کرنا پڑا۔

شیبانی خاں کی آمد سے بابر بہت پریشان و متفکر ہوا اور اس نے یہ سوچ لیا کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ ہندوستان کی طرف چل دے گا۔ شیبانی واپس چلا گیا تو بابر کو تسلی ہوئی۔ اگلے تین سالوں میں صرف ایک ہی اہم واقعہ پیش آیا 1508ء میں بابر کے بجائے ویس مرزا کو تخت پر بٹھانے کی ایک گہری سازش عمل میں آئی لیکن بابر کی ہمت، ضبط اور اثر و رسوخ نے اُسے بچا لیا۔ اُس نے وسیع القلبی سے کام لے کر ویس مرزا کو بدخشاں چلے جانے کی اجازت دے دی جہاں اس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ بابر نے یہ بات اچھی طرح بھانپ لی تھی کہ اُس کے ساتھیوں میں بے اطمینانی و بے چینی کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ وہ ترک اور منگول ہمراہیوں کے ساتھ سخاوت کا برتاؤ نہیں کر سکتا مگر مجبوری یہ تھی کہ افغانستان کے وسائل اس قدر کم تھے کہ وہ فیاضی کو دخل نہیں دے سکتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بابر کافی عرصے سے ہندوستان کی طرف حریص نگاہوں سے

دیکھ رہا تھا لیکن وہ افغانستان چھوڑنے کا فیصلہ بھی نہ کر سکتا تھا۔ ایک طرف تو وسط ایشیا سے اس کو دلچسپی تھی دوسری طرف شیبانی خاں کا خطرہ لاحق تھا دونوں باتیں برابر کی اہمیت رکھتی تھیں۔ ابھی افغانستان میں اس کا اتنا اختیار و اقتدار قائم نہ ہو پایا تھا کہ وہ سکندر لودی سے جنگ کرنے کے لیے روانہ ہو۔ سکندر لودی دہلی کا افغان حکمراں تھا اور شمالی ہند کے طاقت ور حکمرانوں میں اس کو کافی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ بابر کسی طرح بھی اس کے لیے تیار نہ تھا کہ افغانستان اس کے ہاتھوں سے نکل جائے کیوں کہ یہی ایک فوجی اہمیت کے اعتبار سے ایسا محفوظ مقام تھا جہاں سے وہ مشرق و مغرب دونوں طرف نگاہیں دوڑا سکتا تھا۔

دسمبر 1510ء میں مرو میں شیبانی خاں اور شاہ اسمٰعیل صفوی کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ شیبانی خاں کے خراسان فتح کرنے اور ازبکوں کے کرمان میں داخلے کے بعد ان دو زبردست فاتحوں کے درمیان جنگ ناگزیر ہو گئی تھی کوئی بھی یہ پیش بینی نہ کر سکتا تھا کہ ازبکوں کو پہلی جھڑپ میں ہی زک اٹھانا پڑے گی مگر ہوا یہی اور قسمت نے شاہ اسمٰعیل کے حق میں فیصلہ کیا۔ شیبانی خاں قتل ہوا۔ بابر نے اس زبردست خوشخبری کا خیر مقدم کیا۔ اس نے نصیر مرزا کو کابل میں چھوڑا اور اپنے دو نابالغ لڑکوں ہمایوں و کامران کے ہمراہ وسط ایشیا کی طرف چل پڑا۔

قندز پہنچ کر بابر کو اپنی بہن خانزادہ بیگم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ شیبانی خاں کے مرنے کے بعد خانزادہ بیگم گرفتار ہو گئی تھی لیکن شاہ اسمٰعیل نے اس کو پورے احترام اور دوستانہ پیغام کے ساتھ اس کے بھائی کے پاس بھیج دیا۔ بابر نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاہ کے دوستانہ پیغام کے جواب میں ایک ایلچی کے ہمراہ بیش بہا تحائف ارسال کیے۔ ان مذاکرات کا نتیجہ دونوں کے لیے اطمینان بخش ثابت ہوا۔ شاہ نے شاید اس بات کا اندازہ لگالیا تھا کہ وسط ایشیا کے سنّی المذہب ترکوں، ازبکوں اور منگولوں پر حکومت کرنا بہت ہی مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔ چنانچہ شاہ نے یہ سوچا کہ اگر وہ بابر کو جو ایک تیموری شہزادہ ہے اپنی اطاعت قبول کرنے کے لیے راضی کرلے تو پھر اس کے لیے یہ کام آسان ہو جائے گا۔ دوسری طرف بابر جانتا تھا کہ ازبکوں کی شکست اور شیبانی خاں کی موت کے باوجود ازبکوں کی طاقت پوری طرح ختم نہیں

ہوئی ہے اور اس بات کا پورا امکان ہے کہ حلیف ازبک سردار ہمیشہ کی طرح پھر ایک نئے قائد کے ماتحت جمع ہو جائیں اور جلد ہی اپنی بگڑی ہوئی حالت کو سنبھالنے کی حیرت انگیز طاقت کا مظاہرہ کریں۔ اس کو یہ بھی امید تھی کہ شاہ ایران سے دوستی کر کے وہ کم ازکم اس وقت تک اطمینان سے حکومت کر سکتا ہے جب تک کہ اس کے حالات مستحکم نہ ہو جائیں لیکن شاہ ایران نہ تو ایک فوجی سربراہ تھا اور نہ ہی اس کی حکومت غیر مذہبی تھی۔ وہ نہ صرف متعصب تھا بلکہ اس کے ساتھی بھی وحشیانہ حد تک تشدد پسند تھے۔ شاہ اپنی حمایت کے عوض بابر سے یہ توقع رکھتا تھا کہ بابر کی سلطنت میں شاہ کے نام کا خطبہ پڑھا جائے۔ سکوں پر اس کا نام کندہ ہو، دربار میں شیعہ طور طریق رواج پذیر ہوں اور شیعہ مذہب کی ترویج ہو۔ بابر کشادہ دل اور وسیع المشرب ہونے کے ساتھ ساتھ سمرقند پر حکومت کرنے کے لیے بہت بے تاب تھا۔ وہ سکوں پر بارہ اماموں کے نام کندہ کرانے پر راضی ہوگیا اور خود بھی شیعہ لباس پہننا شروع کردیا لیکن وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کو کابل اور فرغانہ میں اپنے نام کے سکے جاری کرنے کا اختیار رہے۔ ایسا کرتے ہوئے اسے یہ خیال بھی نہ آیا کہ کابل و فرغانہ میں اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے وہ سنجیدگی کے ساتھ مذہب کا سودا کر رہا ہے۔ چونکہ شاہ اسمٰعیل اس مسئلے میں ایک قابلِ عمل حل چاہتا تھا لہذا بابر کی شرائط منظور کر لی گئیں۔

شاہ اسمٰعیل و بابر کی مشترکہ افواج بخارا کی طرف بڑھیں اور اس پر فوراً ہی قبضہ کرلیا۔ بابر نے مقامی باشندوں کے جوش و خروش سے مطمئن ہوکر اور اس خیال سے کہ سمرقند کے لوگ ایرانی فوج کی موجودگی کے سبب غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں اُن کو تحفے تحائف دے کر شکریے کے ساتھ واپس کر دیا۔ ویس مرزا 1511ء میں سمرقند کی طرف روانہ ہوا جہاں گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا گیا۔ مرزا حیدر نے ازبکوں کو فرغانہ سے نکال باہر کیا۔ اب وہ اس بات پر فخر کر سکتا تھا کہ وہ پو... علاقے یعنی سارے وسط ایشیا اور وہاں سے تاشقند اور کابل تک کی سرزمین پر قابض ہے جس پر اس کا دادا ابوسعید مرزا حکومت کیا کرتا تھا۔

اس سلطنت کو ایک سال سے زائد اپنے قبضے میں رکھنا بابر کی قسمت میں نہ تھا۔ اس کے باوجود کہ وہ شاہ ایران کا بے حد احترام کرتا تھا مگر وہ خود کو اس بات پہ راضی نہ کر سکا۔

کہ وسط ایشیا کے سنی دینی بھائی ظلم وستم کا نشانہ بنائے جائیں اور نہ یہ برداشت کرسکتا تھا کہ شاہ ایران کا مغرور نمایندہ محمد جان اس کے دربار میں کبر و غرور کا مظاہرہ کرے۔ وہ نہ تو متعصب شیعوں کی تخریبی و تبلیغی کارروائیوں میں ان کا ساتھ دے سکتا تھا اور نہ یہ بات فراموش کرسکتا تھا کہ وہ خاندانِ تیموریہ کی عزت و وقار اور اپنے ہم وطن سنیوں کی امیدوں کا علمبردار ہے۔

بابر کے بارے میں محمد جان کے مبالغہ آمیز بیانات نے شاہ اسمٰعیل کو آہستہ آہستہ اس بات کا یقین دلا دیا کہ بابر ایک مغرور، ناقابلِ اطمینان اور بے وفا آدمی ہے۔ دوسری طرف سمرقند کے لوگ یہ محسوس کرنے لگے کہ بابر شیعوں کے ہاتھوں میں کھلونا ہے اور اس میں اپنے اختیار و اقتدار کو جمانے اور اپنے خاندان و رعایا کی عزت و وقار کو بچانے کی ہمت نہیں۔ اس طرح بابر دونوں طرف سے ملامت و بدگمانی کا شکار ہوگیا۔ وہ کسی قطعی کارروائی کی بابت فیصلہ نہ کرسکا کیونکہ اُسے اس بات کا یقین تھا کہ ازبک طاقت ابھی تک کچلی نہیں گئی تھی اور وہ کسی ایسے موقع کے منتظر تھے جس کے ملتے ہی اپنے کھوئے علاقے اور سلطنت کو دوبارہ حاصل کرسکیں۔ حسب توقع ازبک سردار فوراً ہی شیبانی خان کے بھتیجے جانی بیگ اور عبید اللہ خاں کے گرد جمع ہوگئے۔ ان دونوں میں سے عبید اللہ خاں جس کے ہاتھوں سے بخارا نکل چکا تھا بہت ہی مضطرب و بے چین تھا۔ اس نے بابر اور شاہ ایران کے درمیان بڑھتی ہوئی سرد مہری اور خصومت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بخارا پر حملہ کر دیا۔ بابر سمرقند سے بخارا کی حفاظت کی خاطر نکل کھڑا ہوا لیکن کُل مُلک کے قریب اس کو شکست ہوئی۔ اس کا سمرقند واپس جانے کا راستہ روک لیا گیا۔ چنانچہ وہ حصار کی طرف بھاگا اور ازبکوں کے سخت تعاقب کے باوجود حصار پہنچ گیا۔ ازبکوں نے عقلمندی سے کام لے کر حصار کا محاصرہ کرکے اپنا وقت اور طاقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے بجائے وہ اپنا اختیار جمانے اور فوجی طاقت کو مزید مستحکم کرنے کی کوشش میں منہمک ہوگئے۔

شاہ ایران کو اس بات کی امید نہ تھی کہ ازبک اس قدر جلد سنبھل جائیں گے اور اس پھرتی سے جوابی حملہ کردیں گے۔ شاہ اسمٰعیل نے تو اپنے سب سے زیادہ دولت مند اور اعلیٰ ترین امیر نجم الدین ثانی کو گیارہ ہزار سپاہیوں کی سرکردگی میں بابر کو سبق دینے کے

لیے بھیجا تھا. قبل اس کے کہ نجم الدین خراسان کی سرحد تک پہنچے اُسے بابر کی بدقسمتی کا علم ہوگیا۔ اس خبر کو سن کر وہ ششدر رہ گیا اور شاہ ایران کی ہدایات کا انتظار کرنے لگا۔ اُس کو حکم ملا کہ وہ اپنے پہلے منصوبے کو ترک کر دے اور بابر کو پوری مدد پہنچائے کیوں کہ بابر ازبکوں کے مقابلے میں بہت کم خطرناک تھا۔ ایرانی فوج ہمیشہ کی طرح فرقہ وارانہ تعصب اور جوش میں بھری ہوئی قتل و غارت گری کرتی ہوئی آگے بڑھتی گئی جس کے سبب بابر کے دل میں غم و غصہ اور سنّی رعایا کے دل میں خوف و ہراس پھیلتا گیا۔ بہرحال بابر اور ایرانیوں کی مشترکہ فوج بخارا پہنچ گئی اور اس کا محاصرہ کرلیا۔ اس کو محاصرہ کیے ہوئے چند مہینے گزر گئے اور ازبکوں کو مہلت مل گئی کہ وہ اپنی افواج کو اکٹھا کرکے حملہ آور پر دھاوا بول دیں۔ 12 نومبر 1512ء کو غجدوان کے مقام پر ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں ایرانی فوج تباہ ہوگئی اور ان کا سردار مارا گیا ازبکوں نے مرو کا بدلہ لے لیا۔ اب بابر کے لیے جس نے ایرانیوں کے مغرورانہ اور متعصبانہ رویئے سے ناراض ہوکر بے اعتنائی برتی تھی اور جس کو ایرانیوں سے ساز باز رکھنے کے سبب وسط ایشیا کے باشندوں کی ہمدردیاں حاصل نہ ہوسکی تھیں اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہ گیا کہ حصار کی طرف راہِ فرار اختیار کرے لیکن اس کو وہاں سے بھی ناامید اور مایوس ہوکر کابل آنا پڑا۔ بابر کی وسط ایشیا پر حکومت کرنے کی امیدیں خاک میں مل گئیں لیکن اس تمنا کی صدائے بازگشت اس کے خوابوں میں زندگی بھر سنائی دیتی رہی۔

بابر نے اگلے چند سال افغانستان میں اپنی حکومت کو مضبوط کرنے میں صرف کیے۔ وہ مغرب میں حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ اس میں شک نہیں کہ ازبک اس کے دشمن تھے اور ایران سے اب اس کے تعلقات خوش گوار نہ تھے۔ 1514ء میں خالدران کے مقام پر شاہِ ایران اور عثمانی سلطان سلیم (سنگدل) کے درمیان ایک خوفناک جنگ ہوئی۔ ایرانی فوج بہادری کا حیرت انگیز مظاہرہ کرنے کے باوجود ہار گئی کیوں کہ ان کے پاس کسی قسم کے آتشیں اسلحے نہ تھے برخلاف اس کے عثمانیوں کے پاس دنیا کا بہترین توپ خانہ تھا۔ اس جنگ میں توپ خانہ کو جو برتری حاصل ہوئی اس نے بابر کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی۔ گو بابر کے وسائل بہت محدود تھے پھر بھی وہ استاد علی رومی کی خدمات

حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تاکہ اپنی فوج میں بھی آتشیں اسلحے کے استعمال کا کام شروع کرا سکے۔ ابھی یہ کام ہو ہی رہا تھا کہ بابر نے قندھار اور متعدد افغان قبیلوں کے خلاف فوجی مہم شروع کردی۔ جنوری 1519ء کے شروع میں اس نے اپنی نوایجاد توڑے دار بندوق والے دستے کو قبیلۂ یوسف زئی کے مقابلے میں استعمال کیا اور اس کو اس قدر مفید پایا کہ 1520ء میں ایک دوسرے ماہر مصطفیٰ رومی کو اپنی جنگی طاقت مزید مستحکم کرنے کے لیے بلالیا زیادہ احتمال اس بات کا ہے کہ یہ تیاریاں اس نے اس خیال سے کی تھیں کہ وہ ہندوستان پر حملے کی مہم شروع کرنے والا تھا۔ افغانستان کو فتح کرنے کا موقع نہ تو ایرانیوں ہی کے لیے موزوں تھا اور نہ ازبک اس معاملے پر سنجیدگی سے غور کرسکتے تھے۔ مرکزی اور مغربی ایشیا میں عثمانیوں، ایرانیوں اور ازبکوں کے درمیان ایک قسم کا توازن قوت برقرار تھا۔ ان حالات میں بابر اپنی توجہ ہندوستان کی طرف مبذول کرسکتا تھا جہاں کہ افغانوں کی لودی سلطنت کی حالت کمزور ہوتی جارہی تھی۔ افغان بادشاہ سکندر لودی 1517ء میں فوت ہوگیا اور اس کی جانشینی کے سوال پر خانہ جنگی اور ہمہ گیر بدامنی پھیل گئی۔

باب 2

لودی سلطنت

چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں دہلی پر تیمور کے حملوں اور لوٹ مار نے تغلق سلطنت کے تدریجی انتشار کو تیز تر کر دیا تھا۔ اس کے کھنڈرات پر کئی سلطنتیں وجود میں آئیں۔ جو شخص بھی اپنی آزادی کے تحفظ کے قابل فوج جمع کر سکا اس نے آزادی کا اعلان کرنے میں کوتاہی نہ کی۔ یہاں تک کہ شمالی ہند میں بہت سی چھوٹی بڑی، طاقت ور اور کمزور ریاستیں وجود میں آ گئیں۔ ان ریاستوں میں گجرات، مالوہ، جون پور اور بنگال نسبتاً زیادہ منظم ریاستیں تھیں اور اس بات کا امکان تھا کہ وہ استقامت و پائیداری حاصل کر سکیں۔

ان مسلمان ریاستوں کے علاوہ راجپوتانہ میں بہت سی ہندو ریاستیں بھی موجود تھیں جن میں میواڑ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ پندرھویں صدی کے اواخر میں اس نے دوسری راجپوت ریاستوں پر برتری حاصل کر لی تھی۔ ہندوستان کی عام تاریخ پر صوبہ متوسط ، کی ہندو ریاستوں کا اثر باقی نہ رہا تھا اور دوسری طرف اڑیسہ بجائے شمالی ہند کے جنوبی ہند کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لینے لگا تھا۔ شمالی ہند کی نو بنیاد ریاستیں اپنے اثر و رسوخ کے دائرے کو بڑھانے، اپنے سرحدی جھگڑوں کا فیصلہ کرنے یا پھر ہمسایہ ریاستوں پر غلبہ و اقتدار حاصل کرنے کی خاطر آپس میں مستقل طور پر جنگ میں مصروف رہتیں۔ ان میں سے کچھ تو دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کا خواب بھی دیکھ رہی تھیں۔ لیکن یا تو فاصلے کی زیادتی یا پھر دوسری ریاستوں سے کشمکش نے ان کو

اس قدر مہلت ہی نہ دی کہ وہ اپنی اس خواہش کو جامۂ عمل پہنا سکیں۔

1451ء میں بہلول لودی کی دہلی میں تخت نشینی کے بعد ہی سلطنت کا وقار قائم ہونا شروع ہوا۔ خاندان سادات اپنی قوت و استحکام کے لیے بیشتر افغانوں پر بھروسہ کرتا تھا اور ان کے وقار کا سرچشمہ وہ حق مالکیت تھا جو ان کو تیمور سے حاصل ہوا تھا۔ بعد میں جب تیموریوں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے تو سیدوں کا وقار بھی جاتا رہا یہاں تک کہ اگر تیموری حکمران ان مدد کرنا چاہتے تو بھی نہ کر سکتے۔

سیدوں کے افغان ساتھی موقع شناس اور زمانہ ساز تھے اور کوئی وجہ نہ تھی کہ کمزور سیدوں کے لیے ان کے دل میں عزت و وفاداری کا جذبہ باقی رہتا۔ یہ لوگ جنوبی ہند، صوبہ متوسط اور مشرقی پنجاب میں قسمت آزمائی کرتے کرتے یوپی کے علاقے میں بھی داخل ہو گئے اور بڑی بڑی جاگیریں حاصل کرلیں۔ انھیں اپنے راستے میں کچھ مشکلات نظر آئیں۔ ایک طرف تو جون پور کے حکمران نے دوسری طرف کابل کے حکمران نے مخالفت کی اور تیسری طرف سے کھوکھروں کے سردار جسرت کو بہلول لودی نے اپنے ساتھ ملالیا اور وعدہ کیا کہ اگر جسرت اس کے دہلی پر قبضہ کرنے کے منصوبے میں حارج نہیں ہوا تو وہ اس پر حملہ نہ کرے گا۔ جب بہلول کو مغربی خطرے سے نجات مل گئی تو اس نے زور اور چالاکی سے سید خاندان کے کمزور حکمران عالم شاہ کو ہٹا دیا اور 1451ء میں دہلی کا تخت حاصل کرلیا۔

افغانوں کو نہ تو ہندو اور نہ ہندوستان کے غیر افغان مسلمان پسندیدہ نظر سے دیکھتے۔ پرانے امرا ان کو اُجڈ اور ناقابلِ اطمینان وحشی سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ کسی کی بھی ہمدردی حاصل نہ کر سکتے تھے بلکہ زبردست مخالفت کے متوقع تھے۔ سب سے زیادہ مخالفت جون پور کے مشرقی حکمرانوں کی طرف سے عمل میں آئی۔ جب بہلول کو ہندوستان میں مناسب حمایت نہ ملی تو اس نے افغانستان کے مشرقی علاقہ روہ کے باشندوں سے خواہش کی کہ ہندوستان آکر اپنے بھائی بندوں کی عزت و آبرو کو بچائیں۔ اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ "اقتدار میرے ہاتھ میں رہے گا تاہم مفتوحہ علاقوں کو آپس میں بھائیوں کی طرح تقسیم کریں گے" اس میں شک نہیں کہ یہ ایک بہت ہی بلند و بالا وعدہ تھا اور اس کی مختلف تعبیریں کی جا سکتی تھیں۔ روہ کے باشندوں نے اس وعدے کی بہت ہی خوش آئند تعبیر کی اور ہندوستان

کی طرف چل پڑے۔ اُن کے اس سفر کو ممالک متحدہ امریکا کی حصول زر کی مسابقت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ فارسی تاریخ نویسوں نے اپنے مخصوص انداز میں اس کو ملخ و ملخ (ٹڈی دل) اور چیونٹیوں اور ٹڈیوں سے تشبیہ دی ہے۔

افغان قبیلوں اور اُن کے سرداروں کی ہندوستان میں کثرت سے آمد کے سبب بہلول کے ہاتھ مضبوط ہو گئے اور اس کی طاقت شرقیوں اور دوسری ہمسایہ ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ مستحکم ہو گئی لیکن اس کو ایک ایسی پالیسی اختیار کرنی پڑی جس کی مثال نہ تو ہندوؤں میں اور نہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ملتی ہے۔ بہلول نے ہندوستان کے وسیع میدانوں میں ایک ایسا نظام حکومت قائم کیا جو شاید افغانستان کی وادیوں میں تو مفید ثابت ہو سکتا تھا لیکن بعد میں آنے والے افغان حکمرانوں نے جن میں شیر شاہ سوری بھی شامل تھا اس طرز عمل کو مسترد کر دیا۔ مشترک خون و خاندان کے بندھن ایک ایسی قوم کے لیے زیادہ دیرپا ثابت نہ ہو سکتے تھے جو خونخوار جنگوں میں عقیدہ رکھتی ہو اور جس کی دلچسپی ہندوستان کے زرخیز میدانوں اور خوشحال شہروں میں آپس میں ٹکرانا ہو۔ بہرحال بہلول نے اپنے وعدے کا پاس کیا اور افغانوں سے بجائے رعایا کے اپنے حامی و مددگاروں کا سا سلوک کیا۔ سارا ملک چھوٹی بڑی جاگیروں میں بٹ گیا اور یہ جاگیریں قبائلی سرداروں میں بغیر کسی مقررہ اصول کے تقسیم کر دی گئیں۔ یہاں تک کہ سرکاری خزانہ بھی تقسیم ہو گیا۔ بہلول ان افغان سرداروں کے احترام کی خاطر یا پھر بطور انکساری ان کی موجودگی میں تخت پر نہ بیٹھتا اور نہ فرمان کی شکل میں احکامات جاری کرتا۔ اگر ان میں سے کوئی کسی وجہ سے ناراض ہو جاتا تو بہلول خود اس کے گھر جا کر اس کو اس وقت تک نہایت عاجزی کے ساتھ سمجھاتا جب تک کہ اس کی خفگی دور نہ ہو جاتی۔

اس میں شک نہیں کہ بہلول لودی کے اس نظم حکومت میں کچھ عارضی مفاد بھی پوشیدہ ہوں۔ بہلول نے ان لوگوں کے غرور اور باطل خیالات کو شہ دے کر کچھ عرصے کے لیے حکومت کے خلاف ہر قسم کی سازش کے امکانات کو کم کر دیا۔ اس سے اس کو کچھ عارضی نفع تو پہنچا لیکن آگے چل کر یہ روش سخت نقصان دہ ثابت ہوئی کیوں کہ اس رویے کے سبب ایک طرف تو صاحب اقتدار بادشاہ کی حیثیت محض ایک ہم رتبہ نواب کی سی رہ

گئی اور دوسری طرف بے شمار مطلق العنان امراء کی عملداری وجود میں آگئی۔ بہلول کے اس طرزِ حکومت کا یقینی نتیجہ جاگیردارانہ اور تعلقدارانہ نظام کا رونما ہونا تھا۔ یہ نظامِ حکومت بادشاہ اور رعایا دونوں ہی کے لیے خطرناک ثابت ہوا۔ ممکن ہے کہ اس طرز کو غیر ملکی افغان پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوں لیکن یہ سیاست ہندوستان کے غیر افغان باشندوں میں اطمینان و اعتماد کا جذبہ نہ ابھار سکی۔ یہ روش واضح طور پر نسلی، قبائلی اور علاقائی ملوظات پر مبنی تھی۔ چنانچہ وہ غیر ترقی یافتہ اور تنگ نظرانہ ہونے کے باعث ہندوستان جیسے ملک میں مفید ثابت نہیں ہوسکتی تھی۔ اس سیاست کے دامن میں تخریبی عناصر پوشیدہ تھے جو کہ بہت ممکن ہے قبائلی حسد کو بھڑکا دیتے اور افغانوں کی بظاہر بڑھتی ہوئی طاقت کو منتشر کر دیتے۔

سکندر لودی کو جو کہ بہلول کا لڑکا اور جانشین تھا۔ سب سے پہلے اس طرزِ حکومت کے اثرات سے دوچار ہونا پڑا۔ جونہی 1489ء میں وہ تخت نشین ہوا افغان سرداروں نے سلطنت کی تقسیم کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اگر وہ بھائیوں کے درمیان سلطنت کی تقسیم کے اصول کو مان لیتا تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوتا کہ سلطنت چھ ریاستوں میں بٹ جاتی۔ اس نے بڑے تردد کے ساتھ اس بات کو مان لیا کہ سلطنت میں باربک شاہ کو شریک کرلے۔ لیکن جلد ہی اس نے اپنا خیال بدل دیا اور کئی جنگوں کے بعد سلطنت کو پھر سے متحد کرلیا۔ سکندر لائق، جنگجو اور چالاک بادشاہ تھا۔ اس نے جلد ہی اپنے باپ کی سیاست کے غیر عملی ہونے کا اندازہ لگالیا اور فیصلہ کرلیا کہ نظم و نسق اور بادشاہ سے وفاداری کے اصول کو نافذ کرکے رہے گا۔ اس نے انکساری و عاجزی کی سیاست کو خیرباد کہا اور اپنے احکامات و درباری آداب و رسوم میں سخت رویہ اختیار کیا۔ اس نے قبائلی سرداروں کی قوت کو توڑنے کے لیے مذہبی رہنماؤں کو اپنے ساتھ ملایا اور اس کے لیے وہ ہندوؤں پر کچھ مظالم کرنے سے بھی نہ چوکا۔ اس کی جنگی فتوحات، شخصیت، کشادہ دلی، اخلاق اور مسلم علماء و مقدسین میں ہر دلعزیزی نے اس کے وقار، اختیارات اور قوت کو از سرِ نو مضبوط کرنے میں بڑی مدد دی۔ لیکن افغانوں میں قبائلی جذبات اور دولت و طاقت کی حرص اس قدر زیادہ تھی کہ وہ اپنے دلوں میں بہلول لودی کے زمانے کی واپسی کی دعائیں مانگنے لگے۔

سکندر لودی نومبر 1517ء میں فوت ہوگیا۔ اس کے بیٹے ابراہیم کو بھی ایسی ہی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سلطنت کی تقسیم کے سوال پر افغان بٹے ہوئے تھے۔ جو لوگ متحدہ سلطنت کے حامی تھے وہ ابراہیم لودی کے گرد جمع ہوگئے اور پھر خانہ جنگی شروع ہوگئی جس میں ابراہیم کو فتح ہوئی۔ اس جنگ میں خان اعظم ہمایوں شروانی نے جو طرز اختیار کیا تھا وہ بہت ہی مشکوک تھا۔ اوّل تو وہ اپنی وفاداری بدلتا رہا۔ پھر اس پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ اس نے شہزادہ جلال خاں کو جو کہ اس پارٹی کا رہنما تھا جو سلطنت کی تقسیم کے حق میں تھی گویا فرار ہونے دیا۔ چنانچہ اس کو اور اس کے ایک لڑکے کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس بات پر اعظم ہمایوں شروانی کے دوسرے لڑکے اسلام خاں نے کھلی بغاوت کردی اور دارالسلطنت آگرہ پر قبضہ کرلیا۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے ابراہیم نے کوچ کیا۔ لیکن اعظم ہمایوں لودی اور سعید خاں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا انھوں نے ابراہیم سے یہ مطالبہ کیا کہ اعظم ہمایوں شروانی کو رہا کردیا جائے لیکن سلطان نے یہ درخواست ماننے سے انکار کردیا۔ اس نے باغیوں کو شکست دی اور اسلام خاں کو پھانسی دے دی گئی۔ اعظم ہمایوں شروانی یا تو جیل میں مرگیا یا قتل کردیا گیا۔ ایک دوسرا سردار شیخ حسین میاں معروف بہ فرملی ایک ایسے نازک وقت میں راجپوتوں سے جا ملا جب کہ سلطان کی فوج دشمنوں کا نشانہ بنی ہوئی تھی اور شکست کا خطرہ لاحق تھا۔ ایک اور سردار میاں بھوم سکندر لودی کا اعلیٰ افسر مالیہ تھا۔ وہ بوڑھا اور تجربہ کار تھا اور لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ ابراہیم کو وہ بچہ سمجھتا، اس کے احکامات کا مذاق اڑاتا اور بادشاہ کی اجازت حاصل کیے بغیر مالی امور کو اپنی مرضی کے مطابق انجام دیتا۔ چنانچہ سلطان نے اس کو برخاست کرکے اس کے لڑکے کو اس کی جگہ مقرر کردیا۔

ابراہیم لودی نے خون، مقام اور مرتبے کو مدنظر رکھے بغیر نافرمانبردار، ضدی اور سرکش سرداروں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا۔ اس کا حسب دلخواہ اثر ہوا۔ سلطنت کے مرکزی حصے میں اس کا اقتدار مضبوطی سے قائم ہوگیا۔ اس سخت رویے کو اختیار کرنے کی مناسب وجوہ بھی تھیں۔ ایک طرف تو بنگال میں حسین شاہ و نصرت شاہ آہستہ آہستہ جنوبی بہار میں رخنہ ڈال رہے تھے اور دوسری طرف رانا سانگا مشرقی راجپوتانہ میں اپنا

اثر قائم کرنا چاہتا تھا۔ تیسری طرف مغرب میں بابر حملے کی دھمکی دے رہا تھا۔ چنانچہ ایسی سلطنت جو تین طرف سے خطروں میں گھری ہوئی ہو طویل خانہ جنگی کو برداشت نہ کر سکتی تھی اور نہ اس بات کی اجازت دے سکتی تھی کہ تنگ نظرانہ اور شرارت پسندانہ قبائلی احساسات بلا روک ٹوک ملک میں ابھرتے رہیں۔ ابراہیم اپنے باپ کی حکمتِ عملی کی پیروی کر رہا تھا۔ حالات نے اس حکمتِ عملی میں مزید شدت پیدا کر دی جس میں سرعت عمل کو بہت ہی اہمیت حاصل تھی۔

ابراہیم کی مشرقی پنجاب اور یوپی کی فتوحات نے طاقت ور سرداروں کو جو سرحدوں کے محافظ تھے خوف زدہ کر دیا۔ مشرق کی طرف بہار میں نوہانی طاقت پکڑ رہے تھے اور مغرب میں خود اس کے خاندان والے لودی سردار تقریباً پوری طرح غلبہ حاصل کر چکے تھے۔ یہ لوگ بہلول لودی کے زمانے سے ہی سوائے شاہی القاب کے ہر قسم کے اختیارات سے بہرہ مند تھے اور پنجاب کو تو وہ اپنی ہی سلطنت سمجھتے تھے۔ ان کا سردار دولت خاں کا لڑکا تاتار خاں سلطان سکندر کے زبردست دشمنوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے بیس سال تک لاہور میں بے تاج کے بادشاہ کی طرح حکومت کی۔ اس کے ساتھ ابراہیم لودی کا ایک چچا عالم خاں لودی بھی تھا جو خود کو آگرہ کے تخت کا وارث سمجھتا تھا۔ ابراہیم کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ دولت خاں کی وفاداری کا کس طرح یقین کیا جائے ابراہیم نے دولت خاں کو دربار میں طلب کیا لیکن وہ خود نہ آیا بلکہ اپنے ایک لڑکے کو بھیج دیا۔ سلطان نے یہ بات پسند نہ کی اور دھمکی دی کہ ضرورت پڑنے پر وہ اس کے خلاف کارروائی کرنے سے نہ چوکے گا۔ دلاور خاں نے واپس جا کر اپنے باپ کو سلطان کا یہ اشارہ سمجھا دیا اور اس بات کی بھی اطلاع دے دی کہ امراء میں ناراضگی و بے اطمینانی کا جذبہ دب چکا ہے۔ دولت خاں کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ پنجاب کی حکومت اس کے ہاتھ میں رہے۔ اس کے خاندان نے ہی افغانوں کا اقتدار وہاں قائم کیا تھا اور مغربی پنجاب کو مغلوں سے خالی کرایا تھا۔ چنانچہ دولت خاں قدرتی طور پر دریائے سندھ کے مغربی علاقے میں بابر کی نقل و حرکت کو پُر خوف نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

1519ء میں بابر نے دریائے سندھ کو عبور کر کے بھیرا پر حملہ کر دیا جہاں دولت خاں

کالڑکا علی خان حاکم تھا اور وہاں کے باشندوں کو ایک بڑی رقم بطور تاوان ادا کرنے پر مجبور کیا۔ وہاں سے اس نے ملا مرشد کو جو خود کو لودی سلطنت کا قانونی وارث سمجھتا تھا ابراہیم لودی کے دربار میں روانہ کیا اور یہ تجویز پیش کی کہ مغربی پنجاب کے وہ علاقے جو کہ بابر کے چچا الغ بیگ مرزا کی ملکیت تھے واپس کر دیے جائیں۔ دولت خاں نے ایلچی سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا اور اس کو لاہور سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ اسے اس بات کا خوف تھا مبادا ابراہیم ان علاقوں کو بابر کو دے کر اس سے دوستی کر لے یا پھر اگر وہ اس کی تجویز نہ مانے تو بھی پنجاب میں جنگ بھڑک اٹھے۔ بابر اس وقت ہندوستان میں طویل عرصے تک رہنے اور طول نہ طویل جنگی کارروائی کے لیے تیار نہ تھا اس نے اس معاملے پر زیادہ زور نہ دیا مگر وہ ان علاقوں کو اپنے قبضے میں لینے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا خواہ یہ کام صلح و صفائی سے انجام پائے یا زور و زبردستی سے۔ واپس ہوتے ہوئے جب اس نے دریائے سندھ کو پار کیا تو افغانوں نے اس کے سرداروں کو مار بھگایا اور علاقے پر قبضہ کر لیا۔

اگلے سال بابر نے بھیرا پر پھر قبضہ جما لیا اور سیالکوٹ و سیدی پور (امین آباد) تک بڑھتا چلا گیا۔ وہ اور بھی آگے بڑھ جاتا لیکن قندھار پر شاہ بیگ ارغون کے حملے نے بابر کو اپنے بڑھتے ہوئے قدم پیچھے ہٹانے پر مجبور کر دیا۔ ابھی تک تو بابر کے حملے محض تمہیدی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ دریائے سندھ پار کرنے کے بعد پنجاب کا راستہ صاف ہے۔ اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ یا تو افغان مقابلے کی تاب نہ رکھتے تھے یا پھر وہ کسی اور وجہ سے لڑائی سے گریز کرتے تھے۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ ہندوستان پر طولانی حملہ شروع کرنے سے قبل بہتر یہی ہو گا کہ قندھار کو فتح کر کے اس پر قابض ہو جائے۔ قندھار کی فتح افغانستان میں امن و امان اور خود اس کی حفاظت کے لیے ضروری تھی کیونکہ یہ بات بالکل واضح تھی کہ فی الحال بابر کو اپنی دوسری فتوحات کے لیے افغانستان کو مرکز بنانے رکھنا تھا۔ اس کے علاوہ قندھار کی فوجی اہمیت ہرات، کابل اور ہندوستان سب ہی کے لیے یکساں تھی۔ بابر کا بیان ہے کہ بھیرا، خوشاب، چناب اور چنیوٹ 1505 تک ترکوں کے قبضے میں رہے۔ بابر کے چچا الغ بیگ مرزا کی وفات کے بعد جو افراتفری پھیلی اس کے نتیجے میں افغانوں نے

ان علاقوں کو پنجاب میں ملا لیا۔ بابر نے ان علاقوں کو واپس لینے کی خاطر 19-1518ء میں دو حملے کیے۔ پہلا حملہ بھیرا پر کیا جو ہندوستان کا دروازہ کہلاتا تھا اور دوسرا سیال کوٹ پر۔ 1519ء میں اس نے ملا مرشد کو اپنا سفیر بنا کر ابراہیم کے پاس اس تجویز کے ساتھ روانہ کیا کہ مغربی پنجاب کے علاقوں کو اسے واپس کر دے۔ دولت خاں نے نہ صرف ملا مرشد کو ابراہیم کے پاس جانے سے روک لیا بلکہ اس سے ملاقات تک نہ کی اس بات سے بابر ناراض ہوگیا۔

دولت خاں کی پالیسی یہ تھی کہ بابر اور ابراہیم لودی کے درمیان جنگ ہو، وہ اس بات کو ترجیح دیتا تھا کہ پنجاب میں اپنی مرضی کے مطابق کام کرتا رہے اور مشرق و مغرب کے حالات کا جائزہ بھی لیتا رہے تاکہ وقت آنے پر فیصلہ کر سکے کہ اس کو کیا اقدام کرنا ہے۔ یقیناً وہ ابراہیم لودی کی سیاست سے آگاہ تھا لیکن شاید اس کو یہ امید تھی کہ ابراہیم کے مخالف امراء اس کا معاملہ صاف کر دیں گے۔ دولت خاں نے سنجیدگی کے ساتھ بابر کی مزاحمت نہ کی اگر وہ ایسا کرتا تو اس کے نتیجے میں اوّل تو ابراہیم لودی کو یہ جتا سکتا تھا کہ وہ اس کا حامی و مددگار ہے اور دوسری طرف ابراہیم کو مغرب کی طرف سے آنے والے خطرے کا اندازہ ہو جاتا اور اس طرح دولت خاں سلطنت کی حفاظت کے لیے اپنی اہمیت کو ہمیشہ کی نسبت زیادہ جتا سکتا تھا۔ لیکن ابراہیم لودی اور بابر کی کامیابیوں نے دولت خاں کو اس بات کا احساس دلایا کہ وہ ہر طرف سے مخالفوں میں گھرا ہوا ہے۔ اب اس کو اپنے بارے میں قطعی فیصلہ کرنا تھا۔ ابراہیم لودی نے اسے ایک موقع فراہم کیا تھا لیکن اس نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ وہ خود کو خطاوار محسوس کرتا تھا یا پھر اس میں اس کی خود غرضی یا خوف کو دخل تھا۔ اس کے بعد اس کو سلطان کی طرف سے دھمکی کا اشارہ بھی ملا جس کے سبب دولت خاں اپنے حواس کھو بیٹھا۔

اس کے علاوہ اسی قدر ایک پریشان کن خبر یہ بھی تھی کہ قندھار جو ہمیشہ بابر کی راہ میں کانٹا بنا رہا تھا 1522ء میں اس کے قبضے میں آگیا ہے اور شاہ ایران نے اس سلسلے میں کوئی کارروائی نہ کی۔ اب پنجاب پر حملے کے لیے بابر کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

بابر کو دولت خاں سے ناراض ہونے کی کئی وجوہ تھیں کیوں کہ افغانوں نے ہندو بیگ اور دوسرے افسروں کو جنہیں بابر نے ان علاقوں پر حکومت کرنے کے لیے بھیجا اور جن پر وہ اپنا حق بھی سمجھتا تھا نکال دیا تھا۔ اب وقت آگیا تھا کہ دولت خاں اپنے متعلق قطعی فیصلہ کرے۔

ابراہیم لودی دولت خاں سے جھگڑا مول لینے کا خواہش مند نہ تھا۔ فی الحال تو اس کی ساری توجہ اپنی حکومت کو استوار کرنے اور اپنی طاقت کو مضبوط بنانے کی طرف مبذول تھی۔ راجپوتانہ کی حالت بھی اگر پنجاب سے بدتر نہیں تو اسی قدر تشویشناک ضرور تھی۔ رانا سانگا نے مالوہ کے حکمراں محمود ثانی پر زبردست فتح حاصل کی اور 1519ء میں اس کو قید کر لیا۔ 1520ء میں اس نے مبارز الملک کو شکست دے کر احمد نگر جیت لیا۔ ان فتوحات کے نتیجے میں رانا سانگا گجرات کے حکمراں کے مدمقابل آگیا۔ لودی سلطنت کے لیے اس جنگ کا نتیجہ بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ جنگ طول کھینچ رہی تھی اور گجرات کی فوجیں راجپوتوں پر حاوی ہوتی جا رہی تھیں۔ اس بات سے کہ فتح کس فریق کو نصیب ہوگی کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ اگر راجپوت فتح یاب ہوتے تو ممکن تھا کہ وہ اپنی فاتح افواج کو مشرقی راجپوتانہ کی طرف موڑ دیتے اور اگر شکست کھاتے تو آگرے کا راستہ مظفر شاہ ثانی جیسے اولوالعزم اور بارسوخ بادشاہ کے لیے کھلا ہوا تھا۔

ابھی تک مشرقی محاذ پر حالات اس قدر نازک نہ ہوئے تھے لیکن وہاں بھی مصیبتوں کے بادل گھر رہے تھے۔ 1521ء میں ناصرالدین نصرت شاہ نے اپنی افواج کو بہار کی طرف کوچ کا حکم دے دیا۔ اس نے ترہت پر قبضہ کر کے اپنی سلطنت کی سرحدوں کو مونگھیر و حاجی پور تک بڑھا دیا۔ اگر لوہانی اس کی پیش قدمی کو روکنے میں ناکام ہوجاتے تو وہ آسانی سے جون پور اور چنار کو دھمکا سکتا تھا۔ اگر وہ اس سے دوستی کر لیتے تو پھر دونوں مل کر سلطنت کے پورے مشرقی حصے کو دھمکا سکتے تھے کیوں کہ وہ اس وقت تک پوری طرح محکوم نہ ہو پایا تھا اور وہاں ابھی کچھ فتنے سر اٹھا رہے تھے۔

ابراہیم پنجاب کے حالات سے پوری طرح واقف نہ تھا۔ دولت خاں نے بابر کے ایلچی کا اغوا کر لیا اور اس ڈر سے کہ کہیں بابر اور ابراہیم لودی کے درمیان سمجھوتہ نہ ہو جائے اور اس طرح اس کی اہمیت ختم ہو جائے اور پنجاب کی حکومت کی باگ ڈور کسی اور کے ہاتھ

میں چلی جائے اس نے حالات پر ایک آہنی پردہ ڈال رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ابراہیم شمال مغربی سرحد کے حالات کا صحیح جائزہ نہ لے سکا۔ گو یہ بات یقینی ہے کہ اس کو بابر کے حملوں کی خبر ملتی رہی ہوگی۔ ابھی تک بابر کی زندگی اور اس کی کارروائیوں میں کوئی ایسی حیرت انگیز بات دیکھنے میں نہ آئی تھی جس کی وجہ سے ہندوستان کے کسی حکمران کے دل میں کسی قسم کا خوف و ہراس پیدا ہوتا۔ بابر نے اب تک جس قسم کے حملے کیے تھے کم از کم سیدوں کے دورانِ حکومت میں اس قسم کے حملوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔

1523ء میں گجرات اور میواڑ کے درمیان صلح ہوگئی۔ اب ابراہیم نسبتاً زیادہ آزادی کے ساتھ عمل کر سکتا تھا۔ لاہور کے افغان امیروں نے یہ فیصلہ کیا کہ عالم خاں اور دولت خاں کے لڑکے کو بابر کے پاس بھیجا جائے اور وہ اس کو اس پر راضی کریں کہ ابراہیم لودی کو تخت سے اتار کر عالم خاں کو تخت نشین کرانے میں اُن کی مدد کرے۔ اس کارروائی کے لیے جو دلائل پیش کیے گئے ان میں پہلی دلیل تو یہ تھی کہ ابراہیم ایک ناقابلِ اصلاح ظالم حکمراں ہے جس سے افغان امراء و شرفاء بری طرح نالاں ہیں۔ دوسرے یہ کہ عالم خاں کا بابر کے ساتھ رویہ بہت ہی دوستانہ اور مودبانہ ہوگا۔

ان لوگوں نے خود کو غداری کے الزام سے بچانے کی خاطر ابراہیم کی کالے کرتوتوں، احمقانہ و مغرورانہ کارروائیوں اور حرص و ہوس کی ایک مبالغہ آمیز داستان گھڑی اور وعدہ کیا کہ وہ بابر کے احکامات کو بجالائیں گے اور اس کی رہنمائی میں کام کریں گے۔ لاہور کے امراء نے جو راہِ عمل اختیار کی اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ بابر کی توجہ دلاور اور اس کے صوبداروں سے ہٹا کر ابراہیم لودی کی طرف مبذول کرائیں اور کوئی قطعی وعدہ کیے بغیر یہ جتائیں کہ وہ لودی سلطان کے ہٹانے میں اس کی مدد کرنے کے لیے بے قرار ہیں۔ ان جیسی فراخدلانہ تجاویز کو مختلف طور پر تعبیر کیا جا سکتا تھا۔ اگر دلاور اپنے وعدوں کو چھپا لا کر سے مبہم رکھے تھا تو بابر بھی اتنی ہی ہوشیاری کے ساتھ ان کی وضاحت و تشریح کا طالب نہ ہوا۔

بابر کو اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ افغانوں کے درمیان یکجہتی نہ تھی اور اب وقت آپہنچا تھا کہ ہندوستان پر حملہ کر دیا جائے۔ ابھی تک تو بابر محض مغربی پنجاب نے

ان علاقوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو کبھی کابل کی سلطنت کا ایک حصہ رہ چکے تھے۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نگاہیں اگر پوری لودی سلطنت پر نہیں تو پورے پنجاب پر ضرور جمی ہوئی تھیں۔ اگر اس کا منصوبہ پوری طرح کارگر ہو جاتا تو وہ ہندوستان میں تیمور کے کارہائے نمایاں کی یاد تازہ کر دیتا اور اس طرح وسط ایشیا میں اس کو جن ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا یہاں اس کا بدل ہو جاتا۔ اس کے علاوہ ایسا کرنے سے اس کے اقتصادی اور مالی وسائل جن کی خاطر وہ شروع ہی سے اپنی توجہ اور قوت عمل پنجاب کی طرف مبذول کیے ہوئے تھا ہمیشہ کے لیے حل ہو جاتے۔

ابراہیم لودی کو دولت خاں و عالم خاں اور بابر کے درمیان بات چیت کی تفصیلات کا علم ہوا یا نہ ہوا اس کو اس بات کا شبہ تو ضرور ہو گیا ہوگا۔ چنانچہ اس نے لاہور فتح کرنے کے لیے ایک فوج روانہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بہن خاں اور مبارک خاں بغیر کسی خاص مزاحمت کے لاہور پہنچ گئے اور اس پر قبضہ کر لیا۔ دلاور خاں نے شہر خالی کر دیا اور ملتان چلا گیا۔ شاید وہ وہاں پر بابر کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ ابراہیم کی قابض فوج بہت طاقتور نہ تھی اور نہ اس میں اتنی سکت تھی کہ کسی مخالفت کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ بابر نے اس کو شکست دی اور لاہور میں لوٹ مار کے بعد آگ لگا دی۔

بابر نے اپنی ابتدائی فتح کا پورا فائدہ اٹھانے کی غرض سے دیپالپور کی طرف کوچ کیا اور 1524ء میں اس کو بھی فتح کر لیا۔ یہاں پر دولت خاں اظہارِ احترام کے لیے حاضر ہوا۔ بابر نے اسے جالندھر، سلطان پور اور بعض دوسرے علاقوں کا گورنر مقرر کر دیا۔ دولت خاں نے اس معمولی گورنری کی خاطر سودا بازی نہیں کی تھی۔ چنانچہ آبرو ریزی کے ساتھ ساتھ لاہور کی حکومت بھی ہاتھ سے نکل جانے کے سبب اس کو سخت صدمہ پہنچا اور اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

اب دولت خاں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ کسی ترکیب سے بابر سے کم از کم وقتی طور پر چھٹکارا حاصل ہو جائے تاکہ بعد میں آزادی کے ساتھ کوئی اور تجویز بروئے کار لائی جا سکے اس نے بابر کو یہ مشورہ دیا کہ آگے بڑھنے سے قبل وہ افغان ... یں کو جو ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے قریب جمع ہو گئے تھے منتشر کر دے۔ اس کے برعکس دلاور خاں نے جو اپنی مقصد برآری کی فکر میں تھا اور بابر کو اس پر کافی بھروسہ بھی تھا بادشاہ کو یہ سمجھایا کہ ...ن کو

جو مشورہ دیا گیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ شاہی افواج کو تقسیم کر کے ختم کر دیا جائے۔ اس پر بابر نے دولت خاں و غازی خاں کو گرفتار کر لیا۔ دولت خاں کو اس بات سے بہت زیادہ ندامت اٹھانی پڑی۔

بابر کابل کو واپسی پر ان لوگوں کو اپنے ساتھ قیدیوں کی طرح نوشہرہ تک لے گیا اور وہاں جا کر چھوڑ دیا۔ بابر کی واپسی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ پنجاب کے لوگوں کے دلوں میں اپنے لیے کسی قسم کا جذبہ پیدا نہ کر سکا۔ اس کے علاوہ دولت خاں و غازی خاں کا غیر دوستانہ رویہ، ازبکوں کے بدخشاں پر حملہ اور طویل مہم کے لیے بابر کے سرداروں کی غیر آمادگی بھی اس کی واپسی کا سبب بنیں۔

اسی دوران دولت خاں کو ابراہیم لودی کا ایک مکتوب ملا جس میں اس نے اس بات پر شدید تعجب اور مایوسی کا اظہار کیا تھا کہ اس نے افغانوں کے معاملات کو نبٹانے کے لیے غیروں کو کیوں مدعو کیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ وعدہ کیا کہ اس کے سابقہ حقوق و امتیازات پنجاب میں بحال کر دیے جائیں گے۔ دولت خاں اس الزام کو اپنے سر لینے کے لیے تیار نہ تھا اور اس بات کے لیے اس نے خود سلطان کی تنگ نظرانہ اور سخت دلانہ پالیسی کو ذمّہ دار ٹھہرایا۔

بہت ممکن ہے یہ مکتوب اس بات میں بھی مددگار ثابت ہوا ہو کہ وہ مغلوں کے خلاف دشمنانہ رویہ اختیار کرے۔ چنانچہ دولت خاں نے خود کو دو تلواروں سے مسلح کیا جن میں سے ایک بابر سے لڑنے کے لیے تھی اور دوسری ابراہیم لودی سے برسرِ پیکار ہونے کے لیے۔

اگر اس نے یہ کام اس سے پہلے 19-1518ء میں انجام دیا ہوتا تو ممکن ہے کہ اس کے نتائج بہتر برآمد ہوتے لیکن بقول بابر "شاید ہندوستان کے لوگ اور سب سے زیادہ افغان عقل و ہوش سے بے بہرہ تھے اور قوتِ فیصلہ و سمجھداری کے دروازے ان پر بند ہو چکے تھے۔ وہ نہ تو دشمن کی طرح مقابلہ کر سکتے تھے اور نہ دوستی کے اصول و قواعد سے آگاہ تھے۔" دولت خاں نے دلاور خاں کو گرفتار کر لیا اور عالم خاں کو اس جاگیر سے جو کہ بابر نے عطا کی تھی مار بھگایا۔

عالم خاں لودی الگ منصوبے باندھ رہا تھا۔ اس نے بابر کو یہ تجویز پیش کی کہ وہ

اگر دہلی کا تخت حاصل کرنے میں اس کی مدد دے تو اسے کو پنجاب کا صوبہ منتقل کرے گا ممکن ہے اسی وقت رانا سانگا نے بھی اس بات پر اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا ہو کہ وہ ابراہیم لودی پر حملہ کرنے کے سلسلے میں بابر کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالے گا بشرطیکہ رانا کو راجپوتانہ کے ان شمالی علاقوں پر جو میواڑ اور لودی سلطنت کے درمیان باعث نزاع تھے قبضہ کرنے دیا جائے۔

ان تجاویز نے بابر کے ارادے کو اس بات کے لیے اور زیادہ مضبوط کر دیا کہ ہمیشہ کی نسبت بڑے پیمانے پر حملہ کرے کیوں کہ ان حالات میں اس کا امکان تھا کہ اس کو سلطان لودی سے مقابلہ کرنا پڑ جائے۔

بابر کو چھوڑ کر عالم خاں دولت خاں کے پھسلانے میں آگیا۔ امراء سے مشورہ کرکے ایک نیا منصوبہ بنایا گیا اور طے یہ پایا کہ عالم خاں و دلاور خاں دہلی پر حملہ کرکے اسے فتح کر لیں۔ ادھر دولت خاں و غازی خاں پنجاب میں اپنی طاقت جمائیں اور وہاں کے حالات کو استوار کریں۔

ان امراء کا مقصد شاید یہ تھا کہ قبل اس کے کہ بابر ایک بڑی فوج کے ساتھ ہندوستان پر حملہ آور ہو وہ پنجاب کے حالات کو سدھار کر اس کے مقابلے کے لیے تیار ہو جائیں۔ امید کی جاتی تھی کہ یہ منصوبہ بابر کی مداخلت کے بغیر عالم خاں و دولت خاں دونوں کے مفاد کو پورا کر سکے گا اور اگر یہ منصوبہ ٹھیک طریقے سے انجام پاتا تو افغان امراء ابراہیم اور بابر سے اچھی طرح نپٹ لیتے۔

اس کے بعد عالم خاں نے ان مغل سرداروں کو جن کو بابر نے پنجاب میں قلعوں کی حفاظت کے لیے مقرر کیا تھا دعوت دی کہ دہلی کو فتح کرنے میں اس کا ساتھ دیں۔ اس نے ان سرداروں سے یہ بھی بتایا کہ بلخ کے معاملات کو نپٹا کر بابر فوراً ہی ہندوستان کا رخ کرے گا۔ لیکن انھوں نے جواباً عالم خاں کو بتایا کہ جب تک کہ ان کے پاس بابر کا حکم نہ پہنچے یا پھر حاجی خاں و غازی خاں کے لڑکے ان کے پاس بطور ضمانت نہ بھیج دیے جائیں وہ عالم خاں کا ساتھ دینے سے معذور ہیں۔

عالم خاں نے ان کا انتظار کیے بغیر پنجاب دولت خاں کو دے دیا اور اس کے ہمراہ دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ دہلی پہنچنے تک ان کے پاس تیس چالیس ہزار سپاہی

جمع ہوگئے تھے۔ دہلی کا محاصرہ کرلیا گیا۔ ابراہیم تیزی سے آگے بڑھا۔ حملہ آور فوج کا مقابلہ کیا اور ان کو شکست دے کر منتشر کردیا۔ اس طرح یہ منصوبہ خاک میں مل گیا دلاور خاں اور عالم خاں بھاگ کر بابر کے پاس پہنچ گئے۔

دسمبر 1525ء کے آغاز میں بابر نے ہندوستان کی طرف کوچ کیا۔ یہ کہنا کہ بابر کا ہندوستان پر حملہ آور ہونے کا کیا مقصد تھا بہت مشکل ہے کیوں کہ اس نے اپنی تزک میں اس موضوع کو بہت ہی مبہم طریقے سے لکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پنجاب کو از سر نو فتح کرنا چاہتا تھا۔ اس کو ابراہیم لودی کی طرف سے بھی مخالفت کا اندیشہ تھا اور شاید اسی بات سے مجبور ہوکر اسے ہندوستان (پنجاب سے اُس طرف کا علاقہ) میں داخل ہونا پڑا لیکن یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ لودی سلطنت کو ختم کرکے اپنی سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا۔

بابر یہ سن کر کہ دولت خاں لاہور پر حملہ آور ہورہا ہے تیزی سے آگے بڑھا۔ بابر کی آمد کی خبر نے دولت خاں کے ساتھیوں کے حوصلے پست کردیئے۔ فوج کی ایک بڑی تعداد نے اس کو چھوڑ کر راہ فرار اختیار کی۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ سر تسلیم خم کردے۔ اس کی جائداد ضبط کرلی گئی لیکن اس کی ذات یا اس کے خاندان کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچایا گیا۔

غازی خاں کے فرار ہونے اور دولت خاں کے اعتراف شکست کی وجہ سے پنجاب بغیر کسی مزاحمت کے بابر کے قبضے میں آگیا۔ اس طرح اس کا وقار اور حوصلہ پہلے کی نسبت بہت زیادہ بلند ہوگیا۔ اب اس کی ہمت ہوگئی کہ ابراہیم سے بھی نپٹ لے۔

ابراہیم بھی بے کار نہ بیٹھا تھا وہ ایک بڑی فوج لے کر بابر سے لڑنے کے لیے میدان میں نکل آیا۔ قلعہ حصار فیروزہ کے شقدار حمید خاں کو جو کچھ سپاہی لے کر ابراہیم کے پاس جارہا تھا ہمایوں نے ہودل کے مقام پر شکست دی۔ اس کارنامے سے خوش ہوکر بابر نے ہمایوں کو حصار فیروزہ جاگیر میں عطا کیا۔ جنید برلاس نے ایک قراول دستے کو جو حاتم خاں کی سرکردگی میں تھا شکست دی۔

بابر نے یہ اندازہ کرکے کہ حالات زیادہ خطرناک ہوتے جارہے ہیں پانی پت میں ٹھہر کر دشمن سے مقابلے کی تیاری شروع کردی۔ بابر کی فوج کی کل تعداد کا تخمینہ آٹھ

سے چوبیس ہزار تک کیا جاتا ہے۔ اس کی فوج کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی اس نے ایسا دفاعی ڈھنگ اختیار کیا کہ اگر حالات سازگار ہوں تو وہ اپنی فوج کو آگے حملے کے لیے بھی استعمال کر سکے۔

بابر کی فن جنگ کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ اور اس نے منگولوں، ازبکوں و ایرانیوں کی جنگی تدابیر کا مطالعہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس دو ترکی افسر بھی تھے جو عثمانیوں کے فن جنگ سے آگاہ تھے اور آتشیں اسلحے کے استعمال کا تجربہ رکھتے تھے۔ اس جنگ میں افغانوں کو پہلی مرتبہ ایک ایسے زبردست لشکر کا مقابلہ کرنا پڑا جو رسالوں اور آتشیں اسلحوں سے پوری طرح آراستہ تھا۔

بابر نے شہر پانی پت کو اپنی فوج کے ایک پہلو کی حفاظت کے لیے استعمال کیا۔ دوسرے پہلو کی حفاظت کے لیے خندق اور کٹے ہوئے درختوں، اور خاردار جھاڑیوں کی باڑھ استعمال کی۔ سامنے کی طرف اس نے سینکڑوں گاڑیوں کو آپس میں سوکھی کھال کے رستوں سے مضبوطی کے ساتھ باندھ کر کھڑا کیا لیکن اس طرح راستہ بالکل بند نہیں کیا گیا بلکہ چند گاڑیوں کے بعد بیچ بیچ میں جگہ خالی رکھی گئی جس میں بندوقچیوں اور توپچیوں کی حفاظت کے لیے سینے کی بلندی تک پشتے کھڑے کر دیے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی لحاظ رکھا گیا کہ اگر مناسب موقع ہاتھ لگے تو سواروں کے نکلنے کی گنجائش بھی باقی رہے۔ اس صف کے پیچھے بابر نے اپنی فوج کو قدیم تیموری طرز پر آراستہ کیا اور ازبک طرز کے ایسے دستوں کو بھی شامل کر لیا جو کہ آسانی سے اپنی جگہ بدل سکیں۔

ابراہیم لودی ایک زبردست فوج لے کر آیا جس کی تعداد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ کے قریب ہوگی لیکن شاید پچاس ہزار سے کم نہ تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے پاس دو ہزار ہاتھی تھے لیکن ان ہاتھیوں کو نئے قسم کے آتشیں اسلحے کا مقابلہ کرنے کی تربیت نہیں دی گئی تھی اس لیے اس بات کا امکان تھا کہ اگر وہ خود خطرناک ثابت نہ ہوں پھر بھی کم از کم ایک قسم کی رکاوٹ ضرور بن سکتے ہیں۔ جانبین کی فوجیں ایک ہفتے تک ایک دوسرے کے مقابل پڑی رہیں۔

بابر چاہتا تھا کہ ابراہیم کو حملے کے لیے مجبور کرے۔ دونوں کے لیے اس بات کا امکان تھا کہ اگر مزید تاخیر کی گئی تو بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی اور فوج کے حوصلے

بھی پست ہو جائیں گے۔ جب ابراہیم مغلوں کی اشتعال انگیزی سے تھک گیا تو اُس نے اسپارٹا والوں اور راجپوتوں کی تقلید کرتے ہوئے اپنی فوج کو ایک زبردست دعوت دی اپنے افسروں اور سپاہیوں کو قیمتی ہیرے جواہرات موتی اور سونے کی چیزیں تقسیم کیں۔ ان کو حکم دیا کہ خود کو ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے آمادہ کریں۔ دوسرے دن اس فیصلہ کن جنگ کا آغاز ہوا۔

افغان فوج نے چاہا کہ پوری طاقت سے دشمن پر حملہ آور ہو لیکن یہ دیکھ کر کہ دشمن کی صف اوّل بہت ہی تنگ ہے افغان دستوں نے کچھ ہچکچاہٹ دکھائی لیکن پھر ایک دم حملہ آور ہوئے۔ ایسا کرنے سے فوج کی ترتیب بگڑ گئی اور لشکر کے مرکزی حصّے نے ایک بے ترتیب ہجوم کی شکل اختیار کر لی۔

بابر بھی یہی چاہتا تھا۔ اس نے ایک طرف تو اپنے سبک سیر دستوں کو حکم دیا کہ دشمن کی فوج کو داہنے بائیں اور عقب سے گھیر لیں اور دوسری طرف توپچیوں کو حکم دیا کہ گولے برسانے شروع کر دیں۔ ان ترکیبوں سے افغان فوج ہر طرف سے سمٹ کر ایک غیر منظم ہجوم کی شکل اختیار کر گئی اور اس قدر مفلوج ہو کر رہ گئی کہ کوئی مؤثر کام انجام نہ دے سکی۔ فوجیوں کا یہ جھنڈ مرگ آور گولہ باری کا نشانہ بنا ہوا تھا اور ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔

محمود خاں نے ابراہیم لودی سے التجا کی کہ اس سے پہلے کہ دشمن اس کو گھیر لے وہ اپنی جان بچا کر بھاگ جائے۔ سلطان کے نزدیک شہادت پانے کے مقابلے میں جان بچا کر بھاگ جانا نہایت ہی شرمناک فعل تھا۔ چنانچہ اس نے محمود خاں کا مشورہ رد کر دیا اور پانچ چھ سو جانباز سپاہیوں کے ساتھ اس جگہ جا پہنچا جہاں گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ یہاں ان سب نے جامِ شہادت نوش کیا۔ افغان فوج میں ابتری پھیل گئی۔ وہ لوگ اپنے حواس کھو بیٹھے اور راہ فرار اختیار کی لیکن مغلوں نے فرار ہونے والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ واقعہ 21 اپریل 1526ء کا ہے۔ مقتول سلطان کا سر تن سے جدا کر کے بابر کے سامنے پیش کیا گیا۔ بابر کی کامیابی بلاشک اس کی اہرانہ قیادت، با اصول طریقۂ کار، اعلیٰ ہتھیار اور خوش قسمتی پر مبنی تھی۔ یہ جنگ اگر سارے ہندوستان کے لیے نہیں تو کم از کم لودی سلطنت کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوئی

اور دہلی و آگرہ بابر کے قبضے میں آ گئے۔

پانی پت کی جنگ کی فتح یابی نے بابر کی سیاسی دلچسپیاں آگرے پر مرکوز کر دیں۔ اس کے لیے نئے مسائل پیدا ہو گئے۔ سب سے پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ وہ عوام کے درمیان اعتماد پیدا کرے کیونکہ عام لوگ یا تو شہر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور جو باقی رہ گئے تھے انھوں نے جس قدر بھی دفاع کا سامان ہو سکتا تھا جمع کر کے شہر کے دروازے بند کر لیے۔ افغان فوج کی یک جہتی تو ختم ہو چکی تھی لیکن قبائلی سردار اپنے مسلح ساتھیوں کے ہمراہ ادھر اُدھر بلا مقصد گھوم رہے تھے۔ بڑے بڑے افغان نوابین نے خود مختاری اختیار کر لی۔ امن و امان کے قائم کرنے کا طریقہ یا تو یہ ہو سکتا ہے کہ ان سرداروں کی توجہ، مہربانی اور سخاوت کے برتاؤ سے فاتح بادشاہ کی طرف مبذول کرائی جائے یا پھر تلوار کے زور سے ان کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ بادشاہ کے اختیار و اقتدار کو تسلیم کریں۔ ان میں سے کچھ قبائلی سردار مثلاً ناصر خاں نوہانی اور معروف فرملی ان علاقوں پر قابض تھے جو کہ قنوج سے اس طرف واقع ہیں۔ ان لوگوں کو بہار کے نوہانی حکمران کی جس نے ابراہیم لودی کے زمانے ہی میں خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا حمایت حاصل تھی۔

بابر نے دونوں ہی طریقے استعمال کیے۔ جن سرداروں نے اس کا اقتدار و اختیار قبول کیا ان کو اس نے اپنی حفاظت میں لے لیا اور بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں۔ بہت سے افغان سرداروں نے خوشی سے بابر کا ساتھ دیا اور اس نے بھی ان لوگوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک کیا۔

باقی ماندہ سرداروں سے نپٹنے کے لیے اس نے غیر مفتوحہ علاقوں کو بیگ خاندان والوں کے درمیان تقسیم کر دیا اب ان لوگوں کا یہ فرض تھا کہ اپنے علاقے میں جائیں وہاں امن و امان برقرار کریں اور دفتری و مالیاتی کارروائیوں کو جاری رکھیں۔ اس طرح سنبھل، اٹاوہ، قنوج، دھولپور اور دوسرے علاقے قابو میں آ گئے۔ قنوج کے شمال میں جو جنگجو افغان سردار رہتے تھے ان کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ وہ لوگ بہت طاقتور تھے اور ان لوگوں سے کچھ وقت گزرنے کے بعد باقاعدہ اور مؤثر طریقے پر جنگی تدابیر کے ذریعے ہی نپٹا جا سکتا تھا

پانی پت کی فتح فیصلہ کن تھی۔ اسی روز 21 اپریل 1526ء کو ہمایوں کو آگرہ کی

طرف اور مہدی خواجہ کو جو کہ بابر کا برادر نسبتی تھا دہلی کی طرف روانہ کیا۔ جمعہ 27 اپریل کو دہلی کی مسجد جامع میں بابر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور غرباء و فقراء کو خیرات تقسیم کی گئی۔ بابر دہلی سے آگرے کی طرف روانہ ہوا اور 10 مئی کی سہ پہر کو وہاں پہنچ کر سلطان ابراہیم لودی کے محل میں قیام کیا۔

پانی پت کی جنگ کے بعد بابر ہندوستان کی فتح کے دوسرے مرحلے کے اختتام پر پہنچ گیا۔ اس جنگ نے لودی خاندان کی قسمت کو اسی طرح سربمہر کر دیا جس طرح کہ اس کے جد امجد تیمور نے تغلق خاندان کی قسمت کا فیصلہ کیا تھا۔ اس شکست سے افغانوں کے حوصلے بہت پست ہو گئے۔ اُن کے کمزور نظام پر کاری ضرب پڑی۔

فاتحین کے خوف سے کاشت کار اور سپاہی پیشہ دونوں فرار ہو گئے۔ ہر قلعہ بند شہر کے دروازے مقفل کر دیے گئے۔ لوگ اپنے بچاؤ کی تدبیروں میں معروف ہو گئے۔ افغانوں کی فرضی یکجہتی کا خاتمہ ہو گیا اور ان کے مختلف قبائلی سرداروں میں ناچاقی اور زبردست بددلی پیدا ہو گئی۔

رانا سانگا پانی پت کی جنگ میں شریک نہ ہو سکا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کو گجرات کے بادشاہ مظفر شاہ کا خطرہ لاحق تھا۔ مظفر شاہ 15 اپریل 1526ء کو یعنی پانی پت کی جنگ سے صرف پندرہ روز قبل فوت ہو گیا۔ اس مختصر سی مدت میں رانا سانگا ایک مؤثر فوج جمع کر کے پانی پت نہیں پہنچ سکتا تھا۔ آخرکار پانی پت کی فتح نے اس عظیم سلطنتِ مغلیہ کی بنیاد ڈالی جو کہ اپنی شان و شوکت، قوت و استحکام اور تہذیب و ثقافت کے لحاظ سے دنیائے اسلام کی اتنی بڑی سلطنت تھی کہ وہ سلطنتِ روم سے بھی برابری کا دعویٰ کر سکتی تھی۔

دہلی اور آگرے میں جو خزانے ہاتھ آئے اُسے بابر نے اپنے بیگ سرداروں اور سپاہیوں کے درمیان ہزاروں کی تعداد میں بطور انعام و اکرام تقسیم کر دیا۔ اس نے سمرقند، عراق، خراسان اور کاشغر میں اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کو اسی طرح سمرقند، خراسان، مکہ و مدینہ کے علماء اور درویشوں کو تحفے تحائف ارسال کیے۔ اس نے اس قدر فیاضی دکھائی کہ کابل اور نواح وادی کے رہنے والے ہر فرد کو ایک ایک بہلولی روانہ کی۔ اس سخاوت کے سبب اس کو قلندر کا خطاب ملا۔ اس کے باوجود بہت سے بڑے بڑے بیگ سردار اور

بہادر لشکری ہندوستان میں قیام کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار شروع کر دیا۔ ان لوگوں کی بڑبڑاہٹ بلا سبب نہ تھی کیوں کہ ان شمالی علاقے کے رہنے والوں کو جنگ کے فوراً ہی بعد ایک ایسی زبردست گرمی کا سامنا کرنا پڑا جو ہندوستان میں کئی سال بعد اس قدر شدت کے ساتھ پڑی تھی اس کے علاوہ گرم لو کے جھکڑ اور آندھی نے ان کی ایک بڑی تعداد کو ختم کر دیا تھا۔ پہاڑوں اور وادیوں کے ان رہنے والوں کے لیے ہندوستانی سماج نیا اور ناموافق تھا۔ یہاں کے لوگ خوف اور مایوسی کی حالت میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ جس کی وجہ سے معمولی سامانِ رسد کا ملنا بھی محال ہو گیا۔ کیفیت یہ ہو گئی کہ "ہمارے گھوڑوں کے لیے نہ تو دانہ ہی دستیاب ہوتا اور نہ چارہ ہی ملتا"۔ اس کے علاوہ جب ان کو یہ پتہ چلا کہ بابر نے تو ہندوستان میں ہی رہنے کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ سمجھ گئے کہ پانی پت کی جنگ ایک ایسی اہمیت کی حامل ہے کہ ہندوستان فتح کرنے کا یہ پہلا قدم ہے۔

بابر کے ساتھیوں کے لیے ایک طویل عرصے تک ہندوستان کے اکتا دینے والے میدانوں میں رہنا اور کبھی ختم نہ ہونے والی جنگوں کا تصور بہت ہی پریشان کن تھا۔ بابر نے ایک انجمن مشاورت طلب کی اور اپنی فصیح زبان میں ان سے واضح طور پر کہہ دیا کہ "ہم نے سالہا سال کی زحمت کشی، مصیبت اور طولانی سفر اختیار کرکے اور اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جانوں کو لڑائی کی آگ میں جھونک کر کشت و خون کرکے اللہ کے فضل سے کثیر دشمنوں کو اس لیے مغلوب کیا ہے کہ ہم اُن کے ملک پر قبضہ کر سکیں۔ اب وہ کون سی مجبوری یا کون سی ایسی ضرورت آ پڑی ہے کہ ہم بلا وجہ ان علاقوں کو جنھیں جان کو جوکھم میں ڈال کر فتح کیا ہے چھوڑ دیں۔ کیا ہماری قسمت میں یہی تھا کہ ہم کابل میں رہیں اور فقر و تنگ دستی کی زندگی گزاریں۔ مجھے یقین ہے کہ اب میرا کوئی خیرخواہ واپسی کی بات کو زبان پر نہ لائے گا۔ البتہ جو لوگ ثابت قدم و مستقل مزاج نہیں ہیں اور جنھوں نے جانے کا فیصلہ ہی کر لیا ہے انھیں روکا نہ جائے گا۔"

بابر کا اس قدر واضح الفاظ میں اپنے مصمم ارادے کو بیان کر دینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس کے ساتھیوں نے چار و ناچار خوف کو دل سے نکال دیا لیکن کچھ لوگ خصوصاً خواجہ کلاں جس کے پاس بہت سے ملازمین تھے رکنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس کو گھر کی یاد اس قدر

ستارہی تھی کہ اس نے دہلی میں اپنی رہائش گاہ کی دیواروں پر اس معنی کا ایک شعر لکھ رکھا تھا۔

اگر میں زندہ سلامت دریائے سندھ پار کرلوں
اور پھر ہندوستان کی طرف منہ بھی کروں تو خدا میرا منہ سیاہ کرے۔

تعداد کے لحاظ سے بابر کی فوج کو کوئی نقصان نہ پہنچا کیوں کہ کچھ افغان سرداروں نے اس کی اطاعت قبول کرلی تھی۔ بابر نے جب ہندوستان میں رہنے کا ارادہ کر ہی لیا تو یہ بھی یقینی بات تھی کہ اس کو سب سے بڑے راجپوت حکمراں رانا سنگرام سنگھ والیٔ میواڑ سے جو اپنی زندگی میں اٹھارہ جنگیں سر کرچکا تھا دوچار ہونا ہی پڑے گا۔

اس میں شک نہیں کہ رانا کے دل میں جوش و جذبات اور تمناؤں کا ایک سمندر امڈ رہا تھا لیکن سیاسی وجوہ کی بنا پر وہ اسی بات کو ترجیح دیتا کہ اس کا سابقہ نسبتاً کم فوج تک دشمن یعنی لودیوں کے ساتھ پڑے تاکہ اسے پرتھوی راج کے پائے تخت سے شمالی ہندتک ایک وسیع سلطنت پر حکومت کرنے کا موقع مل سکے یا اندرپرستھا کے بجائے چتوڑ کی فصیل سے اقتدار و عظمت کا پرچم لہرانے کا افتخار حاصل نہ ہوسکے۔ جن افغانوں نے ابھی تک بابر کی تلوار کی دھار کا مزہ نہ چکھا تھا وہ بھی حوصلہ مندی سے کام لے رہے تھے اور چاہتے تھے کہ اپنی کھوئی ہوئی آبرو اور سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ایک مرتبہ پھر سر اور دھڑ کی بازی لگادیں۔

بابر نے فیصلہ کیا کہ قبل اس کے کہ رانا کوئی قدم اٹھائے وہ ہندوستان میں رہنے والے افغانوں سے نپٹ لے۔ ایک طرف تو بیانہ، دھولپور، سنبھل، دہری، اٹاوہ اور کالپی ابھی تک افغان حاکموں کے ہاتھ میں تھے۔ دوسری طرف قنوج سے لے کر بنگال کی سرحد تک کا سارا علاقہ (نوہانی) لوہانی اور فرملی قبیلوں کے ہی قبضے میں تھا۔

بابر نے پرانا طریقہ جو اس وقت قابل عمل تھا اختیار کیا یعنی اس نے غیر مفتوحہ علاقوں کو اپنے اہم ساتھیوں میں بانٹ دیا اور ان سے کہا کہ وہ ان علاقوں کو فتح کرکے ان پر قابض ہوجائیں۔ بابر نے ناصر علی خاں نوہانی اور معروف فرملی کے خلاف جنھوں نے قنوج کے سارے مشرقی علاقے پر قبضہ کر رکھا تھا اپنے بیٹے ہمایوں کو اس کی

درخواست پر ان دشمنوں کو زیر کرنے کے لیے روانہ کیا۔ مجموعی طور پر یہ منصوبہ کارگر ثابت ہوا۔ شہزادے نے 21 اگست کو آگرے سے کوچ کیا جوں جوں وہ آگے بڑھتا جاتا افغان بتدریج پیچھے ہٹتے جاتے۔ یہاں تک کہ اس نے جون پور اور غازی پور پر قبضہ کرلیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ افغان ایک زبردست حملے کی تیاری سے قبل آنے والے حالات کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔

بابر نے شاید افغانوں اور راجپوتوں کی نقل و حرکات پر نظر رکھنے کے لیے آگرے ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ باوجودیکہ وہ حالات کے طوفان سے خالی الذہن نہ تھا تاہم اس نے اپنا دھیان بٹانے کے لیے باغات، حمام اور باؤلیوں کی تعمیر کا کام شروع کرایا لیکن اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ رانا سے جنگ سے پہلے ہی وہ دھولپور، بیانہ اور گوالیار سے چھوٹے چھوٹے افغان حکمرانوں کا صفایا کردے۔

بابر کے حکم سے استاد علی خاں نے بیانہ اور دوسرے قلعوں پر بمباری کرنے کے لیے ایک دیو پیکر توپ تیار کی۔ بیانہ راجپوتانہ کا دروازہ کہلاتا تھا۔ اس کے متصل پیلا کھال میواڑ کی شمالی سرحد سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ بابر کے لیے یہ قدرتی بات تھی کہ وہ اس فوجی اہمیت کے قلعے پر قبضہ کرے کیوں کہ یہ قلعہ ایک طرف تو اس کی سلطنت کے بچاؤ کے لیے سدِ فاصل کا کام دے سکتا تھا اور دوسری طرف اگر وہ راجپوتانہ میں داخل ہونے کا فیصلہ کرے تو یہ مقام مہم کا مرکز بن سکتا تھا۔ اس قلعے پر نظام خاں کا قبضہ تھا نظام کا بڑا بھائی اعظم خاں کارولی میں نوہان گڑھ کے قلعے کا قلعدار تھا۔ اس نے بابر کی مدد کا وعدہ کرلیا تھا۔ تردی بیگ کو ڈھائی ہزار سواروں کے ساتھ روانہ کردیا گیا۔ راستے میں عالم خاں بھی اس سے آملا لیکن نظام خاں نے اپنی فوجی تعداد پر بھروسہ کرتے ہوئے ایسا زبردست حملہ کیا کہ حملہ آوروں کو بھاگتے ہی بن پڑا۔ بابر کو جب اس جنگ میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے نظام خاں کو اس کے علاقے میں بغیر کسی چھیڑ چھاڑ کے رہنے دینے کا وعدہ کرلیا۔

جب رانا سانگا نے کندر کے قلعے کو جو رنتھمبور سے چند میل پر مشرق کی جانب واقع ہے فتح کرلیا تو بابر نے آنے والے حالات کا اندازہ کرلیا۔ اس نے اس بات کو بھی اچھی طرح محسوس کیا کہ رانا سانگا نے بڑی بے پروائی کے ساتھ اس کو نظر انداز کردیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فوجی تیاریوں کی کمی اور افغان دشمنوں سے فوری طور پر نبٹنے کی ضرورت نے بابر کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ فی الحال رانا کے خلاف جنگ نہ کرے لیکن بابر کی بیانہ کو فتح کرنے کی کوشش اور نظام سے دوستانہ سلام و پیام نے رانا سانگا کی آنکھیں کھول دیں۔ اب وہ بابر کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ اور بیانہ کو فتح کرنے کی کوششوں سے چشم پوشی نہیں کر سکتا تھا۔

بابر یہ بھی جانتا تھا کہ اگر وہ رانا کی طرف قدم بڑھائے گا تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا چنانچہ اس نے جہاد کا اعلان کر دیا اور 30 نومبر 1526ء کو ہمایوں کے پاس ایک ایلچی روانہ کیا اور حکم بھیجا کہ "جونپور کو کسی قابلِ اعتماد افسر کے سپرد کر کے فوراً آگرے واپس آجاؤ کیونکہ کافر رانا سانگا بہت نزدیک آگیا ہے۔"

چھوٹے چھوٹے سرداروں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ رانا سانگا کی قوت کا مقابلہ کر سکیں۔ چنانچہ انھوں نے بابر کی اس تجویز کو فوراً مان لیا کہ بابر کی حفاظت میں آجائیں اور دوسرے محفوظ تر صوبوں میں اپنی پہلی جاگیروں کے مساوی قیمت کی جاگیریں حاصل کریں۔ اس طرح گوالیار، بیانہ، دھولپور اور دوسرے قلعے خاموشی سے اس کے قبضے میں آگئے ان میں مغل افسروں نے اپنی فوجیں قائم کر دیں۔

بابر کو البتہ ایک زبردست افغان سردار حسن خاں میوات (الور) کے سلسلے میں ناکامی ہوئی۔ حسن خاں ایک زبردست افغان سردار تھا اور جونہی اس کا لڑکا (ناہر یا طاہر خاں) جو پانی پت کے میدان میں بابر کے ہاتھوں قید ہو گیا تھا چھوٹ کر واپس آیا۔ اس نے اپنے مخاصمانہ ارادوں کا اعلان کر دیا۔ بابر کو آخر اپنی دریا دلی کے لیے پچھتانا پڑا۔ حسن خاں نے ابراہیم لودی کے بھائی محمود لودی کی جانشینی کا اعلان کر دیا اور ان کے لیے رانا سانگا کی مدد حاصل کی۔

جس زمانے میں جنگ کی تیاریاں دونوں طرف کی جا رہی تھیں، بابر بال بال موت کے منہ سے بچا۔ ابراہیم لودی کی بوڑھی ماں نے احمد نامی ایک ہندوستانی کے ذریعے جو کھانا چکھنے کا کام انجام دیا کرتا تھا بابر کو زہر دینے کی سازش کی۔ خوش قسمتی سے زہر دیگچی میں پڑنے کے بجائے کھانے کے برتنوں میں چھڑک گیا تھا۔ بابر نے ابھی تھوڑا ہی کھانا کھایا تھا کہ اس کی طبیعت مالش کرنے لگی۔ اس سے شبہات نے زور پکڑا۔

اور جب تحقیقات کی گئی تو سازشش کا سب راز فاش ہوگیا۔ سازشیوں کو قرار واقعی سزا دی گئی اور ابراہیم کی ماں کو کابل بھیج دیا گیا۔ راستے میں دریائے سندھ عبور کرتے وقت ابراہیم کی ماں نے پانی میں چھلانگ لگائی اور ڈوب کر مر گئی۔

بابر کی قسمت کے ستارے اوج پر تھے کیونکہ اگر وہ مرجاتا تو "جس سلطنت کی وہ بنیاد رکھ رہا تھا وہ محفوظ نہ رہتی اور ہندوستان میں راجپوتوں کا اقتدار قائم ہوجاتا۔"

بیانہ سے رانا کے تیزی سے بڑھنے کی بہم اطلاعات آ رہی تھیں۔ چنانچہ بابر 11 فروری 1527ء کو آگرے سے جہاد کے لیے نکل کھڑا ہوا اور شہر کے باہر خیمے نصب کردیے۔ جہاد کے اعلان سے نہ صرف یہ کہ بابر کو اخلاقی طور پر تقویت ملی بلکہ اس نعرے کی وجہ سے یہ امید بھی بندھی کہ سب مسلمان متحد ہوکر رانا کے خلاف جہاد میں شریک ہوجائیں گے۔ اب اس کو یہ خبر ملی کہ رانا اور حسن خاں کی مشترکہ افواج بیانہ پہنچ گئی ہیں۔ بیانہ کی فوج کی یہ کوشش کہ رانا و حسن خاں کی فوجوں کو پیچھے دھکیل دیں ناکام ہوگئی۔

شاہ منصور برلاس اور قسمتی جیسے بہادر سردار نیز تمام وہ لوگ جو بیانہ سے آئے تھے انھوں نے "کفار کی فوجوں کی بہادری اور بے باکی کی بہت تعریف کی۔" بابر نے بیانہ کی فوج کو حکم بھیجا کہ وہ بلا تاخیر آگرے آکر اس کی فوج میں شامل ہوجائے۔

بابر جانتا تھا کہ سیکری کے علاوہ جہاں ایک بڑا تالاب تھا اور کہیں کافی مقدار میں پانی موجود نہیں ہے۔ اس خوف سے کہ کہیں رانا اس پر قبضہ نہ کرلے بابر نے اپنے آدمیوں کو روانہ کیا کہ جھیل کے قریب فوج کی خیمہ زنی کے لیے کوئی مناسب مقام حاصل کریں۔ اسی دوران بابر کی فوج کا ایک 1500 سپاہیوں کا دستہ جو عبدالعزیز کی سرکردگی میں خبر رسانی کے کام پر مامور تھا رانا کی فوج کے ہاتھ لگ گیا جس کو آزاد کرانے کی ساری تدابیر بُری طرح ناکام رہیں۔

بابر اس بات سے متاثر ہوئے بغیر اپنی فوج کے ساتھ آگے بڑھا اور تالاب کی ایک سمت پڑاؤ ڈال دیا۔ اس نے پانی پت کی طرح سامنے کی صف میں مضبوط گاڑیوں کی ایک طویل دیوار کھڑی کردی جو اسی مقصد کے لیے بنائی گئی تھیں اور ان میں سے ہر ایک کو سات آٹھ گز کے فاصلے پر رکھ کر لوہے کی زنجیروں سے باندھ دیا گیا۔

یہ صف ایک تو دشمن کے ناگہانی حملے کو روکنے میں کام آتی اور دوسرے بندوقچیوں

اور توپ اندازوں کے بچاؤ کا کام کرتی جو اس کے پیچھے کھڑے ہو کر گولے برساتے. جہاں گاڑیاں نہیں پہنچ سکتی تھیں وہاں خندقیں کھودی گیئں "تاکہ" ہمارے سپاہیوں کے حوصلے بڑھیں اور فوج کو تقویت کا احساس ہو"

کیمپ چاروں طرف سے گھیر دیا گیا تھا. جہاں کہیں گاڑیاں نہ تھیں اس جگہ لکڑی کی تپائیوں کو سات سات آٹھ آٹھ گز کے فاصلے پر رکھ کر سوکھے چمڑے کی رسیوں سے باندھ دیا گیا تھا - ان تپائیوں کے نیچے پہیئے لگا دیے گئے تھے اور اس طرح سے یہ نئی ایجاد بندوقچیوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی کیونکہ وہ ان کو اپنی ضرورت کے مطابق آگے پیچھے لے جا سکتے تھے.

حالانکہ بابر جنگ کی تیاریوں اور بچاؤ کے کاموں پر بہت ہی توجہ دے رہا تھا لیکن اس کے سردار خوف سے کانپ رہے تھے. انھوں نے سن رکھا تھا کہ رانا شمالی ہند کا سب سے طاقت ور حکمراں ہے اور دہلی گجرات و مانڈو کے سلطان اس کو قابو میں نہ لا سکے. اس کے علاوہ اس کے پاس ایک زبردست فوج ہے. جس کی تعداد عام طور پر ایک لاکھ بتائی جاتی ہے. اس فوج میں سب ہی پیدائشی جنگجو تھے جو رانا کی ایک آواز پر اپنی جانیں قربان کرنے سے کبھی دریغ نہ کرتے. بیانہ کی فوج اور مخبر دستوں نے سرداروں کے دلوں میں خوف و ہراس پیدا کر دیا. وہ یوں ہی پہلے سے بددل تھے. ان حالات نے ان کے حوصلوں کو پست کرنے میں اور تقویت دی.

بابر بے حد پریشان و فکر مند ہوا جب اس نے دیکھا کہ افغان سرداروں نے کول، چندوار، سنبھل اور قنوج کو مغلوں سے دوبارہ چھین لیا. علاوہ برایں عالم خاں، ہیبت خاں اور حسن خاں جیسے اہمیت والے افغان سرداروں نے بابر کا ساتھ چھوڑ دیا. "کسی کے منہ سے بھی کوئی بہادرانہ کلمہ یا مردانہ مشورہ نہ نکلتا."

ان حالات کو دیکھ کر بابر نے انجمن مشاورت طلب کی اور ایک بہت ہی جوشیلی تقریر کے بعد ان سے عہد لیا کہ جب تک زندہ رہیں گے دشمن کا مقابلہ کریں گے. اس کی اس تدبیر کا بڑا اچھا اثر ہوا. ہر شخص نے خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، بیگ ہوں یا معمولی خدمت گزار، خوشی خوشی قرآن مجید کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا، قسم کھائی اور عہد و پیمان باندھا."

بابر نے اپنے فیصلے کو زیادہ سنجیدہ بنانے اور تائیدایزدی حاصل کرنے کے لیے شراب نوشی ترک کردی۔ سونے چاندی کے برتنوں کو توڑ دیا اور ان کے ٹکڑوں کو غریبوں اور فقیروں میں بانٹ دیا۔ اس کی تقلید میں تقریباً تین سو بیگ سرداروں نے بھی ایسا ہی کیا جس جگہ شراب پھینکی گئی تھی وہاں ایک خیرات گھر تعمیر کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ نشہ آور مشروبات کی تیاری استعمال اور فروخت بند کردی جائے۔

مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے یہ حکم بھی صادر کیا گیا کہ مسلمانوں کے سامان تجارت پر چاہے وہ کسی بھی شہر قصبہ سڑک کشتی قلعہ یا گھاٹی میں ہوں ان پر تمغا یعنی ٹیکس عائد نہ کیا جائے گا۔ یہاں یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ بغیر ایک عمدہ تنظیمی ادارے کے یہ کام انجام نہ پا سکتا تھا۔ اس وقت کوئی ایسا تنظیمی ادارہ موجود نہ تھا لیکن ان احکامات کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں بہتر مستقبل کی امیدیں بندھ گئیں۔

17 مارچ 1527ء کو ہفتہ کے دن بابر راجپوتوں سے مقابلہ کرنے کے ارادہ سے ایک پہلے سے تیار کردہ میدان میں پہنچ گیا۔ کچھ خیمے پہلے ہی سے لگائے جا چکے تھے اور ابھی کچھ خیمے لگنا باقی تھے۔ دشمن کے پہنچنے کی خبر آئی۔" میں فوراً اپنے گھوڑے پر سوار ہوگیا اور حکم دیا کہ ہر شخص فوراً اپنی اپنی جگہ پہنچ جائے اور ہماری فوجیں گاڑیوں کی آڑ لے لیں"۔

راجپوتوں کی فوج بابر کی فوج کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ تھی اور بلاشبہ ان کے حوصلے بہت ہی بلند تھے۔ صبح تقریباً ساڑھے نو بجے بابر کی فوج کے انتہائی دائیں جانب حملہ کردیا۔ بابر نے اپنی فوج کے اس حصے کو "تلغما" حملے کے لیے مخصوص کر رکھا تھا اس میں شک نہیں کہ "تلغما" حملہ آوروں کے لیے بہت ہی خطرناک نوعیت رکھتا ہے لیکن اس کی دفاعی قابلیت بہت کمزور ہوتی ہے۔

بابر نے جلد ہی خطرہ کا احساس کرلیا اور راجپوتوں کے بائیں جانب منتخبہ منگول فوجیوں کا ایک دستہ چن تیمور سلطان کی دلیرانہ سرکردگی میں روانہ کیا جس نے ایک جچا تلا حملہ کیا اور اس طرح اس کی دائیں صف پر جو دباؤ پڑا تھا اس میں کمی واقع ہوئی۔

بابر کے اس حملے سے راجپوتوں کی بائیں اور درمیانی صفوں میں خلا پیدا ہوگیا۔ مصطفیٰ رومی نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ کر خوفناک گولہ باری شروع کردی لیکن راجپوت اس ناگہانی حملے سے حواس باختہ نہ ہوئے بلکہ ان کے نبرد آزما سپاہی موج در

موج مغلوں کے دائیں بازو پر حملہ آور ہوتے رہے جس کو بابر کی فوج کے مرکزی حصے کی پوری قوت صرف کر کے ہی بچایا جا سکا۔

دائیں بازو کی طرف لڑی جانے والی خوف ناک جنگ نے طول کھینچا لیکن اس کا نتیجہ راجپوتوں کی توقعات کے مطابق برآمد نہ ہوا۔ چونکہ مرکزی حصے میں توپ خانہ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ راجپوت اس طرف حملہ آور نہ ہو سکے اور انھوں نے اپنی توجہ بائیں بازو کی طرف مبذول کر دی۔ مغلوں کو کافی کاری ضربیں لگائیں۔ لیکن سخت دباؤ کے باوجود مغل اپنی جگہ مضبوطی سے قائم رہے اور اپنی جگہ سے ذرا بھی جنبش نہ کی۔ اس وقت مغلوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ "تلغما دھاوا" بول دیا۔ راجپوت چاروں طرف سے گھر گئے۔ ٹھیک اسی وقت بابر کے مخصوص شاہی دستے نے مرکز کے اطراف سے بہت ہی خوف ناک حملے شروع کر دیے اور لڑائی ہر طرف پھیل گئی۔

مرکزی افواج نے بڑے بڑے پتھر کے گولے برسائے جس کا بہت ہی تباہ کن اثر ہوا۔ ادھر بندوقچیوں نے بھی اپنی گولہ باری تیز کر دی۔ خانگی دستے کے حملے کے سبب راجپوتوں کا مرکز پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا اور آتشیں اسلحے دشمن کے جم غفیر میں موت کا منہ کھولے ہوئے پہنچ گئے۔ راجپوتوں نے ایک مرتبہ پھر خود کو اکٹھا کر کے بابر کے دونوں بازوؤں پر حملے کیے لیکن ان کو پیچھے دھکیل دیا گیا۔ ایک مرتبہ تو ایسا دکھائی دینے لگا کہ مغلوں کا بایاں بازو اب ختم ہی ہونے والا ہے۔ مغل بھی جی توڑ کر لڑ رہے تھے اور جنگی مہارت سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ انھوں نے جدید آتشیں اسلحوں کی مدد سے بہت سے دشمنوں کو ہلاک کر دیا تھا۔

آخر کار دس گھنٹے کی زبردست لڑائی کے بعد راجپوتوں کا طوفان مدھم پڑ گیا۔ راجپوتوں کی ہمت اور بہادری پست ہو کر رہ گئی۔ انھوں نے اپنی قسمت وجدید قسم کے اسلحوں کو کوسا جنھوں نے ان کی تیز دھار تلواروں اور مضبوط دلوں کو بے کار بنا دیا تھا۔ سورج ڈوبنے سے پہلے ہی یہ فیصلہ کن جنگ ختم ہو گئی اور بے دریغ خوں ریزی کے باب کا اختتام ہو گیا۔

ایک دفعہ پھر اعلیٰ فوجی لیاقت تحمل و بردباری، ماہرانہ تدابیر اور توپ خانے کی کامیابی نے بابر کے قدموں کو چوم لیا۔ اگر رانا بابر کو جنگی تیاریوں کا موقع نہ دیتا اور

بیانہ کی فتح کے بعد تیزی سے عمل پیرا ہوتا تو جنگ کا نتیجہ یقیناً بالکل مختلف شکل میں رونما ہوتا۔ اس کے علاوہ خود اس کی قسمت اس کی مخالف تھی وہ جنگ کے ابتدائی مرحلے ہی میں زخمی ہوگیا اور بے ہوشی کی حالت میں میدانِ جنگ سے ہٹا لیا گیا۔ اس خیال سے کہ فوج میں انتشار نہ پیدا ہو جائے۔ ایک شخص جھالا اُجا کو جلدی سے شاہی لباس پہنا کر اور سازوسامان سے آراستہ کر کے رانا کے ہاتھی پر بٹھا دیا گیا۔ سپاہی اس خیال میں رہے کہ رانا ان کی رہنمائی کر رہا ہے لیکن حقیقت میں وہ لوگ اُس کی لیاقت تجربہ اور رہنمائی سے محروم تھے۔ البتہ رانا کی فوج میں کسی قسم کی غداری یا فرار کا واقعہ پیش نہ آیا۔

بلا شبہ جنگ کے اثرات بہت ہی دوررس تھے۔ اس شکست کے نتیجے میں راجپوتوں کا اتحاد جو کہ نہ صرف نسل، قومیت، مذہب اور تمدن کی اعلیٰ نظریات بلکہ اودے پور کے خاندانی وقار اور ان کے سرداروں کی فوجی و سیاسی فتوحات پر مبنی تھا ـــــ پاش پاش ہوگیا۔ اس طرح اُن کے وقار کو زبردست ٹھیس پہنچی۔

اس اتحاد کے خاتمے کے نتیجے میں ہندو اقتدار و برتری کا ہولناک تصور جو کہ شمالی ہند کی مسلمان حکومتوں کو سخت امید و بیم کی حالت میں رکھے ہوئے تھا بکھر کر رہ گیا۔ بہت سے قوی راجپوت سرداروں کی بربادی اور رانا سانگا کے ناکارہ ہوجانے کے بعد جو پھوٹ پڑی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راجپوتانہ کے دروازے ایک بار پھر ہمسایہ حکومتوں کی لوٹ مار کے لیے کھل گئے اور وہ بے دریغ غارت گری میں مشغول ہو گئے۔ مغل سلطنت کی تاسیس میں جو رکاوٹیں تھیں وہ کانوا کی جنگ سے ختم ہوگئیں۔

اب بابر نے غازی کا لقب اختیار کر لیا اور ہندوستان میں اس کا تخت محفوظ ہوگیا اس کی توجہ کا مرکز کابل سے ہٹ کر ہندوستان قرار پایا۔ سب سے اہم بات یہ کہ راجپوتوں کی شکست نے افغانوں کی کمر توڑ دی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر افغانوں کو راجپوتانہ کے قوی اور آزاد راجاؤں کی حمایت حاصل ہو جاتی تو اُن کی متحدہ طاقت مغلوں کے لیے زیادہ خطرناک ثابت ہوتی۔

رانا سانگا کو باسوا (جے پور) لے جایا گیا جہاں سے وہ رنتھمبور چلا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے قسم کھائی تھی کہ جب تک وہ بابر کو شکست نہ دے گا چتوڑ واپس نہ جائے گا۔ اب اس نے دوسری جنگ کی تیاریاں شروع کردیں۔ جب اس کو پتہ چلا

کہ بابر چندیری کی طرف جا رہا ہے تو اُس نے بھی اپنی فوج کو اُس کا تعاقب کرنے کا حکم دیا تاکہ پیچھے سے اُس پر حملہ کر دے۔

رانا سانگا نے اپنے سرداروں کے اس مشورے پر عمل کرنے سے گریز کیا کہ اتنی جلد دوبارہ جنگ نہ چھیڑی جائے اس لیے سرداروں میں اس کے خلاف سازش پھیل گئی اور اُسے زہر دے دیا گیا۔ رانا کا 30 جنوری 1528ء کو کاپی میں انتقال ہو گیا لیکن اس کی نعش کو منڈل گڑھ لے جا کر جلایا گیا۔

فتح کے بعد بابر بیانہ روانہ ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد ہی راجپوتانہ میں داخل ہو جائے لیکن موسم گرما نے اسے میوات (الور) سے آگے نہ جانے دیا۔ بعد میں اس نے میوات پر قبضہ کر لیا۔ بابر پر سخاوت اور دور اندیشی غالب تھی اور اُس نے ناہر خاں کو پناہ دی اور اس کے باپ کی دشمنی کے باوجود اسے لاکھوں روپے کی جاگیر عطا کی۔

بابر نے جب خوب اندازہ کر لیا کہ اب اُس کی حیثیت مستحکم ہو چکی ہے تو اُس نے اپنے ان افسروں اور سپاہیوں کو جو کابل و بدخشاں کی برفیلی پہاڑیوں میں جانے کے لیے مضطرب تھے اجازت دے دی۔ بابر بیکار نہ بیٹھا: مشرق میں جو افغان رہ گئے تھے ان کے مقابلے کے لیے اس نے مہمیں روانہ کیں۔

بابر جلد از جلد راجپوتانہ کا مسئلہ حل کرنا چاہتا تھا مگر مشرقی خطہ کی حالت نازک ہو گئی تھی۔ نصرت شاہ حاکم بنگال نے نہ صرف لودی سلطنت سے آنے ہوئے افغان سرداروں کو پناہ دی بلکہ ابراہیم لودی کی لڑکی سے شادی کر کے ایک طرح سے افغانوں کی سرداری کا حق حاصل کر کے ان کے معاملات میں دلچسپی لینے لگا۔

پانی پت کی جنگ کے بعد بابر کی فوج کی خستگی اور اپنی قوت کی افزائش سے فائدہ اٹھا کر افغانوں نے مغل افسروں کو نکال باہر کیا یا گرفتار کر لیا اور اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔

الیاس خاں نے دوآبہ میں، قطب خاں نے چندوار میں، حسین خاں نوہانی نے راپری میں، بتن و بایزید نے اودھ میں اور ان کے علاوہ بہت سے ہندو سرداروں نے مغلوں کی اطاعت سے انکار کر دیا۔ بابر نے ایک طرف تو اپنے کچھ بہترین سرداروں کو مشرقی علاقے میں افغانوں سے نپٹنے کے لیے روانہ کیا دوسری طرف خود الور سے سنبھل

تک کا دورہ شروع کر دیا۔

بابر کو یقین تھا کہ اس کے بیگ سردار افغانوں کو مغلوب کر لیں گے اور اسی لیے اس نے مزید انتظار کیے بغیر چندیری پر حملہ کا منصوبہ تیار کر لیا۔ چندیری ایک سطح مرتفع پر واقع ہے جو تجارتی اور فوجی اہمیت کا حامل تھا۔ اس شہر کی زرخیزی کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ کہا جاتا تھا کہ شہر پناہ کی دیوار کے اندر بارہ ہزار مساجد تین سو چوراسی بازار اور چودہ ہزار پتھر کے خوبصورت مکانات موجود تھے۔

شہر کی بلند سطح پر ایک 230 فٹ بلند پہاڑی پر چندیری کا قلعہ واقع تھا۔ اس کی فوجی اہمیت اس کے جائے وقوع کے باعث تھی۔ یہ قلعہ مالوہ اور بندیل کھنڈ کی سرحدوں پر مالوہ اور ہندوستان کی درمیانی سڑک پر واقع تھا۔ اس شہر کی تاریخ پر ظلموں رہی ہے اور ایک نسل کی مدت حیات میں یہ شہر تین حکمرانوں کے قبضے میں رہ چکا تھا۔

مالوہ کے تخت کے ایک دعوے دار نے یہ قلعہ سکندر لودی کو اس کی مدد کے بدلے میں دے رکھا تھا جب یہ مدد کامیاب نہ ہوئی تو یہ شہر میدنی رائے کو مل گیا جس نے محمود ثانی حاکم مالوہ کی حمایت کی تھی۔ کچھ تو حاسد مسلمان امرا کی سازشوں کے سبب اور کچھ ان سازشوں کے اثرات کی وجہ سے اور کچھ حکومت سے جارحانہ مداخلت شروع کر دینے کے سبب یہ سلطان کے لیے دردِ سر بن گیا تھا۔

جب محمود نے یہ دیکھا کہ وہ سخت کوشش اور جوشیلے راجپوتوں پر قابو نہیں پا سکتا تو اس نے گجرات کے حکمران مظفر شاہ کو مدد کے لیے طلب کیا۔ میدنی رائے نے محمود اور مظفر شاہ کے مضبوط اتحاد کو رد کر دینے کے لیے رانا سانگا سے سرپرستی کی درخواست کی اور یہ تجویز پیش کی کہ وہ چندیری کو اس کی جاگیر کے طور اپنے پاس رکھے گا۔

محمود نے چندیری پر حملہ کیا لیکن شکست کھائی اور قید ہو گیا۔ اس طرح چندیری رانا کو مل گیا۔ میدنی رائے نے کانوا کے مقام پر رانا کی ماتحتی میں جنگ کی تھی۔ بابر کی فتح کے بعد اس نے اپنی جاگیر اور خود اپنی ذات کو اس کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا۔ ابراہیم اور رانا سانگا کی شکست کے بعد چندیری پر بابر کا حق قائم ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے میدنی رائے کو سزا دینے کے لیے ایک مضبوط فوج بھیجی لیکن کمک رسانی کے باوجود وہ ہار گئی

ایسے وقت میں جب کہ بابر افغانوں کے خلاف مہم شروع کرنے والا تھا۔ یہ شکست ایک فالِ بد تھی۔

بابر کا راجپوتانہ میں مہم کا منصوبہ بڑا دور اندیشانہ تھا۔ مسلمانوں اور راجپوتوں کے درمیان پُرجوش مخالفت کی وجہ سے اسے مقامی مسلمانوں کی زبردست حمایت حاصل ہو سکتی تھی۔ چندیری سے بابر گنگا اور جمنا کی وادی اور راجپوتانہ میں پیش آنے والے واقعات کا بخوبی مطالعہ کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مالوہ ایک مالدار صوبہ تھا اور اس کا امکان تھا کہ وہاں سے اسے جنگی ساز و سامان فراہم ہو سکے گا۔

مالوہ سے راجپوتانہ کے قلب میں پہنچنا بھی آسان تھا۔ فتح مالوہ سے اول تو راجپوتانہ کے خلاف محاصرہ کی مہم کو بہت تقویت پہنچتی اور دوسری طرف راجپوتوں اور مشرقی علاقے کے دشمنوں کے درمیان اتحاد میں رکاوٹ پیدا کی جا سکتی تھی۔ انھیں مفاد کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہ مسلمانوں کے مختلف طبقوں کی مدد حاصل ہو سکے گی اس نے اس مہم کو جہاد کا رنگ دے دیا۔

دسمبر 1527ء میں بابر نے اپنی فوجوں کو آراستہ کیا اور 21 جنوری 1528ء کو چندیری پہنچ گیا۔ اس نے میدنی رائے پر واضح کر دیا کہ یا تو شکست تسلیم کرے یا پھر آخری وقت تک لڑنے کو تیار رہے۔ اس نے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ اس کو اپنی حفاظت میں لے لے گا اور چندیری کے بدلے شمس آباد عطا کرے گا لیکن میدنی رائے نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا۔ 28 جنوری حملے کی تاریخ مقرر ہوئی۔ اس روز صبح کو وزیرِ اعظم خلیفہ ایک بہت ہی پریشان کن خبر لایا کہ مشرق میں افغانوں نے مغل فوج کو شکست دے کر لکھنؤ چھوڑنے اور قنوج لوٹ جانے پر مجبور کر دیا ہے۔

وزیر بڑا مضطرب نظر آتا تھا لیکن بابر کا رویہ بالکل برعکس تھا۔ اس نے اس بات کی مخالفت کی کہ اس خبر کی وجہ سے چندیری کا منصوبہ کسی طرح متاثر ہو۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ جس قدر جلد ممکن ہو چندیری کو فتح کر لیا جائے۔

اگلے روز صبح ایک زبردست حملہ کیا گیا اور تقریباً گھنٹہ بھر بعد قلعہ فتح ہو گیا۔ اس کی وضاحت ذرا مشکل ہے کہ بہادر راجپوتوں اور اُن کے زبردست قائد میدنی رائے نے کس طرح اس مختصر مدت میں قلعہ فتح ہو جانے دیا۔ بہرحال وجہ جو بھی ہو، قلعہ کے خالی ہونے

کے بعد جو کشت و خون ہوا ہے اندازہ ہے کہ تین ہزار سے چھ ہزار تک کے درمیان آدمی قتل ہوئے۔

چندیری احمد شاہ کو دے دیا گیا جو کہ مالوہ کے حکمران خاندان کا ایک رکن تھا۔ میدنی رائے کی دو لڑکیاں قید کر لی گئیں جن میں سے ایک کامران کو دوسری ہمایوں کو دے دی گئیں۔

بابر کا اصل منصوبہ یہ تھا کہ رائے سین، بھیلسہ اور سنگرور کو فتح کرنے کے بعد چتوڑ پر حملہ کیا جائے۔ لیکن افغانوں کی سازش کی پریشان کن خبروں کے باعث اس نے اپنی توجہ مشرق کی جانب مبذول کر دی۔

بابر نے احمد شاہ کو چندیری کا بندوبست سپرد کر دیا اور ۲ فروری کو مشرق کی طرف کوچ کر دیا۔ راستے میں اس کو پتہ چلا کہ افغانوں نے قنوج اور شمس آباد پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ چنانچہ وہ جوش و غصہ میں بھرا آگے بڑھتا گیا اور ۲۸ تاریخ کو قنوج پہنچ گیا۔

بابر کی آمد کی خبر پا کر افغان دریائے گنگا کے مشرقی سمت چلے گئے اور اس کی پیش قدمی کو روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ مغلوں نے توپ خانے کی گولہ باری کی آڑ لے کر دریا پر پل بنایا اور سخت مخالفت کے باوجود دریا پار کر لیا۔ جب افغانوں نے یہ دیکھا کہ اُن کی ساری تدابیر بے کار ہو گئی ہیں تو وہ فرار ہو گئے۔

چن تیمور سلطان کو حکم دیا گیا کہ افغانوں کا تعاقب کرے۔ خود بابر براہ لکھنؤ اجودھیا کی طرف بڑھا۔ افغانوں کو بنگال و بہار کی طرف بھگا دیا گیا اور شاید بکسر تک پہنچ گیا۔

فی الحال افغانی خطرہ ٹل گیا تھا۔ چنانچہ بابر آگرے واپس آیا جہاں اس نے موسم برسات ادبی کاوشوں اور چہار باغ لگانے میں صرف کیا۔ ستمبر میں بابر شکار کے لیے دھولپور کی طرف گیا اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دھولپور اور گوالیار ہو آیا۔ اس نے اپنی بیماری کے باوجود جو افیون کھانے کے سبب لاحق ہو گئی تھی مان سنگھ و وکرماجیت کی عمارتوں کو جو فن تعمیر کی خوبصورتی کی وجہ سے مشہور تھیں ملاحظہ کیا اور ان عمارات نے مستقبل میں فتح پور سیکری کی تعمیر پر اثر ڈالا جو کہ آج تک اکبر کی عظمت کی یاد تازہ

کرتی ہے۔

رانا سانگا نے تین لڑکے چھوڑے۔ ان میں سے ہر ایک رانا سانگا کا جانشین بننے کی اُمید لگائے تھا لیکن عوام نے اس کے تیسرے لڑکے رتن سنگھ کو جانشین بنایا۔ اس کی ماں جودھپور کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی جس میں راجپوت نسل کا غرور اور جنگجویانہ خوبیاں پوری طرح موجود تھیں۔

اس موقع پر اس کے دو بڑے بھائی وکرما دتیہ اور اودے سنگھ رنتھنبور میں اپنی ماں رانی پدماوتی کے پاس تھے جو کہ بوندی کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ رانا سانگا نے انہیں رنتھنبور جاگیر میں دے کر ان کے ماموں سورج مل ہاڈا کو سرپرست مقرر کر دیا تھا۔ رتن سنگھ نے میواڑ کے حکمراں کی حیثیت سے وکرما دتیہ سے سونے کا پٹکا اور تاج طلب کیا جسے رانا سانگا نے کسی جنگ میں حاصل کیا تھا اور اس وقت اس کے قبضے میں تھے۔ وکرما دتیہ ان نشانیوں کو دینے کو تیار نہ ہوا۔ رتن سنگھ کو یہ بات بھی پسند نہ تھی کہ تقریباً پچاس لاکھ روپے کی جائیداد وکرما دتیہ اور اودے سنگھ کے قبضے میں رہے۔

وکرما دتیہ نے مزید پیچیدگیوں کے خوف سے اپنے وکیل اشوک مل کو بابر کے پاس اس تجویز کے ساتھ روانہ کیا کہ اگر اس کو ستر لاکھ روپیہ سالانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے تو وہ اس کی اطاعت قبول کر لے گا۔ بابر نے یہ شرط مان لی اور شاید اس سے کہلا بھیجا کہ قلعہ اس کے سپرد کر دے۔

اشوک مل دوبارہ بابر سے گوالیار میں ملا اور اس سے کہا کہ وکرما دتیہ نے یہ کہلا بھیجا ہے کہ اگر بابر رضامند ہو تو وہ رنتھنبور کو بیانہ کے قلعہ کے بدلے میں دینے کو آمادہ اور تیار ہے۔

یہ گفتگو کچھ عرصے تک چلتی رہی لیکن اس کی کوئی تاریخی اہمیت نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وکرما دتیہ اپنے بھائی کو یہ جتانا چاہتا تھا کہ اگر وہ اس پر دباؤ ڈالے گا تو وہ مخالفین کے ساتھ ہر قسم کا معاہدہ کرنے کو تیار ہے۔

رتن سنگھ نے سمجھ داری سے بات کو آگے نہ بڑھنے دیا اور وکرما دتیہ بھی بابر کی تجاویز پر خاموش رہا اور یہ گفتگو آخر ناکام ہو گئی۔

بابر نے ابھی تک اپنے آباؤ اجداد کی سلطنت کو جیتنے کا ارادہ بالکل ترک

نہ کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ سمرقند کو، جو کہ اس کے خوابوں کا شہر تھا، فتح کرنے کے لیے مناسب موقع کا منتظر تھا۔ وہ ازبکوں کی قسمت کی بلندی و پستی کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ وہ یہ خبر سن کر کہ ازبک ایک بار پھر زبردست طاقت جمع کر رہے ہیں اور ایرانیوں کے مقابلے میں ان کا پلڑ بھاری ہے بہت متفکر ہوگیا۔ اس کے علاوہ بابر ہمایوں کے ان باطل خیالات سے بھی فکر مند تھا جو حوصلہ مند اور پُرجوش ہونے کے بجائے دنیوی آلودگیوں سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے بارے میں سوچتا تھا۔

بدقسمتی سے بجائے اس کے کہ ہمایوں کے دل میں جوش و ولولہ پیدا ہو اس کی پیشانی سے کمزوری کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اس نے اس بات کا بھی اعلان کر دیا کہ وہ کابل واپس جانا چاہتا ہے۔ گو یہ بات مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ نومبر میں جب یہ خبر ملی کہ شاہ طہماسپ نے ستمبر 1528ء میں ازبکوں کو جام کے مقام پر شکست دے کر بڑا کشت و خون کیا تو بابر کی پریشانی رفع ہوئی۔ اس نے ہمایوں کو ایک پُرزور خط لکھا جس میں اس کو ہدایت کی کہ وہ سمجھ داری اور احتیاط سے کام لے ترک دنیا کے خیالات کو ذہن سے نکال دے اور حصار، ہرات اور سمرقند کو فتح کرنے کی کوشش کرے۔

چنانچہ ہمایوں نے ایک بڑی فوج جمع کی جس سے ازبکوں پر جو ابھی اپنی شکست سے سنبھل نہ پائے تھے بہت اثر پڑا اور انھوں نے صلح کی خواہش کا اظہار کیا۔

دسمبر 1528ء میں بابر نے مجلس مشاورت طلب کی اور کچھ بحث و مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ عسکری مرزا کو مشرق کی طرف بھیجا جائے۔ مشرق کے سارے امرا کو تیزی کے ساتھ احکامات صادر کر دیے گئے کہ وہ عسکری کے ساتھ مل کر افغانوں کا جنھوں نے بہار و بنگال میں پناہ لے لی تھی اور وہاں فساد برپا کرتے رہتے تھے استیصال کریں۔ ان کو یہ بھی ہدایت دی گئی کہ بنگال کے حاکم سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ مغل حکومت سے اپنے رویے کا واضح طور پہ اعلان و اظہار کرے۔

یہ تجویز بظاہر اس وجہ سے کی گئی تھی کہ بابر یہ نہ چاہتا تھا کہ بنگال کے سلطان نصرت شاہ سے جس نے کہ دوستی کا اعلان کیا تھا اور پیش کش بھی ارسال کی تھی بلا سبب اور قبل از وقت کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کی جائے۔

بابر یہ بھی چاہتا تھا کہ بلوچیوں کے خلاف تعزیری مہم بھیج کر سزا دی جائے کیونکہ وہ اکثر شاہی اراضیات پر حملہ کرتے رہتے ہیں لیکن 13 جنوری 1529ء کو اُسے دھولپور میں یہ پریشان کن خبر ملی کہ سکندر لودی کے لڑکے محمود لودی نے بہادر کو گرفتار کر کے اُس کی حکومت پر قبضہ جما لیا ہے اور اپنی طاقت میں اضافہ کر رہا ہے۔ چنانچہ بابر نے فوراً ہی اپنے سارے پروگرام ملتوی کر دیئے اور آگرہ واپس آگیا۔

پانی پت کی جنگ کے بعد میوات کے حاکم حسن خاں اور رانا سانگا نے اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ ابراہیم لودی کے تخت کا قانونی وارث اس کا بھائی سلطان محمود لودی ہے۔ سلطان محمود نے کانوا کے مقام پر بابر کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا لیکن شکست کے بعد اس نے میواڑ میں پناہ لی تھی۔ افغان سرداروں بِبن، بایزید اور اُس کے خسر اعظم خاں نے اس کو بہار آنے کی دعوت دی۔ موقع بھی مناسب تھا کیونکہ نوہانی سردار اپنی اہمیت کھو چکے تھے اور شیر شاہ سوری ابھی تک اپنی طاقت پوری طرح نہ جما پایا تھا۔ اس کے علاوہ بنگال کی طرف سے کسی خطرے کا خدشہ نہ تھا کیوں کہ وہاں کا حاکم افغانوں کا دوست تھا۔

ان باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے محمود نے یہ دعوت بخوشی منظور کر لی اور 1528ء کے اواخر میں افغان سرداروں سے جا ملا جنھوں نے اس کو اپنا حکمراں ہونے کا اعلان کر دیا اور اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔

20 جنوری 1529ء کو بابر نے آگرے سے افغانی فتنہ کو دبانے کے لیے کوچ کیا۔ وہ آہستہ آہستہ سفر کر رہا تھا۔ جب وہ کرا پرگنہ ڈگدہی کے مقام پر پہنچا تو عسکری وہاں پہنچ کر احترام بجالایا۔ یہاں اس کو خبر ملی کہ افغانوں نے تین طرف سے حملے کی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ بایزید و بِبن کو سرور کی طرف بھیجا گیا ہے۔ فتح خاں شروانی اور خود سلطان محمود دریائے گنگا کے کنارے کنارے چنار کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے اور شیر خاں سوری وغیرہ نے دریا پار کر کے بنارس کا رخ اختیار کیا ہے۔

یہ خبر پاکر بابر نے بڑے احتیاط سے قدم بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ یہ بات قرار پائی کہ دریائے گنگا کے ایک کنارے پر تو خود بابر روانہ ہو اور عسکری دوسرے کنارے کو سنبھالے۔ نیز یہ کہ دونوں فوجیں ایک ساتھ ہی حرکت و قیام کرتی رہیں۔

۲۳ مارچ کو بابر چنار پہنچا اور قلعہ کا معائنہ کیا۔ بنارس سے چند میل پیشتر اس کو پتہ چلا کہ سلطان محمود لودی سون کے قریب آ پہنچا ہے۔ چنانچہ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ غازی پور کے مقام پر محمود خاں لوہانی و جلال خاں نے اطاعت قبول کر لی۔ اس کے علاوہ دوسرے افغان سرداروں مثلاً جلال خاں و فرید خاں و شیر خاں سوری کی طرف سے عاجزانہ خطوط موصول ہوئے۔ چونکہ افغان بنگال کی طرف فرار ہو گئے تھے اور یہ سمجھا گیا کہ وہ بنگال کے حکمراں کے ساتھ سازش کر رہے ہیں لہذا بابر اس وقت تک بڑھتا گیا جب تک کہ وہ گنگا اور کرانسا کے سنگم پر نہ پہنچ گیا۔ بابر اور نصرت شاہ کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

بابر حقیقتاً یہ چاہتا تھا کہ بنگالیوں سے کوئی جھگڑا نہ ہو لیکن اسس کو ان لوگوں کا رویہ مبہم و ناقابلِ اطمینان معلوم ہوا۔ دراصل ابھی تک یہ بات صاف طور پر معلوم بھی نہ ہو سکی تھی کہ بنگالی مغلوں کے حملے سے خوف زدہ تھے یا افغانوں سے ساز باز کیے ہوئے تھے یا وہ بنگال میں افغانوں کی آمد کو روکنا چاہتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے فوج کے ۲۴ ڈویژن حاجی پور کے گورنر مخدوم عالم کی سرکردگی میں بھیجی تھیں۔ یہ فوج دریائے گنڈک کے کنارے خیمہ زن ہوگئی۔

بہار کے افغانوں اور حاکم بنگال کے دشمنانہ رویے کے پیش نظر بابر نے صوبہ بہار اور چترکا شاہی نشان محمد زماں مرزا کو عطا کر دیا۔ مرشد عراقی اس کا دیوان مقرر ہوا۔ یہ قدم اس لیے اٹھایا گیا کہ اس کے دشمنوں کو اسس بات کا احساس ہو جائے کہ اگر معاملات تسلی بخش طریقے پر فیصل نہ ہوئے تو بادشاہ کسی حد تک بھی جا سکتا ہے۔

بابر نے جنگی انجمن مشاورت طلب کی اور یہ طے پایا کہ دریائے گنگا کو عبور کیا جائے۔ چنانچہ یکم مئی کو گنگا کو پار کیا گیا۔ تین دن بعد مغل فوج نے دریائے گھاگھرا عبور کرنا چاہا۔ پہلے عسکری کے ڈویژن کو دریا پار کرنا تھا۔ باوجودیکہ بنگالیوں نے زبردست مزاحمت کی لیکن بابر نے سخت گولہ باری کر کے راستہ بنالیا۔ بابر کی طاقت اور قوتِ ارادی کی اس غیر معمولی نمائش نے دلخواہ اثر کیا۔

۶ مئی کو بنگالی فوج بغیر کسی مزید مزاحمت کے منتشر ہوگئی۔ یہ جنگ بابر کی شاندار فتوحات میں سے تیسری اور آخری جنگ تھی جس نے بابر کو شمالی ہندوستان

کا مالک بنا دیا۔

اب جب کہ نصرت شاہ اور بہار کے افغانوں کی گوشمالی ہو چکی تو بابر نے یہ مناسب نہ جانا کہ بہار کے مکمل الحاق کی دھمکی کو پوری طرح بروئے کار لایا جائے۔ اس نے اپنا پہلا فرمان کافی حد تک بدل دیا اور اس بات کی اجازت دے دی کہ بہار کا کچھ حصہ جلال خاں کے پاس رہے۔ کچھ خالصہ علاقہ جس کی آمدنی پانچ لاکھ روپیہ تھی اپنے لیے مخصوص کر لی۔ محمد زماں مرزا کو حکم دیا کہ اپنی حکومت کو جونپور کی حدود تک محدود رکھے۔ اس طرح بابر نے بہار کی حکومت کو رسمی طور پر اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے بجائے اس پر ایک قسم کا اقتدار اعلیٰ قائم کر لیا۔

یہ ترمیم شدہ شرائط جلال خاں و نصرت شاہ کو قابل قبول معلوم ہوئیں اور انھوں نے فوراً ہی ان شرائط کو تسلیم کر لیا۔ جن افغان سرداروں نے سر تسلیم خم کر دیا تھا انھیں بابر نے بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں۔ اب چونکہ برسات کا موسم آرہا تھا لہٰذا اس نے اپنی فوج کا رُخ آگرے کی طرف موڑ دیا۔

گھاگھرا کی جنگ نے افغانوں کی بغاوت کی کمر توڑ دی لیکن ابھی وہ پوری طرح کچلی نہیں گئی تھی۔ ببن اور بایزید نے جو دلیر افغان سردار تھے گھاگھرا کو عبور کیا اور لکھنؤ کا (جواب شاہ آباد واقع رام پور کے نام سے مشہور ہے) محاصرہ کرکے فتح کر لیا۔ بابر کی مغرب کی طرف پیش قدمی کی خبر نے ان کو خوف زدہ کر دیا۔ انھوں نے ڈلمؤ کی طرف رُخ کیا لیکن جب بابر کی فرستادہ فوج نے ان کا تعاقب کیا تو وہ مہوبا کی طرف روانہ ہو گئے۔

بابر 24 جون کو آگرہ پہنچا۔ اس نے اس سفر کے آخری 157 میل کا فاصلہ بڑی تیز رفتاری سے 45 گھنٹے میں طے کیا۔

بابر وسط ایشیا کے حالات سے مطمئن نہ تھا۔ ہمایوں نے خراسان میں ازبکوں کی مصروفیت سے فائدہ اٹھا کر سمرقند، حصار و قبادیان فتح کرنے کے لیے فوجیں بھیجیں۔ آخری دو مقامات سے کسی حد تک کامیابی کی خبریں آئیں لیکن ان کو مزید فوجی مدد کی ضرورت تھی۔ ہمایوں اور کامران ایک بڑے حملے کے لیے تیار تھے لیکن جنوری 1528ء کی فیصلہ کن جنگ نے حالات کو بدل دیا۔ ازبک ہمیشہ سے فوج کی فراہمی کے لیے مشہور تھے۔

وہ تیزی سے اپنے مورچوں کی طرف روانہ ہوئے تاکہ تیموریوں کی پیش قدمی کو روک سکیں.
ہمایوں کا شاندار منصوبہ اور بابر کے خواب کی تعبیر اس شکل میں نمودار ہوئی کہ مغل سلطنت میں قبادیاں کا اضافہ ہوا اور ازبکوں کے ساتھ صلح ہوگئی۔ وسط ایشیا کو فتح نہ کرسکنے کا دھبہ ہمایوں کے دامن پر باقی رہا۔

جب بابر مشرق سے آگرے واپس آیا تو اس نے ہمایوں کو بدخشاں سے بلوایا اور ہندال کو وہاں کا حاکم مقرر کردیا۔ ہمایوں نے علاقے کا بندوبست ہندال کے اتالیق میر فخر علی کو سونپ کر خود 6 جون 1529ء کو کابل کی طرف کوچ کردیا جہاں اس نے کامران اور ہندال کے ساتھ عید منائی اور پھر آگرے کی طرف روانہ ہوگیا۔ 27 جون کو بہت تیزی کے ساتھ سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا آگرے پہنچ گیا۔ اس کی آمد سے بابر کو بہت زیادہ اطمینان ہوا۔

ہمایوں کا افسران و عوام کی مرضی کے خلاف بدخشاں سے ناگہانی کوچ کرنا ایک خطرناک عمل تھا۔ ان لوگوں نے ازبکوں کے حملے سے ڈر کر سعید خاں حاکم کاشغر کو علاقے کی باگ ڈور سنبھالنے کی دعوت دی۔ خوش قسمتی سے ہندال سعید خاں سے چند روز قبل پہنچ گیا۔ اس کے باوجود سعید خاں نے تین مہینے تک قلعے کا محاصرہ برقرار رکھا۔ پھر مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔

بہت ممکن ہے سعید خاں اپنا محاصرہ زیادہ عرصے تک جاری رکھتا لیکن اسے یہ خوف تھا کہ اگر سردیاں شروع ہوگئیں تو واپسی پر راستے بند ہوجائیں گے۔ اس کے علاوہ بابر نے سلیمان مرزا کو بدخشاں کا بندوبست سنبھالنے کے لیے روانہ کردیا۔ کیونکہ ایک زمانے میں سلیمان مرزا کے باپ خاں مرزا کی وہاں حکومت تھی۔ ادھر بابر خود بھی مغرب کی جانب روانہ ہوگیا چونکہ بدخشاں کے معاملات سلجھ گئے تھے۔ بابر لاہور ہی سے آگرے واپس آگیا۔

1528ء سے بابر کی صحت آہستہ آہستہ گر رہی تھی۔ ہندوستان کی گرم آب و ہوا مسلسل مصروف زندگی کے سبب ذہنی و جسمانی تناؤ، زہر کے اثرات اور سب سے زیادہ شراب اور دوسری نشہ آور چیزوں کا حد سے گزرا ہوا شوق جس میں افیون، بھنگ اور دوسری بہت سی نشہ آور چیزوں کے مرکبات جن میں پارہ بھی شامل تھا اس کے مضبوط جسم

پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ اسے اکثر بخار ہو جاتا جو کافی دنوں تک قائم رہتا۔ بابر کو اب جسمانی و ذہنی کمزوری نے آدبوچا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ حکومت اور بادشاہت سے تنگ آجاتا اور اس خواہش کا اظہار کرتا کہ ظفر شان باغات میں خاموشی اور سکون کی زندگی گزارے اس کو اس بات کا پورا یقین ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ منت قبول کر لی تھی کہ ہمایوں کی زندگی بچانے کے لیے خود اس کی زندگی قبول کرلے۔

اس خیال نے بھی اس کی ذہنی وجسمانی صحت پر اور خراب اثر ڈالا۔ اس کو ایسا معلوم ہونے لگا کہ آخری وقت قریب آپہنچا ہے۔

ہمایوں کی صحت یابی کے پانچ چھ ماہ بعد بابر کی صحت تیزی سے گرنے لگی اور وہ جولائی میں صاحب فراش ہو گیا۔ اس کی یہ حالت ستمبر تک جاری رہی پھر اس کی صحت یابی کی ساری امیدیں نقش بر آب ہو گئیں۔ بابر نے یا تو ہمایوں کی صحت یابی کے فوراً ہی بعد یا اپنی طولانی علالت کے دوران ہمایوں کی جانشینی کا اعلان کر دیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ بابر کی زندگی کے آخری ایام میں اس کے وزیر اعظم نظام الدین خلیفہ نے جو اپنے اور نوزائیدہ مغل سلطنت کے مستقبل کے بارے میں متفکر رہتا تھا یہ چاہا کہ ہمایوں اور اس کے بھائیوں کو نظر انداز کر کے بابر کی بہن خانزادہ بیگم کے شوہر مہدی خواجہ کو تخت نشین کر دے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خلیفہ بعض نامعلوم اور شخصی وجوہ کی بنا پر ہمایوں سے خائف تھا۔ اس کے علاوہ اس کو ہمایوں کی اہلیت اور استعداد حکمرانی پر بھی شک تھا۔ مگر جب اس کو مقیم ہروی نے جو دیوان بیوتات تھا یہ بتایا کہ مہدی خواجہ کا خیال ہے کہ تخت حاصل کرنے کے بعد غداری کے الزام میں خلیفہ کی کھال کھنچوائے گا تو یہ معلوم کر کے اس کے جو اس باختہ ہو گئے اور اس نے فوراً ہی اپنا ارادہ بدل دیا اور مہدی خواجہ کو ایک گھر میں قید کر دیا اور ہمایوں کو پائے تخت بلا بھیجا۔

یہ داستان عہد حاضر کے مورخین کے درمیان شدید مباحثات، مختلف نظریات اور مختلف نتائج کا باعث بنی ہوئی ہے۔ طبقات اکبری میں یہ واقعہ مقیم ہروی کے لڑکے کے بیان پر مبنی ہے۔ اس واقعہ کا ذکر اکبر نامہ میں بھی ہے۔ طبقات اکبری میں مذکورہ عبارت کے تنقیدی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف کے معترضانہ مقصد کے

علاوہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ بہت ہی مشکوک اور متضاد ہے۔ کسی بیان کا واضح اور بلاواسطہ ہونا اس کی صحت کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہدی خواجہ خلیفہ کی دوستی، مہربانی اور اس کی شہرت سے اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

جوں ہی خلیفہ کو مہدی خواجہ کی حقیقت کا حال معلوم ہوا اس کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کی آرزوئیں نا تمام رہ گئیں۔ حقیقت کچھ بھی ہو اس واقعہ کی عملی اہمیت سوائے اس کے کچھ بھی نہیں کہ اس حرکت نے خلیفہ کے پاک وصاف دامن وفاداری و اطاعت پر ایک بدنما داغ لگا دیا۔

بدقسمتی سے ہمایوں اپنے بیمار باپ کی تیمارداری نہ کر سکا۔ بابر نے اسے راجہ کالنجر اور افغانوں سے نبٹنے کے لیے بھیج دیا جنھوں نے شہنشاہ کی بیماری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مغل علاقوں پر دست درازی کرنا شروع کر دی۔

26 دسمبر 1530ء کو بابر کی وفات ہو گئی۔ چونکہ ہمایوں سنبھل سے واپس نہیں آیا تھا لہٰذا بابر کی موت کو راز رکھا گیا لیکن یہ راز فاش ہو گیا۔ اس ڈر سے کہ کہیں افراتفری نہ پھیل جائے یہ ضروری سمجھا گیا کہ اعلان کر دیا جائے کہ بابر نے دنیا ترک کر کے درویشی اختیار کر لی ہے اور ہمایوں کو جانشین مقرر کر دیا ہے۔ چار دن بعد ولیعہد واپس آ گیا اور 30 دسمبر 1530ء کو تخت نشینی عمل میں آئی۔ بابر کو آرام باغ میں جو کہ دریائے جمنا کے کنارے واقع ہے دفن کر دیا گیا۔

شیر شاہ کے عہد میں بابر کی نعش اس کی بیوہ بی بی مبارک کابل لے گئی اور ایک بہت ہی خوبصورت مہتابی باغ میں دفن کر دیا گیا جہاں وہ آج تک موجود ہے۔

بابر غیر معمولی لیاقت و استعداد کا مالک تھا اس میں اس قدر اعلیٰ صفات تھیں کہ تیموری خاندان کے کسی اور فرد میں شاید ہی پائی جاتی ہوں۔ اس میں وسعتِ قلب، فیاضی، انسانی ہمدردی، رحم دلی، سادگی اور صفائے باطن کی خوبیاں موجود تھیں۔ وہ ایک عمدہ دوست، محبت کرنے والا شوہر اور مشفق باپ تھا اور ہر محفل میں شمع محفل کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ مردانہ عقل و خرد اور حسن اخلاق کا عمدہ نمونہ تھا۔ فارسی اور عربی کے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ اس کو ترکی زبان میں بھی مہارت حاصل

تھی اور اسں زبان میں دل کش و مؤثر طریقے سے لکھ سکتا تھا۔ نثر نگار کی حیثیت سے اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اسں کی مشہور زمانہ تزک ساری دنیا میں ادبی شاہکار کا بہترین نمونہ مانی جاتی ہے۔

بابر میں غیر معمولی بصیرت، زبردست قوت مشاہدہ اور حقیقت شناسی کا اعلیٰ احساس موجود تھا۔ اس نے اپنی تزک میں انسانوں اور چیزوں کی خصوصیات، ہر ملک کی اور وہاں کے باشندوں کی صفات، نباتات وحیوانات کی تفصیل ہر فرقے کے سماجی وعام حالات یہاں تک کہ ہر اُس چیز کو جو اس کا تجسس دماغ اور وسیع ذہن محسوس کرتا تھا بہت ہی استادانہ اور دلچسپ طریقے پر ذکر کیا ہے۔

فارسی و ترکی کے شاعر کی حیثیت سے اس کا رتبہ معمولی شعراء سے بہت بلند ہے۔ ترکی میں میر علی شیر بیگ نوائی کے بعد بابر ہی سب سے عمدہ شاعر مانا گیا ہے۔ اس نے ترکی میں اپنے بیٹے کامران کے لیے ایک مثنوی لکھی جس کا نام مبین ہے اس میں دو ہزار شعر ہیں جن میں دینی، قانونی واخلاقی مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بابر نے حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کے رسالہ والدیہ کا ترکی نظم میں ترجمہ کیا۔ اس نے علم عروض پر بھی ایک کتاب لکھی اور اس کو رسالہ عروض کا نام دیا۔ اس نے ایک نیا خط ایجاد کیا جس کو خط بابری کہتے ہیں۔ چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسں نے ادب کے میدان میں بھی ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جیسے کہ میدانِ جنگ میں۔

ایک سپاہی اور فوجی سردار کی حیثیت سے اسں کا رتبہ بہت بلند ہے۔ اس میں ترکوں اور مغلوں کی بہادری اور برداشت وتحمل کے ساتھ ساتھ ایرانیوں کی ہمت اور آگے بڑھنے کی صلاحیتیں شامل تھیں۔ وہ ایک ماہر شمشیر زن، عمدہ تیر انداز اور اعلیٰ درجے کا شہسوار تھا۔ وہ شکست سے کبھی دل برداشتہ اور سختی ومحنت کی زندگی سے دل شکستہ نہ ہوتا۔

مخالفین کی اعلیٰ فوجی طاقت سے اسں نے کبھی ہمت نہ ہاری۔ اسں کو عمل و کوشش پسند تھی۔ سخت بحران اور میدانِ جنگ میں وہ اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتا اور اسں کی حرکات و تدابیر اسں قدر لچک دار ہوتیں کہ وہ لڑائی کے آثار چڑھاؤ کے مطابق بدلی جا سکتی تھیں۔ فوجی تدابیر و تجاویز میں وہ بلاشبہ اپنے سارے مخالفین

سے خواہ وہ افغانستان کے باشندے ہوں یا ہندوستان کے افضل و برتر تھا۔ چاہے وہ فوجی نابغہ ہو یا نہ ہو لیکن اپنے زمانے کے ہندوستانی فوجی سرداروں میں سب سے بہتر اور برتر تھا۔

ایک زبردست فوجی جنرل اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ بابر کو اور چیزوں سے بھی دلچسپی تھی۔ اُسے باغات لگانے اور پودوں کے متعلق نئی نئی معلومات حاصل کرنے کا شوق تھا۔ پھولوں اور باغات سے اس کو جو عشق تھا وہ اس کی ذاتی اور قومی خصوصیت تھی۔ اس کو باغوں کا شہزادہ کہا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف باغوں کے نقشے بنانے اور اُن کی نہال بندی اور اُن کی دیکھ بھال میں دلچسپی لیتا بلکہ خود پھاوڑا لے کر اپنے ہاتھ سے کام کرتا اور پودوں کی روز بروز اور فصل بہ فصل تبدیلی و ترقی کا بغور مطالعہ کرتا۔ اس کے تجربات نے ہندوستان میں خربوزہ اور انگور کی جنس کو بہتر بنانے میں بہت مدد کی۔

بابر کو فنِ معماری میں بھی اسی قدر دلچسپی تھی۔ اس کی ایک خواہش یہ تھی کہ راجپوتانہ کی سرحد پر ایک ٹھنڈی رہائشی عمارت تعمیر کرے۔ اس کی ہدایت کے بموجب آگرہ، سیکری، بیانہ، دھولپور، گوالیار، کول اور دوسرے شہروں میں بھی عمارات تعمیر کی گئیں۔

بابر کو موسیقی کا بھی شوق تھا۔ وہ خود بھی اچھا گانا جانتا تھا لیکن بیشتر موسیقی کی دُھن تیار کرنے کا شوق تھا۔ اس نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ کبھی کبھی اس کے دل میں گیت لکھنے کی خواہش بڑی شدت اختیار کرتی ہے۔ شعر و شراب، ساز و موسیقی، گل و گلزار، نہروں، دریاؤں اور عمارات کا شوق بیشتر ایرانی صحبت اور تمدن کے اثر کا نتیجہ تھا۔ ان امور میں اس کو خاص دسترس حاصل تھی۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ بابر ایک عمدہ فوجی اور ادبی شخصیت کا مالک تھا لیکن وہ ایک اچھا مدبر نہ تھا۔ ممکن ہے کہ یہ خیال اس حد تک صحیح ہو کہ اس نے اپنا کوئی مخصوص مکتبِ سیاست ایجاد نہ کیا اور نہ افغانستان و ہندوستان میں رائج طرزِ حکومت و نظم و نسقِ مملکت میں کسی قسم کی اصلاح کی۔

افغانستان کی سماجی و سیاسی زندگی میں قبائلی احساسات و رسم و رواج

اس قدر گہری جڑیں پکڑ گئے تھے کہ ان میں کسی قسم کی مداخلت یا اُن کو بدلنے کا کوئی تجربہ کرنا خالی از خطر نہ ہوتا۔ اس نے صرف ایک مرتبہ افغانستان میں کچھ اقتصادی تبدیلیاں کرنا چاہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو ایک انقلاب کا سامنا کرنا پڑا اور مجبوراً اپنے قدم واپس ہٹانا پڑے۔

بابر پانی پت کی لڑائی کے بعد صرف تین سال آٹھ ماہ زندہ رہا۔ اس مختصر عرصہ میں اس کو راجپوتوں اور افغانوں کی مشترکہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ عوام ملک میں کسی قسم کی شدت آمیز سیاسی تبدیلی سے خوف زدہ تھے۔ وقت کا تقاضہ تھا کہ عوام کے دلوں میں اطمینان و اعتبار پیدا کیا جائے اور امن و امان برقرار ہو۔ ملک کے قدیمی قوانین، رسم و رواج اور مکتب فکر کی پوری تحقیقات اور ان کا بغور مطالعہ کیے بغیر یہاں کے نظم و نسق مالیات اور زراعتی امور میں کسی قسم کی اصلاح کرنا زبردست غلطی ہوتی۔

شیر شاہ اور اکبر کے برخلاف بابر اس ملک میں کاملاً اجنبی تھا۔ چنانچہ اس کے لیے سب سے زیادہ یہی مناسب تھا کہ وہ ملک کے رسم و رواج، قوانین اور قدیم روایات کا جو اس کے حملے کے وقت موجود تھیں احترام کرے اور اس طرح خود بھی ہر قسم کے بحران سے محفوظ رہے۔

اس سیاست کا مقصد یہ تھا کہ ملک میں امن و امان قائم رہے، لوگوں کے دلوں میں اعتبار پیدا ہو اور ملک کی سماجی و اقتصادی ساخت کی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ان مسائل کا مطالعہ کرنے کے لیے زیادہ وقت مل سکے۔ اس کا یہ فیصلہ کہ ذمہ دار امراء کو عوام کی تالیف قلوب کے لیے روانہ کیا جائے اور ملک کا انتظام مقامی روایات و دستورات کے مطابق وہاں کے افسران اور کارکنان کی مدد سے انجام دیا جائے، بے حد عاقلانہ تھا۔ بابر کی حکومت نے آگرہ اور کابل کے درمیان کا راستہ ہر طرح محفوظ رکھا اور پندرہ پندرہ میل کے فاصلے پر سرائیں تعمیر کرائیں۔ اس نے یہ بھی حکم دیا کہ مختلف مقامات کے درمیان فاصلوں کو ناپا جائے اور ڈاک کا انتظام دوبارہ جاری کیا جائے۔

بابر کی انتظامی لیاقت کا اندازہ لگانے کے لیے اگر ہم ان باتوں کی طرف توجہ دیں جو اس نے انجام نہیں دیں یا انجام نہیں دے سکا تو یہ طرز فکر غلط ہوگا۔ صحیح فیصلہ کرنے کے لیے ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے کیا کیا کام انجام دیے یا وہ کیا کچھ کرنا چاہتا تھا۔ سب سے

پہلے اس کی حکومت کے کھوئے ہوئے وقار کو جو کہ کم از کم فیروز تغلق کی موت کے بعد ہاتھ سے نکل چکا تھا از سر نو حاصل کرنا تھا۔

بلبن، علاء الدین اور محمد بن تغلق سے لوگ ڈرتے زیادہ تھے اور محبت کم کرتے تھے۔ فیروز تغلق سے عوام کو اُنسیت تھی اور وہ اس کا احترام کرتے تھے لیکن اس میں خوف کا عنصر شامل نہ تھا۔ افغان سردار حاکم مطلق کے نظریے کو قبول کرنے کو تیار نہ تھے لیکن جہاں تک بابر کا تعلق ہے لوگ اس سے ڈرتے بھی تھے اور اس کا احترام بھی کرتے تھے۔ ایک قائد کی حیثیت سے اس کو لوگوں کا اعتبار و اعتماد حاصل تھا اور ایک حکمراں کی حیثیت سے وہ عوام کا محبوب تھا۔ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ امرا سے فرداً فرداً اور بحیثیت مجموعی کس طرح نبٹا جا سکتا ہے۔

بابر میں تحمل، انسانی ہمدردی اور عفو کے ساتھ ساتھ سختی اور عمل کی خصوصیات بھی شامل تھیں۔ کوئی شخص موت کا خطرہ مول لیے بغیر اس کے احکامات کی خلاف ورزی کی ہمت نہ کر سکتا تھا۔ لڑائی کے میدان میں وہ کبھی کبھی اس قدر سختی برتتا کہ لوگ متحیر ہو جاتے۔ شاید یہ خصوصیت اس نے اپنے ترک اور منگول اجداد سے ورثے میں پائی تھی۔ صلح کے بعد وہ اپنی رعایا کے لیے ایک رحمدل، انصاف پسند، ہمدرد اور محافظ کی حیثیت رکھتا اور بلاتخصیص نسل و مذہب اس فرض کو انجام دیتا۔

حالانکہ بابر اپنے مذہب، مسلم علماء، شیوخ اور فقہا کا بڑا احترام کرتا تھا لیکن اس نے اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کو کبھی ان لوگوں کے محدود و متعصبانہ مذہبی مشوروں سے متاثر نہ ہونے دیا۔ اس کے دربار میں مذہبی یا فرقہ وارانہ اختلاف و کش مکش بہت کم دیکھنے میں آتی۔ وہ خود سنی مسلمان تھا لیکن ایسے سوقیانہ تعصب کی رو میں کبھی نہ بہا جس نے اس کے عہد کے ایران و توران کی تاریخ کو داغدار بنا دیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ اس نے ہندوؤں کو کافر اور افغانوں کو ناقابل اعتماد بیان کیا ہے لیکن اس کے باوجود اس کا رویہ ان لوگوں کے سرداروں اور عوام کے ساتھ شریفانہ، مہذبانہ اور دوستانہ تھا۔ اس نے کم از کم دو بار مندرجہ بالا وجوہ کی بنا پر علم جہاد بلند کیا لیکن اس کا رویہ میدان جنگ کے معمولی اصول و قوانین کے عین مطابق تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ایک موقع پر اس نے رسمی طور پر مسلمانوں کو باج د

تمغا کی ادائیگی سے معاف کر دیا تھا لیکن یہ بات پوری طرح واضح نہیں کہ آیا یہ حکم کبھی عمل میں بھی آیا یا نہیں۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ اگر وہ چاہتا بھی تو اس قسم کا حکم نافذ نہ کر سکتا۔ اِدھر اُدھر کچھ جوشیلے افراد نے دو ایک مندروں کو نقصان پہنچایا لیکن اس قسم کے واقعات زبردست سیاسی انقلاب کے باوجود کم ہی رونما ہوئے اور یہ بات انتہائی تعجب انگیز ہے۔

اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ بابر کے عہد میں غیر مذہب والوں پر ظلم و ستم کرنا حکومت کی سیاست کا ایک جزو تھا یا اس سلسلے میں ان لوگوں کو بابر کی اخلاقی حمایت حاصل تھی۔ اگر اس قسم کے واقعات کا ان واقعات سے مقابلہ کیا جائے جو کہ شرق نزدیک و مشرق وسطیٰ میں شیعہ اور سنیوں کے درمیان ہو رہے تھے یا مغربی ممالک میں مختلف مذہبی فرقوں کے درمیان رونما ہوئے تو یہ واقعات بہت ہی ناچیز نظر آئیں گے۔

بابر نے متعدد ریاستوں کے درمیان نام نہاد توازنِ قوت کو ختم کرکے ہندوستان کے قدیم نقشے کو بالکل ہی منسوخ کر دیا اور ایک ایسی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو کہ نئی روایات پر مبنی تھی۔

سولھویں صدی عیسوی میں جب کہ بادشاہت ہی وہ تنہا طرزِ حکومت تھی جس سے دنیا والے آگاہ تھے اس وقت ایک متحدہ ہندوستان صرف شاہی جھنڈے ہی کے نیچے وجود میں آ سکتا تھا۔

بابر نے لودیوں اور راجپوتوں کی برتری کا خاتمہ کرکے ایک جدید طرز کی سلطنت کی تعمیر کا راستہ صاف کر دیا جس کو اس کے اعلیٰ مرتبت منگول اجداد قائم کرنا چاہتے تھے۔ دراصل یہ ایک عملی اور سیاسی طرز کی حکومت تھی۔ بابر نے جن اصولوں کے ماتحت اپنی مرکزی حکومت ترتیب دی ان کے بموجب وہ یہ نہ چاہتا تھا کہ حکومت کے سب شعبوں کا اختیار شہنشاہ کے ہاتھوں میں ہو اور وزرار محض کٹھ پتلی ہو کر رہ جائیں۔ اس بات پر شیر شاہ جیسے مسلم الثبوت استاد نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مغل بادشاہ نے سارے اختیارات اپنے وزیروں کے ہاتھوں میں سونپ دیے تھے۔ بابر جس اصول پر کام کرنا چاہتا تھا اس کے مطابق شہنشاہ کا فرض تھا کہ وہ یہ دیکھے کہ وزرار اپنے اپنے کاموں کو دیانت داری، ذمہ داری، ہوشیاری اور پوری محنت کے ساتھ انجام دیتے

ہیں یا نہیں۔ جب تک ان کی کارروائیاں حکومت، عوام یا شہنشاہ کی عام اصول کے مفاد کے خلاف نہ ہوتیں ان کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق کام کریں اور نتیجتاً جو شہرت یا بدنامی حاصل ہو اسے برداشت کریں۔ جب یہ معلوم ہوتا کہ وزیر غلطی کر رہا ہے یا ناکام ہو رہا ہے تو شہنشاہ محض غلطی کی اصلاح کرنے کے لیے مداخلت کرتا اور اگر ضروری سمجھتا تو وزیر کو تنبیہہ کرنے یا برطرف کرنے سے بھی گریز نہ کرتا۔ بشکل دیگر اگر ضرورت ہوتی تو وزیر کے ہاتھوں کو زیادہ مضبوط بنانے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ شہنشاہ حکومت کے منصب اعلیٰ کا کام انجام دیتا اور یہ کام وہ اسی وقت انجام دے سکتا تھا جب وہ خود کو حکومت کے اجرائیہ، مالیہ اور عدلیہ کے محکموں سے دور رکھتا۔

اس کا کام حکومت کرنا نہ تھا بلکہ یہ دیکھنا تھا کہ حکومت ٹھیک طرح چلتی رہے اور عوام کی نگاہیں اس کی طرف ہمدردی اور انصاف کے لیے اٹھیں۔ خواہ رعایا یہ انصاف حکومت کے خلاف ہی کیوں نہ مانگتی ہو۔ یہی وہ اصول تھا جس کی اس کے مشہور و معروف پوتے اکبر نے پیروی کی۔

بابر ایک ماہر موقع شناس تھا اور جب حکمتِ عملی سے کام نہ چلتا تو پھر زور و قوت کا استعمال کرتا۔ اس نے جس طرح ہندوستانی اور افغان امرا اور بنگال و بہار کے حکمرانوں سے برتاؤ کیا۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس میں زبردست تحمل، حوصلہ مندی، سلیقہ شعاری اور ہوشیاری کی صفات موجود تھیں۔ اگر اس میں یہ خصوصیات نہ ہوتیں تو وہ ایسے مختلف النوع آمادۂ پیکار نسلی اور طبقاتی عناصر کو۔ جو کہ اس کے دربار میں موجود تھے کیوں کر قبضے میں رکھ سکتا تھا۔

بابر ہندوستان کی تاریخ پر بہت اثر انداز ہوا۔ شمالی ہندوستان کی سیاسی حالت کو مکمل طور پر بدل کر اس نے ہندوستان کو ایک مرتبہ پھر مغربی اور وسط ایشیا سے جا ملایا۔ کشن خاندان کی حکومت کے بعد سے افغانستان ہندوستان کا حصہ نہ رہا تھا۔ ترکی عہد حکومت کے سارے ابتدائی دور میں ہندوستان کی سرحدات کمزور رہیں کیونکہ افغانستان کے فاتح کو ہمیشہ یہ حرص دامنگیر رہتی کہ وہ دریائے سندھ کو عبور کر کے کم از کم پنجاب پر قابض ہو جائے۔ اب جب کہ بابر نے افغانستان و ہندوستان دونوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا اور آگرے کو پایۂ تخت بنالیا تو ہندوستان کی شمال

مغربی سرحد کی سیاست اور اس کی حفاظت نے بھی ایک نئی صورت اختیار کر لی۔ اس علاقے کی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی تجارتی اور ثقافتی اہمیت کو بھی کسی طرح کم نہ سمجھنا چاہیے۔

بابر اپنے ساتھ جو طریقۂ جنگ لایا اس نے ہندوستان میں جنگ کا طرز ہی بدل دیا۔ ترک دورِ حکومت کی ابتدا میں اور یوروپ کے باشندوں کے ہندوستان میں بندوقوں کے استعمال سے قبل اس ملک میں ایک قسم کے آتشیں اسلحے استعمال ہوتے تھے لیکن پانی پت کی جنگ سے پہلے نہ تو ہندوستان کے عام حکمراں اور نہ شمالی ہندوستان کے حکمراں اس بات سے آگاہ تھے کہ توپ خانہ جنگ میں ایک فیصلہ کن ہتھیار کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس جنگ نے ہندوستان کے حکمرانوں کے دل و دماغ پر یہ بات ہمیشہ کے لیے ثبت کردی کہ توپ خانہ اور سواروں کے ماہرانہ اشتراک سے ایک ایسی فوج پر جو کہ تعداد میں کہیں زیادہ ہو فتح حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس نئے اسلحے کی ایجاد و استعمال نے قلعوں کی اہمیت کو آہستہ آہستہ کم کر دیا اور میدانی علاقوں میں پرانے طریقے کا جاگیردارانہ نظام ختم ہونا شروع ہو گیا۔

چتوڑ، رنتھمبور، مانڈو، کالنجر اور چنار جیسے قلعے جو ناقابلِ تسخیر تصور کیے جاتے تھے مضبوط و پُراثر توپ خانے کے سامنے زیادہ عرصے تک اپنا استحکام قائم نہ رکھ سکے۔ چنانچہ نئی نئی قسم کے آتشیں اسلحے کی ایجاد اور ان کا استعمال فوجی، اجتماعی و اقتصادی نقطۂ نظر سے بہت اہم تھا۔

مغل سلطنت کا وقار نہ صرف فوجی طاقت پر منحصر تھا بلکہ غیر مسلم رعایا اور خاص طور پر راجپوتوں کے ساتھ مذہبی رواداری کو بھی بڑا دخل تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس سیاست کا بیج اکبر کے عظیم و نامور دادا نے بویا تھا تو اس بات سے اکبر کی حقیقی عظمت کو کسی طرح دھکا نہ پہنچے گا۔

بابر نے ایک جدید سلطنت کا تصور قائم کیا جس کی بنیاد مذہبی یا طبقاتی تفریق کے بجائے سیاسی نظریات پر تھی۔ اس نے سلطنت میں بادشاہ کے مقام کا تعین کیا۔ راجپوتوں کے مسئلے کو اتحاد اور ازدواجی تعلقات کے ذریعے حل کیا

اور دربار کو تمدنی و ثقافتی خصوصیات کا حامل بنایا۔ اس طرح بابر نے نہ صرف ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کا ڈھنگ سکھایا بلکہ اس سلطنت کی خصوصیات اور اس کی رہنمائی کے اصولوں کو بھی واضح کر دیا۔ اس نے ہندوستان میں ایک نئے خاندان اور نئی روایات کی بنیاد رکھی جس کی مثال کسی اور ملک کی تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکے گی۔

بابر کی زندگی کے سلسلے وار تاریخی واقعات

1	بابر کی پیدائش		1483
2	بابر کی تخت نشینی		1494
3	فتح سمرقند		1497
4	شیبانی خاں کا سمرقند کو دوبارہ چھین لینا۔		1501
5	فرغنہ کا ہاتھ سے نکلنا		1503
6	بابر کی فتح کابل	اکتوبر	1504
7	بابر کا ملتان کی طرف کوچ		1504
8	بابر بادشاہ کا خطاب اختیار کرتا ہے ۔		1507-8
9	ہمایوں کی پیدائش		[illegible]
10	جنگ مرو	دسمبر	1510
11	کامران کی پیدائش		[illegible]
12	بابر کی سمرقند پر قبضہ جمائے رکھنے کی آخری کوشش		1511
13	جنگ غزدوان	نومبر	1512
14	جنگ غلدران		3514
15	عسکری کی پیدائش		1516
16	ہندال کی پیدائش		1519
17	بابر کا ہندوستان میں ورود		1519
18	بابر کا بھیرا و سیالکوٹ پر حملہ		1520
19	بابر کی فتح قندھار		1522
20	بابر کا لاہور و سرہند پر حملہ		1523
21	جنگ پانی پت	اپریل	1526

22	جنگ کانوا	1527
23	فتح چندیری	1528
24	جنگ جام	1528 ستمبر
25	جنگ قنوج	1529
26	جنگ گھاگرا	1529
27	ہمایوں کی بدخشاں سے واپسی	1529 جون
28	ہمایوں کی علالت	1530 مارچ
29	بابر کی علالت	1530 اپریل
30	بابر کی علالت کا شدت اختیار کرنا	1530 جولائی
31	بابر کی وفات	1530 26 دسمبر

بابر کے متعلق وسیع مطالعے کے لیے مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیں

ترکی:

بابر = تزک بابری۔ انگریزی ترجمہ اے۔ ایس۔ بیورج

فارسی:

عبدالرحیم = تزک بابری کا فارسی ترجمہ۔ انگریزی ترجمہ جے لیڈن وڈ بلیو ارسکین

حیدر دوغلات = تاریخ رشیدی۔ انگریزی ترجمہ۔ این۔ الیاس وڈینیسن راس

گلبدن بیگم = ہمایوں نامہ۔ انگریزی ترجمہ۔ اے۔ ایس۔ بیورج

ابوالفضل = اکبر نامہ جلد اوّل۔ انگریزی ترجمہ۔ ایچ۔ بیورج

نظام الدین = طبقات اکبری۔ انگریزی ترجمہ۔ بی۔ ڈے

محمد قاسم فرشتہ = گلشن ابراہیم۔ انگریزی ترجمہ۔ لیفٹیننٹ کرنل جے۔ برگز

بدایوں = منتخب التواریخ۔ جلد اوّل K. Tr. Ranking

انگریزی:

Erskine: History of India - Vol.I

Rushbrook Williams: An Empire Builder of the 16th Century

Elliot and Dowson: History of India as told by its own Historians. - Relevant Volume

اُردو:

ذکاء اللہ = تاریخ ہندوستان جلد سوم

هندی:

اوجھا جی = اودے پور کا اتہاس

اس کتاب کا اُردو ترجمہ ترقی اُردو بیورو، وزارتِ تعلیم اور ثقافت نے شائع کر دیا ہے۔

باب 3

ہمایوں 1531-1556

بابر نے چار لڑکے اور تین لڑکیاں چھوڑیں۔ سب سے بڑا لڑکا ہمایوں تھا جو 6 مارچ 1508ء کو ماہم سلطانہ کے بطن سے پیدا ہوا۔ ماہم سلطانہ ہرات کے حکمران حسین بایقرا کے خاندان سے تھی۔ دوسرے دو لڑکے کامران وعسکری بابر کی دوسری بیوی گل رُخ بیگم کے بطن سے تھے۔ چوتھے لڑکے ہندال کی والدہ کا نام دلدار آغاچی تھا۔ ہمایوں کو باپ کی زندگی ہی میں کئی ایسے مواقع میسر آئے جن سے فائدہ اٹھا کر وہ فوجی اور مملکت داری کے تجربے حاصل کر سکا۔

ہمایوں پانی پت اور کنوا کی جنگوں میں شریک ہوا۔ اس کے علاوہ مشرق میں باغی افغان سرداروں کی سرکوبی کے لیے جو کامیاب مہم بھیجی گئی اس کا سردار بھی ہمایوں ہی تھا۔

ان مہموں میں ہمایوں نے اپنی قوتِ فیصلہ، ارادے کی مضبوطی اور سرعتِ عمل کا ثبوت دیا جس کی وجہ سے اس کا باپ اس سے بہت متاثر ہوا۔ بابر نے دو بار بدخشاں کی حکومت اس کے سپرد کی۔ (پہلی مرتبہ 1520ء سے 1525ء تک اور دوسری مرتبہ 1527ء سے 1529ء تک) اس زمانے میں بدخشاں ازبکوں کے مقابلے میں جو کہ ایک جنگجو اور ناقابلِ تسخیر قوم تھی سدِ فاصل سمجھا جاتا تھا

ہمایوں کے دورِ حکومت میں بدخشاں میں کوئی خاص مشکلات پیش نہ آئیں۔ جب ہمایوں بدخشاں چھوڑ کر عازمِ ہند ہوا تو وہاں کے باشندوں نے اس سے استدعا کی کہ

ان کو ازبکوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر ہندوستان نہ جائے۔ یہ بات اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ ہمایوں ایک لائق حکمراں سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستان میں بھی کچھ عرصے کے لیے وہ ایک بہت ہی شورش پسند علاقہ سنبھل کا حاکم رہا۔

ہمایوں عربی، ترکی اور فارسی زبانوں کا ماہر تھا۔ وہ مہذب، ہوشیار، سنجیدہ، مہربان، دلیر، سخی اور فیاض شخص تھا۔ اس میں اگر کوئی کمی تھی تو یہ کہ وہ سیاسی چال بازیوں سے مبرّا اور بے اصولے پن و جارحیت سے دور رہتا تھا۔ ہمایوں امن و آشتی کو جنگ کے مقابلے میں زیادہ پسند کرتا تھا اور اس کا مزاج صوفیانہ تھا۔ اس کا باپ بابر جو کہ آدمی کی شناخت میں ماہر تھا اس سے محبت کرتا اور اس پر پورا بھروسہ کرتا تھا۔

ہمایوں 29 دسمبر 1530ء کو تیئس سال کی عمر میں، شہر آگرہ میں تخت نشین ہوا اس موقع پر عوام نے خوشیاں منائیں اور ایک کشتی بھر سونا تقسیم کیا گیا۔ امرائے دولت اور افسرانِ حکومت نے غیر مشروط وفاداری کا حلف اٹھایا اور اس کے عوض ہمایوں نے اُن کی گذشتہ کارروائیوں کی جانچ پڑتال کیے بغیر اُن کو اپنے اپنے عہدوں پر مستقل کردیا۔

بابر نے ہمایوں کے لیے ایک وسیع مملکت وراثت میں چھوڑی جو کہ دریائے آمو سے بہار تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے مغربی علاقے قندز، بدخشاں، کابل، غزنی اور قندھار تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہندوستان میں ملتان، پنجاب، اترپردیش اور بہار کا کچھ علاقہ اس کی سلطنت میں شامل تھا۔ بیانہ، رنتھنبور، گوالیار، الور اور چندیری اس کی سلطنت اور راجپوتانہ و مالوہ کی ریاستوں کے درمیان ایک غیر مستقل سرحد کی حیثیت رکھتے تھے۔

بابر کی سلطنت کمزور بنیادوں پر کھڑی تھی۔ نہ تو اس کو اتنا وقت ملا اور نہ شاید اس نے یہ چاہا کہ سوائے چند علاقوں کے ایک نیا نظامِ حکومت قائم کرے۔ سلطنت امراء اور جاگیرداروں کے درمیان بٹی ہوئی تھی۔ وہ لوگ اس بات کے ذمے دار تھے کہ اپنے اپنے علاقوں میں امن و امان قائم رکھیں اور حسبِ ضرورت فوجی خدمات انجام دیں۔ اس کے علاوہ ان کو شاہی خزانے میں ایک مقررہ رقم بحیثیت خراج کے ادا کرنی پڑتی۔ یہ قیاس بے جا نہ ہوگا کہ افسرانِ حکومت عوام کے مقامی رسم و رواج اور نظام میں جو کہ لودیوں کے آخری دور سے چلا آرہا تھا زیادہ مداخلت نہ کرتے تھے۔ یہ بھی گمان

ہوتا ہے کہ مغلوں اور افغانوں کی دشمن فوجوں کی متواتر نقل وحرکت کے سبب ہندوستان کی رعایا ایک زبردست سیاسی خلفشار اور اقتصادی پریشانی میں مبتلا تھی۔

مغل فوج کی تشکیل بھی کچھ زیادہ تسلی بخش طور پر نہ ہوئی تھی۔ اس میں ازبک مغل، ترک، ایرانی، افغانی اور ہندوستانی سب ہی شامل تھے۔ عموماً ان کے سردار اپنے اپنے قبیلوں کے رہنما ہوتے تھے۔ ان مختلف النسل عناصر کے سبب ان میں ذاتی اور قبائلی رنجشیں پیدا ہوگئیں اور فوج میں اتحاد و اتفاق کا جذبہ جو کہ ایک عمدہ فوج کی شیرازہ بندی کے لیے اشد ضروری ہے پیدا نہ ہو سکا۔

چنانچہ یہ مختلف النسل فوج جس میں اتفاق و یکجہتی کا فقدان تھا۔ جنگی مقاصد کے لیے موزوں نہ تھی۔ ان عوامل نے فوج میں ایک مستقل تناؤ پیدا کر دیا جو حکومت کے لیے کسی وقت بھی نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس کی واضح مثالیں مرزاؤں اور اُن کے ہمراہیوں کا طرزِ عمل اور وہ متضاد مشورے تھے جو کہ مغل اور افغان سرداروں نے ہمایوں کو چنار میں دیئے۔

شورش پسند امرا سے کہیں زیادہ خطرناک وہ شہزادے تھے جن کی رگوں میں شاہی خون جوش زن تھا۔ ہمایوں کے تین بھائی اور تھے۔ ان میں سب سے زیادہ حریص ولالچی اور جاہ طلب کامران تھا جس میں بلاشک وشبہ نظم ونسق اور جنگ کی کچھ صلاحیتیں بھی تھیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اپنی تند مزاجی کے باوجود ایک کامیاب حکمراں ثابت ہوتا۔

ان شہزادوں کے اردگرد خود غرض لوگوں کا ایک گروہ جمع رہتا جو ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے اور اپنے شخصی اغراض کے پورا کرنے کے لیے حکومت کے مفاد کو بھی قربان کرنے سے نہ چوکتے۔ ان تین بھائیوں کے علاوہ سلطان حسین بایقرا کے پوتے و نواسے بھی تھے جو مرزا برادران کہلاتے۔ ان کی رگوں میں خالص تیموری خون تھا۔ یہ لوگ بھی کسی طرح اپنے حقوق بابر کی اولاد کے حقوق سے کم نہ سمجھتے تھے۔ ان سب میں محمد زمان مرزا جو بابر کی بیٹی معصومہ بیگم کا شوہر تھا قابلِ ذکر ہے۔ اس کو پہلے تو بہار کی حکومت اور شاہی نشان پیش کیا گیا لیکن پھر اس کا تقرر جونپور کے حکمراں کی حیثیت سے کر دیا گیا۔ جونپور اس وقت سلطنت کا ایک سرحدی صوبہ تھا۔

محمد زمان کے علاوہ محمد سلطان مرزا قابلِ ذکر ہے۔ وہ سلطان حسین بایقرا کا نواسا تھا۔ ان مرزاؤں کی اپنی کوئی جاگیر نہ تھی اور اسی وجہ سے انھوں نے ہندوستان کو اپنی سیاسی جاہ طلبی اور ہوس ملک گیری کی تکمیل کے لیے جولانگاہ بنایا۔

ہمایوں کے لیے جو کہ بیرونی خطروں سے گھرا ہوا تھا یہ اندرونی مشکلات بہت ہی زیادہ نقصان دہ ثابت ہوئیں۔ باوجودیکہ بابر نے پانی پت اور گھاگھرا کے مقامات پر دو زبردست فتوحات حاصل کیں لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان جنگوں کے نتیجے میں ہندوستان سے افغانوں کی حکومت کا پوری طرح قلع قمع ہوگیا۔ گو افغان ان جنگوں میں شکست کھا جانے کی وجہ سے پست ہمت ہو گئے تھے لیکن ان کی بہت بڑی تعداد مغلوں کی ماتحتی قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ انھوں نے محمود خاں لودی کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلیا اور بیبن' بایزید اور معروف فرملی جیسے بہادر اور لائق سرداروں کے ماتحت مغلوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے۔ وہ ایک مناسب موقع کی تلاش میں تھے تاکہ اپنی کھوئی ہوئی عزت اور حکومت دوبارہ حاصل کرسکیں۔

جب بھی ان افغانوں کو زیادہ دبایا جاتا یہ لوگ بہار اور بنگال میں پناہ لیتے۔ بنگال اور گجرات کے حکمرانوں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں۔ یہ بات بھی پوشیدہ نہ تھی کہ بنگال و گجرات کے حکمراں مغلوں کو ملک سے باہر نکالنے کے لیے صلاح و مشورہ کررہے تھے۔

گجرات کا حکمراں بہادر شاہ ایک جوان اولوالعزم اور جنگ جو شہزادہ تھا اس کا ملک دولت مند اور اس کے وسائل بہت وسیع تھے۔ ہندوستان بھر میں اس کے پاس سب سے عمدہ اسلحہ خانہ تھا اور اس کے افسران اپنے وقت کے بہترین ماہرفن مانے جاتے تھے۔ اس وقت اتفاق سے حالات بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ گو اس کے تعلقات پرتگالیوں کے ساتھ اچھے نہ تھے لیکن خشکی پر اس کو ان سے کوئی خطرہ نہ تھا اور نہ اس کی پوزیشن ساحل پر بھی کسی طرح پرتگالیوں کے مقابلے میں کمزور تھی۔ اس کی طاقت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ گجرات کے دو بڑے حریف مالوہ اور میواڑ اس سے خائف رہتے۔ یہ دونوں ریاستیں اس کے مقابلے میں کمزور تھیں اور اس کے حملے کی تاب نہ لا سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ برار اور خاندیش

کے حکمران بھی اس کی نظرِ عنایت کے خواہاں تھے ۔ اس نے احمد نگر کو فتح کر لیا اور 1529 میں بیدر اور احمد نگر کے حکمرانوں کو مجبور کیا کہ اس کے نام کا خطبہ پڑھیں اور سکوں پر بھی اس کا نام کندہ کرائیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ میدان میں کوئی اس کا حریف و مدِمقابل در دکن، راجپوتانہ اور مالوہ کے حکمران اس سے خائف رہتے ۔

یہ قدرتی بات تھی کہ افغان سردار جن کو مغل حملہ آوروں شمال سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا ۔ ایک ایسے اولوالعزم جنگجو اور بااثر حکمراں کے گرد جمع ہوں ۔ چنانچہ فتح خاں، قطب خاں، عمر خاں، عالم خاں اور دوسرے لودی سردار اس کے دربار میں حاضر ہوئے ۔ بہادر شاہ نے ان کو عہدے اور جاگیریں دے کر نوازا ، ان کو خوش آمدید کہا اور ہر ممکن مدد کا وعدہ کیا ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمایوں کے مقابلے میں بہادر شاہ ہی دہلی کے تاج و تخت کا ایک قوی مدِمقابل تھا ۔ وہ شمالی ہند کے سیاسی معاملات میں سرپنچ کی حیثیت رکھتا تھا اور اگر وہ ہندوستان کا شہنشاہ بالاستحقاق نہ تھا تو بھی ایک طرح سے حاکم بالفعل ضرور تھا ۔

ان حالات نے ہمایوں کو شش و پنج میں ڈال دیا ۔ پرانے ترک و منگول رسم و رواج کے مطابق بابر کی سلطنت اس کے بیٹوں میں تقسیم ہونا چاہیے تھی ۔ خود بابر نے بھی اس بات کے خوف سے کہ کہیں پرانے رسم و رواج کی پابندی نہ کرنے کے نتائج خطرناک ہوں ہمایوں کو بڑی نرمی سے یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ مہربانی سخاوت اور احترام سے پیش آئے ۔ اگر ہمایوں اس بات کی کوشش کرتا کہ وہ ساری سلطنت پر خود ہی قابض ہو جائے تو نہ صرف اس کو اپنے بھائیوں کا مقابلہ کرنا پڑتا بلکہ امرائے دربار بھی اس کو یہی مشورہ دیتے کہ قدیم رسوم کو ترک نہ کرے ۔

چنانچہ خانہ جنگی کو روکنے کی خاطر اس کو سلطنت کی عادلانہ تقسیم کرنا پڑی ۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو سلطنتِ مغلیہ جو کہ ابھی اپنے پیروں پر بھی کھڑی نہ ہو پائی تھی قبل اس کے کہ کوئی بیرونی خطرہ اس کو نقصان پہنچاتا آپس کی خانہ جنگی کا شکار ہو جاتی ۔ لہذا

اس نے یہ کام محض اپنی سخاوت یا باپ کی نصیحت کو ماننے کی خاطر نہیں بلکہ اشد ضرورت اور مصلحتِ وقت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انجام دیا۔

اس کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار بھی نہ تھا۔ بھائیوں کی رضا اور ہمدردی حاصل کرنا اور ان کی مدد سے سلطنت کی حفاظت کی خاطر مشترکہ کوشش کرنا ہمایوں کی اپنی بھلائی کی بات تھی۔ اس کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ اپنے سب بھائیوں اور خاص طور سے کامران کے حصّے کا تصفیہ کر دیتا لیکن تخت نشینی کے کچھ عرصے بعد تک وہ اس بات کا فیصلہ نہ کر پایا۔

بہرحال اس کو اپنی مرضی کے خلاف یہ فیصلہ کرنا ہی پڑا کہ وہ سلطنت میں بھائیوں کو بھی شریک کرلے۔ گو اصولاً وہ بابر کے تخت شاہی کا وارث و جانشین تھا اور اقتدار مملکت میں کوئی اس کا سہیم و شریک نہ تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ سلطنت کے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ کامران کو کابل اور بدخشاں کا علاقہ پہلے ہی مل چکا تھا۔ عسکری کو جس کی عمر ابھی پندرہ سال ہی تھی سنبھل کا صوبہ ملا اور الور تیرہ سالہ ہندال کے حصّے میں آیا۔ یہ تقسیم کامران کو جو کہ اکیس سالہ جوان تھا پسند نہ آئی وہ جانتا تھا کہ افغانستان کے امرا اور سردار اس کی پشت پر ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنی طاقت سے بھی آگاہ تھا۔

بابر کا یہ ہمیشہ قاعدہ رہا کہ اگر کسی چیز کی تقسیم کرتا اور ہمایوں کو اس کے چھ حصے ملتے تو کامران کو پانچ حصے دیتا۔ بابر کی اس روش نے بھی کامران جیسے اولوالعزم شہزادے کو اس بات کے لیے ابھارا کہ وہ باپ کی چھوڑی ہوئی سلطنت میں نسبتاً بڑے حصے کا حقدار ہے۔ ان تمام حالات کے باوجود ہمایوں نے فی الحال کوئی قدم نہ اٹھایا۔

کالنجر کا تاریخی قلعہ (جو کہ اترپردیش کے ضلع باندا میں ہے) کوہ وندھیاچل کی ایک علیحدہ پہاڑی پر سینکڑوں فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور اس تک پہنچنے کا راستہ بہت دشوار گزار ہے۔ یہ قلعہ ترک دورِ حکومت کے آغاز ہی سے ترکوں اور راجپوتوں کے درمیان باعثِ نزاع بنا ہوا تھا۔ حملہ آوروں نے کئی مرتبہ فتح کیا اور ہاتھ سے نکل بھی گیا۔ ہمایوں کو بھی شہزادگی کے زمانے میں اس قلعہ کو فتح کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا لیکن اس نے راجہ سے صلح کر لی تھی۔ اپنی تخت نشینی کے سات آٹھ مہینے بعد (اگست 1531ء میں) اسے راجہ پرتاپ رودر دیو پر جو کالپی کے راجہ کو دھمکا رہا تھا حملہ کرنا پڑا۔

کالپی، مالوہ اور جمنا کی وادی کے علاقوں کے درمیان ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا تھا اور اب جب کہ بہادر شاہ نے 1531ء میں مالوہ فتح کر لیا تو یہ قلعہ ہر ممکن حملے کو روکنے کے لیے ایک رکاوٹ کی حیثیت سے بہت اہم ہو گیا۔

ہمایوں کو راجہ کے رویئے اور نیت پر شک ہوا اور اس نے راجہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ کالنجر کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ ہمایوں کے توپ خانے نے قلعے کی فصیل پر گولہ باری شروع کر دی۔ اس محاصرے کو ابھی مشکل سے ایک ماہ ہوا تھا کہ یہ پریشان کن خبر ملی کہ ابراہیم لودی کے بھائی محمود لودی نے جونپور پر قبضہ کر لیا اور مغل افسران کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔

اس وحشت ناک خبر کو سن کر ہمایوں نے راجہ پرتاپ رودرا کے ساتھ کچھ غیر واضح شرائط پر صلح کر لی اور تیزی سے چنار کی طرف روانہ ہو گیا۔

تاج خاں سارنگ خانی سلطان سکندر لودی کے خاص امرائے افغانی میں شمار ہوتا تھا اور سلطان نے قلعہ چنار کی کمان اور حکومت اس کے سپرد کر رکھی تھی۔ تاج خاں نے اس خیال سے کہ قلعہ ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا ابراہیم لودی کی اطاعت سے انکار کر کے اپنی آزاد حکومت کا اعلان کر دیا۔

جب محمود لودی نے قلعہ فتح کرنا چاہا تو تاج خاں نے سخت مقابلہ کیا اور ساتھ ہی ساتھ بابر کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور اس کو اپنی اور اپنے بیٹوں کی وفاداری کی پیشکش کی۔ یہ واقعہ مارچ 1529ء کا ہے۔ جون کے مہینے میں بابر نے یہ حکم دیا کہ تاج خاں قلعہ کو جنید برلاس نامی سردار کے حوالے کر دے تاکہ یہ قلعہ بہار کی دوسری لائن کے طور پر استعمال کیا جا سکے اور اپنی قلعہ بندی کے سلسلے کو مکمل کر سکے۔ غالباً قلعہ کے قبضے کی تبدیلی عمل میں نہ آئی۔

1530ء میں تاج خاں یا تو قتل ہو گیا یا اپنی موت مر گیا۔ شیر خاں نے فریب، رشوت اور دغابازی سے قلعہ اور تاج خاں کی بیوہ دونوں پر قبضہ کر لیا۔ شیر خاں چونکہ مغل شہنشاہ کا حامی و مددگار مانا جاتا تھا اور بابر نے پہلے بھی قلعہ پر قبضہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اس لیے ہمایوں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ اس قلعہ پر قابض ہو جائے۔ اس قلعہ کی اہمیت میں کوئی شک و شبہ نہ تھا۔ یہ قلعہ آگرہ و مشرقی علاقوں

کے درمیان کے سارے زمینی و دریائی راستوں کی گزرگاہ تھا۔ یہ مشرقی ہندوستان کا دروازہ کہلاتا تھا۔ ہمایوں نے اس قلعہ کا محاصرہ کر لیا لیکن اس محاصرے کا کوئی اثر نہ تو قلعہ پر ہوا اور نہ افغان فوج کے بلند حوصلے میں کوئی فرق پڑا۔ چونکہ افغانی فتنہ روز بروز خطرناک صورت اختیار کرتا جا رہا تھا ہمایوں نے یہ مناسب نہ جانا کہ اس محاصرے پر مزید وقت ضائع کرے چنانچہ اس نے محاصرہ اٹھا لیا اور واپس چلا گیا۔

محمود لودی اور اس کے ساتھیوں نے پہلے تو بہار پر قبضہ جمایا اور پھر وہ لوگ وہاں سے ایک بڑی فوج جمع کر کے مغل سرحدات کی طرف بڑھے اور جونپور سے مغلوں کو مار بھگایا۔ اس کے بعد اودھ میں اپنا اقتدار قائم کرنے لگا۔ ہمایوں اس کو پیچھے دھکیلنا چاہتا تھا لیکن بارش کے شروع ہونے اور پنجاب میں کامراں کی سرگرمیوں کی خبر سن کر اس نے یہ مہم یونہی چھوڑ دی اور اپنے بھائی سے نبٹنے کے لیے اپنی فوج کو مضبوط کرنے کی خاطر تیزی سے آگرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہمایوں کی ان مصروفیات سے فائدہ اٹھا کر کامران نے افغانستان کے کاروبار کو اپنے چھوٹے بھائی عسکری کے سپرد کیا اور خود پنجاب کی طرف بڑھا۔ اس نے ملتان اور لاہور فتح کر لیا اور ہمایوں کے افسروں کو ہٹا کر اپنے افسر مقرر کر دیے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہمایوں کو بہت ہی عاجزانہ اور پُر احترام خطوط لکھتا رہا جن میں اپنی وفاداری جتاتا اور اس سے یہ مطالبہ کرتا کہ ملتان اور پنجاب کے صوبے اس کو عطا کر دیے جائیں۔

جب ہمایوں نے دیکھا کہ کامران حقیقت میں ان صوبوں پر قابض ہو چکا ہے تو اس نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے بھائی کی درخواست کو قبول کرے کیوں کہ اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی اور چارہ ہی نہ تھا۔ اس طرح اس نے ہاری ہوئی بازی کو اچھی طرح سنبھال لیا اور اپنے بھائی کو بھی ممنون احسان بنا لیا۔

ہمایوں نے کامران کی درخواست مان کر نہ صرف اپنے وقار و اقتدار کو بچا لیا بلکہ اپنے جنگجو اور تیز و طرار بھائی کی خوشنودی بھی حاصل کر لی جو کہ سلطنت کے مغربی صوبوں کے معاملات کو سنبھال سکتا تھا۔ اس طرح ہمایوں کے لیے اب (1532ء میں) محض مشرقی اور جنوبی علاقوں کے معاملات کو نبٹانے کا کام باقی رہ گیا۔

کامران کو اس کی مرضی کے مطابق سلطنت میں حصہ دے کر ہمایوں اب افغانوں

کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس نے داوُرہ (داورا یا داؤرا) کے مقام پر جو کہ لکھنؤ کے قریب دریائے سائی کے دائیں کنارے پر واقع ہے افغانوں سے مقابلہ کیا۔ شیر خاں کی غیر جانبداری بلکہ غدّاری کے باوجود افغانوں کی صفوں میں پراگندگی پھیل گئی۔ وہ لوگ بڑی بہادری سے لڑے لیکن ہار گئے۔ ان کے دو سردار ابراہیم خاں یوسف خیل اور بایزید فرملی قتل ہو گئے۔ محمود لودی بہار کی طرف روانہ ہو گیا اور ہمیشہ کے لیے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ جونپور پر ہمایوں کا قبضہ ہو گیا اور اس کو پھر جنید برلاس کے سپرد کر دیا گیا۔

شیر خاں کو یہ امید تھی کہ محمود لودی اور اس کے ساتھیوں سے ایک بہت ہی نازک موقع پر غدّاری کرنے کے صلے میں ہمایوں اس کا تسلّط چنار پر قبول کرے گا لیکن اس کی یہ امید نقش بر آب ثابت ہوئی کیوں کہ ہمایوں نے افغانوں پر فتح یابی کے کچھ ہی عرصے بعد شیر خاں سے اس کا مطالبہ کیا کہ وہ چنار کا قلعہ اس کے حوالے کر دے۔ اس کام کے لیے ہندو بیگ کو روانہ کیا۔ شیر خاں نے قلعہ واپس کرنے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں ہمایوں نے اس پر چڑھائی کر دی اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ قلعہ پر حملے کی باگ ڈور خود سنبھال کر ہمایوں نے غلطی کی۔ اس کو چاہیے تھا کہ وہ خود آگرے میں رہتا اور کسی اور کو اس مہم پر روانہ کرتا۔

شیر خاں ایک تجربہ کار اور جنگجو افغان تھا۔ اس نے چنار کا انتظام اپنے دوسرے بیٹے جلال خاں کو سونپا اور خود بہار کے پہاڑی علاقوں کی طرف نکل گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے خاندان والوں کو کسی محفوظ جگہ پہنچا کر خود واپس لوٹ آئے تاکہ محاصرہ کرنے والوں کو پریشان کر سکے اور قلعہ میں سامان رسد کی فراہمی کے کام کو بھی جاری رکھے۔

محاصرے نے تقریباً چار ماہ طول کھینچا۔ افغانوں نے بہادری سے قلعہ کا دفاع کیا۔ ہمایوں کے پاس تو عمدہ قسم کی قلعہ شکن توپیں تھیں اور پتھریلی زمین ہونے کے باعث وہاں سرنگیں کھودنا ممکن نہ تھا۔ اس کے علاوہ دریائے گنگا کے سبب ہمایوں قلعہ میں رسد کی فراہمی کو بھی مؤثر طریقے پر بند نہ کر سکا۔ اس کے برخلاف قلعہ کی فصیل پر جو توپیں تھیں ان کو افغانوں نے بہت ہی ہوشیاری سے استعمال کیا اور حریف کو زبردست نقصان پہنچایا۔

قلعہ فتح ہونے کے کوئی آثار نہ تھے لیکن شیر خاں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ معاملے کو غیر متعینہ مدت تک چلاتا رہے کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ بنگال کا حکمراں نصرت شاہ اس بات کا مخالف ہے کہ بہار میں ایک مضبوط سلطنت وجود میں آئے اور شیر خاں جیسا جاہ طلب نو دولتیا شخص اس پر قابض ہو۔ چنانچہ شیر خاں نے یہ چاہا کہ اس کو ذرا دم مارنے کی مہلت مل جائے اور اسی لیے وہ مغلوں سے جنگ ختم کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

شیر خاں کو خوش قسمتی سے ایک اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ گجرات کا حکمراں بہادر شاہ مالوہ کی ساری ریاست پر (مارچ 1531ء) قبضہ کر چکا تھا اور اس کی سلطنت گونڈ وانا کی حدود تک پھیل گئی تھی۔ بہادر شاہ نے اپنی کامیابی کے جوش میں ہمایوں کی آگرے سے غیر حاضری کا فائدہ اٹھانا چاہا اور یہ منصوبہ بنایا کہ اپنی حکومت کو میواڑ تک پھیلائے۔ اس وقت میواڑ بہادر شاہ اور مغلوں کی سلطنتوں کے درمیان ایک غیر جانب دار ریاست کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ نومبر دسمبر 1532ء میں بہادر شاہ نے چتوڑ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

اس کا یہ عمل نہ صرف راجپوتانہ بلکہ ہمایوں کی سلطنت کے لیے بھی خطرناک تھا۔ اس نئے خطرے کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نے چنار کی فتح کی اہمیت کو پس پشت ڈال دیا۔ ہمایوں بے چین تھا کہ جتنی جلد ممکن ہو چنار سے چھٹکارا حاصل کر لے۔ چنانچہ وہ شیر خاں کی ہر مناسب شرط ماننے پر آمادہ ہو گیا۔

چونکہ دونوں فریق صلح کے خواہاں تھے اس لیے صلح میں دیر کا کوئی امکان نہ تھا مگر شیر خاں نے جو حالات کا بغور مطالعہ کر رہا تھا موقع کا فائدہ اٹھایا اور شہنشاہ سے بہت مودبانہ درخواست کی کہ قلعہ کو اس کے پاس ہی رہنے دے۔ اس نے اپنی وفاداری کے ثبوت میں اپنے تیسرے بیٹے عبدالرشید کو جو کہ قطب خاں بھی کہلاتا تھا ایک مضبوط فوج کے ساتھ شہنشاہ کی خدمت میں بھیج دیا۔

ہمایوں نے شیر خاں کی درخواست خوشی سے مان لی۔ محاصرہ ختم کر دیا گیا اور وہ دارالسلطنت واپس ہو گیا۔ بظاہر دونوں فریق اس فیصلے سے مطمئن نظر آتے تھے لیکن جہاں تک شیر خاں کا تعلق ہے۔ یہ سارا معاملہ اس کو اپنے منصوبوں کے پورا کرنے

میں مددگار ثابت ہوا۔ اس کے برخلاف اس معاہدے کی وجہ سے ہمایوں کی ساکھ جاتی رہی۔

ہمایوں چنار سے گوالیار کی طرف روانہ ہوا تاکہ بہادر شاہ کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھ سکے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گجرات کا جواں سال و اولوالعزم حکمراں بڑے پیمانے پر منصوبے بنا رہا تھا۔ اس نے شیر خاں سے معاہدہ کر لیا اور اس کو زبردست کمک فراہم کی۔ اس کے علاوہ اس نے بنگال کے حکمراں سے بھی تعلقات پیدا کر لیے جس کا دربار سلطنت مغلیہ سے سرکشی کرنے والوں کے لیے ایک کھلی پناہ گاہ تھی۔ اگر میواڑ پر اس کا حملہ کامیاب ثابت ہوتا تو ایک ایسی غیر جانب دار ریاست کا قلع قمع ہو جاتا جو بہادر شاہ اور مغلوں کے درمیان فاصل ریاست کی حیثیت رکھتی تھی اور اس طرح بہادر شاہ سلطنت کی سرحدوں تک پہنچ جاتا اور سارے راجپوتانے کے تمام وسائل اس کے اختیار میں آجاتے۔ چنانچہ ان حالات میں ہمایوں کا پریشان و متفکر ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ اسی وقت اس کو چتوڑ کے رانا وکرما دتیہ کی ماں رانی پدماوتی کی طرف سے ایک پُرزور درخواست موصول ہوئی جس میں اس سے گذارش کی گئی تھی کہ وہ گجرات کے سلطان کے مقابلے میں میواڑ کی مدد کرے۔

ہمایوں نے تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد اپنی فوج کو تیار کیا اور گوالیار میں ڈیرے ڈال دیے۔ ایک طرف تو ہمایوں کو مشرق میں افغانوں کی طرف سے خطرہ تھا جس کو وہ نظر انداز نہ کر سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس کی فوج کی جنگی استعداد بھی معیاری نہ تھی لہٰذا وہ اس بات کا خواہش مند نہ تھا کہ فوراً ہی بہادر شاہ سے جنگ میں بھڑ جائے۔ چنانچہ وہ سیاست سے کام لے کر جنگ کی دھمکی دیتا رہا۔

ادھر بہادر شاہ بھی اس کے لیے تیار نہ تھا کہ اتنی جلد مغلیہ فوجوں سے متصادم ہو جائے۔ وہ راجپوتوں اور مغلوں کی مشترکہ مخالفت کے مقابلے کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔ چنانچہ اس نے وکرما دتیہ کی اس تجویز کو فوراً ہی مان لیا کہ وہ اس شاہی نشان کو جسے رانا سانگا نے مالوہ کے حکمراں سے حاصل کیا تھا اور مالوہ کا وہ علاقہ جو میواڑ میں شامل تھا واپس کر دے۔ ادھر رانا نے سلطان کو قیمتی تحفے تحائف بطور تاوان جنگ دینا قبول کر لیا۔ چنانچہ مارچ 1533ء میں صلح ہو گئی اور بہادر شاہ نے اپنی فوجیں

واپس بلالیں۔

چتوڑ کے معاہدے کے سبب میواڑ کی ریاست سلطان کے قبضے میں آنے سے رہ گئی اس وجہ سے ایک طرف تو راجپوتوں اور مغل بادشاہوں کو اطمینان ہوگیا اور دوسری طرف بہادر شاہ اس بات سے خوش ہوا کہ اس کو مالوہ کی پوری ریاست کا بادشاہ تسلیم کرلیا گیا۔ ہمایوں بھی فی الحال اس انتظام سے مطمئن تھا۔ اس نے گوالیار سے کوچ کرکے آگرے کا رُخ کیا۔

گوالیار سے واپسی پر ہمایوں نے اپنا بیشتر وقت (34-1533) ایک بہت ہی محفوظ و مضبوط شہر کی تعمیر میں صرف کیا جوکہ کوہ اراولی کی نچلی چوٹیوں اور دریائے جمنا کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ اس قسم کے شہر کی تعمیر کی ضرورت بالکل واضح تھی۔ کامران مرزا کی پنجاب میں آمد اور اس کی جاگیر کی حصار فیروزہ تک وسعت احتیاطی تدابیر کی مقتضی تھی۔

یہ نیا محصور شہر کامران کے حملے کے مقابلے میں سدِ فاصل اور ایک مضبوط بیرونی چوکی کا کام دے سکتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ پرانے زمانے کے ایک فراموش شدہ تہذیب و عظمت کو از سرِنو زندہ کرتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی مدِنظر رکھا گیا کہ اگر بہادر شاہ آگرے کی طرف بڑھ آئے تو مغلوں کو ایک مناسب پناہ گاہ مل سکے۔

ہمایوں کی اس نئے قلعہ کی تعمیر میں دلچسپی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی رواداری کے طرزِ عمل نے ہندوستان کے مختلف علاقوں اور مغربی و وسط ایشیا کے مسلم ممالک سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ ایک بہت ہی ناقابلِ یقین مختصر مدت میں یہ شہر دنیائے اسلام کا سب سے زیادہ اہم تہذیبی مرکز مانا جانے لگا۔ ہمایوں کی اس نئے شہر کی تعمیر کی طرف توجہ اس بات کا ثبوت سمجھا جانے لگا کہ وہ مالوہ اور راجپوتانہ میں بہادر شاہ کی حرکات سے بہت زیادہ متفکر و پریشان نہیں ہے۔

ہمایوں کا مرزاؤں سے سلوک بالکل مختلف تھا۔ محمد زماں اور محمد سلطان مرزا اور اس کے دو لڑکوں نے یہ محسوس کیا کہ ہمایوں ان کی طرف سے لاپرواہی برت رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے علمِ بغاوت بلند کیا لیکن ان کی بغاوت کو سر اٹھانے کا پورا موقع نہ ملا اور وہ ابتدا ہی میں کچل دی گئی۔ یادگار ناصر مرزا نے 1534ء میں ان کو شکست

دی اور قید کر لیا۔

ہمایوں نے جس خوش اسلوبی سے فتنہ و فساد کی سرکوبی کی اس نے بہادر شاہ کو بہت متاثر کیا اور اس نے ہمایوں کے پاس اپنا سفیر بیش بہا تحائف اور دوستی کا پیغام لے کر روانہ کیا۔

شہنشاہ نے سفیر کو عزت و احترام کے ساتھ باریابی بخشی اور دوستانہ جواب دے کر واپس کیا لیکن دوستی کے یہ مظاہرے سنجیدگی کے ساتھ قلب کی گہرائی سے نہیں کیے گئے تھے۔ بہادر شاہ نے اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے محمد زماں مرزا کا جو کہ بیانہ کی جیل سے ایک جعلی خط کو ذریعہ بنا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا، بہت ہی شاہانہ استقبال کیا۔ جب ہمایوں نے مرزا کی واپسی کا مطالبہ کیا تو بہادر شاہ سیاسی پناہ گزینوں کے سلسلے میں قانون اور رسم و رواج کی بحث چھیڑ بیٹھا۔

اس مرحلے پر بہادر شاہ نے یہ محسوس کر لیا کہ اب ہمایوں سے جنگ ناگزیر اور قریب الوقوع ہے۔ افغان سرداروں اور مرزاؤں کے پیہم کان بھرنے سے بہادر شاہ کو یہ بات پوری طرح باور ہو گئی تھی کہ ہمایوں ایک نا اہل حکمراں ہے، اس کی فوج ناکارہ ہے اور اس پر حملہ کر کے دہلی کا تخت چھین لینا کوئی مشکل کام نہیں۔ ان باتوں سے بہادر شاہ کے جوان جوشیلے تخیلات کو ہوا ملی اور اس نے دل و جان سے ایک زبردست فوجی مہم کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اسی دوران اس نے رنتھنبور اور اجمیر فتح کر لیے۔ علاوہ بریں اس نے پرتگالیوں سے چند مراعات اور سہولتوں کے عوض فوجی مدد کا وعدہ لے لیا۔

بہادر شاہ کا منصوبہ یہ تھا کہ مغلیہ سلطنت پر مختلف اطراف سے حملہ کر کے اس کو کچل ڈالے۔ اس نے علاء الدین لودی کو جو ابراہیم لودی کا چچا تھا ایک فوج کے ہمراہ کالنجر روانہ کیا تاکہ وہ ہندوستان اور مشرقی صوبوں کے باغیوں کی حمایت کرے۔ علاء الدین کے بیٹے تاتار خاں کو جو ایک قابل فوجی افسر تھا رنتھنبور روانہ کیا تاکہ وہ ایک بڑی فوج جمع کر لے برہان الملک کو کروڑوں روپیہ بھیجا گیا اور اس کو ہدایت کی گئی کہ تاتار خاں کی مدد کرے۔ اس کے علاوہ برہان الملک کو یہ بھی حکم دے دیا گیا کہ ناگور ہو کر پنجاب پر چڑھائی کرے اور دہلی یا پنجاب کے قریب ہمایوں کی فوجی طاقت کو متمرکز نہ ہونے دینے کے

لیے ایک زبردست مہم شروع کردے۔ خود اپنے متعلق بہادر شاہ نے یہ فیصلہ کیا کہ گجرات کی اصلی فوج لے کر چتوڑ پر حملہ کرے۔

اس منصوبے کے قابلِ عمل ہونے کے بارے میں لوگوں میں بہت ہی اختلاف تھا۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ اس پلان کے نتیجے میں فوج کی طاقت منقسم ہوجائے گی۔ اس کے وسائل منتشر ہوجائیں گے۔ اور اس طرح ہمایوں ان کی منقسم فوج کو ایک ایک کرکے شکست دے سکے گا۔ اس کے برخلاف کچھ لوگوں نے یہ دلیل پیش کی کہ مختلف جگہوں پر ہمایوں کی توجہ ہٹانے کے لیے جنگ چھیڑنے سے اس کی غیر تنظیم یافتہ فوج اور کمزور وسائل پر زبردست دباؤ پڑے گا۔ ملک میں بغاوت بھڑک اٹھے گی اور سلطنت کے مختلف حصوں میں دشمن عناصر فتنہ وفساد برپا کردیں گے۔

اس طرح ہمایوں چتوڑ کے بچاؤ کے لیے اپنی پوری طاقت اور توجہ مبذول نہ کرسکے گا اور بہادر شاہ ایک قلیل مدت میں آسانی کے ساتھ چتوڑ پر فتح حاصل کرلے گا۔ بہادر شاہ نے اس تجویز کو مان لیا کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ لودی سرداروں کو شمالی ہندوستان میں کافی مدد مل جائے گی اور اگر کہیں شکست کا سامنا کرنا ہی پڑا تو وہ ہمایوں سے یہ کہہ سکے گا کہ حملے کی ساری ذمّے داری دوسروں کے سر ہے بہرحال حالات اس کے لیے سازگار تھے۔

ایک طرف تو کامران خراسان کے صوبے دار کی مخاصمانہ سرگرمیوں کی وجہ سے جس نے قندھار پر حملہ کردیا تھا پنجاب چھوڑنے پر مجبور ہوگیا۔ دوسری طرف مشرقی صوبوں میں ہمایوں کے خلاف بغاوت پھیل گئی۔ ادھر سلطان مرزا گوالیار سے فرار ہوکر قنوج کے قریب فتنہ برپا کیے ہوئے تھا۔ ان سب کے علاوہ شیر خاں کی کارروائیاں بہت ہی زیادہ خطرناک تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بنگال کی فتح کے لیے بہت بے چین ہے چنانچہ ہمایوں نے آگرے سے مشرق کی طرف کوچ کردیا۔

چتوڑ ابھی بہادر شاہ کے حملے کے اثر سے مشکل ہی سے سنبھل پایا تھا کہ دوسرا اور زیادہ خطرناک حملہ شروع ہوگیا۔ بہادر راجپوتوں نے جان توڑ مقابلہ کیا لیکن زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے کیوں کہ بہادر شاہ بہترین قلعہ شکن توپوں سے جو اس وقت ہندوستان میں بہترین تھیں قلعہ کی فصیلوں پر گولے برسا رہا تھا۔ ان توپوں کو رومی خاں نامی ایک بہت

ہوشیار ترک توپ باز پرتگالیوں کی ہدایت کے ماتحت چلا رہا تھا۔
ہمایوں کو کالپی کے نزدیک بہادر شاہ کی چال اور چتوڑ کے محاصرے کی خبر ملی اس نے خود کو دونوں طرف مصیبتوں میں گھرا ہوا پایا۔ اس نے اس خیال سے کہ بہادر شاہ کے مقابلے میں شیر خاں کم خطرناک ہے مشرق کی طرف روانہ ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سورج گڑھ کی فتح نے جو 1534ء میں عمل میں آئی شیر خاں کے وقار اور طاقت میں بڑا اضافہ کر دیا تھا اور اس کو بہار کا بلا شرکت غیرے حاکم بنا دیا تھا۔ چونکہ اس کو بنگال کے جنگجو حکمراں سے نبٹنا تھا لہٰذا اس نے ہمایوں سے اپنی وفاداری کو ظاہرا طور پر ختم نہ کیا اور نہ خود کو بہار کا حاکم ہونے کا اعلان کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کی طاقت، وقار، دولت، اثر و رسوخ اور فوجی قوت اس وقت بھی کسی طرح بہادر شاہ کے برابر نہیں مانی جا سکتی تھی۔ چنانچہ یہ بات واضح تھی کہ ہمایوں کس طرف پہلے توجہ دے۔

ہمایوں کنار (ضلع کالپی) سے تیزی کے ساتھ آگرے واپس آیا۔ اسی عرصے میں تاتار خاں چالیس ہزار سواروں کے ہمراہ بیانہ کی طرف بڑھا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ مرزا عسکری، یادگار ناصر مرزا اور ہندال اٹھارہ ہزار (18000) سواروں کے ساتھ تاتار خاں کے مقابلے کے لیے روانہ کر دیے گئے۔

مغلوں کے آتے ہی تاتار خاں کی فوج فرار ہو گئی۔ 1534ء میں تاتار خاں بہت مایوسی کی حالت میں مندریل کے مقام پر اپنے تین سو جانباز سپاہیوں کے ہمراہ مغلوں کی فوج پر ٹوٹ پڑا لیکن ان سب کے تکے بوٹی کر دیے گئے۔

8 نومبر 1534ء کو ہمایوں آگرے سے بہادر شاہ سے لڑنے کے لیے روانہ ہوا۔ مندریل کی فتح کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمایوں بغیر کسی رکاوٹ کے مالوہ میں داخل ہو گیا اور رائے سین سے گذرتا ہوا کسی قدر دشواری کے ساتھ سارنگ پور پہنچ گیا۔ اس کا مشرقی راجپوتانہ سے ہو کر گزرنا ایک عاقلانہ اقدام تھا کیوں کہ اس طرح جس جگہ بھی اس کی زیادہ ضرورت ہوتی وہ آسانی سے جا سکتا تھا۔ جب تک ہمایوں سارنگ پور نہ پہنچ گیا

بہادر شاہ کو اس کے صحیح ٹھکانے کا پتہ نہ چلا۔

اب بہادر شاہ نے ہمایوں سے یہ درخواست کی کہ اس وقت جب کہ وہ ایک کافر کے خلاف جہاد میں مصروف ہے اس پر حملہ نہ کرے۔ کہا جاتا ہے کہ ہمایوں بہادر شاہ کی اس درخواست سے جس میں اس کو اسلامی جذبے کا واسطہ دیا گیا تھا بہت متاثر ہوا لیکن اس کے باوجود بڑے احتیاط کے ساتھ چتوڑ کی طرف بڑھتا گیا۔ شاید اس کو اس بات کی امید تھی کہ اس کی چتوڑ کی طرف پیش قدمی بہادر شاہ کو محاصرہ اٹھانے پر مجبور کر دے گی۔

ہمایوں کی محتاط پیش قدمی کے اور بھی ٹھوس وجوہ تھے۔ وہ بسرعت مالوہ آیا اس بات کا خواہش مند تھا کہ بہادر شاہ سے جنگ سے پہلے اپنی افواج کو پوری طرح منظم کر لے۔ باوجودیکہ مالوہ میں بہادر شاہ کے حملے کے خلاف راجپوتوں اور پرانے امراء میں جو کہ اپنے عہدوں سے برطرف کر دیے گئے بے چینی پھیلی ہوئی تھی لیکن ہمایوں کو اس بات سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے مکمل اطلاعات اور وقت کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ اس نے شاید یہ بھی محسوس کیا کہ احتیاط کو ہاتھ سے نہ چھوڑے کیونکہ ایک طرف تو مالوہ کے کچھ لوگ بہادر شاہ کے طرفدار تھے اور دوسری طرف دکن کی شمالی ریاستیں بھی اس کی حلیف تھیں۔

ہمایوں اس بات کا خواہش مند تھا کہ وہ مالوہ میں ایک ایسے مقام پر قیام کرے جہاں سے کہ وہ بہادر شاہ کو مانڈو یا احمد آباد سے پہنچنے والی امداد کو روک سکے۔ اور اگر بہادر شاہ ان دونوں مرکزوں میں سے کسی ایک کی طرف بھاگ کر پناہ لینے کی کوشش کرے تو اس پر راہِ فرار مسدود کر دے۔

ہمایوں علاء الدین لودی کی نقل و حرکت سے بھی مطمئن نہ تھا جو کالنجر کی طرف بھیجا گیا تھا۔ اگر وہ کالنجر سے واپس لوٹ آتا تو ہمایوں کی افواج کی پشت پر آ دھمکتا۔ تاتار خان کی ہزیمت کے بعد اس بات کا قوی امکان تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغل شہنشاہ نے بہادر شاہ کی درخواست کو مانتے وقت ان تمام باتوں کو خوب سمجھ لیا تھا اور یہ بھی خیال کیا ہوگا کہ اس طرح وہ مسلمانوں کے درمیان تقدس اور اولوالعزمی کی سستی شہرت بھی حاصل کرے گا۔

اس میں شک نہیں کہ ہمایوں فوجی اعتبار سے یقیناً بہتر حالت میں تھا اور اگر راجپوت زیادہ عرصے تک مقابلہ کرتے تو یہ بات میواڑ کے لیے بالواسطہ طور پر مفید ثابت ہوتی۔ شاید ہمایوں کو بہادر شاہ کے توپ خانے کی طاقت کا صحیح اندازہ نہ تھا جس نے راجپوتوں کی مقاومت کو ہمایوں کے سارنگ پور پہنچنے کے دس دن کے اندر اندر ختم کر دیا تھا۔ 8 مارچ 1535ء کو چتوڑ اُس کے محافظین کی بہادرانہ اور خونریز جنگ کے باوجود فتح کر لیا گیا۔ ان کے اس قدر جلد شکست کھا جانے کی وجہ یہ تھی کو ان کے پاس کافی مقدار میں آتشیں اسلحے نہ تھے۔

ہمایوں کو جوں ہی چتوڑ کے فتح ہونے کی خبر ملی اس نے فوراً ہی اپنی فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیا اور مندسور کے مقام پر ایک ایسی جگہ جو فوجی اعتبار سے بہت اہم تھا اپنا مورچہ قائم کر لیا۔ ادھر صدر خاں و تاج خاں نے بہادر شاہ کو یہ مشورہ دیا کہ قبل اس کے کہ گجرات کی فوج کا جوش ٹھنڈا ہو وہ مغلوں پر حملہ کر دے لیکن اس نے رومی خاں کے مشورے پر عمل کیا اور فوج کو توپوں، توپ بردار گاڑیوں اور رتھوں کے پیچھے مورچے بنا کر چھپا دیا اور کوشش کی کہ مغلوں کو فریب دے کر توپوں کی زد میں لے آئیں۔ مغلوں کو اس چال کا پتہ چل گیا اور وہ دور ہی رہے۔ وہ گجراتی افواج کے اردگرد چکر لگاتے۔ ان پر تیر برساتے اور ان کی رسد کی فراہمی میں رکاوٹ ڈالتے رہے۔ اس طرح از خود محصور ہو جانے سے بہادر شاہ کی افواج فاقہ کشی کی حد کو پہنچ گئیں۔ جنس اور چارہ کی کمیابی اور لاچاری کے باعث فوج کے حوصلے پست ہو گئے۔ اس صورت حال سے بیزار ہو کر بہادر شاہ نے توپوں کو نذر آتش کر دیا اور سارے قیمتی جواہر و دیگر اشیا کو چکنا چور کر دیا یا جلا ڈالا۔ اس نے اپنے کیمپ کو اکھاڑ دیا اور ہمایوں کے لیے زبردست مال غنیمت چھوڑ کر مانڈو کی طرف فرار ہو گیا۔ محمد زمان مرزا لاہور کی طرف فرار ہو گیا لیکن وہاں سے کامران نے جو کہ حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے بروقت آن پہنچا تھا اس کو نکال باہر کیا

رومی خاں کا توپ خانہ برباد ہو گیا اور بہادر شاہ کا اس پر سے اعتماد بھی اٹھ گیا۔ اس نے مغل شہنشاہ کی طرف رخ کیا اور ہمایوں نے اس کو اپنی ملازمت میں رکھ لیا۔ گجراتیوں نے اس بدبختی کا سارا الزام رومی خاں کے سر تھوپ دیا اور اس

کے خلاف غداری کا الزام لگایا لیکن واقعات اس الزام کی تصدیق نہیں کرتے۔

مغل افواج نے تیزی سے فراریوں کا پیچھا کیا۔ مانڈو کے مقام پر مالوہ چتوڑ اور گجرات سے باہر کے علاقوں کو مغلوں کے سپرد کر دینے کے لیے بات چیت شروع ہو گئی۔ گجراتیوں کے حفاظتی انتظامات کمزور پڑ گئے اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کچھ مغل شہر میں داخل ہو گئے اور زبردست افراتفری پھیل گئی۔ بہادر شاہ کو مشکل سے اتنی فرصت ملی کہ وہ قلعہ میں پناہ لے سکے۔ اس نے وہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ سمجھا لہٰذا صرف پانچ ساتھیوں کے ہمراہ بھیس بدل کر چمپانیر کی طرف فرار ہو گیا اور مانڈو کو مغلوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ مغلوں نے قتل عام کا حکم دیا اور اس طرح فوج کو مجبور کر دیا کہ قلعہ ان کے سپرد کر دے۔

چمپانیر پہنچ کر سب سے پہلے بہادر شاہ نے اس بات پر توجہ دی کہ اپنی عورتوں اور جس قدر خزانے کا لے جانا ممکن ہو دیو کے مقام پر منتقل کر دے۔ اس کام کو انجام دینے کے بعد اس نے قلعہ اختیار خاں کے سپرد کر دیا۔ شہر کو آگ لگا دی اور خود کیمبے کی طرف فرار ہو گیا

ہمایوں نے ایک ہزار سپاہیوں کے ہمراہ اس کا پیچھا کیا۔ کیمبے پہنچ کر بہادر شاہ نے حکم دیا کہ سو کشتیوں کا ایک بیڑا جو اس نے پرتگالیوں سے لڑنے کے لیے تیار کیا تھا جلا دیا جائے اور خود دیو کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہمایوں صرف چند گھنٹے کی تاخیر سے کیمبے پہنچا۔ باوجودیکہ بہادر شاہ گرفتار نہ کیا جا سکا لیکن ہمایوں یہ بات فخر سے کہہ سکتا تھا کہ اس نے بہادر شاہ کو گجرات سے نکال باہر کیا۔

ہمایوں کے کیمبے پہنچنے کے دو دن بعد اس کے کیمپ پر کولی اور گاوروں نے جو کہ مغل دشمن پروپیگنڈے سے بھڑک اٹھے تھے حملہ کر دیا۔ حملہ کرنے والے بڑی تعداد میں قتل ہوئے اور ہمایوں نے غضب ناک ہو کر شہر کو لوٹنے اور جلا دینے کا حکم دے دیا ہمایوں یہاں نومبر تک ٹھہرا اور اس نے یہ کوشش کی کہ پرتگالیوں کو اس بات کے لیے رضامند کرے کہ وہ اس کے ساتھ معاہدہ کر لیں لیکن پرتگالیوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ بہادر شاہ سے ایک جنگی اور دفاعی عہد نامے پر دستخط کریں۔

چمپانیر واپس پہنچ کر ہمایوں نے جوش و خروش سے اس قلعہ کو فتح کرنے

کے لیے مہم شروع کی جو ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ چمپانیر کے قلعہ کی دوہری فصیل تھی، اور پرتگالی توپچی اس کی حفاظت کے لیے موجود تھے۔ قلعہ میں گولہ بارود اور دیگر سامان افراط سے موجود تھا۔ مزید ضروری سامان خفیہ راستوں سے پہنچ سکتا تھا۔ اتفاق سے ہمایوں کو ایک ایسا راستہ نظر آگیا جو اس جگہ پہنچ کر ختم ہوتا تھا جہاں قلعہ کا پشتہ صرف ساٹھ یا ستر گز بلند تھا۔ دشمن کی توجہ ہٹانے کی خاطر اس نے حکم دیا کہ رات میں قلعہ پر حملہ کر دیا جائے اور خود چالیس آدمیوں کے ہمراہ قلعہ کی دیوار پر لوہے کی میخوں کے ذریعے چڑھ گیا۔ پھر انھوں نے تین سو آدمی اور چڑھا لیے اور ایک دم اچانک دھاوا بول دیا۔ شہنشاہ کی موجودگی سے قلعہ کے مدافعین گھبرا گئے اور قلعہ پر مغلوں کا قبضہ ہوگیا قلعہ میں گجرات کے حکمرانوں کا جمع کیا ہوا سونا اور دوسرے ذخائر حملہ آوروں کے ہاتھ لگے۔ ہمایوں نے بعض اشخاص کی مخالفت کے باوجود انتہائی بے پروائی سے جو شاید اس کو باپ سے ورثے میں ملی تھی ان خزائن کا بڑا حصہ اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔

دریائے مہندری کے اس پار کا علاقہ ابھی تک فتح نہ ہو پایا تھا۔ وہاں کے باشندوں کو یا تو یہ امید تھی کہ مغلوں کے بادل چھٹ جانے کے باعث بہادر شاہ کی حکومت دوبارہ قائم ہو جائے گی یا پھر اس وجہ سے کہ ان کو مظفر شاہ کے خاندان سے قدرتی ہمدردی تھی بہادر شاہ کو مالگزاری وصول کرنے کی دعوت دی۔ عماد الملک نے مالگزاری جمع کرنے کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ وہ مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ روانہ ہوا لیکن احمد آباد پہنچنے تک اس کی کمان میں دس ہزار سوار آ چکے تھے اور تھوڑی ہی دیر میں اس کی فوج تیس ہزار تک پہنچ گئی۔ جوناگڑھ کا زمیندار مجاہد خاں بھی اس کی فوج میں شامل ہو گیا۔

جب ہمایوں نے یہ خبر سنی کہ عماد الملک احمد آباد پہنچ گیا ہے تو وہ اس کو بھگانے کی خاطر چمپانیر سے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے دریائے مہندری عبور کر کے عماد الملک سے جنگ کی۔ فوج کے طلایہ کو جو عسکری کے ماتحت تھا شکست ہوئی لیکن آخرکار گجرات کی فوج کو زبردست جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا اور ایک خونخوار جنگ کے بعد وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ اور احمد آباد پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔

اب وقت آگیا تھا کہ گجرات کا تصفیہ کر دیا جائے۔ ہندو بیگ نے شہنشاہ کو یہ مشورہ دیا کہ چونکہ بہادر شاہ گجرات میں بہت ہر دلعزیز ہے اس لیے اس کو دوبارہ بحال کر دے اور خود آگرہ واپس چلا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ ایک بہت ہی صحیح مشورہ تھا اور ہمایوں نے اس کو نہ مان کر بڑی سخت غلطی کی۔ ایسا کرنے سے ہمایوں کی فیاضی کی شہرت میں اضافہ ہوتا اور بہادر شاہ بھی احسان کی مضبوط ڈوری سے بندھ جاتا۔ شہنشاہ کے وسائل اس قدر وسیع نہ تھے کہ وہ ایک ایسے دور افتادہ صوبے کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے جہاں کے رہنے والے قدیمی حکمراں خاندان کے لیے وفاداری کا شدید جذبہ رکھتے ہوں۔ دوسری طرف بہادر شاہ بھی اس رویے سے بہت خوش ہوتا اور خوشی سے شہنشاہ کی متابعت قبول کر لیتا اور قلعوں کو اس کے اختیار میں رہنے دیتا۔ لیکن یہ محض قیاس آرائی ہے۔ یہ نہ بھولنا چاہیے کہ بہادر شاہ بڑا اولوالعزم تھا۔ اس جیسا جوان، تیز طرار اور خود شناس حکمراں ہمایوں کی آنے والی اُن مشکلات سے جو اس کو افغانوں کے مقابلے میں شمال مشرق میں پیش آئیں فائدہ نہ اٹھاتا۔

چنانچہ اس اقدام کے عاقلانہ ہونے میں شک کیا جا سکتا ہے کہ شمالی ہندوستان کے سب سے زیادہ خوش حال اور وسائل سے بھرپور صوبے کو ایک ایسے شخص کے ہاتھوں سونپ دینا کہاں تک درست ہوتا اور پھر ہمایوں کو اس بات کے لیے مشکل سے رضامند کیا جا سکتا تھا کہ وہ بہادر شاہ یا شیر خاں کے اظہارِ دوستی پر بھروسہ کرے۔

آخر میں طے یہ پایا کہ گجرات کو سلطنت میں شامل کر لیا جائے۔ عسکری مرزا کو جو کہ مغلوں کے بہترین فوجی سرداروں میں شمار ہوتا تھا گجرات کا صوبے دار مقرر کیا گیا اور احمد آباد اس کا مرکز قرار پایا۔ ہندو بیگ کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج احمد آباد میں متعین کی گئی۔ پٹن کا علاقہ یادگار ناصر مرزا کو دے دیا گیا اور بھڑوچ اور سورت قاسم حسین سلطان کو عطا ہوئے۔ کھمبے و بڑودہ میں دوست بیگ کا تعین ہوا اور محمود آباد و چمپانیر علی الترتیب میر بچکا اور تردی بیگ کو تفویض ہوئے۔

جب یہ سارے انتظامات مکمل ہو گئے تو ہمایوں بہادر شاہ کی تلاش میں دیو کی طرف روانہ ہوا۔ وہ ابھی احمد آباد سے صرف تیس کوس کا فاصلہ طے کر پایا تھا کہ اس کو

ہندوستان کے صوبہ مالوہ میں بغاوت پھیل جانے کی خبر ملی ۔ ہنڈیا اور اُجین پر سکندر خاں اور ملّو خاں نے قبضہ کر کے چتوڑ کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد آگرے سے یہ اطلاع ملی کہ محمد سلطان مرزا اور اس کے بیٹے نے ہندوستان اور اس کے مشرقی صوبوں میں بغاوت کر دی ہے۔ چنانچہ شہنشاہ نے اپنا ارادہ بدل دیا اور بڑودہ بھروچ، سورت، اسیر اور برہان پور ہوتا ہوا مالوہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ شہنشاہ کی واپسی کی خبر مؤثر ثابت ہوئی۔ مالوہ کی بغاوت دب گئی اور بہار میں شیر خاں کی سرگرمیاں سرد پڑ گئیں۔ چونکہ مانڈو کی آب و ہوا ہمایوں کو بہت ہی راس آئی اس نے مناسب سمجھا کہ وہاں پر کچھ دن آرام کرے اور اس مرکزی مقام سے دکن اور سلطنت کی مشرقی و مغربی ریاستوں کے حالات کا جائزہ لے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے افسروں کی کارروائیوں میں ہم آہنگی پیدا کرے۔ چنانچہ وہ چار پانچ مہینے مالوہ میں مقیم رہا۔

ہمایوں کی سلطنت جس تیزی سے پھیل رہی تھی اس کی مضبوطی اور استحکام کا کام اسی رفتار سے انجام نہ پا سکا۔ بہادر شاہ آزاد تھا، مالوہ کے باغی فرار ہو چکے تھے، رنتھنبور، چتوڑ اور اجمیر پر بہادر شاہ کے افسروں کا قبضہ تھا اور ان کو نکالنے کا کام ابھی تک باقی تھا۔ رومی خاں سفر اب بھی گجرات کے بحری بیڑے کی مدد سے سورت کے قلعہ کا دفاع کر رہا تھا اور کاٹھیاواڑ کے لوگ بہادر شاہ کے علاوہ کسی اور کو اپنا بادشاہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔

بہادر شاہ نے اس سلسلے میں شیر خاں سے رابطہ پیدا کیا اور یہ کوشش کی کہ شیر خاں اس بات کے لیے راضی ہو جائے کہ اپنی کارروائیوں سے ہمایوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرے ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بہادر شاہ نے اس مقصد کے لیے کچھ مالی امداد بھی فراہم کی۔ ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمایوں کا اس وقت مانڈو میں قیام کرنا کوئی غیر عاقلانہ اقدام نہ تھا۔

بظاہر تین مہینے تک بالکل سکون رہا لیکن اس سکون کی تہ میں بے چینی کا ایک زبردست سیلاب جوش مار رہا تھا۔ اس کے علاوہ بہادر شاہ اور اس کے ساتھی مغلوں کو گجرات سے نکالنے کے لیے ایک مشترکہ منصوبہ بنا رہے تھے۔ خانجہاں

شیرازی جس نے بہادر شاہ کا ساتھ چھوڑ کر مغل شہنشاہ کی وفاداری قبول کر لی تھی اور جس کو سورت کا علاقہ مل گیا تھا پہلا شخص تھا جس نے بغاوت کی آگ بھڑکائی۔ نوساری، سورت، بھروچ اور بڑودہ مغل افسران کے قبضے سے نکال لیے گئے اور بغاوت تیزی سے پھیلنے لگی۔ کیمبے اور پٹن بھی ہاتھ سے نکل گئے۔

اس سے پیشتر مغل امرا میں اتحاد و یکجہتی کی ضرورت کا اس قدر احساس نہ ہوا تھا کیوں کہ چھوٹی چھوٹی افواج کا بیرونی مورچوں پر قبضہ جمائے رکھنا ممکن العمل نہ تھا اس لیے ان کو احمد آباد واپس بلا لیا گیا۔ عسکری اور اس کے مشیروں نے یہ فیصلہ کیا کہ سارے جنگی وسائل کو ایک جگہ جمع کر کے باغیوں سے مقابلہ کیا جائے ان حالات میں یہی ایک عاقلانہ تدبیر تھی۔ مغل فوج کی کل تعداد تقریباً بیس ہزار سوار تھی۔

گجرات کے سلسلے میں ہندو بیگ جیسے بلند مرتبہ افسر کی رائے یہ تھی کہ اس بات کا اعلان کر دیا جائے کہ گجرات ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے مرزا عسکری کے ماتحت رہے گا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے گجرات کے رہنے والوں کے احساسات کو تسکین ہوگی اور ان کے خدشات بھی رفع ہو جائیں گے اور ممکن ہے یہ بات ان کو بہادر شاہ سے دور کرنے میں مفید ثابت ہو۔

اس تجویز میں یہ خیال پوشیدہ تھا کہ گجرات کے شرفاء اور عوام کو یہ یقین دلایا جائے کہ اگر وہ مغل شہزادے کو اپنا حاکم مان لیں تو ان کے مفاد اور ان کی قدیم ریاست کی سالمیت برقرار رہے گی۔ اس سیاست کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لیے ضروری تھا کہ خطبہ میں عسکری بھی پڑھا جائے اور سکوں پر بھی اس کا نام کندہ ہو یہ اقدام نہ صرف یہ کہ بہت ہی خطرناک تھا بلکہ ممکن تھا کہ شہنشاہ اور دوسرے شہزادے غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں۔ اس کے علاوہ یہ اقدام ایک ہاری ہوئی بازی کے مترادف معلوم ہوتا تھا۔ اس کی بھی کوئی ضمانت نہ تھی کہ ایسا کرنے سے گجرات کے لوگ یقینی طور پر مظفری خاندان کے مقابلے میں جو کہ گجرات میں ہر دلعزیز تھا مغلوں کو جو کہ ایک بیگانہ قوم تھی ترجیح دیں گے ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے خود عسکری نے اس مشورے کو رد کر دیا۔

اس طولانی اور سنجیدہ غور و فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ حریفوں سے مقابلہ کرنا طے پاگیا گو
مغلیہ فوج اور گجراتی فوج میں دو اور پانچ کا تناسب تھا۔ یوں تو تعداد کی کمی مغلوں کے لیے
کچھ زیادہ پریشان کن نہ تھی کیوں کہ وہ اپنے سے بے شمار زیادہ بڑی فوجوں سے لڑنے کے
عادی تھے لیکن اخلاقی حمایت کا فقدان تھا یا یوں کہا جائے کہ گجراتیوں کی مخاصمانہ
سرگرمیاں ایک پریشان کن عنصر تھیں۔ مغلوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ دشمن سے کھلے میدان
میں مقابلہ کریں گے اور اس لیے انھوں نے غیاث پور کے مقام پر خیمے لگا دیے لیکن
روز بروز بڑھتی ہوئی عوام دشمنی اور عماد الملک کی فوج کی روز افزوں تعداد نے انھیں
اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنی تجویز پر نظر ثانی کریں۔ ان حالات میں احمد آباد ایک
غیر محفوظ جزیرے کی طرح معلوم ہونے لگا جو دشمنی کے بڑھتے ہوئے طوفان میں گھرا
ہو۔ ایسی غیر محفوظ جگہ کو اپنی فوجی کارروائیوں کی پائے گاہ بنانا بہت ہی غیر عاقلانہ
بات ہوتی۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ مغل فوج کو چمپانیر لے جایا جائے جو ہر لحاظ سے ایک
عمدہ فوجی مرکز تھا۔ حالانکہ اس اقدام سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ مغل افواج گجرات
کو خالی کر کے پیچھے ہٹ رہی ہیں لیکن اس کے بغیر کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا۔ بہرحال
اس اقدام کے نتیجے میں اگر مغل فوج مقابلہ کی تاب لا سکی تو احمد آباد کو دوبارہ فتح
کیا جا سکتا تھا اور اگر مغل اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہوتے تو اس ترکیب سے
کم از کم اپنی فوج کو تو تباہی سے بچا لیتے۔

ممکن ہے کہ عسکری اور اس کے مشیروں نے احتیاط اور دور اندیشی کے پیش نظر
اس اصول کو اختیار کرنے میں غلطی کی ہو لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ فیصلہ محض حوصلے
کی کمی یا مایوسی کے سبب کیا گیا کیوں کہ عسکری اور یادگار ناصر مرزا دونوں ہی دلیر
فوجی افسر تھے اور ان کے ہمراہ تجربہ کار اور آزمودہ کار مشیر بھی تھے۔

شہزادہ جن خطرات سے دوچار تھا اس کے لیے بابر کی حوصلہ، ہمت، اثر و رسوخ
اور اقتدار کی ضرورت تھی۔ لیکن عسکری نہ تو بابر کی طرح بلند حوصلہ ہی تھا اور نہ اس
کی طرح مقتدر و صاحب اختیار۔ بعض اوقات مصلحتاً پیچھے ہٹنا بھی بے سوچے سمجھے آگے
بڑھنے سے بہتر و مفید ہوتا ہے۔

مغل افواج کے سالار ہونے کے سبب اسے اس بات کا حق تھا کہ وہ خود فیصلہ

کرے کہ اس کو کب اور کہاں حفاظتی تدابیر اختیار کرنا ہیں اور کس وقت پیش دستی کرنا ہے۔

چمپانیر جنگ کا مرکز بن سکتا تھا اگر تردی بیگ عسکری کو دل وجان سے مدد دینے کو تیار ہوتا اور اپنے سارے وسائل شہزادے کی خدمت میں بے چون وچرا پیش کر دیتا۔ عسکری اور اس کے ساتھیوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ تردی بیگ ہر طرح سے ان کا ساتھ دے گا' اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور خیال کی گنجائش بھی نہ تھی۔ تردی بیگ سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ شہزادے کے احکام کی پوری پوری تعمیل کرے گا کیوں کہ شہزادہ اس کا افسر اعلیٰ تھا۔ مغل فوج کے پیچھے ہٹتے وقت دشمنوں نے عقب سے حملہ کر دیا تھا سخت معرکہ آرائی ہوئی اور اس جنگ میں دونوں حریفوں کا بہت جانی نقصان ہوا۔

تردی بیگ نے شہزادے کا پرتپاک استقبال تو کیا لیکن شہنشاہ کی اجازت حاصل کیے بغیر کسی قسم کی مالی مدد دینے سے انکار کر دیا۔ اجازت حاصل کرنے کی کارروائی اصولاً کتنی ہی ضروری کیوں نہ ہو مگر منظوری کے حصول میں کم از کم دس دن تو لگ ہی جاتے۔ حالات کی نزاکت اس قدر تاخیر کی اجازت نہ دیتی تھی۔

بہادر شاہ کی فوج خطرناک حد تک نزدیک آ چکی تھی اور حالات کا تقاضا یہ تھا کہ اتنی تاخیر نہ کی جائے کہ مغل فوجوں کا جوش وخروش اور جذبۂ انتقام اور کھوئی ہوئی عزت کو دوبارہ حاصل کرنے کا عزم ٹھنڈا پڑ جائے۔ تردی بیگ کی خودسری اور ایسی صورت میں جب کہ خطرات کے بادل سر پر منڈلا رہے تھے شہزادے کو مدد دینے سے انکار نہ صرف یہ کہ جواں سال شہزادے کے لیے خجالت اور شرمندگی کا باعث بنا بلکہ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے خلاف اس کا غضب بھڑک اٹھا۔ بے انتہا مایوسی کی حالت میں عسکری نے اپنے مشیروں کے مشورے کو مان لیا اور تردی بیگ کو گرفتار کرنے کا منصوبہ تیار ہو گیا لیکن تردی بیگ کے کان میں اس بات کی بھنک پہلے ہی سے پڑ چکی تھی اس لیے اس کے شبہات میں اضافہ ہو گیا اور اس نے شہزادے سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ علاوہ بریں اس نے شہزادے سے چمپانیر چھوڑنے کا مطالبہ کیا اور یہ دھمکی بھی دی کہ وہ قلعہ پر سے گولہ باری شروع کر دے گا۔ عسکری گھبرا گیا اور اسے اپنی اہانت کا سخت احساس ہوا۔

چونکہ ان مختصر وسائل کے ساتھ بہادر شاہ سے جنگ کرنا ممکن نہ تھا اسی لیے عسکری کے پاس صرف دو راستے تھے۔ یا تو وہ ہمایوں کے پاس واپس چلا جائے یا پھر کسی اور طرف کا رُخ کرے۔ عسکری اپنی مہم کی ناکامی کے سبب شہنشاہ کے سامنے جانے سے شرماتا تھا۔ اس کے علاوہ تردی بیگ جس کے اختیار میں مالوہ کی شاہراہ تھی اس کا راستہ روک سکتا تھا کیونکہ اسے عسکری کی نقل و حرکت میں بدنیتی کے آثار نظر آتے تھے چنانچہ شہزادے نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ صحراؤں میں بھٹکتا پھرے چنانچہ وہ بے نیل و مرام راجپوتانہ میں سرگرداں رہا۔

تردی بیگ نے شہنشاہ کو یہ اطلاع بھیجی کہ عسکری نے تاج و تخت پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا ہے اور وہ آگرے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس خبر نے ہمایوں کو پریشان کر دیا اور اس نے فوراً یہ فیصلہ کیا کہ عسکری کا آگرے کی طرف جانے کا راستہ روک دیا جائے۔ گھاٹ خارجی پر (واقع ریاست پالن پور) اس نے عسکری کو جا لیا لیکن عسکری کے برتاؤ نے ہمایوں کے شبہات کو ختم کر دیا اور ان کی ملاقات میں گرم جوشی کا انداز تھا۔ یقیناً ہمایوں نے سارے معاملات کا خوب اندازہ کر لیا ہوگا چنانچہ اس نے مرزا اور اس کے ساتھیوں کو نہ تو کوئی سزا دی اور نہ ہی ملامت کیا۔ دونوں بھائی مارچ 1537ء میں آگرے کی طرف روانہ ہو گئے۔

گجرات کی شکست کا مالوہ پر اثر انداز ہونا یقینی بات تھی کیوں کہ مالوہ کے حالات ابھی تک پرسکون نہ ہو پائے تھے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ گجرات کی شکست سے دکن کی ریاستوں کا رویہ بھی بدل جائے گا۔ وہ فوج جو گجرات میں مقیم تھی بجائے اس کے کہ مانڈو پہنچ کر ہمایوں کی فوج میں شامل ہو جائے، شمال کی طرف جا چکی تھی اور عسکری کا رویہ جیسا کہ تردی بیگ نے اطلاع دی تھی پریشان کن تھا۔ مالوہ میں ہمایوں کے وسائل خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل ہی ناکافی تھے۔ وہ اس بات کے لیے آمادہ نہ تھا کہ مالوہ میں رہ کر اور علاقوں سے منقطع ہو جائے اور مغلوب کر لیا جائے۔ چنانچہ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ مالوہ چھوڑ کر تیزی سے آگرے کی طرف روانہ ہو جائے۔ اگر عسکری مانڈو میں ہمایوں سے مل جاتا تو اسے کچھ امید ہوتی کہ وہ کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکے گا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ گجرات کی شکست کا اصلی سبب یہ تھا کہ ہمایوں عسکری کو فوجی امداد فراہم نہ کر سکا اور بلا واسطہ یہی بات مالوہ پر اثر انداز ہوئی، اس نظریے میں یہ بات مضمر ہے کہ ہمایوں کے پاس ایک بڑی فوج تھی اور گجرات میں مغل فوج کی تعداد کم تھی۔ اس نظریے کو درست ماننے کا کوئی جواز نہیں۔ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ مالوہ میں مقیم فوج گجرات کی فوج سے کچھ زیادہ بڑی نہ تھی۔ حالانکہ مالوہ کی حفاظت گجرات کو قبضے میں رکھنے کی ضرورت کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ علاوہ بریں گجرات کے فوجی حکام نے کسی مدد کی درخواست بھی نہ کی تھی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ نہ تو ہمایوں نے اور نہ عسکری اور اس کے مشیروں نے اس کی ضرورت سمجھی کہ گجرات میں مزید فوج بھیجی جائے کیونکہ فوجی نقطۂ نظر سے گجرات میں مغل فوج کی طاقت کچھ زیادہ غیر تسلی بخش نہ تھی۔ مرزا عسکری کے اس بدنصیب فیصلے نے کہ وہ شمال کی طرف چلا جائے، مالوہ میں ہمایوں کی صورت حال کو بہت کمزور کر دیا اور اسی وجہ سے وہ صوبہ ہاتھ سے نکل گیا۔ اگر تردی بیگ نے عسکری کو مددی ہوتی تو اس بدبختی سے نجات حاصل ہو جاتی اور تردی بیگ کو بھی اس شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑتا کہ چمپانیر جیسا قلعہ بزدلی کے ساتھ دشمن کو سونپ دیا۔ مغلوں کی اس ناکامی کے لیے کہ وہ گجرات اور مالوہ کی ریاستوں کو قبضے میں نہ رکھ سکے کسی کو بھی پوری طرح ذمے دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ یہ کچھ تو اتفاقی و ناگہانی حالات اور کچھ اس بات کا نتیجہ تھا کہ مغل افواج میں ایک دوسرے پر شک اور بے اطمینانی پائی جاتی تھی۔

مالوہ سے ہمایوں کے کوچ کی خبر وہاں پر بغاوت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ بھوپت رائے اور ملو خاں نے فوراً مانڈو پر قبضہ کر لیا۔ خاندیش کے محمد شاہ نے ان کا ساتھ دیا۔ مالوہ کے لوگوں نے بھی بہادر شاہ کی طرفداری کا اعلان کر دیا لیکن قسمت نے زیادہ عرصے تک اس کا ساتھ نہ دیا۔ بہادر شاہ پرتگال کے وائسرائے منہو دا کنہا کو اس بات پر راضی کرنے کے لیے دیو روانہ ہوا کہ وہ اُن کے تعمیر کردہ قلعہ اور شہر کے درمیان ایک دیوار کھڑی کرنے کی اجازت دے دے۔ بہادر شاہ یہ دیوار اس لیے بنانا چاہتا تھا کہ پرتگالیوں اور شہر کے باشندوں کے درمیان اکثر جو جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں ان کو ختم کیا جائے۔ گورنر نے جو کہ جنگی سپاہیوں کے ہمراہ آیا تھا بیماری کا بہانہ بنایا اور

یہ کہلا بھیجا کہ وہ سلطان کے پاس آکر اس سے بات چیت کرنے سے قاصر ہے۔ شاید اس کو کسی قسم کے فریب کا خوف تھا۔ چنانچہ سلطان اس سے ملنے جہاز پر چلا گیا۔ جب سلطان نے گورنر کو صحیح و سالم اور تندرست پایا تو اس کو شک ہوا اور اس نے فوراً ہی واپس آنا چاہا۔ اس کو روکنے کی کوشش کی گئی جس کے نتیجے میں لڑائی چھڑ گئی۔ اس لڑائی میں قلعہ کا کمانڈر مانوئل دی سوسا سمندر میں گر کر ڈوب گیا ادھر بہادر شاہ نے سمندر میں کود کر پیر کر نکلنے کی کوشش کی لیکن وہ بھی زخمی ہوا اور غرق ہو گیا۔ یہ واقعہ فروری 1537 میں رونما ہوا۔

باب 4

دوسری افغان سلطنت

فروری 1536ء اور فروری 1537ء کے دوران ہمایوں کی آگرے سے عدم موجودگی میں شمال میں کچھ اہم واقعات رونما ہوئے۔ شاملو امراء نے جن میں سے ایک ایران کا وزیر اعظم تھا شاہ طہماسپ کے خلاف بغاوت کردی۔ وہ لوگ شاہ کے بھائی سام مرزا کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے۔ جب وہ اپنے منصوبے میں کامیاب نہ ہوئے تو انتقام کے خوف سے انھوں نے راہ فرار اختیار کی۔ فراہ کے صوبے دار افشار سے ساز باز کرکے انھوں نے قندھار کا محاصرہ کرلیا مگر خواجہ کلاں نے بڑی بہادری سے اس کا دفاع کیا۔ جب کامران کو مدد کی درخواست پہنچی تو وہ بیس ہزار سوار لے کر فوراً ہی پہنچ گیا اور ایرانیوں کو فروری 1535ء میں شکست دی۔

کامران کی عدم موجودگی میں لاہور پر محمد زمان مرزا نے حملہ کیا لیکن کامران تیزی سے لاہور واپس آیا اور محمد زمان مرزا کو محاصرہ اٹھانے اور مشرق کی سمت فرار ہونے پر مجبور کردیا۔ اپریل 1537ء میں یہ افسوسناک خبر ملی کہ خود طہماسپ نے قندھار پر حملہ کرکے اسے فتح کرلیا۔ لیکن سال ختم ہونے سے قبل ہی کامران مرزا نے ایک بار پھر ایرانیوں کو شکست دی اور قلعہ کو اس کے حاکم صوبے دار نے چھین لیا۔ اس طرح سلطنت کے مغربی صوبوں کی سالمیت کی برقراری میں کامران کا بڑا ہاتھ رہا۔

مشرقی علاقے میں ہندال نے حالات کا بخوبی مقابلہ کیا۔ جولائی۔ اگست 1536ء میں محمد سلطان مرزا نے علم بغاوت بلند کیا لیکن ہندال نے اس کو بلگرام کے مقام پر

شکست دی۔ مرزا بھاگ کر اپنے بیٹے الغ بیگ سے جا ملا جس کی جاگیر دریائے سرجو کی وادی میں تھی۔ قبل اس کے کہ ہندال فوجی مدد حاصل کر سکے ان دونوں نے جوابی حملہ شروع کر دیا۔ ہمایوں کی آگرہ واپسی کی خبر سے ہندال کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ دشمنوں کو شکست دینے اور بھگانے میں کامیاب ہو گیا۔

مشرق میں شیر خاں سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ بہار میں اس کی سرگرمیاں بڑی دوررس اثرات کی حامل تھیں۔ مشرقی علاقے میں شیر خاں کے اثرات بڑھ رہے تھے اور وہ افغانوں کا سردار بن گیا۔ اس نے افغانوں کو باقاعدہ منظم کرنا شروع کر دیا اور ان کو یہ امیدیں بندھائیں کہ وہ افغانوں کی کھوئی ہوئی سلطنت کو مغلوں سے دوبارہ حاصل کر لیں گے۔ دور و نزدیک کے افغان اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس نے بہادر شاہ کے ساتھ بھی ارتباط قائم رکھا جس نے شیر شاہ کی مالی امداد بھی کی۔

شیر شاہ نے اس بات کی کوشش بھی کی کہ فتح ملکہ جو کالا پہاڑ کی لڑکی تھی اس سے زبردست امداد حاصل کرے۔ یہ مالی ذرائع اور خود اس کی اپنی مضبوط مالی معاشیات نے مل کر اس کو اس قابل بنا دیا کہ وہ ایک عمدہ اور بڑی فوج رکھ سکے جس میں پندرہ سو ہاتھی بھی شامل تھے۔

حالانکہ چنار کے معاہدے کی رو سے شیر خاں نے اس بات کا وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک افغان فوجی دستہ اپنے بیٹے قطب خاں کی سرکردگی میں مغل فوج میں خدمات کی انجام دہی کی غرض سے بھیجے گا لیکن اس کے باوجود اس نے قطب خاں کے خفیہ طور پر منڈاسر سے بھاگ جانے پر چشم پوشی کی۔ جوں ہی شیر خاں کا لڑکا اور اس کی افواج واپس آ گئیں اس کو کسی قسم کا خدشہ باقی نہ رہا۔ اب اس نے واضح طور پر غاصبانہ اور تشدد آمیز طرز اختیار کر کے دریائے گنگا کے کنارے کنارے چنار تک اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ اس نے بنگال پر جو کہ حکومت کی کمزوری کے باعث سخت سیاسی پریشان حالی میں مبتلا تھا حملہ کیا اور گوڑ کے مقام پر ایک بڑی و مستحکم فوج لے کر پہنچ گیا۔

بنگال کے نالائق بادشاہ محمود شاہ نے تیرہ لاکھ دینار کا تاوان جنگ دے کر اپنا پیچھا چھڑایا۔ شیر خاں نے اس بات کو اس طرح تعبیر کیا کہ محمود نے اس کے اقتدار اور برتری کو تسلیم کر لیا۔ یہ واقعہ 36-1535ء میں پیش آیا۔

ہمایوں جب آگرہ واپس آیا تو اس کو مشورہ دیا گیا کہ شیر خان پر اس کے تشدد، غرور اور نافرمانی کے جرم میں حملہ کر دیا جائے۔ یہ کام عملی نہ تھا کیوں کہ ظاہر تھا کہ مشرقی علاقے میں مہم شروع کرنے کے لیے ایک تازہ اور مضبوط فوج کی ضرورت تھی۔ اسی دوران میں ہمایوں نے ہندو بیگ کو جونپور کا حاکم بنا کر روانہ کیا اور اس کو یہ ہدایات دی گئیں کہ مشرقی علاقے کے حالات کی اطلاعات بھیجتا رہے۔

شیر خاں نے چنار اور شاید بنارس کے علاوہ مشرقی علاقوں سے اپنا قبضہ ہٹا لیا۔ اس نے ہندو بیگ کو قیمتی تحفے تحائف ارسال کیے اور شہنشاہ سے اپنی وفاداری کا اعلان کیا۔ ممکن ہے اس نے مشرقی علاقوں میں اپنی کارروائیوں پر یہ کہہ کر پردہ پوشی کی ہو کہ اس کو یہ سب مرزا کی بغاوت کے سبب کرنا پڑا اور اس میں کسی قسم کی نافرمانی کے جذبے کو دخل نہ تھا۔ علاوہ ازیں اس نے نہ تو اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور نہ اپنے نام کے سکے جاری کیے۔

ہندو بیگ نے شیر خان سے کسی ایسے خطرے کا احساس نہ کیا جس کے سبب کسی فوری اقدام کی ضرورت ہوتی۔ ہندو بیگ نے بنگال میں شیر خاں کی سیاست کے نتائج کا گہرا مطالعہ نہ کیا بلکہ اس نے اس مسئلے کو ہمایوں کے لیے چھوڑ دیا کہ اس سلسلے میں وہ خود اپنا نظریہ قائم کرے۔

اس اطلاع نے وقتی طور پر ہمایوں کو پریشانیوں سے نجات دلائی اور وہ از سر نو اپنی فوج کی تنظیم میں مصروف ہو گیا۔

ابھی مشکل سے ایک یا دو مہینے ہی گزرے تھے کہ یہ خبر آئی کہ شیر خاں نے ایک بار پھر جون 1537ء میں بنگال پر محمود سے سالانہ خراج وصول کرنے کے بہانے حملہ کر دیا ہے۔ یہ بات بہت ہی مشتبہ ہے کہ شیر خاں کا یہ حق حق بجانب تھا یا نہیں کیونکہ محمود نے شیر خاں کے حق کو کبھی تسلیم نہ کیا تھا۔

شیر خان کے اس دعوے میں اور بہت سے مسائل پوشیدہ تھے جن کو ہمایوں خاموشی کے ساتھ نظر انداز نہ کر سکتا تھا۔ چونکہ شیر خان نے معاہدۂ چنار کی رو سے خود کو شہنشاہ کی رعایا نظام جاگیرداری سے وابستہ ہونا منظور کر لیا تھا اور وہ اپنی وفاداری کا اعلان کرتا رہا تھا اس لیے وہ کسی اور ریاست سے شہنشاہ کی اجازت

کے بغیر نہ تو اعلانِ جنگ کر سکتا تھا اور نہ کسی قسم کا خراج وصول کر سکتا تھا۔ شکست خوردہ حکمران حاکم با اختیار ہی کو خراج ادا کرتا ہے نہ کہ اس حاکم با اختیار کے کسی امیرو سردار کو۔ لیکن شیر خاں کے طرزِ عمل سے یہ بات صاف طور پر واضح ہو گئی کہ گو بظاہر وہ اس بات کا اعتراف نہ کرتا تھا لیکن اس نے آزادانہ رویہ اختیار کر رکھا تھا اور اس کا رویہ ایک مقتدر و با اختیار حکمران کے مانند تھا۔

قانونی پیچیدگیوں کے علاوہ، بنگال میں شیر خان کی کامیابی، اس کی زبردست فوج و لا متناہی وسائل، اس کا وقار اور اثر و رسوخ جو مشرق میں چنار سے گوڑ تک پھیلا ہوا تھا اور افغان سلطنت کی تجدید کی آرزو جو اس کے دل میں موجیں مار رہی تھیں ان سب باتوں سے اس کے ساتھیوں کے دلوں میں بھی جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا۔ یہ سب وجوہ اس بات کے لیے کافی تھیں کہ ہمایوں نہ صرف احتیاط برتے بلکہ اس سلسلے میں کوئی سیاسی مؤثر قدم اٹھائے۔

جولائی 1537ء میں ہمایوں باوجود بارش کے آگرے سے روانہ ہو گیا۔ کڑا مانک پور میں دو مہینے گنوا کر وہ چنار کی طرف روانہ ہوا اور نومبر 1537ء میں چنار سے چند میل ادھر پڑاؤ ڈال دیا کیوں کہ شیر خاں کا لڑکا قطب خان ہمایوں کی خدمت میں احترام بجالانے کے لیے حاضر نہ ہوا لہذا ہمایوں کے شبہات یقین میں تبدیل ہو گئے۔ اس نے اپنے امراء سے اگلے اقدام کے بارے میں مشورہ کیا۔ افغان امراء نے اس کو یہ مشورہ دیا کہ وہ گوڑ کی طرف روانہ ہو جائے اور شیر خان کا بنگال فتح کرنے کا منصوبہ ناکام بنادے۔ لیکن مغل امراء نے ہندو بیگ کی سرکردگی میں یہ مشورہ دیا کہ چنار جیسے قلعہ کو دشمن کے ہاتھوں چھوڑ دینا دانشمندی کے خلاف ہے۔ کیونکہ یہ قلعہ بنگال جانے والی شاہراہ پر واقع ہے اس قلعہ کی فتح سے وسائل کی فراوانی ہوگی اور آگرے سے آمدو رفت کا محفوظ رابطہ قائم رہے گا۔ چونکہ چنار بنگال و بہار کے راستے پر واقع ہے اس لیے اس قلعے کو مشرق میں افغانوں کے خلاف مہم چلانے کے لیے بطور مرکز استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں نے یا تو بنگال کے حکمران کی قوت و مقاومت کا اندازہ اصل حقیقت سے زیادہ لگایا یا شیر خان کی قوت و وسائل کا اندازہ لگانے میں اس کو کمتر سمجھا۔ بہرحال وہ یہ نہ سمجھتا تھا کہ گوڑ اتنی جلد و آسانی کے ساتھ فتح

ہوجائے گا۔ اس نے افسروں کے مشورے کو قبول کیا۔ رومی خاں نے بھی اس کو یقین دلایا تھا کہ قلعہ مختصر مدت میں فتح ہوجائے گا۔

قلعہ کی فتح یابی ایک بہت ہی مشکل اور سخت کام ثابت ہوا۔ ایک تو خود قلعہ ناقابلِ تسخیر اور نہایت مستحکم تھا۔ دوسرے افغانوں نے اس کا بہادری سے دفاع کیا۔ افغان توپچیوں اور توڑے دار بندوقچیوں نے اپنے اسلحے کو اس خوبی کے ساتھ استعمال کیا کہ انھوں نے دشمنوں کو زبردست نقصان پہنچایا۔ مغلوں میں افراتفری پھیل گئی اور رومی خان کی متعدد کوششیں اور اچانک حملے ناکام ہوکر رہ گئے۔

رومی خاں نے اپنے جاسوسوں کے ذریعے قلعہ کی محافظت کے بارے میں کافی معلومات فراہم کرلیں اور پھر اپنی مہارت سے ایک معلّق توپ خانے کو سادگی سے تیار کیا جس نے قلعے پر اس قدر زبردست گولہ باری کہ وہاں کی فوج کو مجبوراً شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

چنار کی فتح میں چھ مہینے سے زیادہ کا عرصہ لگ گیا اور جون 1538ء میں قلعہ فتح ہوگیا۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ قلعہ چنار کی فتح پر اس قدر وقت صرف کرنا زبردست غلطی تھی اور ہمایوں کو اس غلطی کے خمیازے میں اپنی سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ممکن ہے یہ بات پوری طرح صحیح نہ ہو لیکن اس بات میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ ہمایوں کا بہار یا بنگال میں ایک زبردست فوج بھیج کر وہاں انتشار پیدا کرنا ایک قابلِ افسوس غلطی تھی۔ اگر گوڑ کو چنار کی فتح یابی تک آزادی نہ ملتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔

چنار جیسے قلعہ کو افغانوں کے ہاتھ میں چھوڑنا ناعاقبت اندیشی اور خلافِ مصلحت کام تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ساری فوج کو وہاں لگائے رکھنا اور شیر خان کو کھلی چھوٹ دے دینا ایک سخت غلطی تھی اور اگر قلعہ اس قدر پریشانی اور جان کو جوکھم میں ڈال کر فتح کیا گیا تھا تو اس کو یا تو پوری طرح مسمار کردیا جاتا یا پھر بہتر یہ ہوتا کہ اس کو اس قدر مضبوط بنادیا جاتا کہ افغان اس کو دوبارہ فتح نہ کرسکتے۔

اس وقت جب کہ مغل چنار کی تسخیر میں مشغول تھے، شیر خاں نہ صرف اپنے خاندان کو روہتاس گڑھ لے گیا بلکہ دھوکا بازی سے قلعہ کو راجہ چنتامنی سے چھین لینے کی چال چلی۔

ہمایوں چنار سے بنارس گیا جہاں اس کو پتہ چلا کہ گوڑ کا قلعہ یا تو فتح ہو گیا ہے یا ہونے والا ہے۔ وہاں زیادہ وقت ضایع کیے بغیر وہ روہتاس گڑھ کے قلعے پر حملہ کرنے کی غرض سے آگے بڑھا۔ یہ حملہ اس بات کو دھیان میں رکھ کر کیا گیا کہ ایسا کرنے سے گوڑ والوں کو بلا واسطہ طریقے سے بڑی نجات وسہولت مل سکے گی۔

پٹنہ پہنچنے سے پہلے ہمایوں کو قطعی طور پر پتہ چلا کہ گوڑ کا قلعہ اپریل 1538ء میں فتح ہو گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ خبر سُن کر ہمایوں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

ہمایوں نے فیصلہ کیا کہ شیر خاں کے ساتھ اگر ہو سکے تو بغیر جنگ کیے فیصلہ کرے اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ موسم برسات شروع ہو گیا تھا۔ اس نے شیر خاں کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ اگر وہ گوڑ کے حکمران سے حاصل کیا ہوا شاہی نشان واپس کر دے نیز بنگال کی سلطنت اور رہتاس گڑھ کا قلعہ اس کو منتقل کر دے اور شخصاً اس کی خدمت میں حاضر ہو تو ہمایوں اس کو چنار اور جونپور اپنے قبضے میں رکھنے کی اجازت دے دے گا۔ یہ شرائط بلاشبہ سخت تھیں اور ان سے اس بات کا صاف پتہ چلتا ہے کہ شہنشاہ کو اپنی قوت پر پورا بھروسہ تھا اور وہ اس بات کے لیے آمادہ نہ تھا کہ شیر خاں خود کو کسی مغل امیر سے برتر سمجھے۔ شیر خاں نے ہمیشہ کی طرح اپنی وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے خود اپنی تجاویز پیش کیں جو کہ حقیقتاً ہمایوں کی شرائط کا توڑ تھیں۔ اس نے بہار کی ریاست اور بنگال کے شاہی نشان کو تسلیم کرنا مان لیا۔ بشرطیکہ شہنشاہ آگرے واپس لوٹ جائے اور اس کو بنگال اپنے قبضے میں رکھنے دے جس کے عوض میں وہ سالانہ دس لاکھ روپیہ بطور خراج ادا کرے گا۔ چونکہ دونوں بنگال کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے تھے اس لیے بات چیت مفید ثابت نہ ہوئی۔ مذاکرات کی طوالت سے جو تاخیر ہوتی اس سے شیر خاں فائدہ اٹھا کر اپنی قوت کو مجتمع کر سکتا تھا، اور یہ بات شہنشاہ کے لیے مضر ہوتی لہذا ہمایوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا سفر جاری رکھے۔ پھر بھی اس نے شیر خاں کو ایک اور پیغام بھیجا جس میں شاید اس کو دھمکی دی گئی کہ اگر اس نے شاہی تجویز کو نہ مانا تو خراب نتائج برآمد ہوں گے جس کا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔ اور دوبارہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کے لیے توجہ دلائی۔ بظاہر کوئی وجہ نہ تھی کہ ہمایوں اپنی پہلی شرط کو جو یقیناً اس کے لیے

مفید یہی موقوف کر کے شیر خاں کی شرائط کو قبول کرے۔

شہنشاہ اور شیر خاں کی بات چیت کے دوران محمود حکمران بنگال کے ایلچی آئے اور ہمایوں کو اس بات کی اطلاع دی کہ گو شیر خاں نے گوڑ فتح کر لیا تھا مگر بنگال کو فتح نہیں کیا ہے اور وہاں کے لوگ اب بھی محمود کو ہی اپنا حکمران تسلیم کرتے ہیں۔ اس نے ہمایوں سے یہ بھی استدعا کی کہ شیر خاں کی باتوں کا اعتبار نہ کرے۔ شہنشاہ نے بغیر کسی قسم کا وعدہ کیے معاملے کو ٹالے رکھا تاکہ اس دوران میں مزید اطلاعات فراہم کرے۔

ہمایوں کا ایلچی شیر خاں کے پاس سے واپس آیا اور اس نے بتایا کہ شیر خاں اپنی تجاویز پر قائم ہے۔ اسی دوران میں بنگال کا حاکم محمود بری طرح مجروح ہو کر پریشانی کے عالم میں حاضر ہوا۔ اس نے اپنے ایلچیوں کی بات کی تصدیق کی اور شہنشاہ پر زور دیا کہ مزید تاخیر کیے بغیر بنگال کو نجات دلائے۔

چنانچہ شہنشاہ نے فیصلہ کر لیا کہ گوڑ کی طرف کوچ کرے اور وعدہ کیا کہ وہ دوبارہ اس کو بنگال کا تخت بحال کر دے گا۔

ہمایوں آگرے سے شیر خاں سے نبٹنے اور اس کی بڑھتی ہوئی قوت کو کچلنے کے لیے آیا تھا لیکن بظاہر اس کا کوئی ارادہ نہ تھا کہ خود کو بنگال کے معاملات میں الجھائے۔ وہاں کے حاکم نے اس سے مدد کی کوئی درخواست بھی نہ کی تھی۔ بلکہ شیر خاں کی فتح بنگال نے ہمایوں کو وہاں کا مسئلہ حل کرنے کے لیے ابھارا تھا۔ شیر خاں سے بات چیت کی ناکامی اور محمود شاہ کی مدد کے لیے ذاتی درخواست نے ہمایوں کو مزید الجھا دیا اور وہ افغانوں کے خلاف اور حکمران بنگال کی طرفداری کے لیے کمربستہ ہو گیا۔

شیر شاہ کے بنگال پہنچنے سے قبل محمود کے لڑکوں کے قتل کی خبر اور اس کے بعد خود محمود کی موت نے اس کو بنگال کی فتح پر مجبور کر دیا۔ گویا ہمایوں بتدریج بنگال کی سیاست کی پیچیدگیوں میں الجھتا چلا گیا۔ افغانوں نے جو شہزادہ جلال خاں کی سرکردگی میں تیلیا گڑھی اور سکاری گلی کی گھاٹیوں پر قابض تھے مغلوں کی پیش قدمی کو روک دیا شیر خاں نے انھیں ہدایت کر دی تھی کہ مغلوں کی پیش قدمی کو روک دیں مگر ان سے جنگ نہ کریں۔ حالانکہ شہزادے نے اپنی توہین کے جوش میں آ کر مغلوں سے کامیاب لڑائی لڑی تاہم اپنے باپ کی ہدایات پر عامل رہا۔ جب شیر خاں نے اپنے منصوبے مکمل

کرلیے تو اس نے اپنے لڑکے کو واپس بلالیا اور اس طرح یہ گھاٹیاں مغلوں کے لیے کھل گئیں۔ اب راستے میں کوئی روک نہ تھی۔ ہمایوں ستمبر 1538ء میں گوڑ پہنچ گیا

شیر خاں کی خوش قسمتی سے ہمایوں کو بعض وجوہ کی بنا پر تین چار مہینے بنگال میں رکنا پڑا۔

حسینی خاندان کے زوال سے بنگال میں بد امنی اور بے چینی پھیل گئی ہوگی تازہ فتح شدہ علاقے میں امن وامان برقرار کرنے کے لیے تجربہ، وقت اور نظم کی ضرورت ہوتی ہے۔ شہنشاہ نے یہ کام ایک بہت ہی مختصر وقت میں انجام دیے جو واقعی قابلِ تعریف ہے۔ علاوہ ازیں اس سے قبل کہ وہ اپنا واپسی کا سفر شروع کرے یہ بات ضروری تھی کہ تھکی ہوئی فوج کی از سرِ نو تنظیم کرے۔ اور اس کے لیے سامان رسد وغیرہ فراہم کرے۔ اس نے ہندال مرزا کو اس کی جاگیر میں ترہت اور پورنیا روانہ کیا تاکہ سامان رسد فراہم کرے۔ لیکن مرزا بغیر اجازت کے آگرے کی طرف روانہ ہوگیا اور اس سے ہر قسم کا رابطہ ختم ہوگیا۔

شہنشاہ نے شیخ بہلول کو صحیح حالات معلوم کرنے اور شہزادے کو راہ راست پر لانے اور فرض کی انجام دہی کا احساس دلانے کے لیے روانہ کیا۔ ہندال کے اس مبہم عمل سے شہنشاہ کی پریشانی اور رسد کی کمی کی فکر دوچند ہوگئی۔ ادھر شیر خاں نے راستوں پر جو اپنے محافظ بٹھا رکھے تھے ان کی وجہ سے رسل و رسائل کا سلسلہ اور مشکل ہوگیا۔ ہمایوں کے لیے اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہ گیا کہ جب تک صحیح اطلاعات حاصل نہ ہوں اور تیاریاں مکمل نہ ہوجائیں وہیں ٹھہرا رہے۔

یہ حالات ایک طویل امید و بیم کے بعد ختم ہوگئے، شہنشاہ کو اطلاع ملی کہ ہندال نے اقتدار سنبھال لیا ہے اور شیخ بہلول قتل ہوگیا اور شیر خاں پر مغرب کی جانب سے کوئی دباؤ نہیں ڈالا جاسکتا تھا۔ مزید برآں یہ کہ بنارس و قنوج کا درمیانی علاقہ شیر خاں نے فتح کرلیا ہے۔

یہ خبریں اس قدر پریشان کن تھیں کہ ہمایوں اس بات کے لیے مجبور ہوگیا کہ جلد از جلد واپس ہو۔ اس نے مختلف دستوں کو جو کہ صوبے میں اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے واپس بلایا اور اس بات کی کوشش کی کہ انسانوں اور جانوروں کے جانی نقصان کی تلافی

کرے اور اس صورتحال میں جہاں تک ممکن ہو حالات کو قابو میں رکھے اس کے سامنے سب سے زیادہ نازک مسئلہ یہ تھا کہ وہ کسی لائق سردار کو اس بات پر راضی کرلے کہ اُس کے جانے کے بعد بنگال کو سلطنت میں قائم رکھے۔ مغل امراء اس مشکل کام کو ایک دور افتادہ اور غیر صحت مند صوبے میں انجام دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ آخر کار جہانگیر قلی خان نے گوڑ میں رہنے کی حامی بھرلی حالانکہ اس کے پاس صرف پانچ ہزار فوج چھوڑی گئی۔

افغانوں کا منگیر پر قبضہ کر لینے کی وجہ سے گنگا کا جنوبی ساحل بہت ہی خطرناک ہو گیا تھا۔ ہمایوں نے فیصلہ کیا کہ شمال کی طرف سے سفر کیا جائے کیونکہ یہ راستہ نسبتاً زیادہ محفوظ تھا۔ مرزا عسکری کو آگے آگے روانہ کیا گیا۔ مرزا نے شہنشاہ کو اطلاع دی کہ شمالی راستہ بھی اسی قدر غیر محفوظ ہے اور افغانوں نے اسے روک رکھا ہے۔

ہمایوں نے غور و فکر کے بعد جنوبی راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور منگیر کے قریب دریائے گنگا کو عبور کیا۔ خیال یہ تھا کہ مغل اسی راستے سے واپس جائیں جس راستے سے حملہ کرتے وقت آئے تھے کیونکہ وہ علاقہ ان کا دیکھا ہوا تھا۔ جبکہ شمالی راستے سے وہ بالکل ناواقف و ناآشنا تھے۔ اس کے علاوہ جنوبی راستے سے وہ چنار پہنچ سکتا تھا جو کہ ابھی تک گو افغانوں کے محاصرے میں تھا مگر فتح نہ ہوا تھا۔

چنار ہر لحاظ سے جونپور سے بہتر تھا۔ اس وقت جونپور میں بھی افغانوں سے مقابلہ ہو رہا تھا۔ چنار کا قلعہ وسیع اور مضبوط تھا۔ وہ مانک پور اور قنوج کے درمیانی علاقے پر واقع تھا اور وادی جمنا و مشرقی علاقوں کے درمیان ایک بیش قیمت سلسلہ اتصال کا کام دیتا تھا۔ راستے کی تبدیلی کی اصل وجہ کو پُرشکوہ انداز بیان سے بدل کر ظاہر کیا گیا ہے کہ شہنشاہ نے شیر خاں سے ڈر کی وجہ سے راستے کی تبدیلی کے خیال کو قبول نہ کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ اسی راستے سے ہو کر گزرے گا۔

راستے کی تبدیلی نے ایک حد تک شیر خاں کے حملے کے منصوبے کو اُلٹ دیا اور اسے از سر نو جارحانہ انداز کے بجائے دفاعی طرز کا منصوبہ بنانا پڑا جس کی وجہ سے مغلوں کی فوج کی پیش قدمی نسبتاً آسان اور تیز تر ہو گئی۔ شہنشاہ نے چوسا اور مارچ 1539ء میں کرم ناسا عبور کر کے دریا کے مغربی سمت پڑاؤ ڈال دیا۔

اسس مرحلے پر ہمایوں کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وہ چنار جائے جہاں بآسانی پہنچا جا سکتا ہے یا اس وقت تک خیمہ زن رہے جب تک کہ بہار میں حالات سازگار نہ ہو جائیں شاید وہ متوقع تھا کہ بنگال سے واپسی کی خبر پا کر ممکن ہے اسس کے بھائی [illegible] د کو پہنچ جائیں چونکہ چنار ابھی تک اسس کے آدمیوں کے قبضے میں ہے اس لیے اس [illegible] پشت محفوظ ہے اور ضرورت کے وقت وہ وہاں جا سکتا ہے۔ اس کو اس بات کی بھی پریشانی نہ تھی کہ افغانوں نے شمال کی جانب غلبہ کر رکھا ہے کیوں کہ دریائے گنگا اسس کے بازو کی محافظت کر رہا تھا۔ ان سب باتوں کے علاوہ شیر خاں کے صلح کی بات چیت شروع کرنے سے بھی اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ ہمایوں کے معاملات قابلِ اطمینان تھے۔

شیر خاں نے یہ شرط پیش کی کہ اگر شہنشاہ اسس کو بنگال اور چنار کا قلعہ اپنے قبضے میں رکھنے کی اجازت دے دے تو وہ شہنشاہ کے نام کا خطبہ پڑھائے گا اور اسس کے نام کا سکہ چلائے گا۔

ہمایوں نے اس تجویز کو اسس شرط پر قبول کرنے کا اظہار کیا کہ شیر خاں مشرقی ساحل کو خالی کر دے اور اپنی فوجیں واپس بلائے۔ اس کے علاوہ ہمایوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ مغل فوج کو مشرقی ساحل عبور کرنے اور نمائشی طور پر واپس ہوتی ہوئی افغان فوج کا تعاقب کرنے کی اجازت دی جائے۔ یہ آخری تجویز بہت ہی عجیب تھی لیکن شیر خاں نے اسس کو مان لیا۔ شہنشاہ نے دریا عبور کر کے خود کو غیر ضروری خطرے میں ڈال دیا۔

شیر خاں موقع کو ہاتھ سے کھو دینے کے لیے تیار نہ تھا جب کہ موثوق ذرائع سے اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ مغل فوج کے پاس اسلحے وسائل نقل وحمل بہت کم ہیں۔ علاوہ بریں شیر خاں نے ظاہرا طور پر شہنشاہ کی شرائط قبول کر کے اس کو اپنی حفاظتی تدابیر کی طرف بہت لاپرواہ بنا دیا تھا۔ شہنشاہ اسس قدر مطمئن نظر آتا تھا کہ اس نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ واپسی کے دن سے صرف ایک روز قبل شیر خاں نے علی الصبح مغل افواج پر دھاوا بول دیا اور تین طرف سے گھیر لیا۔ مغلوں میں اس اچانک حملے کی وجہ سے افراتفری پھیل گئی اور وہ گرتے پڑتے پریشان حالی کے عالم میں کرمناسا کے ساحل کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ چونکہ پل توڑ دیا گیا تھا مغلوں کو دریا پیر کر پار کرنا پڑا۔ افغانوں نے ان کو بڑی بے رحمی سے قتل کیا قتل ہونے والوں کی تعداد سات ہزار تھی جن میں کئی

اہم اور ممتاز فوجی افسران بھی شامل تھے۔ جہاں تک ہوسکا عورتیں اور بچے چھوڑ دیے گئے۔ بعد میں عورتوں کو بحفاظت ان کے گھروں میں بھیج دیا گیا۔

ہمایوں اور عسکری مرزا دریا کے دوسرے کنارے پہنچنے میں کامیاب ہوگئے اور ان لوگوں کے ساتھ جو اُن کے پاس پہنچ سکے دریائے گنگا کے جنوبی کنارے سے چنار کا راستہ اختیار کیا۔ ایک افغان فوجی دستے نے ان کا تعاقب کیا اور دوسرے دستے نے سامنے سے اُن کا راستہ روک لیا۔

اس موقع پر گھورا کا حکمراں راجہ ویربھان جو الہ آباد کے نزدیک اریل کے مقام پر موجود تھا ان کی مدد کو آگیا۔ اس نے افغانوں کو مار بھگایا۔ شہنشاہ اور اس کے ساتھیوں کی پذیرائی کی اور چند روز تک اریل میں مہمان رکھا۔ ان کو ضروری ساز و سامان بہم پہنچایا اور کڑا مانک پور تک ان کے ہمراہ گیا۔ جولائی 1539ء میں ہمایوں کالپی کے راستے آگرے پہنچ گیا۔

کامران نے جو کہ دہلی کے صوبے دار کی درخواست پر شہر کو مرزا ہندال سے بچانے کے لیے لاہور سے آگیا تھا ہمایوں کا استقبال کیا۔ جس وقت شہنشاہ بنگال میں تھا مرزا ہندال فتنہ پرداز لوگوں کے زیرِ اثر آکر بادشاہ سے باغی ہوگیا۔ ہندال باوجودیکہ ایک بہادر جوان تھا لیکن اس کی قوتِ فیصلہ کمزور تھی۔ دہلی اور آگرہ کے صوبیداروں نے اس کو ترغیب دی کہ وہ فوج اور روپیہ اور وسائلِ جنگ فراہم کر کے شہنشاہ کی مدد کو پہنچ جائے۔

یادگار نصیر مرزا نے بھی اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ دراصل وہ اسی خیال سے آگرہ سے روانہ ہوا لیکن ہمایوں کے ایک برادر نسبتی زاہد بیگ اور نورالدین نے شیخ بہلول کو قتل کردیا اور ہندال کو بھی اسی میں ملوث کرلیا۔ ہمایوں نے شیخ بہلول کو بنگال سے اسی غرض سے بھیجا تھا کہ وہ آگرہ جاکر ہندال مرزا کو سمجھائے، راہِ راست پر لائے اور ذمے داری کا احساس دلائے۔

شیخ بہلول کے قتل کے ... انھوں نے ہندال کو قوت و اقتدار ہاتھ میں لینے، اپنے نام کا خطبہ پڑھوانے اور سکّہ جاری کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ چنانچہ ہندال کھلے طور پر باغی ہوگیا۔ وہ دہلی کا محاصرہ کرنے کے لیے آگے بڑھا جس پر وہاں کا صوبے دار اور

یادگار نصیر مرزا ہمایوں کی طرف سے متعین تھا۔

جون 1539ء میں کامران کی آمد نے نہ صرف قلعہ بچایا بلکہ ہندال کے خواہوں اور خود غرضانہ خواہشات پر پانی پھیر دیا۔ وہ الور کی طرف فرار ہوگیا لیکن کامران نے اسے آگرہ بلوا بھیجا۔ دونوں بھائی ہمایوں کی مدد کو جانا چاہتے تھے جو کہ اس وقت چوسا میں تھا لیکن کامران کے ہمراہیوں نے اس بات کی مخالفت کی اور تجویز ناکام ہوگئی۔ یہ بات بہت ہی افسوسناک ہے کیوں کہ ان کی بروقت مدد سے ہمایوں اور ہندوستان میں سلطنت مغلیہ نجات پا سکتی تھی۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے ہوئے مشرق میں بدلتے ہوئے حالات کا مطالعہ کرتے رہے۔

جب ہمایوں محض پانچ سو سواروں کے ہمراہ آگرے پہنچا تو کامران نے اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور چند روز بعد ہندال کو اس کے حضور میں پیش کیا گیا۔ ہمایوں اس سے مہربانی سے پیش آیا اور اس طرح دوستی و محبت کے ماحول کو برقرار رکھا۔ چوسا کی ہزیمت کے باوجود امرائے سلطنت خاموش اور وفادار رہے۔ جنھوں نے غلط رویہ اختیار کیا تھا وہ بھی اس کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اس کے برتاؤ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بابر کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔

ہمایوں کی جنگی مشین پوری طرح بے کار ہو چکی تھی۔ اس کی فوج ختم ہو چکی تھی۔ اس کا پہلا کام یہ تھا کہ جلد از جلد فوج مہیا کرے۔ چوسا میں شیر خاں کا صوبیدار شیر خاں کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا اور جلد سے جلد آگے بڑھنے کے لیے آمادہ کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں نے آنے والے خطرے کا اندازہ کر لیا تھا اور متحدہ طور پر شہنشاہ کی آواز پر لبیک کہہ رہے تھے۔ کامران نے یہ پیش کش کی کہ وہ اپنے دس ہزار سواروں کے ہمراہ شیر خاں کے مقابلے کو روانہ ہو جائے۔

ہمایوں کو شیر خاں کے اثر و رسوخ اور اس کی قوت کا تجربہ ہو چکا تھا اس لیے اس نے کامران کو اس بات سے روکا کہ پوری تیاری کیے بغیر اس کے ساتھ چھیڑ نہ کی جائے۔ علاوہ بریں کامران کی فوج کو جو اس وقت تک ایک موثر لشکر کی حیثیت رکھتی تھی خطرے میں ڈالنا دانائی کے خلاف تھا کیونکہ اگر کامران شکست کھا جاتا تو برے وقت پر پھر کون کام آتا اور اگر وہ فتحیاب ہو جاتا جس کی امید بہت کم تھی، تو شیر خاں کو شکست

دینے کا افتخار کامران کو حاصل ہوتا۔

لوگوں نے کامران سے کہا تھا کہ چونکہ ہمایوں شیر خاں سے پہلی بازی ہار چکا ہے اس لیے انتقام لینے کے لیے دوسری بازی خود ہی لگائے گا کیوں کہ اب اس کی عزت و آبرو اور شخصی خاصت کا معاملہ ہے۔

آگرے کی آب و ہوا کامران کو موافق نہ آئی وہ بیمار ہو گیا اور تقریباً تین مہینے تک صاحب فراش رہا۔ وہ اس بیماری سے اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ اس کے اعضا تقریباً اپنا عمل ختم کر چکے تھے اور قوتِ گویائی بھی متاثر تھی۔ بعض شرانگیزوں نے اس کو سمجھایا کہ ہمایوں بتدریج اس کو مسموم کر رہا ہے لہٰذا جتنی جلد ممکن ہو وہ آگرے سے چلا جائے۔ اس زمانے کی سیاست میں اس کا یقین نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن علالت کے عالم میں کامران کے دل میں ان شبہات کو تقویت ہوئی۔ لہٰذا علالت کے عالم میں جب اس کو نظام سقہ کے دربار میں حاضر ہونے کو بلایا گیا تو اس کو سخت ناگوار ہوا۔ نظام کو جو سا میں شہنشاہ کی جان بچانے کے انعام کے صلے میں آدھے دن کی بادشاہت عنایت کی گئی تھی۔

کامران کو احساس ہوا ہو گا کہ شہنشاہ کا دماغ کمزور اور وہ مضحک حد تک سنکی ہو گیا ہے اور اس کے دل میں شہنشاہ کے لیے جتنا بھی جوش و خروش تھا وہ جاتا رہا۔

اب کامران کو اپنے معاملات کی فکر لاحق ہوئی۔ وہ ایک سال سے زیادہ عرصے تک پنجاب سے غیر حاضر تھا۔ اسی دوران میں وسط ایشیا کی سیاست میں بھی بہت سی قابلِ توجہ تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ ازبک سردار عبید اللہ کا انتقال ہو چکا تھا اور شاہ طہماسپ اس کی فکر سے آزاد ہو گیا تھا۔

ہندوستان میں مغلوں کے درمیان افراتفری پھیلنے کے باعث شاہ ایران ایک بار پھر قندھار پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے کامران ہمایوں کی اس خواہش پر رضامند نہ ہوا کہ وہ اپنی ساری فوج چھوڑ جائے۔ پھر بھی اپنے تین ہزار سوار شہنشاہ کی خدمت کے لیے چھوڑ کر لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دفعہ اس کے اور شہنشاہ کے درمیان غلط فہمی کی بنیاد پڑ گئی بہت سے لوگوں نے مرزا کے ساتھ اپنے خاندان کے افراد کو لاہور بھیج دیا اور اس کی

وجہ یہ بھی تھی کہ ان کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ مستقبل قریب میں افغانوں کی پیش قدمی سے آگرہ غیر محفوظ ہو جائے گا۔

لوگوں کی تشویش بے بنیاد نہ تھی۔ شیر خاں نے چوسا کی فتح یابی کی خوشی میں شہر بنارس میں اپنی آزاد اور خود مختار بادشاہت کا اعلان کر دیا اور شیر شاہ سلطان عادل کا لقب اختیار کیا۔

افغانوں نے بنگال فتح کر کے وہاں کے مغل صوبے دار کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد شیر شاہ نے ہندوستان پر زبردست حملے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ قنوج کی طرف جانے والی فوج کی کمان وہ خود سنبھالے اور اپنے لڑکے قطب خاں کو دریائے جمنا کے کنارے کنارے آگرہ بھیجا۔ اس نے گجرات اور مالوہ کے حکمرانان اور دوسرے سرداروں کو بھی دعوت دی کہ وہ اس کے لڑکے کے ساتھ مل کر آگرے کی طرف کوچ کریں۔

شیر شاہ نے قنوج آسانی سے فتح کر لیا لیکن اس کا لڑکا قطب خاں شہنشاہ کے پھرتیلے جوابی حملوں کے سبب پیش رفت نہ کر سکا۔ شہنشاہ نے عسکری اور ہندال کو مالوہ کے راجہ کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے روانہ کیا اور یادگار نصیر مرزا کو قطب خاں کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے بھیجا۔ چونکہ شیر خاں کی درخواست کا مالوہ کے حاکم کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا لہٰذا مغلوں کو افغان شہزادے سے نبٹنے میں آسانی ہوئی۔ کالپی کے قریب ایک جنگ ہوئی جس میں قطب خاں قتل ہو گیا اور افغان فوج پسپا ہو گئی اور اس طرح شیر شاہ کا منصوبہ ناکام ہو کر رہ گیا۔

ہمایوں اس ابتدائی فتح سے فائدہ اٹھا کر 16 مارچ 1540ء کو شیر شاہ کا مقابلہ کرنے کے لیے آگرہ سے روانہ ہوا۔ اس کی فوج تعداد کے اعتبار سے تو ضرور بڑی تھی لیکن منظم اور تربیت یافتہ نہ تھی۔ ہمایوں دریائے گنگا کو عبور کر کے خیمہ زن ہو گیا اور شیر شاہ کے اگلے اقدام کے انتظار میں اپنی فوج کو پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا۔ اتفاق سے جو میدان مغلوں نے اپنے پڑاؤ کے لیے منتخب کیا۔ وہ اس میدان کے مقابلے میں نشیب میں تھا جس پر افغانوں نے پڑاؤ ڈالا تھا۔

شیر شاہ مشرق سے خواص خان کی آمد کا منتظر تھا۔ اس کی واپسی پر شیر شاہ نے

خود کو آغازِ جنگ کے لیے تیار پایا۔

ہمایوں کی بدقسمتی سے جس میدان میں اس کی فوج خیمہ زن تھی اس میں بارش کا پانی بھر گیا تھا۔ ہمایوں نے اپنی فوج کو جنگی طرز پر منظم کیا اور یہ کوشش کی کہ کسی بہتر جگہ پہنچ جائے۔ شیر شاہ نے ان حالات کو اپنے لیے مساعد سمجھتے ہوئے مغل فوج کے دونوں طرف حملہ کردیا۔ مرزا ہندال نے جو کہ بائیں پہلو کی قیادت کر رہا تھا شہزادہ جلال خان کے حملے کو پسپا کردیا اور بڑی افراتفری کی حالت میں دشمنوں کو پیچھے دھکیل دیا لیکن عسکری جو کہ دائیں بازو کی قیادت کر رہا تھا وہ اتنا خوش قسمت نہ نکلا۔ شہزادہ عادل خاں اور خواص خاں نے اس کی فوج کو پسپا کردیا۔ اور اس کے سپاہی مغل فوج کے مرکز کی طرف بھاگے اور وہاں بھی افراتفری پھیلادی۔

اس موقع پر افغانوں کے ایک دستے نے مغل فوج کے رسل و رسائل کے پچھلے دستوں پر حملہ کردیا وہ لوگ بھی گھبرا کر فوج کے مرکز کی طرف دوڑے۔ ان واقعات کی وجہ سے مرکز پر اس قدر دباؤ پڑا کہ توپچی دب کر رہ گئے اور مغل توپ خانہ بالکل ناکارہ ہو کر رہ گیا۔

شیر شاہ نے اس انتشار سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے مغل فوج کے قلب پر دھاوا بول دیا اور بیک وقت بائیں پہلو پر دوسرا حملہ کردیا۔ ان شدید حملوں نے مغل فوج کے چھکے چھڑا دیے اور مغل شکست کھا گئے۔ یہ واقعہ 17 مئی 1540ء میں پیش آیا۔

جان بچانے کے لیے مغلوں نے دریا کا رُخ کیا۔ اس وقت ہمایوں کے حواس قائم نہ رہ سکے اور اس کی فوجی اہلیت جواب دے گئی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر افغانوں نے پانی پت کے میدان میں اپنی کھوئی ہوئی عزت و آبرو کو دوبارہ حاصل کرلیا۔

ہمایوں، حیدر مرزا، عسکری، ہندال اور یادگار دریائے گنگا کو پار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ آگرے کی طرف بھاگے۔ افغانوں نے ان کا سختی سے پیچھا کیا۔ شیر شاہ نے دو لشکر روانہ کیے۔ ایک آگرے کی طرف اور دوسرا سنبھل کی جانب۔ ہمایوں بے شمار رکاوٹوں، پریشانیوں، فاقہ مستیوں اور تھکان کے باوجود آگرے پہنچ گیا۔ وہاں اس نے ایک شب گزاری۔ دوسرے روز اپنے افراد خاندان اور کچھ خزانہ لے کر دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

رہتک میں ہندال اس سے آملا اور دونوں سرہند ہوتے ہوئے لاہور کی طرف فرار ہو گئے
جولائی 1540ء میں عسکری مرزا بھی ان سے آملا۔

ہمایوں اور اس کے بھائی حیدر دوغلات و یادگار مرزا نے آپس میں مل کر افغان فتنہ سے نبٹنے کے لیے تبادلۂ خیال کیا۔ ہمایوں چاہتا تھا کہ سب اپنے اپنے وسائل کو یکجا کر کے کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ثابت قدمی سے کوشش کریں۔ کامران کو یہ فکر لاحق تھی کہ پنجاب کو بچائے۔ مبادا وہ اس کے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ اُس کا خیال تھا کہ چونکہ مغلوں کے فوجی وسائل محدود تھے لہذا شیر شاہ سے گفت وشنید کی جائے۔ ہمایوں اور کامران کے درمیان صرف ایک مسئلے میں اختلاف تھا کہ آیا شہنشاہ بحیثیت ایک حاکم اعلیٰ کے سب کی طرف سے گفت وشنید کرے یا کامران پنجاب کے حکمران بالفعل کی حیثیت سے؟

حیدر دوغلات نے شہنشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ کشمیر جا کر اسے فتح کرے کیوں کہ وہاں طبقاتی اختلافات کی وجہ سے طوائف الملوکی کا دور دورہ ہے اور وہاں رہ کر اس وقت تک انتظار کرے جب تک افغانوں کو شکست نہ ہو جائے۔

ہندال اور یادگار مرزا یہ چاہتے تھے کہ ہمایوں سندھ فتح کرلے اور بعد ازاں گجرات پہنچ جائے جہاں بہادر شاہ کے انتقال کے بعد سے اب تک کوئی مناسب اور لائق حکمران وہاں کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے موجود نہ تھا۔

یہ بالکل واضح تھا کہ ہمایوں کے علاوہ کوئی بھی عملاً شیر شاہ سے جنگ کرنے کے لیے مناسب نہ تھا۔ ان سب تجاویز میں کوئی نہ کوئی خامی تھی۔

ہمایوں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ موجودہ حالات میں شیر شاہ سے گفت وشنید کرنے کی تجویز کو آزمایا جائے گو اس کی کامیابی کی امید کم ہی تھی۔

چنانچہ اس نے شیر شاہ کے پاس ایک ایلچی یہ تجویز دے کر بھیجا کہ سرہند کو افغان اور مغل سلطنت کے درمیان سرحد سمجھا جائے۔ کامران نے اس خوف سے کہ مبادا شیر خان ہمایوں کے ساتھ معاملہ طے کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو اس نے قاضی عبداللہ کو خفیہ طور پر یہ ہدایت کی کہ یہی تجویز اس کی طرف سے شیر شاہ کو پیش کرنے کی کوشش کرے۔ اس کو اس بات کی امید تھی کیونکہ اب تک کامران شیر شاہ سے مدمقابل نہ ہوا

تھا اسس لیے ممکن ہے کہ اسس تجویز پر شیر شاہ غور کرنے کو تیار ہو جائے۔ ان دونوں تجاویز کا مقصد یہ تھا کہ اگر مغل ان علاقوں پر قابض رہیں جن پر بابر جنگ پانی پت سے پہلے قابض تھا تو افغان اس پر مطمئن ہو جائیں گے۔

شیر شاہ نے اپنی سوجھ بوجھ سے یہ اندازہ لگا لیا کہ مغل اس حالت میں نہیں کہ جنگ کر سکیں اور اسس قسم کا معاہدہ زیادہ عرصے تک نہ چل سکے گا کیوں کہ پنجاب میں کوئی تسلی بخش قدرتی سرحد نہ تھی جو ان دونوں سلطنتوں کو علیٰحدہ کر سکے۔ اس نے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا کہ مغل شہزادوں میں یا تو اتفاق نہیں یا پھر وہ اسس کو فریب دینا چاہتے ہیں۔

چنانچہ اسس نے ایک سیدھی سادی قابلِ عمل تجویز پیش کی کہ اگر مغل اسس بات کے لیے راضی ہوں کہ دریائے سندھ کو دونوں سلطنتوں کی درمیانی سرحد تسلیم کر لیا جائے تو وہ اپنی تلوار کو نیام میں رکھنے کے لیے تیار ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ اس بات کے لیے تیار نہ تھا کہ ہندوستان کو ہمایوں یا کامران یا کسی اور کے ساتھ تقسیم کرے۔

گفت و شنید کی ناکامی کے ساتھ یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ شیر شاہ جلد ہی ان کا مقابلہ کے لیے تیار ہو جائے گا۔ یہ بات بھی واضح تھی کہ پنجاب پر نہ تو ہمایوں کا قبضہ رہے گا اور نہ کامران کا۔

کامران کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ پنجاب بغیر کسی قصور کے اسس کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے جس میں اس کے بھائی کی نااہلی کو دخل ہے۔ چنانچہ وہ اپنے لیے کابل و قندھار کو بچانے کے لیے اور زیادہ مضطرب ہو گیا۔

اپنے باپ کی طرح کامران کا بھی یہ خیال تھا کہ افغانستان کے وسائل مغل امرا کی فضول خرچیوں کے لیے کافی نہیں ہو سکتے۔ اس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ جب وہ افغانستان میں پناہ لے سکتا ہے تو مارا مارا کیوں پھرے۔ لہٰذا اس نے ان متعدد تجاویز میں کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔

ہمایوں تو یہ چاہتا تھا کہ وہ بدخشاں چلا جائے جہاں سب اس کو جانتے پہچانتے ہیں لیکن بدخشاں بھی اس کو سلیمان مرزا سے لڑے بغیر ہاتھ نہ آسکتا تھا کیوں خود بابر

نے بدخشاں پر سلیمان مرزا کا آبائی حق تسلیم کر لیا تھا۔ کوئی نہ کہہ سکتا کہ اگر بدخشاں میں جنگ چھڑ جائے تو کیا پیچیدگیاں رونما ہو سکتی تھیں کیونکہ بدخشاں مغلوں اور ازبکوں کے درمیان وجہِ نزاع بنا ہوا تھا۔

کامران، افغانستان کے مالک بالفعل کی حیثیت سے اس بات کو پسند نہ کرتا کہ اس کی سرحدات پر فتنہ و فساد اٹھ کھڑا ہو۔ اس کے علاوہ اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ ہمایوں بدخشاں میں اپنی طاقت کو مضبوط کرنے کے بعد کابل کو فتح کرنے کی طرف راغب نہ ہوگا۔

تاریخ نے یہ بات ان گنت بار ثابت کر دی ہے کہ بادشاہت کسی رشتہ داری کا پاس نہیں کرتی۔ انھیں وجوہ کی بنا پر کامران نے ہمایوں کے بدخشاں جانے کی تجویز کی مخالفت کی۔ ہمایوں جیسے نیک دل اور ہر ایک سے حسنِ ظن رکھنے والے کو کامران کا رویہ بہت ہی خود غرضانہ اور مایوس کن معلوم ہوا۔ وہ اپنے بھائی کے دلائل سمجھنے سے قاصر تھا۔ حالانکہ اس کے دلائل سیاسی اعتبار سے بالکل منطقی تھے۔ حق تو یہ ہے کہ کامران نے اعلان کر دیا کہ جو لوگ بھی افغانستان میں پناہ لینا چاہیں اور وہاں رہنے کو تیار ہوں وہ ان کو اپنے ہمراہ لے جانے پر آمادہ ہے۔ اس نے یہ بھی پیش کش کی کہ وہ اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں کے خاندانوں کی حفاظت اور دیکھ بھال اپنے ذمے لینے کو تیار ہے تاکہ وہ آزادی اور اطمینان کے ساتھ ہر مہم کو انجام دے سکیں۔

اب ہمایوں کو کشمیر اور سندھ کے درمیان کسی ایک کو انتخاب کرنا تھا اسے کشمیر جانے میں اس وجہ سے تامل تھا کہ اگر وہ وہاں چلا گیا تو ایک ایسے ملک میں پھنس جائے گا جو اقتصادی طور پر غریب اور سیاسی لحاظ سے ناقابلِ اعتماد ہے۔ اسی وقت اسے شیر شاہ کی پیش قدمی کی خبر ملی۔

مرزا حیدر دوغلات ہمایوں سے جدا ہو چکا تھا۔ کامران اور عسکری افغانستان جا چکے تھے۔ ہندال اور یادگار ناصر مرزا نے ہمایوں کا ساتھ دینے کا عہد کیا۔ چنانچہ اکتوبر 1540ء میں وہ سندھ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب شیر شاہ کے لیے میدان خالی تھا وہ تیزی سے آگے بڑھا اور دریائے سندھ تک سارے پنجاب پر غلبہ حاصل کر لیا۔

ہمایوں کے آگرے سے روانہ ہونے کے چند روز بعد ہی شیر شاہ پائے تخت میں

داخل ہوگیا۔اس نے وہاں کچھ وقت اپنے ابتدائی کاموں کا تصفیہ کرنے اور الورو سنبھل کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے افسروں کے انتخاب میں گزارا۔ پھر اس نے اپنی فوج کو آہستہ آہستہ روانہ کیا اور سرہند پہنچ گیا اور وہاں ٹھہر کر مغل شہزادوں کی نقل و حرکت کا مطالعہ کرتا رہا۔

ان دنوں سندھ میں ارغونوں کی حکومت تھی جن کو بابر نے قندھار سے مار بھگایا تھا۔ ان لوگوں نے سندھ میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔جب ہمایوں سندھ پہنچا تو شاہ حسین ارغون کو خطرہ لاحق ہوا۔ اس نے چھ ماہ تک ہمایوں کی خوب اچھی آؤ بھگت کی اور اس کو خوش و خرم رکھا۔ اسی دوران اس نے یادگار ناصر مرزا کو ورغلانے کی کوشش کی۔

ہندال اور ہمایوں کے درمیان غلط فہمی پیدا ہو جانے کے سبب شاہ حسین کی کوششیں غیر متوقع طور پر کامیاب ہوگئیں۔ ہندال کی ناراضگی کا سبب یہ تھا کہ ہمایوں ہندال کے پیر و مرشد کی جوان بیٹی حمیدہ بانو کے عشق میں مبتلا ہو کر خود کو کھو بیٹھا تھا۔ اور آخر کار 21 اگست 1541ء میں اس سے شادی کرلی۔ اس بات سے خفا ہو کر ہندال یادگار مرزا کی باتوں میں آگیا اور قندھار کے گورنر قراچہ بیگ نے کامران کی طرف سے جو دعوت نامہ بھیجا تھا اس کو قبول کر کے قندھار روانہ ہوگیا۔ بہرحال ہمایوں بددل نہ ہوا۔ اس نے یادگار ناصر مرزا کو بھکر پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے روانہ کیا اور خود سیہوان کا قلعہ فتح کرنے کے لیے روانہ ہوا۔

آدمیوں اور وسائل کی کمی کے باعث قلعہ فتح نہ کیا جا سکا اور سندھیوں کی شرارت کے جب جنہوں نے رسد کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ ہمایوں کے کیمپ میں سامان کی زبردست کمی واقع ہوگئی۔ قلعہ سات مہینے تک محصور رہا لیکن اس کے باوجود فتح کے آثار نظر نہ آتے تھے۔

اسی دوران شاہ حسین نے یادگار مرزا کو اپنی طرف ملا لیا۔ اس نے اپنی اکلوتی بیٹی کی یادگار سے شادی کردی اور گجرات کو فتح کرنے کے لیے اس کو مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ان واقعات کے سبب ہمایوں کے ساتھی اس کو چھوڑ کر جانے لگے۔ یہاں تک کہ اس کے پاس صرف مٹھی بھر آدمی رہ گئے۔

مرزا نے ایک قدم اور بڑھایا اور ہمایوں پر حملہ کر دیا۔ ہمایوں ان حالات سے اس قدر مایوس ہوا کہ اس نے دنیا ترک کر دینے اور مکہ جاکر درویشانہ زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اس کے بہی خواہوں نے اس کو ایسا کرنے سے روک دیا۔ اب چونکہ سندھ میں مزید قیام نہ صرف بیکار بلکہ خطرناک بھی تھا لہٰذا ہمایوں مارواڑ کے حکمراں راجہ مالدیو کے بلانے پر راجپوتانہ کی طرف چل پڑا۔

رانا سانگا کے انتقال کے بعد میواڑ کے وقار اور طاقت کو زوال آگیا اور مارواڑ کے حکمراں خاندان نے اہمیت حاصل کر لی لیکن گجرات کے فرماں روا بہادر شاہ کے انتقال سے پہلے مالدیو کو اپنی آرزوؤں کے پورا کرنے کے لیے میدان صاف نہ ملا تھا۔ چنانچہ مالدیو نے چار سال کے عرصے میں میرتا کے اس پار ناگور، جالور اور اجمیر سے ہنڈون اور بیانہ تک اپنی حکومت قائم کر لی۔

کہا جاتا ہے کہ میرتا کا راجہ بیجن دیو شیر شاہ کے پاس پہنچ گیا۔ پھر مالدیو نے بیکانیر پر حملہ کیا۔ وہاں کے راجہ جیتسی نے اپنے لڑکے کلیان مل یا کلیان سنگھ اور اپنے وزیر ناگراج کو شیر شاہ کے پاس مدد مانگنے کے لیے بھیجا۔

بیکانیر کے راجہ کے اس عمل کے ردعمل کے طور پر مالدیو نے نہ صرف یہ کہ اس کی ریاست پر حملہ کیا بلکہ اسے فتح بھی کر لیا نیز ہمایوں کے ساتھ اتحاد و اتفاق کا رشتہ جوڑ لیا۔ اس نے ہمایوں کو دعوت دی اور بیکانیر دینے کا وعدہ کیا اور یہ بھی پیش کش کی کہ گجرات اور ہندوستان کی فتح میں اس کا ساتھ دے گا۔ جب تک کہ ہمایوں کو سندھ کی فتحیابی کی امید تھی اس نے اس تجویز پر توجہ نہ دی لیکن جب اس کی یہ امیدیں ختم ہوگئیں تو اس نے مالدیو کی پیش کش قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا اور جولائی 1542ء میں پھلودی پہنچا۔ یہاں مالدیو کے نمائندوں نے تحفے تحائف اور نقد رقم سے اس کا استقبال کیا۔

شیر شاہ کو مالدیو اور ہمایوں کے تعلقات کا علم تھا اس نے مالدیو کے پاس ایلچی بھیج کر یہ درخواست کی کہ یا تو ہمایوں کو اس کے حوالے کر دے یا اپنی ریاست سے نکال دے۔ اس نے یہ بھی کہلا بھیجا کہ اگر راجہ اس کی تجویز پر عمل کرے گا تو شیر شاہ اس کو الور یا کوئی اور مقام عطا کرے گا اور ناگور پر اس کا قبضہ تسلیم کرے گا۔ جس وقت کہ ایلچی جودھپور میں مقیم تھا تو ہمایوں بھی اسی کے قریب خیمہ زن رہا۔

ہمایوں کو یہ امید تھی کہ راجہ خود آکر اس سے ملے گا، کافی مقدار میں فوجی تیاریاں موجود ہوں گی اور جودھ پور میں فوج مجتمع ہوگی لیکن اس کو ان تمام باتوں میں مایوسی ہوئی۔ اس کے برعکس اس کو وہاں شیر شاہ کا ایلچی ملا اور تشویشناک افواہیں سننے میں آئیں جن کا مقصد یہ تھا کہ راجہ غداری اور دغا بازی کے ارادے رکھتا ہے۔ یہ بات یقینی طور پر معلوم نہ ہو سکی کہ راجہ نے شیر شاہ کو کیا جواب دیا یا یہ کہ واقعی اس کا کیا ارادہ تھا لیکن عام حالات اور بعض اشخاص کی نقل و حرکت جن پر راجہ کے جاسوس ہونے کا شبہ کیا جا سکتا تھا ایسی تھیں کہ ہمایوں ان سے اس قدر خائف ہوا کہ یکایک اس نے اپنا پڑاؤ اٹھایا اور تیزی سے راہ فرار اختیار کی۔

اس میں شک نہیں کہ مالدیو نے ہمایوں کی گرفتاری کی کوئی کوشش نہ کی لیکن اس کو کسی قسم کی مدد بھی نہ دی اور نہ ہمایوں اس کی ریاست میں ٹھہر سکا گو ہمایوں کے فرار سے شیر شاہ کی ایک شرط پوری ہوگئی لیکن بعد کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں اور مالدیو میں کسی قسم کی دوستی و محبت کا شائبہ تک نہ تھا ممکن ہے مالدیو غداری اور کینہ پن کر سکتا ہو لیکن اس پر ہمایوں کے خلاف غداری کا الزام پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا۔ اگر اس کے خلاف کچھ کہا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ اس نے ہمایوں سے جو وعدے کیے تھے ان کو پورا نہ کر سکا۔ ممکن ہے ایسا اس وجہ سے ہوا ہو کہ شیر شاہ تیزی سے مالوہ پر چڑھ آیا اور بغیر کسی مخالفت کے اس کو فتح کر لیا۔

مالوہ میں شیر شاہ کی ایک طاقت ور فوج کے ساتھ موجودگی نے مالدیو کو اس بات سے روک دیا ہوگا کہ وہ کوئی ایسا قدم اٹھائے جس کے سبب قبل از وقت جنگ چھڑ جائے یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ اس نے ہمایوں کو جو تجاویز پیش کی تھیں، ان میں کوئی صداقت نہ تھی لیکن حالات نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ کم از کم وقتی طور پر ان کو پورا نہ کرے۔ بہرحال اس کی نیت کے بارے میں اختلاف نظر باقی رہے گا۔

ہمایوں جیسلمیر ہوتا ہوا 22 اگست 1534ء کو بڑی ہی قابل رحم حالت میں امرکوٹ جا پہنچا۔ رانا بیرسل نے پذیرائی کی اور جو کچھ سہولتیں بہم پہنچا سکتا تھا فراہم کیں۔ وہ ڈیڑھ مہینے سے زیادہ وہاں مقیم رہا۔ رانا کی دلی آرزو یہ تھی کہ ہمایوں شاہ حسین

ارغون سے انتقام لینے میں اس کی مدد کرے کیونکہ شاہ حسین نے اس کے باپ کو قتل کر دیا تھا۔ چنانچہ رانا نے ہمایوں سے اس بات پر اصرار کیا کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے وہ جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ رانا نے اس کے لیے سات ہزار سوار جمع کر لیے۔ ہمایوں نے اس بات کو ٹالنے کی کوشش کی کیونکہ ان دنوں حمیدہ کے وضع حمل کے ایام قریب تھے اور چند ہی دنوں میں بچہ پیدا ہونے کا امکان تھا۔ رانا کے مستقل اصرار نے اسے اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ بیگم کو محل میں چھوڑ دے۔ وہ 11 اکتوبر کو جنگ کے لیے روانہ ہوگیا۔ چند روز بعد 15 اکتوبر 1542ء کو حمیدہ بانو سے ایک بچے کی ولادت ہوئی جو آگے چل کر ہندوستان کی تاریخ میں کافی مشہور ہوا اور جس نے اپنے باپ کے مصائب کا افغانوں سے انتقام لے لیا۔

ہمایوں کئی ماہ تک سندھ میں گھومتا رہا۔ ارغونوں نے جُن کے مقام پر اس کا مقابلہ کیا وہ ان کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ یہاں اس کی بیوی اور بچہ بھی آ ملے۔ اسی دوران بیرم خاں بھی افغانوں کے پنجے سے چھوٹ کر بڑی جانبازی کے ساتھ ہمایوں سے آملا۔

جُن سے ہمایوں نے راجاؤں اور قبائلی سرداروں کے نام یہ پیغام بھیجا کہ وہ غاصب ارغون کو مار بھگانے کے لیے اس کا ساتھ دیں۔ اس کی اس دعوت کا کافی اثر ہوا اور تقریباً سولہ ہزار سوار اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے لیکن ایک مغل سردار کی باتوں سے پریشان ہو کر رانا اور اس کے قبائلی سردار ہمایوں کا ساتھ چھوڑ بیٹھے۔

جب ہمایوں نے یہ دیکھا کہ سندھ میں اس کا گزارہ نہیں ہو سکتا تو وہ 11 جولائی 1543 کو جُن سے روانہ ہو کر سیوی ہوتا ہوا قندھار کی طرف روانہ ہوگیا۔ شاہ حسین کامران اور عسکری کے مابین بظاہر صلح و صفائی ہو چکی تھی' ہمایوں نے انہیں قندھار کی طرف روانگی کی اطلاع دے دی۔

جب ہمایوں مشتنگ پہنچا تو اس کو پتہ چلا کہ کامران کی ہدایت کے بموجب عسکری اس کو گرفتار کرنے آ رہا ہے اور زیادہ دور نہیں۔ چنانچہ ہمایوں نے اپنے ساز و سامان اور معصوم بچے کو قابلِ اعتماد لوگوں کے سپرد کر کے خود دسمبر 1543ء میں اپنی بیوی اور 22 وفادار ساتھیوں کے ساتھ غزنی کے راستے ایران کا رخ کیا۔ شاید عسکری نے چشم پوشی کی کیونکہ اس نے تیزی سے تعاقب کرنے کا حکم نہ دیا۔

سیستان کے صوبہ دار نے ہمایوں کا اچھی طرح استقبال کیا۔ شاہ ایران کو جب ہمایوں کے ایک خط کے ذریعے اس کی آمد کی اطلاع پہنچی تو اس نے سب مقامات کے افسران کو جدھر سے ہمایوں کو گزرنا تھا احکامات صادر کر دیے کہ ہمایوں کا شاہانہ استقبال کیا جائے اور اس کو جملہ قسم کی سہولتیں اور آسائش مہیا کی جائیں۔ وہ ہرات اور مشہد ہوتا ہوا قزوین پہنچا جو کہ ایران کا پایۂ تخت تھا۔ اس وقت شاہ ایران موسم گرما کے پایۂ تخت سورلیق میں تھا جہاں جولائی 1544ء میں ہمایوں کو شاہ طہماسپ کے حضور میں لے جایا گیا۔

ہمایوں کو اس برتاؤ سے اپنے دل میں حقارت و جھجک محسوس ہوئی لیکن اس کو ظاہرداری برتنا پڑی۔ مذہبی عقائد کا اختلاف اور ایرانیوں کا یہ خیال کہ غزدوان میں ایرانی فوج کی شکست کی ذمے داری اُس کے باپ بابر پر تھی یہ سب ایسی باتیں تھیں جن کی وجہ سے دونوں بادشاہوں کے درمیان رنجش پیدا ہوگئی تھی اور یہ بات مشکل نظر آتی تھی کہ ہمایوں کے ساتھ دوستانہ سلوک کیا جائے گا۔ ہمایوں نے بادل ناخواستہ ایرانیوں کی طرح لباس پہننا شروع کر دیا اور کم ازکم ظاہرا طور پر شیعہ فرقہ کی رسومات و قواعد پر عمل پیرا ہونے لگا۔

بدقسمتی سے ہمایوں نے نادانستہ طور پر شاہ کے بھائی بہرام مرزا اور کچھ دوسرے بااثر لوگوں کے احساس حسد کو بھڑکا دیا۔ انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ شاہ کو ہمایوں کے خلاف بھڑکائیں اور وہ اپنے اس مقصد میں اس حد تک کامیاب ہوگئے کہ شاہی مہمان کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوگیا۔ لیکن شاہ کی ہمشیرہ سلطانم نے ہمایوں کی طرفداری کی اور شاہ کو اس بات پر رضامند کرلیا کہ وہ ہمایوں کی مدد کرے۔

آخر یہ بات طے پائی کہ شاہ تقریباً تیرہ ہزار سواروں کی ایک فوج شہزادہ مراد کی برائے نام سرکردگی میں روانہ کرے اور وہ فوج ہمایوں کے لیے قندھار فتح کرے۔

اس مہربانی کے عوض ہمایوں سے کہا گیا کہ وہ شاہ ایران کی ہمشیرہ کی ایک لڑکی سے شادی کرے اور یہ وعدہ کرے کہ جب ایرانی فوج اُس کے لیے قندھار، غزنی اور کابل فتح کرے تو قندھار شاہ ایران کے قبضہ میں دے دیا جائے۔

یہاں یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ کسی قسم کی مذہبی، فرقہ وارانہ یا کسی سیاسی اطاعت اور

فرماں برداری کی شرط ہمایوں پر عائد نہ کی گئی۔ شاہ نے ہمایوں کو کچھ خطوط کامران اور سلیمان مرزا کے نام دیے جن میں ان لوگوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ جنگ سے گریز کریں اور ہمایوں کے ساتھ کسی قسم کا دوستانہ تصفیہ کریں۔ لیکن ہمایوں نے یہ خطوط ان لوگوں کو نہ بھیجے۔

قندھار کا محاصرہ کرلیا گیا۔ چونکہ اس کا فتح کرنا مشکل معلوم ہوا۔ لہٰذا ہمایوں نے شاہ کا خط بیرم خاں کی معرفت کامران کے پاس روانہ کیا۔ کامران نے اس پر سنجیدگی سے غور کیا اور سلیمان و ہندال اور دوسرے امراء پر سے اپنا زور کم کرلیا لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ کیا۔

اسی دوران ہمایوں ایک ایسی پہاڑی پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا جہاں سے قلعہ صاف نظر آتا تھا اور قلعہ پر موثر طریقے سے گولہ باری کی جاسکتی تھی۔ ان اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ قندھار اور کابل کے کچھ بااثر لوگوں نے کامران کا ساتھ چھوڑ دیا۔ چونکہ عسکری کو فوجی مدد نہ پہنچی اس لیے اس نے ستمبر ۱۵۴۵ء میں ہتھیار ڈال دیے اور اُس کو مقید کردیا گیا۔

ایرانی جنرل بوداغ خاں نے ہمایوں سے کہا کہ وہ قلعۂ قندھار کو مع ساز و سامان، اموال و اشخاص و مرزا عسکری کے شہزادۂ مراد کے سپرد کردے۔ ہمایوں قلعہ دینے پر تو رضامند ہوگیا لیکن اموال و اسباب کو وہ برابر برابر تقسیم کرنا چاہتا تھا نیز اپنے بھائی کو ان کے حوالے کرنے پر راضی نہ تھا۔ اس کے اور ایرانیوں کے درمیان شبہات اور ناگواری بڑھنے لگی۔ ادھر قندھار کے لوگ ایرانیوں کو ان کے مغرورانہ اور خود پسندانہ برتاؤ اور جبریہ روپیہ وصول کرنے کی روش کو ناپسند کرتے تھے۔

یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ شیعہ سپاہی اور سُنّی رعایا آپس میں مل کر نہ رہ سکتے تھے۔ چنانچہ باشندگانِ قندھار قدرتاً ہمایوں سے امداد کے طلب گار ہوئے۔ اس کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایرانی قندھار پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد بالکل مطمئن اور قانع ہوگئے تھے۔ اور وہ غزنی و کابل کی فتح میں ہمایوں کی مدد کرنے کے لیے آمادہ نہ تھے حالانکہ ہمایوں اور شاہ ایران کے درمیان جو سمجھوتہ ہوا تھا اس کے مطابق غزنی و کابل فتح کرنے کی شرط بھی شامل تھی۔ ہمایوں کا رویّہ بالکل فطری تھا خواہ قانونی طور پر مشتبہ ہو۔ ایرانیوں کو خود غرضی اور اپنے کیے ہوئے وعدے کو پوری طرح انجام دینے میں کوتاہی کے الزام سے مبرّا

نہیں کیا جا سکتا۔

ہمایوں نے قندھار کے باشندوں کے اتحاد اور جوڑ توڑ سے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ شاہ ایران کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے ہمایوں نے بیرم خاں کو قندھار کا صوبے دار مقرر کیا۔ قندھار کی فتح نے ہندال، یادگار ناصر مرزا اور دوسرے بہت سے ایسے امراء کو اس بات پر اکسایا کہ وہ ہمایوں سے جا ملیں اور اس کے وقار، اثر اور قوت میں اضافہ کریں۔ جب بہت سے افسران اور سپاہیوں نے کامران کا ساتھ چھوڑ دیا تو اس کے حوصلے پست ہوگئے اور وہ کابل سے فرار ہوگیا۔ ہمایوں نے کابل پر شیر شاہ کی وفات کے تقریباً چھ ماہ بعد از سر نو قبضہ کرلیا۔

شیر شاہ کے مقابلے میں ہمایوں کی ناکامی کی وجوہ پر بحث کرتے وقت بھائیوں کی آپس کی رنجش اور ہمایوں کی اخلاقی کمزوریوں مثلاً افیون کھانے اور نرمی و سستی برتنے کی عادت کو بہت اچھالا جاتا ہے۔ دانشمندان عصر حاضر ان توضیحات کو نہ صرف مبالغہ آمیز اور سطحی سمجھتے ہیں بلکہ بڑی حد تک نامناسب اور غیر عادلانہ تصور کرتے ہیں۔ ہمایوں کے مالوہ اور بنگال میں قیام کی وجوہ کو مناسب موقع پر بیان کیا جا چکا ہے جہاں سستی اور آرام طلبی کی خواہش کو کوئی دخل نہ تھا۔

یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ہمایوں کی سلطنت کے ابتدائی دس سالوں میں کامران کا رویہ مخاصمانہ نہ تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے احترام مخلصانہ مناسب اخلاق اور وفاداری کے ساتھ عمل کیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قنوج کی جنگ میں شکست کے بعد کامران کو اپنے بھائی کی اہلیت اور استعداد پر جو بھروسہ تھا وہ ختم ہوگیا اور اسی وجہ سے اس نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کردیا۔ کامران ہمایوں سے متفق الرائے نہ تھا۔ لہٰذا اس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ اپنا آزادانہ لائحہ عمل تیار کرے۔ اسے امید تھی کہ اس طرح کم از کم کابل، غزنی، بدخشاں اور قندھار کو قبضہ سے نکلنے سے بچایا جا سکتا ہے۔ اس نے یہ سمجھ لیا کہ اگر اپنے مفاد کو اس نے ہمایوں کے ساتھ وابستہ کردیا تو اس کے اپنے مقبوضات خطرے میں پڑ جائیں گے چنانچہ اس نے خود کو ملک بدر شہنشاہ سے علیحدہ کرلیا اور اس کو اس کے معاملات میں اکیلا چھوڑ دیا۔ جہاں تک عسکری کا سوال ہے اس نے کبھی غداری نہیں کی۔ اس نے شہنشاہ کی

حتی المقدور خدمت کی اور ہمایوں کی تمام اہم جنگوں میں خواہ وہ مشرق میں لڑی گئی ہوں خواہ مغرب میں ہمیشہ اُس کے ساتھ رہا۔ جب کامران شہنشاہ سے علیحدہ ہوگیا تو عسکری بھی کامران سے جا ملا جو اس کا ماں جایا بھائی تھا۔ کامران نے اس کو قندھار کی حکومت سونپ دی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عسکری کے دل میں ہمایوں کے لیے ایک نرم گوشہ تھا جب ہمایوں ایران کی طرف بھاگ رہا تھا تو عسکری نے چشم پوشی کی اور اکبر کے ساتھ محبت اور نرمی کا سلوک کیا۔

ہمایوں کے سب سے چھوٹے بھائی ہندال نے بغاوت کی لیکن بے دلی کے ساتھ اس کی قوتِ فیصلہ کمزور تھی اور اسی وجہ سے بعض باغی امراء کے بھڑکانے کے سبب افسوسناک حالات کا شکار ہوگیا۔

نازک صورتِ حال کے موقع پر ہندال کی کابلی چوسا میں ہمایوں کی زبردست پسپائی کا سبب بنی۔ یہ سب کچھ ہندال کی ذاتی خواہش کی بنا پر ہوا۔ وہ دراصل اس بات سے خوف زدہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کو بہار سے آگرہ فرار ہونے کی سزا دی جائے۔ اس کے بعد اس نے محض جذباتی وجوہ کی بنا پر ہمایوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور جس میں سندھ کی مصیبت بھری زندگی یا سیاسی عزائم کو کوئی دخل نہ تھا۔ وہ کامران کے ساتھ بھی خوش نہ رہ سکا اور جوں ہی حالات کا رُخ بدلا وہ فوراً ہمایوں کے ساتھ آملا۔ اس کے اور شہنشاہ کے درمیان تعلقات ہمیشہ محبت آمیز رہے۔

ہندال نے صرف ایک مرتبہ اپنے فرائض سے منہ موڑا اور ایسی احمقانہ حرکت کی جس کا ذکر اوپر ہوچکا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اس نے ہمایوں کی خدمت بڑی وفاداری اور مستعدی سے انجام دی اور آخرکار اس کی طرفداری میں لڑتا ہوا مارا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ اگر ہندال و کامران بروقت اور مستعدی کے ساتھ عمل کرتے تو چوسا کو شکست سے بچایا جا سکتا تھا۔ اس موقع پر ان کا خاموش رہنا غلط مشورے اور کوتاہ نظری پر مبنی تھا اور یہ ایک بہت ہی افسوسناک عمل تھا لیکن اس میں ہمایوں کو اس کے اختیارات یا زندگی سے محروم کرنے کی کسی خواہش کو دخل نہ تھا۔ ان لوگوں نے چوسا کی ہزیمت کے بعد شہنشاہ کی افسوسناک اور بے چارگی کی حالت کا کوئی فائدہ

نہ اُٹھایا۔

ان تمام عوامل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہمایوں کے بھائیوں کا اس کی ناکامی میں کوئی ہاتھ نہ تھا۔ دراصل چوسا کی شکست کے بجائے قنوج کی ہزیمت ہمایوں کے ملک چھوڑنے کا اصل سبب تھی۔ قنوج میں مغل طاقت کے زوال کی ذمّے داری نہ تو ہمایوں کے بھائیوں پر عائد ہوتی ہے اور نہ کامران پر۔

ہمایوں کے اخلاق و عادات کو بھی اس کی ناکامی کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ وہ بہادر، خاموش طبیعت، معتدل مزاج اور باوقار شخص تھا اور موافق حالات میں غیر معمولی کوشش اور مشقت سے گریز نہ کرتا۔ وہ مہربان، سخی، وسیع القلب، ذہین، مہذب، شائستہ اور شریف انسان تھا۔ ہمایوں ایک لائق ماہر فن حرب اور تجربہ کار سپہ سالار تھا۔ ان تمام صفات کے ساتھ وہ ایک محبوب اور کامیاب حکمران بن سکتا تھا۔

جہاں تک ہمایوں کی افیون خوری کا تعلق ہے اس کا یہ شوق بابر کے ہر قسم کی منشیات اور شوق کے مقابلہ میں ہیچ تھا۔ دراصل وہ بڑے اعتدال اور احتیاط کے ساتھ افیون کھاتا تھا اور اس نے کبھی اس طور پر استعمال نہ کیا کہ اس کی ذہنی صلاحیتیں اور اس کا ادراک و فہم متاثر ہو۔

اگر بابر نے ابراہیم لودی کو شکست نہ دی ہوتی تو اس کی کامیابیاں اس کے جانشین کی کامیابیوں کے مقابلے میں بہت کم ہوتیں۔ علاوہ ازیں اگر بابر کو ابراہیم لودی کے بجائے شیر شاہ سے نبٹنا پڑتا تو اس کی کامیابی اتنی یقینی نہ ہوتی۔ لیکن بابر ہمایوں کے مقابلے میں ایک بہتر شخصیت کا مالک تھا اور شاید اس کے ساتھ بہتر فوج بھی تھی۔ اس کے علاوہ بابر کی ایک فوقیت یہ تھی کہ اس کے پاس آتشیں اسلحے تھے جبکہ اس کے مخالفین اس سے محروم تھے۔

ہمایوں کو شیر شاہ اور بہادر شاہ جیسے دو قوی دشمنوں کی مشترکہ افواج سے مقابلہ کرنا پڑا جب کہ اس کے پاس وہ دو آخرالذکر چیزیں نہ تھیں جن سے کہ بابر فائدہ اٹھا سکا۔ وہ تجربہ، تنظیمی لیاقت، زمانہ سازی، موقع شناسی، حیلہ گری اور سیاسی چالبازی میں شیر شاہ کا مدِ مقابل نہ تھا۔

افغان سردار فن حرب و سپاہ آرائی میں اگر ہمایوں سے برتر نہ تھا تو اس کا

ہم پلہ ضرور تھا۔ اس کی فوج اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے کے قومی جوش سے سرشار تھی۔ اس وقت تک افغان فن تلغما سے پوری طرح آشنا ہو چکے تھے۔ اگرچہ بہادر شاہ ایک جنرل کی حیثیت سے ہمایوں سے بہت کمتر تھا لیکن اس کے پاس گجرات کے سارے مادی و اخلاقی وسائل موجود تھے۔

ہمایوں کی کمزوری کا دوسرا سبب اس کی فضول خرچی اور مالی معاملات میں اس کی کم اہلی تھی۔ شاید اس کو یہ کمزوری اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہمایوں بنگال میں مصروف پیکار تھا تو مرکزی حکومت فوجی یا کسی قسم کی مالی امداد ہمایوں کے پاس روانہ نہ کر سکی اور اس نازک لمحے میں مال و اسباب کی کمی نے اس کے بہی خواہوں اور حامیوں کے جوش کو بھی ٹھنڈا کر دیا۔

ہمایوں بالطبع شکی مزاج نہ تھا اور ہر شخص کو صادق القول سمجھتا تھا۔ اگر وہ شیر شاہ پر بھروسہ نہ کرتا اور احتیاط سے کام لیتا تو شاید چوسا کا افسوسناک واقعہ وجود میں نہ آتا۔ اس کی اس کمزوری سے افغان سردار شیر شاہ اور سندھ کے ارغون حکمران نے کئی مرتبہ ناجائز فائدہ اٹھایا۔

ہمایوں بے رحم تقدیر کا بھی شکار تھا۔ عسکری کی اس مہم میں یہ ناکامی کہ وہ تردی بیگ کو مدد دینے کے لیے رضامند نہ کر سکا اور شہزادے کا یہ افسوسناک فیصلہ کہ وہ شمال کی طرف چلا جائے، گجرات اور مالوہ دونوں جگہ مغلوں کی شکست کا باعث بنے۔ بنگال کے حاکم محمود شاہ کے چند مہینے اور ثابت قدم نہ رہنے کی وجہ سے مشرقی علاقے کی ساری سیاست بدل گئی اور ہمایوں غیر متوقع مشکلات میں پھنس گیا۔ قنوج میں اس کا کیمپ وسط مئی کی اچانک اور زبردست بارش میں گھر گیا جس کے سبب اس کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ اور یہ بات بڑی حد تک شکست کا باعث بنی۔ ہمایوں کی نہ تو قسمت ہی اچھی تھی اور نہ ہی قدرت نے اس کو اہلیت ہی بخشی تھی کہ وہ ان زبردست مسائل کا بوجھ برداشت کر سکے جن کا اسے سامنا کرنا پڑا۔ اس کے سب سے بڑے مخالف شیر شاہ کو یہ دونوں صفات میسر تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں کا دماغ صرف ایک ہی طرف جھکا ہوا تھا۔ اگر کوئی بات اس کے منصوبے کے خلاف وجود میں آتی تو حالات کے مطابق وہ اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر پاتا۔ وہ نئی مشکلات اور حالات میں

اس بات کا اندازہ کیے بغیر کہ ان کے کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں آسانی سے پھنس جاتا اور شاید یہ بات اس وجہ سے تھی کہ اس کو اپنی محدودیت کا اندازہ نہ تھا۔ مثلاً اس کو بنگال اور گجرات جیسے دور دراز علاقوں میں فوجی مہم سر کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ مالوہ اور بہار میں اپنی طاقت مستحکم کرنے کے بعد ان علاقوں کو فتح کر سکتا تھا۔ وہ ہر اس کام کو جو بتدریج انجام پا سکتا تھا ایک دم پورا کرنا چاہتا تھا۔ اس کے سیاسی نظریات ناقص ہوتے اور ان سے اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ وہ نہ تو انسانوں اور ان کی نیتوں کا صحیح اندازہ لگا سکتا تھا اور نہ سیاسی حالات و انتظامی امور کا۔ بحیثیت سیاست داں وہ نہ تو بابر کا ہم پلہ تھا اور نہ شیر شاہ کا۔ اس میں اس بات کی بھی استعداد نہ تھی کہ ان علاقوں کو جن کو اس نے بغیر سوچے سمجھے ایک ذہنی دورہ کی کیفیت میں فتح کر لیے تھے انھیں ایک رشتے میں پرو دیتا۔ وہ ان پر پوری طرح قبضہ نہ جما سکا اور ان کے ہاتھ سے نکل جانے کے سبب ہمایوں کی قسمت اور سلطنت دونوں کو زبردست دھکا پہنچا۔

سلسلے وار تاریخی واقعات

واقعہ	تاریخ
ہمایوں کی تخت نشینی	30 دسمبر 1530
بہادر شاہ کی فتح مالوہ	مارچ 1531
ہمایوں کا محاصرہ کالنجر	ستمبر 1531
بہادر کی فتح اجین	دسمبر 1531
ہمایوں کا چنار پر پہلا محاصرہ	فروری 1532
بہادر کی فتح رائے سین، چندیری و مندسور	مئی۔جون 1532
جنگ دورا	اکتوبر 1532
بہادر شاہ کا چتوڑ پر پہلا حملہ	نومبر۔دسمبر 1532
ہمایوں چنار کا محاصرہ اٹھا لیتا ہے	جنوری 1533
ہمایوں کی گوالیار میں آمد	فروری 1533
بہادر شاہ چتوڑ کا پہلا محاصرہ اٹھا لیتا ہے	مارچ 1533
ہمایوں کی گوالیار سے واپسی	مارچ 1533
بہادر شاہ کی فتح رنتھنبور و اجمیر	1533
دین پناہ کی بنیاد	اگست 1533
محمد زمان کی دوسری بغاوت	1533 - 34
ہمایوں کی آگرہ سے کالپی کو روانگی	نومبر 1534
تاتار خاں کی شکست	جنوری۔فروری 1535
بہادر شاہ کی فتح چتوڑ	مارچ 1535
بہادر شاہ کا مندسور سے فرار	اپریل 1535
بہادر شاہ کا چانپانیر سے فرار	جون 1535
ہمایوں کی کیمبے سے واپسی	اکتوبر۔نومبر 1535

کامران کا ایرانیوں سے دوبارہ قندھار فتح کرنا	جنوری	1536
ہمایوں کی فتح چپانیر	اگست	1536
ہندوستان میں محمد سلطان مرزا کی بغاوت	جولائی۔ اگست	1536
عسکری کا بحیثیت صوبہ دار گجرات میں تقرر	اگست	1536
گجرات میں مغلوں کے خلاف بغاوت	نومبر	1536
عسکری کی چپانیر کی طرف پسپائی	دسمبر	1536
ہمایوں آگرے میں	فروری	1537
محمد سلطان مرزا کی شکست	فروری	1537
چنار کا محاصرہ اور فتح	جنوری۔ فروری	1538
ہمایوں کی پٹنہ میں آمد	اگست	1538
ہمایوں کی گوڑ میں آمد	اکتوبر	1538
شیخ بہلول کا قتل	دسمبر	1538
ہمایوں کی گوڑ سے روانگی	جنوری	1539
ہمایوں کی چوسا میں آمد	مارچ۔ جون	1539
شیر خاں کی فتح قنوج	فروری۔ مارچ	1540
قنوج کی جنگ	17 مئی	1540
ہمایوں کی لاہور میں آمد	جولائی۔ اکتوبر	1540
ہمایوں کا حمیدہ بانو سے عقد	21 اگست	1541
ہمایوں جودھپور میں	مئی	1542
ہمایوں امرکوٹ میں	اگست	1542
اکبر کی ولادت	15 اکتوبر	1542
ہمایوں کی سندھ سے روانگی	جولائی	1543
ہمایوں کی طہماسپ سے ملاقات	جولائی	1544
ہمایوں کی فتح قندھار	ستمبر	1545
ہمایوں کی فتح کابل	نومبر	1545

ہمایوں کے بارے میں مزید مطالعہ کے لیے ملاحظہ فرمائیں

فارسی :

ابوالفضل۔ اکبرنامہ جلد اوّل۔ انگریزی ترجمہ بیورج
عبدالقادر بدایونی۔ منتخب التواریخ۔ انگریزی ترجمہ رانکن
نظام الدین۔ طبقات اکبری۔ انگریزی ترجمہ بی۔ ڈے
ابوالقاسم فرشتہ۔ گلشن ابراہیم۔ انگریزی ترجمہ برگز
عباس خاں۔ تاریخ شیرشاہی۔ انگریزی ترجمہ ایلیٹ
گلبدن۔ ہمایوں نامہ۔ انگریزی ترجمہ۔ بیورج
جوہر۔ تذکرۃ الواقعات۔ انگریزی ترجمہ اسٹیوارٹ۔ سی
حیدر دوغلات۔ تاریخ رشیدی۔ انگریزی ترجمہ ایلیاس وراس

ان کے علاوہ جن کتابوں کا بابر اور شیرشاہ کے ضمن میں ذکر ہوا ہے اور خاص طور سے تزک کا مطالعہ کریں۔

انگریزی :

Elliot and Dowson: History of India, Vol.V

Erskine: History of India under Babar and Humayun, Vol. II

Banerji, S.K.: Humayun Badshah

Qanungo, K.R.: Sher Shah

باب 5

شیر شاہ

شیر شاہ ان عظیم ہستیوں میں سے ایک ہے جو خاک سے اُٹھے اور اپنی ہمت، لیاقت، اثر و رسوخ اور تلوار کے زور سے شہرت اور ترقی کے بلند ترین مدارج پر پہنچے۔ وہ نہ تو پوتڑوں کا امیر تھا نہ اسے اس بات کا فخر تھا کہ وہ کسی مذہبی یا فوجی سردار کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا دادا شاید گھوڑوں کا سوداگر تھا اور جب اس کو اپنی حقیر تجارت سے کچھ زیادہ منافع نہ ہوا تو اس نے سلطان بہلول لودی کی افغانوں کو صلائے عام کو لبیک کہا اور اپنے بیٹے حسن کو ساتھ لے کر روہ کے ناہموار علاقے سے ہندوستان کی طرف کوچ کیا۔

حصار فیروزہ میں ایک افغان سردار جمال خاں نے اس کو ملازم رکھ لیا اور پچاس سوار رکھنے کے لیے چند گاؤں جاگیر میں دے دیے۔ آہستہ آہستہ ترقی کر کے وہ پانچ سو سواروں کا کمانڈر مقرر ہوا اور حصار کی جاگیر عطا ہوئی۔

حصار فیروزہ میں جسے نارنول بھی کہتے ہیں حسن کی افغان بیوی کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام فرید تھا۔ اس کی صحیح تاریخ پیدائش کا علم نہیں لیکن 1472ء اور 1486ء اس کے سال پیدائش بتائے جاتے ہیں۔ ابراہیم کی وفات کے بعد اس کے بیٹے کو جاگیر مل گئی۔ حسن کی چار بیویاں تھیں۔ فرید اور اس کے ماں جائے بھائی نظام کے علاوہ چار لڑکے اور تھے۔ کہا جاتا ہے کہ حسن اپنی سب سے چھوٹی بیوی اور اس کے دو لڑکوں سلیمان اور احمد سے بہت لگاؤ رکھتا تھا۔

چند سال بعد جمال خاں مشرقی صوبوں میں تبدیل ہوگیا اور حسن اور اس کا خاندان بھی جمال خاں کے ساتھ منتقل ہوگیا۔ حسن سہسرام میں قیام پذیر ہوگیا جو خواص پور ٹانڈا کے ساتھ اسس کو جاگیر میں ملا تھا۔

یہاں فرید کے تعلقات اپنے باپ سے بہت کشیدہ ہو گئے کیوں کہ حسن اس کے سوتیلے بھائیوں کی طرفداری کرتا تھا۔ فرید نے بہت مایوسی کی حالت میں باپ کے گھر کو خیرباد کہا اور جونپور چلا گیا جو اس وقت صوبے کی حکومت کا صدر مقام اور علم و ادب کا مرکز تھا۔

کہا جاتا ہے کہ فرید چند سال جونپور میں رہا اور اپنا وقت مفید کاموں میں گزارا اس نے فارسی پڑھی، کچھ عربی کا علم بھی حاصل کیا اور تاریخ و سوانح کی طرف خاص توجہ دی۔ یہاں رہ کر اسس نے صوبے کے فوجی اور ملکی انتظام کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے زمانے کے کچھ علمار اور درویشوں کے ساتھ جن کا عوام پر بہت اثر تھا شناسائی حاصل کی۔ فرید نے اپنی دانش وری، حُسنِ اخلاق، تندہی، محنت اور مردانہ خصوصیات کے سبب جونپور میں شہرت حاصل کرلی۔

فرید کی کامیابیوں کی اطلاعات اور حسن کے دوستوں کے متواتر اصرار سے حسن کو ترغیب ہوئی کہ وہ فرید کو جونپور سے اسس وعدے پر بلالے کہ وہ اس کو اپنے پرگنوں کا انتظام سونپ دے گا۔ کچھ تردّد کے بعد فرید نے اپنے باپ کی بات مان لی۔

فرید نے اپنے باپ حسن کے پرگنوں کا جتنا عمدہ انتظام کیا اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اسس نے بدامنی پیدا کرنے والوں کو کچل دیا۔ سرکاری ملازمین کے ظلم و ستم کا قلع قمع کر دیا اور اسس طرح حسن کی جاگیر میں خوش حالی اور امن کا دور دورہ ہوگیا۔ اس کے انتظام میں دو باتیں خاص توجہ کے لائق ہیں۔ اول تو یہ کہ اس نے کاشت کاروں کو ایک طرح کی مقامی فوج میں بدل دیا اور ان کی مدد سے بہت سے سرپھرے اور غارت گر زمینداروں کو مغلوب کر دیا۔ دوسرے یہ کہ اس نے زارعین کو لگان کے تعین میں ہر ممکن اور مناسب سہولتیں بہم پہنچائیں لیکن اسس کی وصولیابی میں سختی سے کام لیا۔ اس نے کوئی انتہا پسندانہ اصلاحات رائج نہیں کیں بلکہ اسس نے ہر جگہ کے کاشتکاروں کو اس بات کا اختیار دیا کہ لگان کے تعین کے سلسلے میں وہ اپنی مرضی سے کسی بھی ایک قاعدہ کو جو کہ اس وقت

اس کی جاگیر میں رائج تھے اختیار کرلیں اور اس پر پابند رہیں. بیشتر کاشت کاروں نے اسی قاعدے پر پابند رہنے کو ترجیح دی جس کے وہ عادی تھے۔

حسن فرید کی انتظامی لیاقت اور جاگیر کی خوشحالی سے بہت خوش ہوا لیکن فرید کی سوتیلی ماں نے حسن سے کہا کہ اس کے بچوں کو بھی جاگیر کے انتظام کا موقع ملنا چاہئے۔ فرید جاگیر کا انتظام کم و بیش بیس سال سے کر رہا تھا اور اب وہ اس کام کو اپنا اجارہ سمجھتا تھا۔ اس کی سوتیلی ماں کی خواہش مناسب و معقول تھی۔ حسن آخرکار یہ خبر پاکر کہ ایک لڑکی نے فرید کی جذباتی محبت کا شکار ہوکر خودکشی کرلی ہے' اپنی بیوی کی بات ماننے کا فیصلہ کرلیا۔

فرید اول تو اپنے عشق کے افسوسناک انجام کی وجہ سے اندوہگین تھا ہی اس پر جب یہ پتہ چلا کہ اس کے باپ نے جاگیر کا انتظام اس کے سوتیلے بھائیوں کو سونپنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو وہ اور پریشان ہوگیا۔ اس نے پہلے تو یہ چاہا کہ اپنے باپ کے اس فعل کی جو اس کی نظروں میں ایک جابرانہ اور جانبدارانہ عمل تھا مخالفت کرے لیکن اس نے اپنے بہی خواہوں کی نیک صلاح مان کر یہ خیال ترک کردیا اور یہ فیصلہ کیا کہ کہیں اور قسمت آزمائی کی جائے۔ چنانچہ وہ 1519ء میں اپنا کاروبار چھوڑ کر آگرے کی طرف روانہ ہوگیا۔

آگرے میں اس نے دولت خاں کے پاس ملازمت کرلی۔ دولت خاں اس کے کام سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے سلطان ابراہیم لودی سے اس کا ذکر کیا اور یہ درخواست کی کہ حسن کی جائداد فرید کو منتقل کردی جائے۔ لیکن سلطان نے فرید کی درخواست کو جو اس نے دولت خاں کے ذریعہ پیش کی تھی قبول کرنے سے انکار کردیا کیونکہ سلطان کے نزدیک باپ کی برائی کرنا بڑا ہی کمینہ پن تھا۔ یہ واقعہ 1520ء کا ہے۔

خوش قسمتی سے حسن کا اسی سال انتقال ہوگیا۔ فرید تیزی سے سہسرام پہنچا اور اپنے سوتیلے بھائی کو بے دخل کرکے باپ کی ساری جاگیر پر قابض ہوگیا۔ ناکام اور نامراد جوان سور قبیلہ کے سب سے زیادہ بااثر سردار محمد خاں جاگیردار چوند کی پناہ میں جا پہنچے اور اس نے ان لوگوں کی طرفداری کی۔

فرید نے اس خوف سے کہ حالات نازک صورت اختیار نہ کرلیں 1528ء میں اس

امید پر بہار کے بہادر خاں نوہانی کی ملازمت کر لی کہ ممکن ہے کہ اس کے اثر سے اس کی پریشانیاں ٹل جائیں۔

بہادر خاں فرید کی محنت اور لیاقت سے بے انتہا متاثر ہوا۔ اسی زمانے میں فرید نے شیر کو مار کر شیر خاں کا خطاب حاصل کیا۔ کچھ عرصے بعد اس کو جلال خاں کا، جو کہ ولیعہد تھا نائب اور اتالیق مقرر کر دیا گیا۔

ایک مرتبہ شیر خاں رخصت لے کر اپنی جاگیر پر گیا لیکن بلا کسی معقول عذر کے وقت سے زیادہ قیام کیا۔ محمد خاں سور نے شیر خاں کے خلاف بہار کے سلطان کے کان اس حد تک بھرے کہ وہ ناراض ہو گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر محمد خاں نے یہ سوال اٹھایا کہ شیر خاں کی جائداد اس کے سوتیلے بھائیوں میں بھی تقسیم ہونی چاہیے لیکن شیر خاں نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ تب اس نے شیر خاں پر اس کی جاگیر میں ہی حملہ کر دیا۔

شیر خاں نے جب دیکھا کہ وہ محمد خاں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو بہار سے فرار ہو گیا اور 1527ء میں جنید برلاس کی ملازمت اختیار کر لی۔ جنید کو بابر نے مشرقی صوبہ کا صوبیدار مقرر کیا تھا۔ فرید نے جنید برلاس کی مدد سے اپنی جاگیر پھر سے حاصل کر لی اور محمد سور کو نکال باہر کیا۔

جنید شیر خاں کو آگرے لے گیا اور اپنے بھائی خلیفہ سے جو کہ وزیر اعظم تھا اس کی تعریف کی۔ شیر خاں پندرہ مہینے مغل فوج میں رہا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر شیر خاں نے مغلوں کے اخلاق و عادات، طور طریقوں اور انتظامی امور کا بغور مطالعہ کیا۔ وہ خوش قسمتی سے بابر کے ساتھ 1528ء میں چندیری کی مہم پر بھی گیا۔ 1529ء میں مشرقی صوبجات میں اس کی فوجی کارروائیوں کو دیکھا اور اس طرح مغلوں کی فوجی تنظیم و طرز جنگ کا قریب سے مطالعہ کیا۔ بابر نے جو کہ شیر خاں کی لیاقت سے خوش تھا اس کی کھوئی ہوئی جاگیر 29-1528ء میں واپس دلا دی۔

اب شیر خاں نے اپنی طاقت مجتمع کرنے اور جاگیر کے انتظام کی درستی کی طرف توجہ کی۔ اسی دوران ابراہیم لودی کے بھائی سلطان محمد لودی اور اس کے ہمراہ دوسرے امراء اعلیٰ لودی اور فرملی کی آمد نے اس کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ ان کے ساتھ

شریک ہو جائے۔ بہرحال اس نے اپنی پہلی فرصت میں بابر سے جب کہ وہ 1529ء میں مشرق کی سمت جارہا تھا اپنی معذرت کا اظہار کر دیا۔

چند ماہ بعد بہار کے نابالغ حکمران جلال خان کی ماں دودو نے شیر خاں کو بلایا اور جلال خاں کا نائب مقرر کر دیا۔ شیر خاں نے اس حیثیت سے سیاسی تدبر اور ملکی انتظام میں مہارت حاصل کر لی جو آگے چل کر اس کے بہت کام آئیں۔

شیر خاں نے ملکی اور فوجی انتظامات میں جو دسترس حاصل کی تھی اس کے نتیجے میں نوہانیوں کے درمیان اس کے خلاف حسد و ناراضگی پیدا ہو گئی۔ شیر خاں نے ان کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ حکومت کے مالی یا فوجی شعبہ جات میں سے کسی ایک کو اپنے لیے منتخب کر لیں۔ ان لوگوں نے اس بات کا اندازہ لگائے بغیر کہ اب مشکل ہی سے کوئی علاقہ ایسا باقی رہ گیا ہے جس کو فتح کرنا سود مند ہوگا اور یہ سمجھے بغیر کہ انھیں ہر کام کے لیے دیوان سے مالی اخراجات کی اجازت حاصل کرنا ہو گی فوجی شعبے کو اپنے لیے منتخب کر لیا۔ جب انھوں نے خود کو مایوس کن حالات میں پایا تو بنگال جا کر نصرت شاہ سے مدد مانگی کہ وہ ان کو اختیارات واپس دلا دے۔

شیر خاں نے ان کی مشترکہ افواج کو ستمبر اکتوبر 1530ء میں سورج گڑھ کے مقام پر شکست دی اور اس طرح نوہانیوں کی اقتدار کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ اس شکست کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال کے حکمراں کی کمزوری کا راز فاش ہو گیا اور سور قبیلے کے ابھرتے ہوئے سردار کو اپنی آرزوؤں کی تکمیل میں مدد ملی۔

شیر خاں نے مشکل ہی سے اپنی نئی فتوحات پر قبضہ جمانے کا کام شروع کیا تھا کہ بہار میں بیبن، بایزید اور دوسرے بڑے امراء کے ساتھ محمود لودی کی آمد نے اس کام کو پس پشت ڈال دیا۔ اس کو مجبوراً ان کا ساتھ دینا پڑا۔ اور جب انھوں نے ہمایوں کے خلاف کوچ کیا تو ان کے ساتھ جانا پڑا۔ اس نے مغل بادشاہ کے ساتھ گفت و شنید کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی غیر جانب داری کے سبب دورا کے مقام پر 1532ء میں افغانوں کو شکست ہوئی اور وہ افغانوں کا ایک نمایاں سردار ہو گیا۔

شیر خاں کی ہمایوں سے جھڑپوں کا ذکر موخر الذکر کے دوران حکومت کے بیان میں آچکا ہے لیکن مغل سلطنت کے مشرقی صوبوں اور بہار و بنگال میں شیر خاں کی پیش قدمی

کا ذکر محض برسبیل تذکرہ تھا۔ اب ضروری ہے کہ اس کو واضح طور پر تحریر کیا جائے۔
ہمایوں کی دوسرے مقامات پر مصروفیت سے شیر خاں نے فائدہ اٹھا کر اپنی طاقت کو منظم اور مستحکم کیا۔ اس نے حکم دیا کہ ہر بالغ افغان فوج میں شریک ہو۔ اس نے ان کو اخلاقی و فوجی تربیت دی تاکہ وہ افغان حکومت کی بازیابی کی منظم کوشش میں اس کے مددگار ثابت ہو سکیں۔ اس نے ایک زبردست فوج تیار کی جس میں پندرہ سو کشتیوں کا ایک بیڑا اور اسی قدر ہاتھی شامل تھے۔
اس کی پیادہ فوج مضبوط تھی لیکن سواروں کی فوج ابھی کمزور تھی۔ اس کے باوجود اس کی فوجی طاقت اتنی تھی کہ وہ پورے بہار کو فتح کر سکتی تھی۔ چنانچہ 1538ء میں گوڑ پہنچ کر بنگال کے حکمراں کو اپنی شرائط ماننے پر مجبور کر دیا۔
اگلے سال اس نے گوڑ کا محاصرہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ محاصرہ خراج کی بقایا وصول کرنے اور اس کو فتح کرنے کی نیت سے کیا تھا۔ چھ مہینے کے شدید محاصرے کے بعد گوڑ فتح کر لیا۔ جس دوران میں شیر خاں بنگال میں مصروف تھا ہمایوں نے چنار فتح کر لیا لیکن چنار کے ہاتھ سے نکل جانے سے جو نقصان ہوا تھا شیر خاں نے چالبازی سے رہتاس کے قلعہ کو فتح کر کے اس کی تلافی کر لی۔ اور اب وہ اس قلعہ میں اپنے خزانے اور خاندان کو محفوظ طریقے پر رکھ سکتا تھا۔
چوسا اور قنوج کے مقامات پر اس نے ہمایوں پر جو فتوحات حاصل کیں ان کے نتیجے میں وہ نہ صرف شیر شاہ بن گیا بلکہ ان فتوحات نے اس کو 1540ء میں دہلی کے شاہی تخت پر بیٹھنے میں مدد دی۔ تخت نشینی کے بعد اس کا پہلا فرض یہ تھا کہ وہ گھکڑوں کو قابو میں لائے ———— اور مغلوں کی واپسی کے امکانات کو ختم کر دے۔
گھکڑ ایک نیم وحشی جنگجو غارت گر قبیلہ تھا جو کہ دریائے سندھ و جہلم کے بالائی علاقے کے پہاڑوں پر آباد تھے جہاں آج کل ہزارا، راولپنڈی اور جہلم کے اضلاع واقع ہیں۔ جب شیر خاں نے ان سے یہ چاہا کہ وہ اس کی حاکمیت کو تسلیم کر لیں تو انھوں نے جواب دیا
"ہم شیر اور سپاہی ہیں تم کو ہم سے سوائے دشمنی اور تیروں کے کچھ نہ ملے گا۔"
شیر شاہ اس منہ پھٹ جواب سے غضب ناک ہو گیا اور کہا کہ وہ "سب گکڑوں (گھکڑوں) کے سینوں کو ایسی برچھیوں کا نشانہ بنائے گا جو قیامت تک چھدی رہیں گی۔" چنانچہ جنگ کا اعلان

کر دیا گیا۔ یہ جنگ گھکڑوں کے علاقے کی جغرافیائی خصوصیات کے سبب طول پکڑ گئی۔ گھکڑ عشق آزادی میں سرشار اور اپنے فن شمشیر زنی پر مغرور تھے۔ انھوں نے طویل عرصے تک جی توڑ مقابلہ کیا۔ شیر شاہ نے جوشِ انتقام میں ان کے وطن کو اجاڑ دیا اور جتنے آدمی گرفتار ہو سکے ان سب کو جنگی قیدی بنا لیا۔ اس نے حکم دیا کہ ان ضدی لوگوں کو قابو میں رکھنے اور سرحدات کی حفاظت کے لیے رہتاس میں قلعہ تعمیر کیا جائے۔ گھکڑوں نے ہر ممکن طریقے سے رکاوٹیں ایجاد کیں لیکن قلعہ ٹوڈرمل کھتری کی نگرانی میں تعمیر ہو گیا۔

شیر شاہ نے پنجاب کے قیام کے دوران ایک مفرور کشمیری شہزادے کو فوجی مدد فراہم کی تاکہ وہ حیدر مرزا کو کشمیر سے نکال دے لیکن یہ مہم کامیاب نہ ہو سکی۔

ابھی پنجاب کے استحکام اور صلح و امن کے قیام کا کام پوری طرح انجام بھی نہ پایا تھا کہ شیر شاہ کو بنگال جانا پڑا۔ بنگال کے گورنر خضر خاں نے وہاں کے سابق حاکم محمود شاہ کی لڑکی سے 1541ء میں شادی کر لی اور آزادی کے منصوبے بنانے لگا۔ حالانکہ خضر خاں شیر شاہ کے استقبال کے لیے آیا لیکن اس کو گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔ بنگال کیوں کہ ایک وسیع صوبہ تھا لہٰذا اس بات کا امکان تھا کہ وہاں کا گورنر خودسر ہو جائے گا۔

چنانچہ شیر شاہ نے صوبے کو متعدد علاقوں میں تقسیم کر دیا۔ ان علاقوں میں سے ہر ایک میں اس نے ایک ایک کمشنر مقرر کر دیا اور ان کے کاموں میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے قاضی فضیلت کو امینِ بنگالا یا امیرِ بنگالا مقرر کیا۔

بہادر شاہ کی وفات کے بعد گجرات میں ابتری پھیل گئی۔ اس ابتری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ملو خاں نے جس کے متعلق پہلے ذکر ہو چکا ہے خود کو مانڈو کا آزاد حکمراں ہونے کا اعلان کر دیا اور قادر شاہ کا لقب اختیار کیا۔ اس کے اس ناجائز قبضے کو گجرات کے وزیر عماد الملک نے وہاں کے نابالغ بادشاہ مظفر سوم کے حق میں تسلیم کر لیا۔ قادر شاہ کے علاوہ جو کہ مانڈو، اجین، سارنگ پور اور رنتھنبور پر حاکم تھا دوسرے سرداروں نے بھی مالوہ کے علاقوں میں اپنی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔

اس وقت سکندر خاں میانہ، سیواس اور ہنڈیا پر حکمراں تھا اور راجہ پرتاپ شاہ رائے سین چندیری اور بھوپال کے علاقے پر قابض تھا اسنے بیجا گڑھ

اور ناماٹا کو بھی اپنے علاقہ میں شامل کر لیا۔

شیر شاہ نے بنگال سے واپسی پر قادر شاہ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ قادر شاہ نے شیر شاہ کو یہ استفسار کر کے ناراض کر دیا تھا کہ اس کو کیا حق ہے کہ اسے جو فرمان بھیجا گیا ہے اس پر چوسا کی فتح یابی کے بعد بادشاہ ہونے کا لقب اختیار کیا ہے اور اس کے اظہار کے لیے سرِ فرمانِ شاہی مہر بھی ثبت کی ہے۔

قادر شاہ کا کہنا تھا کہ اس مہر کو کوئی بادشاہ ہی استعمال کر سکتا ہے جب وہ کسی جاگیردار کے نام فرمان جاری کرے۔ اس جیسے خود مختار حکمران کے فرمان پر اس قسم کی مہر استعمال نہیں کی جا سکتی۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ کالپی کی لڑائی میں قطب خاں کی شکست اور موت کو اس بات پر محمول کیا کہ قادر شاہ نے اس کی مدد نہ کی۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ ہمایوں سندھ میں کسی مناسب مقام کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ چنانچہ مالوہ جیسا کمزور علاقہ خطرے کا موجب ہو سکتا تھا۔ چوتھی وجہ یہ تھی کہ مالدیو فتوحات حاصل کرنے کی سنجیدہ کوشش کر رہا تھا اور در اصل اس بات کا خواہش مند تھا کہ مالوہ پر قبضہ جمالے۔ اگر مالدیو اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو اس کی طاقت خطرناک حد تک بڑھ جاتی۔

ان باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شیر شاہ نے فوج کی کمان خود اپنی سرکردگی میں سنبھالی اور کوچ کا حکم دیا۔ راستے میں گوالیار کے مضبوط قلعے کو عبدالقاسم سے فتح کر لیا جسے ہمایوں نے مقرر کیا تھا۔

جب وہ گگرون پہنچا تو رائے سین کے حاکم راجہ پرتاپ شاہ کے طاقت ور نائب پورن مل نے شیر شاہ کو خراج عقیدت پیش کیا۔ قادر شاہ ہمت ہار بیٹھا اور وہ بھی سارنگ پور کے مقام پر شیر شاہ سے اظہارِ اطاعت کے لیے آ پہنچا۔ شیر شاہ نے مناسب نہ سمجھا کہ مانڈو قادر شاہ کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ اس نے اس کو کالپی کی حکومت یا بنگال میں جاگیر کی پیش کش کی۔

قدرتی بات تھی کہ قادر شاہ اس پیش کش کو قبول نہ کر سکتا تھا۔ لہٰذا رات کو وہ اپنے خاندان والوں کے ہمراہ گجرات کی سمت فرار ہو گیا اور اپنی نئی سلطنت شیر شاہ کے ہاتھوں میں چھوڑ دی۔ جب شیر شاہ اجین پہنچا تو سکندر اظہارِ اطاعت کے لیے حاضر ہوا۔

شیرشاہ قادر شاہ کے فرار سے سبق حاصل کر چکا تھا۔ لہٰذا اس نے سکندر کی نیت پر شک کرتے ہوئے اس کی گرفتاری کا حکم دیا اور اس کی ریاست ضبط کر لی۔

شیر شاہ نے مالوہ کی حکومت وانتظام کے لیے اپنے حکام مقرر کیے اور پھر رنتھنبور کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں کے حاکم عثمان خاں نے بغیر کسی مخالفت کے قلعہ سونپ دیا۔ اس طرح ایک مختصر سی مدت میں سارا مالوہ اور رنتھنبور شیر شاہ کے قبضے میں آگیا۔ شیر شاہ نے اس علاقے کے انضباط و استحکام کا کام اپنے معتمد حکام کے سپرد کیا اور آگرہ واپس آیا۔ اس کی واپسی کے کچھ عرصے بعد 1542ء میں قادر شاہ نے اپنی ریاست حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس کو زبردست ہزیمت اٹھانی پڑی۔

شیر شاہ نے بہار کا مختصر دورہ کیا۔ اس دوران میں اس نے صوبے کی ازسرِ نو تنظیم کے لیے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی سرحدوں کا تعین کیا کیوں کہ یہ کام بنگال کی ریاست کی تقسیم کے سبب بہت ضروری ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے دریائے گنگا اور گنڈک کے سنگم پر شہر پٹنہ کی بنیاد رکھی اور ایک مضبوط قلعہ کی تعمیر کی جو چنار کے قلعہ کی طرح فوجی اور تجارتی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ صوبائی حکومت کا مرکز شہر بہار سے اس نئے شہر میں منتقل کر دیا گیا اور اس وقت (43-1542) سے آج تک یہ شہر برابر اپنی اہمیت کے لحاظ سے ترقی کرتا چلا جا رہا ہے۔

رائے سین اور چندیری کی مضبوط راجپوت ریاستوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو جنھیں چتوڑ کے رانا کی حمایت حاصل تھی۔ اسے مالوہ، گجرات یا دہلی کے حکمرانوں نے کبھی بھی پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھا۔

چندیری کو بابر نے فتح کر لیا تھا اور بہادر شاہ نے رائے سین کو فتح کر لیا تھا۔ بہادر شاہ کی موت کے بعد افراتفری پھیلی تو رائے سین اور چندیری پر پورن مل نے قبضہ کر لیا۔ پورن مل مشہور و معروف سیلاہدی (سیلہاری) کا فرزند تھا جو کہ اپنے بڑے بھائی کے بیٹے راجہ پرتاپ کی طرف سے بحیثیت نائب کے حکومت کرتا تھا۔

شیر شاہ نے مالوہ پر پہلے حملے کے وقت پورن مل کو گوالیار کے حاکم رام شاہ کے ذریعے وفاداری کا اعلان کرنے کی دعوت دی۔ شجاعت خاں نے پورن مل کو شیر شاہ کے حضور میں پیش کیا۔ شیر شاہ نے سو خلعت فاخرہ اور سو گھوڑے عنایت کیے۔ اس نے

اپنے چھوٹے بھائی کر اقعان بادشاہ کی خدمت میں چھوڑدیا اور اس کو اجازت دے دی گئی کہ وہ رائے سین واپس چلا جائے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک شیر شاہ کا یہ ارادہ نہ تھا کہ راجپوتوں سے چھیڑ چھاڑ کی جائے۔ وہ مالوہ پر اپنی حکومت و اقتدار کے قیام سے بالکل مطمئن نظر آتا تھا۔

بنگال و بہار کے معاملات کا انتظام کرنے کے بعد شیر شاہ کا رویہ بدل گیا۔ کہا جاتا ہے کہ شیر شاہ نے بہار میں اپنی علالت کے دوران یہ قسم کھائی کہ وہ پورن مل کو اُن الزامات کے بدلے میں سزا دے جو کہ بہادر شاہ نے سیلاہدی کے خلاف عائد کیے تھے۔ ان الزامات میں مسلمانوں پر ظلم و ستم کرنے، ان کے خاندانوں کو غلام بنانے اور اُن کی لڑکیوں کو رقاصہ بنا کر رکھنے کے الزامات شامل تھے۔ حالانکہ اس زمانے میں ہندو اور مسلمان فاتحین دونوں ہی مفتوحین اور قیدیوں کو غلام بنالیتے اور مذہب کو چنداں اہمیت نہ دیتے تھے لیکن چونکہ یہ ایک صریح اور سنجیدہ قسم کا الزام تھا لہذا ضروری تھا کہ اس کی پوری تحقیقات کی جائے اور جواب طلب کیا جائے۔ بہرحال شیر شاہ فیصلہ کر چکا تھا۔

1543ء میں شیر شاہ نے رائے سین کا محاصرہ کر لیا۔ راجہ کی طرف سے پورن مل نے اطاعت قبول کر لی اور چھ سو ہاتھیوں کا تحفہ ارسال کیا لیکن وہ خود اظہار اطاعت کے لیے حاضر نہ ہوا۔ محاصرہ چھ ماہ تک جاری رہا۔ آخر کار پورن مل آیا۔ شیر شاہ نے اس سے کہا کہ جن مسلمانوں کو اس نے غلام بنا لیا ہے آزاد کر دے اور بنارس کی صوبے داری سنبھالے۔ پورن مل نے مسلمانوں کو غلام بنا لینے کے الزامات سے انکار کیا اور قلعہ کو سپردگی میں دینے اور بنارس کی صوبے داری قبول کرنے کے لیے راجہ سے مشورہ کی اجازت مانگی۔

مشورے کے بعد اس نے شیر شاہ کو یہ پیغام بھیجا کہ اگر شہزادہ عادل خاں اور قطب خاں بانت قسم کھا کر محصورین کی زندگی اور آبرو کی حفاظت کی ضمانت دیں تو ان کو شیر شاہ کی شرائط منظور ہیں۔ قطب خاں بانت کو قلعہ میں بھیجا گیا۔ اس نے قسمیں کھا کر ضمانت دی اور پورن مل اور اس کے خاندان کو اپنے ہمراہ لے آیا۔ ان لوگوں کو شیر شاہ کے کیمپ کے وسط میں ایک خیمہ دے دیا گیا۔

حالانکہ شیر شاہ ان الزامات سے جو کہ پورنمل کے خلاف عاید کیے گئے تھے واقف تھا اور اس بارے میں اسلامی قانون اور دستورات سے پوری طرح واقف تھا پھر بھی اس نے پورنمل سے اس معاملے میں گفت و شنید کی اور اس کی اور اس کے خاندان کی حفاظت کا وعدہ کر لیا لیکن اس کے باوجود اس نے راجپوتوں کے قتلِ عام کا حکم صادر کر دیا۔

بعض لوگوں نے شیر شاہ کی اس بدعہدی کو نظر انداز کر دیا ہے اور بعض لوگوں نے قابلِ اعتراض سمجھا ہے لیکن شیر شاہ کے لیے بدعہدی کرنا کوئی نئی بات نہ تھی کیوں کہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ وہ اس قسم کی حرکات پورے اطمینان قلب کے ساتھ کر چکا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ اس نے شروع ہی سے اس بات کا ارادہ کر لیا ہو کہ وہ قلعہ کو (بقول عباس کے) "اپنے حسن تدبیر" بلکہ دغابازی سے فتح کرے گا۔ بیواؤں اور ملاؤں کا نام تو محض بعد میں اس کشت و خون کو جائز قرار دینے کے لیے درمیان میں لایا گیا۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ پورنمل اور اس کے ساتھی "اس قدر شجاعت سے لڑے کہ انھوں نے رستم و اسفندیار کے کارناموں کو فراموش کر دیا"۔ راجپوتوں کی قیام گاہیں مقتل بن گئیں اور بیشتر عورتوں نے اپنی آبرو بچانے کے لیے جوہر کی رسم ادا کی۔ بدقسمت بچوں کو قیدی بنا لیا گیا لڑکوں کو آختہ کر دیا گیا اور لڑکیوں کو تقسیم کر دیا گیا۔ ان لڑکیوں میں پورنمل کی ایک چھوٹی لڑکی بھی تھی جس کو نٹوں کو دے دیا گیا کہ وہ اس کو بازاروں میں نچاتے پھریں۔ اس میں شک نہیں کہ رائے سین کے اس سانحے نے شیر شاہ کے نام پر "بہت ہی بدنما داغ لگا دیا"۔ اس بدعہدی کے سبب قطب خاں کو اس قدر رنج ہوا کہ اس نے خودکشی کر لی۔

1542-43ء میں پنجاب کے گورنر ہیبت خاں نیازی نے صوبے پر مکمل قبضہ جمانے کے کام کو تیزی سے انجام دیا۔ فتح خاں جاٹ کو جو کہ کا بولاہ (نزد موجودہ ضلع منٹگمری) کے ڈاکوؤں کا سردار تھا اور دہلی و لاہور کے درمیان عوام کے دلوں میں اس کی بڑی ہیبت بیٹھی ہوئی تھی گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ اس کے دوسرے ساتھی ہندو بلوچ کا بھی وہی انجام ہوا۔ ملتان کے صوبے پر قبضہ کر لیا گیا اور وہاں امن و امان قائم ہو گیا۔

اس بات کا بھی امکان ہے کہ 1543ء میں سندھ کے کچھ حصے بھی شیر شاہ

کے بے رحم کر دیے گئے ہوں لیکن اس سلسلے میں شہادت اس قدر کمزور ہے کہ اس بات کو یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔

جولائی 1532ء میں مالدیو جودھپور کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے راجپوتانہ کے سیاسی انتشار کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی سلطنت کو شمال میں سانبھر، ناگور، بیکانیر تک اور اور مشرق میں اجمیر و بیدنور تک اور جنوب میں گجرات تک پھیلا دیا۔ اس نے اجمیر، میرتا اور جودھپور کے پرانے قلعوں کو مضبوط کرایا اور دوسری اہم فوجی جگہوں پر نئے قلعوں کی بنیاد ڈالی۔

اس میں شک نہیں کہ مالدیو راجپوتانہ کا سب سے طاقت ور حاکم تھا اس کی ریاست بہت وسیع تھی اور کہا جاتا ہے کہ اس کی فوج پچاس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔

جب مالوہ اور پنجاب کی فتوحات کا کام ختم ہو گیا تو شیر شاہ کو اس بات کی فرصت ملی کہ ریاست مارواڑ پر مہم کی تیاریاں شروع کرے۔ ادھر بیکانیر کے راؤ کلیان مل اور میرتا کے بیرم دیو نے جن کو ان کے بھائی مالدیو نے اپنی اپنی جاگیروں سے بے دخل کر دیا تھا شیر شاہ کو مارواڑ پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔

اس موقع سے فائدہ اٹھا کر شیر شاہ نے اسی ہزار سپاہیوں کی فوج لے کر 1544ء میں مالدیو پر حملہ کر دیا۔ اتنی زبردست فوج شیر شاہ اس سے قبل میدان جنگ میں نہ لے گیا تھا۔ شیر شاہ غیر معمولی احتیاط کے ساتھ آگے بڑھا۔ ہر جگہ جہاں اس کی فوج پڑاؤ ڈالتی وہ خندقیں کھدواتا اور حفاظت کے سارے انتظامات کرتا۔

ایک مہینے تک دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے میں پڑی رہیں۔ ان میں سے کوئی بھی حملے میں پہل کرنے کو تیار نہ تھا۔ دونوں سربراہ بہت ہی محتاط تھے۔ آخر کار شیر شاہ کے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ اس نے ایک جعلی خط مالدیو کے وزیر کے خیمے کے قریب اس طرح ڈلوا دیا کہ اس کی توجہ اس خط کی طرف مبذول ہو جائے۔ خط کے مضمون نے مالدیو کو چوکنا کر دیا۔ اس کے شبہات اس بات سے اور زور پکڑ گئے کہ اس نے اپنی رعایا کی جاگیریں چھیننے میں بہت سختی برتی تھی۔

مالدیو نے گھبرا کر فوج کو واپسی کا حکم دے دیا۔ اس کے بعض امرا جو جیٹھا اور

گنپا کو اپنا سردار مانتے تھے راجہ کے اس طرز عمل سے جس نے کہ ان کی وفاداری پر بدنما دھبہ آ آتا تھا سخت آزردہ ہوئے۔ انھوں نے اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لیے چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ افغان فوج پر حملہ کر دیا اور جو کچھ ان کے سامنے آیا اس کو روندتے چلے گئے۔

بدقسمتی سے جب وہ افغان فوج کے قریب پہنچے تو راجپوت اپنی رسم کے بموجب دست بدست لڑائی کے لیے اپنے گھوڑوں پر سے اتر آئے۔ یہ ان کی غلطی تھی۔ شیر شاہ نے چالاکی سے اس کو بھانپ لیا اور افغانوں کو حکم دیا کہ جو کوئی تلوار سے لڑے گا اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہدایات جاری کر دیں کہ ہاتھیوں کے ذریعے ان کو روند کر تیر اندازی اور گولہ باری کا نشانہ بنایا جائے۔

راجپوت جوانمردی سے لڑے اور ان کا ایک ایک آدمی کام آگیا۔ شیر شاہ کو اس خطرے کا پورا پورا اندازہ تھا لیکن خوش قسمتی سے وہ اس پر غالب آگیا۔ شیر شاہ نے اس سلسلے میں اپنے احساسات بیان کرتے ہوئے کہا ہے: "نزدیک تھا کہ میں مٹھی بھر باجرے کی خاطر ہندوستان کی سلطنت سے ہاتھ دھو بیٹھتا"

جب مالدیو کو شیر شاہ کی چالاکی کا پتہ چلا تو اس کو اپنی غلطی پر سخت ندامت ہوئی لیکن اب موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ قبل اس کے کہ مالدیو کچھ کر سکے شیر شاہ آگے بڑھا اور اس کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

شیر شاہ نے ایک دستہ خواص خاں کی سرکردگی میں جودھپور فتح کرنے کے لیے روانہ کیا اور خود باقی فوج کے ساتھ اجمیر کا رخ کیا۔ مالدیو کو مجبوراً جودھپور خالی کرنا پڑا۔ اور سوانا میں پناہ لی۔

اجمیر فتح کرنے کے بعد شیر شاہ نے پالی میں غارت گری کی اور آبو پہاڑی پر قبضہ کر کے ایک مضبوط فوجی چوکی قائم کی۔ شیر شاہ اجمیر میں اپنی فوج چھوڑ کر چند ماہ کے لیے آگرے چلا گیا۔ واپسی پر اس نے چتوڑ پر حملہ کیا جہاں خانہ جنگی کے سبب افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ چتوڑ وکرما دتیہ اور بنبیر دوغلہ کی بدنظمی کی وجہ سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔

اودے سنگھ کے وزیروں نے بغیر کسی سنجیدہ مزاحمت کے چتوڑ کی چابیاں شیر شاہ کے پاس بھیج دیں۔ وہاں سے فتحیاب ہو کر شیر شاہ ڈھندر (جے پور) ہوتا ہوا فتح کے ڈنکے

بچاتا واپس ہوا اور راستے میں شاید کچھ اہم سرداروں نے اطاعت قبول کر لی جو مزاحمت کرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ اب شیر شاہ اس بات کا دعویٰ کر سکتا تھا کہ اس نے راجپوتانہ فتح کر لیا ہے۔

اب شیر شاہ نے جے پور سے کالنجر کا رُخ کیا جو اس وقت کیرت سنگھ کے زیر حکومت تھا۔ کالنجر پر حملے کے کئی سبب تھے۔ اول تو اسے ناقابلِ تسخیر قلعہ سمجھا جاتا تھا جو دریائے جمنا کی وادی میں واقع تھا۔ مشرقی راجپوتانہ اور مالوہ کی فتح کے بعد فوجی اور ملکی انتظامات میں سہولت کی خاطر یہ لازمی سمجھا گیا کہ اس پر قبضہ کر کے دہلی اور مالوہ سے مشرقی صوبجات تک قلعہ بندی کے سلسلے کو مکمل کر دیا جائے۔

شیر شاہ کو یہ بات بھی ناگوار ہوئی کہ راجہ اظہارِ اطاعت کے لیے اس کی قیام گاہ سیہوندا کے مقام پر نہ آیا جو کہ کالنجر سے صرف تیس میل شمال مغرب میں واقع ہے۔

راجہ کالنجر ہمایوں کی اطاعت قبول کر چکا تھا اور جب تک کہ وہ صاف طور سے شیر شاہ سے اپنی وفاداری اور اطاعت کا اظہار نہ کرتا وہ ہمایوں کا ہی خواہ سمجھا جاتا۔ اس کا شیر شاہ کے حضور میں حاضر نہ ہونا نافرمانی پر محمول کیا گیا۔ علاوہ بریں شیر شاہ ایک رقاصہ حاصل کرنا چاہتا تھا جس کی شہرت نے اسے مشتاق بنا رکھا تھا۔ ان سب کے علاوہ حملے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے گاہورا کے حکمراں وزیر سنگھ بگھیلا کو جو کہ بابر کا حامی تھا پناہ دی تھی جس کی ماں کلیان دیوی رائے سین کے راجہ پورنمل کی بیٹی تھی۔

پھر لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ جس وقت ہمایوں چوسا سے جان بچا کر بھاگا تو راجہ کالنجر کا لڑکا ویر بھانو بھی اس کے ہمراہ کڑا تک گیا تھا۔

شیر شاہ نے قلعہ فتح کرنے کی بے حد کوشش کی۔ سات مہینے تک ہر شخص خواہ وہ سپاہی ہو یا حمال یا ملازم دن رات ماہرین کے کام میں ہاتھ بٹاتا رہا۔ سرنگیں کھدائی گئیں اور قلعہ کے سامنے بلند چبوترے توپ خانے کے لیے تعمیر کیے گئے اور کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی گئی

22 مئی 1545ء کو فیصلہ کن حملہ کیا گیا۔ بدقسمتی سے ایک بم دیوار سے ٹکرا کر لوٹا اور

گولوں کے ڈھیر کے پاس آگر گرا اور ایک زبردست دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا۔ شیر شاہ جو کہ قریب ہی کھڑا ہوا جنگی کارروائیوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ اس دھماکے میں مہلک طور پر زخمی ہوگیا۔

افسوس ناک حادثے سے فوجی افسروں اور سپاہیوں پر اس قدر اثر ہوا کہ انھوں نے جان توڑ کوشش کی اور بستر مرگ پر اپنے آقا کو قلعہ کی تسخیر کی خوشخبری سنادی۔ شیر شاہ نے اپنی کوششوں کی کامیابی پر خدا کا شکر ادا کیا اور 22 مئی 1545 بروز سنیچر خاموشی کے ساتھ جان جان آفریں کے سپرد کی۔ اس کو اپنی خواہش کے مطابق سہسرام میں ایک نہایت عالی شان مقبرے میں دفن کیا گیا جسے اس نے اپنے لیے تعمیر کرایا تھا۔

شیر شاہ کا شمار دہلی کے عظیم ترین حکمرانوں میں کیا جاتا ہے۔ وہ قسمت کا دھنی تھا۔ اس نے اپنی جدوجہد سے ایک سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ وہ ایک بہادر سپاہی' ایک شجاع سپہ سالار غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک اور سیاسی اہلیتوں کا حامل تھا۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس کا ایک بلند مقام ہے وہ ناکامی و بدبختی سے نہ گھبراتا تھا۔ اور ہر کام کو چاہے کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو حوصلہ مندی اور امید کے ساتھ انجام دینے سے باز نہ آتا۔ شیر شاہ اپنے منصوبے بڑے غور وفکر کے بعد تیار کرتا اور ان کے ہر جز کا غیر معمولی صحت و درستی کا خیال رکھتا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کسی کام کو چاہے کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو اپنی شان کے خلاف نہ سمجھتا۔ جب بھی حالات کا تقاضا ہوتا وہ خود بھی ایک معمولی سپاہی کی طرح کام کرتا۔ اور اس کی انجام دہی میں ایک عظمت محسوس کرتا۔ فتوحات حاصل کرکے وہ کبھی مغرور نہ ہوا۔ اس کے نزدیک فتوحات ایک عام واقعہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ وہ ہمیشہ مستقبل پر نظر رکھتا۔ نازک موقعوں پر وہ غیر معمولی ضبط وتحمل سے کام لیتا۔ وہ کبھی کسی ناممکن الحصول چیز پر ہاتھ نہ ڈالتا۔ کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کے حصول کا ارادہ کیا ہو اور اس کو حاصل نہ کرلیا ہو اس کی سیرت کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہر کام کو پوری توجہ اور احتیاط کے ساتھ انجام دیتا۔ وہ نامکمل اقدامات سے مطمئن نہ ہوتا اور نہ کسی کام کو ادھورا چھوڑتا۔ حالانکہ شیر شاہ اصول واخلاق کا پابند تھا لیکن جب بھی ملک کے مفاد کا مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ کسی بات سے نہ جھجکتا۔ وہ اُن ارزاں قسم کے اخلاقیات کا پابند نہ تھا جو

لوگوں کو ناکام بنادیتے ہیں۔ شیر شاہ اپنی تمام عظمت کے باوجود نہ تو جدت پسند مفکر تھا اور نہ ہی اعلیٰ نظریات کا موجد۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ درحقیقت ایک حقیقت پسند اور عملی انسان تھا۔ ہادل نے اس کی ذہانت کو بڑے عمدہ طریقے سے ان الفاظ میں بیان کیا: "شیر شاہ ایک اچھا اور محنتی منتظم جاگیر تھا۔"

شیر شاہ اور مرہٹہ قوم کے معمار اوّل شیواجی کی شخصیت میں بڑی مماثلت ہے بقول سرکار "شاہ جی بھونسلے کا نظر انداز فرزند حسن سور کے فرزند سے بہت مشابہ تھا۔ ان دونوں کے بچپن کے گھریلو واقعات، ان کی ابتدائی زندگی و تربیت، ان کے کردار کے نشوونما، چال چلن، یہاں تک کہ تخت حاصل کرنے کے ڈھنگ بھی ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ شیواجی اور شیر شاہ محض اپنے اطوار و عادت اور ذہانت ہی میں یکساں نہ تھے بلکہ ان دونوں نے یکساں ماحول میں پرورش پائی تھی۔"

دہلی کے سارے مسلمان حکمرانوں میں صرف شیر شاہ ہی ایک ایسا بادشاہ تھا جس کو انتظام مملکت کی ہر سطح کے بارے میں پوری پوری معلومات حاصل تھیں۔ اس نے اپنے باپ کی جاگیر کے ناظم کی حیثیت سے ضلع اور پرگنہ کے انتظامی امور کا تفصیلی مطالعہ کیا تھا۔ بحیثیت ایک ذہین آدمی کے اس نے جونپور کے دوران قیام میں سیاسی اور انتظامی مسائل اور صوبجاتی حکومت کے فن سے پوری طرح واقفیت حاصل کی ہوگی بہار میں نوہانی حکمراں کی بیوہ ملکہ کے ولیعہد کے آتالیق اور نائب کی حیثیت سے اس نے اس صوبائی ریاست میں امور مملکت داری کے مختلف شعبوں میں اس قدر مہارت حاصل کرلی کہ وہاں کے دوسرے وزرا اس سے حسد کرنے لگے۔ وہاں اس نے اپنا پورا تسلط قائم کرلیا اور حاکم بالفعل کی حیثیت سے کام کیا۔ اس نے افغان طریقہ مملکت داری کے قواعد میں مہارت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ مرکزی اور مقامی انتظامات میں مغلیہ طرز حکومت سے بھی عام واقفیت حاصل کرلی۔ فوجی اور مالی تنظیمات کے بارے میں بھی اس کی معلومات اور تجربات مختلف النوع اور مکمل تھے۔

شیر شاہ ہندوستان میں پیدا ہوا اور یہیں نشوونما پائی۔ وہ یہاں کے لوگوں کے طور طریق سے اچھی طرح واقف اور ان کے مسائل سے پوری طرح آگاہ تھا۔ وہ ان کے ساتھ پورے اعتماد کے ساتھ نپٹ سکتا تھا۔

شیر شاہ ہندوستانی معاملات کی پوری معلومات رکھتا تھا اور تجربہ و تنظیم و ضبط کے ہتھیاروں سے پوری طرح مسلح تھا۔ وہ ضبط و نظم و نسق کے دبستان کا تربیت یافتہ تھا۔ اس نے دوسری وسیع تر افغان سلطنت کے انتظام کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھال لی۔

شیر شاہ ایک محنتی، سرگرم عمل، انتھک اور محتاط شخص تھا۔ وہ تین بجے صبح سے رات گئے تک منہمک رہتا۔ درمیان میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے آرام کرتا اور فریضۂ نماز ادا کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ حکومت کے متعلق ہر کام کو چاہے وہ حسابات سے متعلق ہوں یا سرکاری ملازمین کی رپورٹیں ہوں یا سپاہیوں کی بھرتی کا کام ہو یا مختلف شعبوں کی دیکھ بھال وہ خود انجام دیتا تھا۔ چنانچہ پانچ سال کی مدت میں جتنی کامیابی اس نے حاصل کی اتنی کامیابی کسی اور حکمراں نے حاصل نہیں کی۔ اس نے اس قلیل مدت میں اتنا کام کیا کہ اس سے پہلے یا اس کے بعد کوئی پندرہ بیس سال میں انجام نہ دے سکا۔

حالانکہ شیر شاہ افغانوں کے سماجی و سیاسی رسم و رواج اور طریقوں اور ان کے جذبات کا بہت لحاظ کرتا تھا لیکن وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ہندوستان افغانستان نہیں ہے اور اس لیے ان رسم و رواج اور طریقوں کو بغیر ضروری تبدیلی کیے ہندوستان میں نافذ کرنا ممکن نہیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ افغانوں کو آہستہ آہستہ ان کے قبائلی اور قومی نظریے سے الگ کرنا ہوگا اور ان کو یہ بات سکھانی ہوگی کہ وہ معاملات کو ایک متحدہ سلطنت کے نقطۂ نظر سے دیکھیں۔ اس نے ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی زندگی کے واقعات کا گہرا مطالعہ کر کے اس بات کا بھی اندازہ لگا لیا ہوگا کہ دہلی کے ابتدائی ترک سلاطین نے بھی ترکی اور اسلامی قوانین کو اس ملک کے حالات کی مناسبت سے تبدیل کر دیا تھا۔ اس نے بابر کے دربار میں بھی مطالعہ کیا ہوگا کہ انتظام مملکت میں فقہ اسلامی کے اصول پر سختی سے پابندی نہ کی جاتی تھی اور اس سلسلے میں ایک وسیع اور آزادانہ روش اختیار کی گئی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک درمیانہ روش اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ کوشش کی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے افراط و تفریط سے پرہیز کیا جائے۔

اس کو ملکی معاملات میں علماء کا غیر معمولی دخل پسند نہ تھا اور وہ چاہتا تھا کہ

ان کو کم ازکم اس وقت تک جب تک کہ وہ ان سے سختی کا برتاؤ کرنے کے قابل نہ ہو جائے مناسب حدود کے اندر رکھے لیکن ابھی تک اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ اس معاملے کو کس طرح سلجھایا جائے۔

شیر شاہ شیعوں کو ذاتی، سیاسی اور فرقہ وارانہ وجوہ کی بنا پر پسند نہ کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے دل میں یہ خواہش تھی کہ راجپوت کافروں کو مغلوب کرنے کے بعد وہ جنوبی ہندوستان کی شیعہ ریاستوں کو فتح کرے اور اگر ممکن ہو تو ایران پر بھی قبضہ جمالے۔

وہ اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ کافی نرمی، انصاف اور سخاوت کا سلوک کرتا تھا وہ کسی بھی طبقہ، فرقہ یا مذہب والوں کو خواہ مخواہ خوش کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ اس نے سب کو اجازت دے رکھی تھی کہ اپنے اپنے تہوار منائیں اور اپنے طریقے پر عبادت کریں۔ اس بات کی کوئی شہادت نہیں کہ اس نے اپنی غیر مسلم رعایا پر کسی قسم کی پابندیاں عاید کی ہوں۔ وہ خود ایک اچھا سنی مسلمان تھا لیکن غیر مسلم رعایا کے ساتھ اس کا رویہ عدم مداخلت کا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعض وسیع النظر سلطانوں کی سیاست پر گامزن تھا اور جزیہ وصول کیا کرتا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود اعلیٰ فوجی عہدوں پر افغان ہی فائز تھے۔ البتہ کبھی کبھی غیر افغان مسلمانوں کو بھی یہ عہدے مل جاتے تھے۔ اس کی شاید ہی ایسی کوئی شہادت مل سکے گی کہ اس نے تمام ملازمتوں کے دروازے غیر مسلموں کے لیے کھول دیے تھے یا یہ کہ اس نے اپنے متقدمین کی سیاست سے مختلف طرز حکومت پر عمل کیا۔

اگرچہ وہ افغان قبائلی سرداروں کے نظریۂ حاکمیت و اقتدار سے پوری طرح متفق نہ تھا پھر بھی وہ اس کو کاملاً نظر انداز نہ کر سکا۔ اس نے افغان طرز حکومت اور ترکی نظریۂ حاکمیت میں اعتدال قائم کیا۔ شیر شاہ کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ ان کا قومی ہیرو اور منتخبہ رہنما تھا اور اس نے افغانوں کی گم شدہ عزت و سلطنت کو دوبارہ حاصل کیا تھا لہذا اس کا وقار اور محبوبیت سب کے دلوں میں موجود تھی اور عام طور پر اس کے احکامات کی تعمیل کی جاتی تھی۔ اس نے قبائلی سرداروں کے نظریات کو بدلے بغیر آسانی سے عزت واحترام

حاصل کر لیا اور لوگوں کو اپنا مطیع بنا لیا۔ کوئی بھی اُس کے احکامات سے سرتابی نہ کرتا تھا کیوں کہ اس کی ذاتی شخصیت و وقار کے علاوہ اس کی فوج اس قدر مضبوط اور قوی تھی کہ شاید ہی کسی اور افغان حاکم کے پاس اتنی طاقت ور فوج رہی ہو۔

شیر شاہ کے زمانے میں انتظامی علاقوں کی ترتیب عام طور پر پہلے کی طرح ہی تھی۔ گاؤں حکومت کی سب سے چھوٹی اکائی سمجھا جاتا تھا۔ کئی گاؤں کو ملا کر پرگنہ بنتا تھا اور کئی پرگنوں کو ملا کر ایک شق (سرکار) بنتی تھی۔ بعض جگہوں پر جیسے کہ پنجاب، مالوہ اور بنگال میں کئی شق ایک ہی افسر کے ماتحت ہوتی تھیں جس کو ہم صوبیدار کے برابر کہہ سکتے ہیں۔ کسی معقول اصطلاح کی عدم موجودگی میں اس افسر کے حلقۂ اختیارات کو ایک صوبے دار کہا جا سکتا ہے۔ لیکن شیر شاہ نے بنگال میں یہ علاقائی تقسیم عاید نہ کی اور پرانے طریقے کو برقرار رکھا۔

ترک حکومت کے آغاز ہی سے بنگال دہلی سلطنت کے پہلو میں کانٹے کی طرح چبھتا رہا ہے۔ جب بنگال کے صوبے دار خضر خاں نے بلا اجازت متوفی محمود شاہ کی ایک لڑکی سے بیاہ کر لیا تو اس کو برخاست کر کے گرفتار کر لیا گیا۔ پھر بنگال کو کئی علاقائی تقسیم میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا اور ہر علاقے میں ایک جاگیر دار مقرر کر دیا گیا۔ حلقۂ اختیارات اور شخصی مفاد کی خاطر باہمی تنازعات کو رد کئے اور جاگیرداروں کے کاموں میں تطبیق و ہم آہنگی پیدا کرنے اور عام دیکھ بھال کی خاطر قاضی فضیلت کو بغیر کسی واضح اختیارات دیے امین کی حیثیت سے مقرر کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شیر شاہ نے صوبائی انتظامات کے لیے واضح منصوبہ وضع نہیں کیا تھا۔

ایک وسیع سلطنت میں منظم صوبائی نظام کی اہمیت کو جو کہ مرکزی اور مقامی حکومت کے درمیان حلقۂ اتصال کا کام دیتا ہے فراموش نہیں کیا جا سکتا اور یہ صوبائی نظام حکومت اور عوام دونوں کے مفاد کے لیے ضروری ہے۔ اس سلسلے میں شیر شاہ نے نہ تو کوئی حصہ لیا اور نہ وہ کوئی کارروائی کر سکتا تھا۔

دیہی زندگی میں اور وہاں کے انتظامی معاملات میں مسلمان حکمرانوں نے کم سے کم مداخلت بھی نہ کی تھی۔ گویا ہر گاؤں ایک مختصر لیکن مکمل اکائی تھا۔ حالانکہ طاقتور شاہی حکومتوں اور سیاسی انقلابوں کے سبب دیہات کا قدیمی اثر اور وقار کم ہو گیا تھا لیکن انکی علم

شکل اور بنیادی اصول اپنی جگہ برقرار تھا۔ ہر گاؤں کا ایک مکھیا یا مقدم ہوتا تھا جو حکومت اور گاؤں کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتا تھا اور حکومت اس کی معرفت گاؤں کے کسانوں کے معاملات کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ مکھیا کے اثر اور اختیارات میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی آتی گئی۔ لیکن ہمیں اس کا علم نہیں ہے کہ شیر شاہ کے زمانے میں مکھیا کا کتنا اختیار اور ذمے داریاں تھیں۔ بایں ہمہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ گاؤں کے عام معاشی حالات میں مکھیا سب سے زیادہ اہم شخص سمجھا جاتا تھا۔

علاوہ ازیں شیر شاہ کا یہ عام اصول تھا کہ کسانوں کے ساتھ بلا واسطہ تعلق رکھا جائے۔ لہٰذا اس بات کا امکان ہے کہ گاؤں کے معاملات اور مالگزاری جمع کرنے میں مکھیا کے اختیارات پر بہت برا اثر پڑا ہوگا۔ تاہم وہ سرکاری ملازم نہ ہوتے ہوئے بھی گاؤں میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے ذمے دار تھا۔ مکھیا کے علاوہ ہر گاؤں میں ایک پٹواری بھی ہوتا تھا جو سرکاری ملازم تو نہ تھا لیکن گاؤں والوں کا ملازم ضرور تھا۔

حالیہ تحقیقات نے یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ شیر شاہ مالگزاری کے علاوہ پرگنہ کے انتظامی امور میں کوئی مداخلت نہ کرتا تھا۔ ہر پرگنہ میں پہلے کی طرح شقدار یا عامل ہوتا تھا جو اس اکائی کا سرغنہ ہوتا۔ اس کا سب سے اہم کام مالگزاری جمع کرنا تھا۔ اس کا یہ کام بہت ہی نفع بخش تھا لہٰذا شیر خاں ہر سال یا دوسرے سال تبادلہ کر دیتا۔

شقدار کے علاوہ منصف یا امین بھی ہوتا (شاید قدیمی مشرف کی جگہ یہ نیا عہدہ بنایا گیا تھا) جس کا کام یہ ہوتا کہ مالگزاری عاید کرنے کے لیے زمین کی پیمائش کرے اور اراضیات کے صحیح رقبے وغیرہ کے سلسلے میں جو تنازعات ہوں ان کو حل کرے۔ چونکہ امین سرکاری ملازم ہوتا تھا اس لیے اس کی تقرری یا برطرفی سرکار کی طرف سے عمل میں آتی۔ ہر پرگنہ کے کاشت کاروں کے مفاد اور وہاں کے رسم و رواج کی حفاظت کے لیے ایک قانون گو ہوتا جس کے پاس پرگنہ کے کاغذات رہتے اور یہ نیم سرکاری عہدہ عام طور پر وراثتاً ملتا۔

ہر شقدار کی امداد کے لیے دو محرر ہوتے جن کو کارکن کہا جاتا تھا۔ یہ کارکن سارے سرکاری کاغذات کی دیکھ بھال کرتے، خزانہ اور نقدی خزانہ دار (یا فوطہ دار) کے پاس رہتی۔ وہ قدیمی محصل کے برابر ہوتا۔ کارکن اپنے حساب کتاب فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں تیار کرتے۔

کئی پرگنے مل کر ایک سرکار بنتی۔ شیر شاہ کی سلطنت چھیاسٹھ سرکاروں پر مشتمل تھی۔ ہر سرکار میں ایک ڈویژنل آفیسر ہوتا جس کو شقدار شقداران کہتے۔ وہ اپنے علاقے کے مختلف پرگنوں کے شقداروں کے کام کی دیکھ بھال کرتا۔

پرگنہ کے امین کے کام کی دیکھ بھال کرنے کے لیے منصف منصفاں مقرر ہوتا اور دیہی علاقے (سرکار) کا سب سے بڑا افسر مالگزاری سمجھا جاتا۔ باوجودیکہ کوئی واضح شہادت موجود نہیں پھر بھی یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ سرکار کے دفتر میں بھی کارکن ہوں گے۔ بہرحال سرکار میں خزانہ دار کی موجودگی کے بارے میں شبہات ہیں حالانکہ اس کا وجود ناممکن نہیں ہے۔

شیر شاہ کے زمانے کی مرکزی حکومت کے انتظام کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہوئی ہیں۔ وہ مغلیہ طرز انتظام سے متاثر نہ تھا جو کہ وزرا کی ذمہ داری کے نظریہ پر مبنی تھا۔ کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ مغلیہ شہنشاہ نے اپنے وزرا کو بہت اختیارات دے رکھے تھے، جو عام طور پر رشوت خور اور نا فرض شناس تھے۔ پہلی افغان سلطنت کے زمانے میں بھی وزرا کو وسیع اختیارات حاصل نہ تھے۔

شیر شاہ کا خیال تھا کہ حکومت پر براہ راست نگرانی اور قابو ہونا چاہیے کیونکہ اس کو بڑے افسروں پر بالکل بھروسہ نہ تھا۔ اس کی حکومت مطلق العنان تھی۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ افغان قبائلی سردار سوائے شیر شاہ کے کسی اور کے احکامات حاصل کرنا پسند نہ کرتے تھے وہ اسکی ایک منتخبہ ہیرو اور صاحب اقتدار حاکم کی حیثیت سے عزت کرتے اور حکم بجالاتے اور کسی کی اطاعت کے لیے تیار نہ تھے۔ شاید یہ ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ شیر شاہ نے سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہے کیونکہ اسے اپنے کام کرنے کی لامحدود استعداد پر پورا بھروسہ تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شیر شاہ اپنی وسیع معلومات اور سرکاری مسائل اور انتظامی تفصیلات میں تجربے اور انتھک محنت و فرائض منصبی کی انجام دہی میں پرخلوص کوشش کے سبب بہت سا کام خود ہی انجام دیتا ہوگا پھر بھی سخت محنت کرنے کی استعداد کے باوجود کسی بھی شخص واحد کے لیے ممکن نہ تھا کہ اس قدر وسیع نو بنیاد سلطنت کے روز افزوں کاموں و منہا انجام دے سکے۔

شیر شاہ اپنے زمانے کے سب سے زیادہ کامیاب حکمرانوں میں سے تھا لیکن یہ بات بہت ہی زیادہ مشکوک ہے کہ شخصی حکومت تمام سرکاری شعبوں میں اعلیٰ کارکردگی کو بروئے عمل لا سکتی ہے۔ مرکز میں ایک عمدہ منظم سرکاری نظام کئی وجوہ کی بنا پر ایک وسیع سلطنت کے لیے ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے شیر شاہ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اس کے اس عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی ساخت بہت کمزور رہی۔ حکومت پوری طرح بادشاہ کی لیاقت و استعداد پر منحصر تھی اور اگر کوئی بارعب لائق اور مستعد شخصیت موجود نہ ہوتی تو حکومت کا زوال یقینی ہو جاتا۔

شیر شاہ کا سب سے بڑا کارنامہ اصلاحِ مالگذاری تھا۔ اس کی تین اہم خصوصیات تھیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ شیر شاہ نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا کہ مالگذاری کے تعین کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ صحیح پیمائش پر مبنی ہو۔ چنانچہ ساری سلطنت کی احمد خاں کی نگرانی میں جو شیر شاہ کا ذاتی دوست اور قابل اعتماد افسر تھا پیمائش کرائی گئی۔

شیر شاہ نے پیمائش کا قانون تقریباً پوری سلطنت میں سختی سے عاید کیا۔ حالانکہ علاؤالدین اور محمد تغلق کے زمانے میں سلطنت کے بہت سے حصوں میں اس بات کی مخالفت کی گئی۔ صرف ملتان کے بارے میں یہ بات معلوم ہے کہ وہ مستثنیٰ رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اوّل تو اس کے آس پاس کا علاقہ سیاسی انقلابات کا زبردست مرکز تھا اور دوسرے یہ کہ وہ علاقہ فوجی لحاظ سے بھی بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ وہاں کی غیر مطمئن رعایا بڑی پریشانیوں اور مصیبتوں کا سبب بن سکتی تھی۔ حکومت اور زمیندار یا کاشتکار کے درمیان جو معاملہ طے پاتا اس کا ریکارڈ رکھا جاتا اور موخرالذکر کو بھی ایک پٹہ دیا جاتا جس میں فیصلے کی شرائط واضح طور پر لکھی ہوتیں۔

شیر شاہ کے مالگذاری کے طرز کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو سکے ہر علاقے کی اہم پیداوار کے بدلے میں مالگذاری نقد وصول کی جائے۔ جلد خراب ہونے والی اشیاء کی مالگذاری بھی نقد ہی وصول کی جاتی اسی وجہ سے زمین کی اس کی زرخیزی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم جنس اکائیوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اراضیات کو تین درجوں میں بانٹا گیا یعنی عمدہ متوسط اور خراب۔ ان تینوں درجوں کی زمینوں کی اوسط پیداوار کو جمع کر کے کل کا تیسرا حصہ مالگذاری کے تعین کے لیے ایک بیگھہ زمین کی اوسط پیداوار تسلیم کیا

جاتا۔ اس اوسط پیداوار کا تہائی حصہ سرکاری حصہ کے بطور طلب کیا جاتا۔ نقد ادائیگی کی شکل میں سرکاری مطالبہ آس پاس کے بازاروں کے نرخ کے مطابق طے پاتا۔ فصلوں کے نرخ کی فہرستیں (درائی) جن میں مالگذاری کے تعین کا طریقہ اور نرخ درج ہوتے محفوظ رکھی جاتی تھیں۔

شیر شاہ کی مالگذاری کی پالیسی کی تیسری خصوصیت یہ تھی کہ اس نے اراضیات کی پیمائش کے لیے جو پیمانے مقرر کیے ان کا معیار قائم کر دیا نیز جو عمال تخمینہ لگانے، وصولیابی اور نزاعات کا فیصلہ کرنے کے لیے مقرر کیے جاتے ان کا معاوضہ مقرر کر دیا۔ یہ بات باعث دلچسپی ہوگی کہ زمینداروں اور کاشت کاروں کو مالگذاری کا ڈھائی فی صدی ایک قسم کے ریزرو فنڈ میں جمع کرانا پڑتا تھا اور اس رقم سے قحط سالی یا اور دوسرے قدرتی مصائب کے زمانے میں لوگوں کی مدد کی جاتی۔

اراضیات کی مالگذاری کے علاوہ جو کہ ہندوستان میں مالیات کا خاص ذریعہ تھی۔ دوسرے ذرائع آمدنی بھی موجود تھے جن میں جزیہ، زکوٰۃ مختلف قسم کی اشیاء پر چنگی ضبط شدہ جائداد، کرگات، محصول مال درآمد اور مال غنیمت بھی شامل تھا۔

شیر شاہ کی مالگذاری کی شرح گو بہت زیادہ تھی لیکن سولھویں صدی کے متعدد حکمرانوں کی مروجہ شرحوں کے مقابلے میں بہت مناسب تھی۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ مالگذاری کے تعین کے موقع پر کتنی ہی نرمی برتی گئی ہو لیکن وصولیابی کے معاملے میں بہت سختی برتی جاتی تھی۔ ہمارے پاس جو ذرائع معلومات موجود ہیں ان میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ مالگذاری کی وصولیابی میں نرمی برتی گئی ہو۔ پیداوار نہ ہونے یا آفات ارضی وسماوی کے وقت کاشت کاروں کو تقاوی اور سامان قرض دینے کی پرانی رسوم پر عمل کیا جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے رعب وداب اور خوف کی وجہ سے اور انتظامی امور میں محتاط رویے کے سبب امور مملکت میں بہتری پیدا ہوگئی ہوگی۔ شیر شاہ کے کٹر مخالفین کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس نے حکومت اور کاشت کار یا گاؤں کے مکھیا کے درمیان بے اصولے دمن مانے طریقوں کا سدباب کرکے ملک کو نجات دلائی۔ وہ بڑی حد تک مالیات میں یکسانیت پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے رعیت واڑی طریقہ رائج کیا۔ حالانکہ یہ کہنا کہ وہ کس حد تک کامیاب ہوا مشکل ہے۔ یہ

بات واضح ہے کہ شیر شاہ جاگیرداری نظام کو نہ تو بالکل ختم کر سکا اور نہ ہی بڑی حد تک کم کر سکا۔ یہ نظام ہندوستان میں قدیم زمانے سے رچا بسا ہوا تھا اور افغان قبائلی سردار بھی اس کو معاشی، فوجی، سماجی اور ذاتی مفاد کی بنا پر پسند کرنے لگے تھے۔ ممکن ہے شیر شاہ ملک کے ان حصوں میں جو کہ حکومت کے براہ راست انتظام میں تھے اپنی اصلاحات کو اپنے مختصر دورِ حکومت میں کامیابی کے ساتھ رائج کر سکا ہو۔

شیر شاہ کے طریقہ تعین مالیات اور اُن کی وصولیابی میں دو بڑے نقص تھے۔ پہلا نقص تو یہ تھا کہ متوسط اور خراب قسم کی زمین کے کاشت کاروں کو اپنی پیداوار کا نسبتاً زیادہ حصہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس کے برعکس عمدہ زمین کے مالکوں کو نسبتاً کم ادا کرنا ہوتا اور اس طرح وہ اپنے بدقسمت ہموطنوں کے خسارے سے مزے اڑاتے۔

یہ صحیح ہے کہ حکومت کے اس طرز سے بلا واسطہ یہ اثر ہوتا کہ بری اراضی کے کاشتکار کوشش کرتے کہ اپنی اراضی کو بہتر بنا کر اس کو اچھی سطح پر لے آئیں لیکن جب تک ایسا نہ ہوتا وہ لوگ خسارے میں رہتے۔ دوسرا نقصان یہ تھا کہ حکومت کے حصہ کی آمدنی کا دارومدار صحیح معلومات، درست تحقیقات اور فوری رپورٹ دینے اور مرکزی حکومت کے بروقت فیصلے صادر کرنے پر منحصر تھا۔ یہ طریقہ بہت ہی تاخیر طلب اور ناقابلِ اطمینان تھا۔ چنانچہ امکان تھا کہ مالگذاری کی وصولیابی کے کام میں تاخیر ہو اور وصول کرنے والوں اور ادا کرنے والوں دونوں کو تکلیف، نقصان اور جھنجھلاہٹ کا سامنا کرنا پڑے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ بڑے پیمانے پر تجربہ کر رہا تھا اور اگر وہ زیادہ عرصے تک زندہ رہتا تو بہت ممکن ہے کہ وہ ان نقائص کو دور کر دیتا۔

ایک اچھے مسلمان حکمران کی طرح شیر شاہ عدل و انصاف پر بہت زور دیتا۔ اس کے عدل کا نظریہ بہت بلند تھا۔ وہ کہا کرتا تھا "عدل مذہب کا ایک اہم فریضہ ہے اور اس کو کافر و مومن دونوں بادشاہ پسند کرتے ہیں۔"

اس کے علاوہ اس کا عقیدہ تھا کہ "انصاف کے یہ معنی نہیں کہ سختی سے گریز کیا جائے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے ساتھ درست اور ایماندارانہ برتاؤ کیا جائے۔"

انصاف برتنے میں وہ بڑے چھوٹے یا امیر و غریب کا لحاظ نہ کرتا۔ مسلمانوں کے

دیوانی معاملات کا بہانے طریقے پر قانون شریعت یا رسم و رواج کے مطابق قاضی ہی فیصلہ کرتے لیکن شاید فوجداری معاملات کو شقدار اعلیٰ حل کیا کرتا۔ میر عدل کے بارے میں بھی ایک مبہم اشارہ ملتا ہے لیکن اس کے حلقہ اختیارات و فرائض واضح نہیں۔ یہ بھی مشکوک ہے کہ شیرشاہ کے زمانے میں اس نام کا کوئی افسر موجود تھا بھی یا نہیں۔ قانون فوجداری سخت اور سب کے لیے یکساں تھا۔ جرم کی شدت کے لحاظ سے قید، کوڑے لگانے، اعضا کا قطع، تشدد، جرمانہ یا موت کی سزا دی جاتی۔ کبھی کبھی چوری اور رشوت ستانی کی سزا موت ہوتی۔

مالی معاملات کے مقدمات کو منصب اعلیٰ سلطان کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق فیصل کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیرشاہ نے انصاف کے نظم و نسق یا عدلیہ کے انتظامات میں کوئی رد و بدل نہیں کیا۔

شقدار و شقدار اعلیٰ اپنے اپنے حلقۂ اختیار کے اندر امن و امان برقرار رکھنے کے ذمے دار ہوتے۔ شیرشاہ امن و امان کے سلسلے میں مقامی حکام کو ذمے دار گردانتا۔ یوں تو سب ہی حکام کا فرض تھا کہ جہاں تک ہو سکے امن و امان قائم رکھیں لیکن جرائم کی تفتیش کا کام چودھری اور مقدم کے سپرد تھا۔

اگر کسی گاؤں کے قریب چوری، ڈاکہ یا قتل واقع ہو جاتا تو وہاں کے مقدم کا کام تھا کہ مجرم کو تلاش اور مال کو برآمد کرے اور اگر وہ اس کام میں کامیاب نہ ہوتا تو اس کو سخت سزا دی جاتی۔ کبھی کبھی انہیں سزائے موت بھی دی جاتی۔ اس طرح مجرموں کی تلاش اور جرم ثابت ہونے پر ان کو سزا دینے کی ذمے داری حکومت سے مقدم کی طرف منتقل ہو گئی تھی۔

اس طریقۂ کار کی ظاہر اخرابیوں کے باوجود مقدموں اور گاؤں والوں کو اپنی ذمے داریوں کا احساس ہونے لگا اور وہ امن و امان کے قیام میں پوری طرح امداد باہمی سے حصہ لینے لگے۔ یہ طریقۂ کار عوام میں پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور اس میں جبر کے عنصر نے اس کی اخلاقی اہمیت کو ختم کر دیا تھا۔ چنانچہ یہ بات تعجب انگیز نہیں کہ شیرشاہ کے بعد یہ طریقہ ختم ہو گیا۔ بہت ممکن ہے کہ بڑے بڑے شہروں میں پولیس کے فرائض کی انجام دہی کے لیے کوتوالوں کا تقرر ہوتا ہو۔ عام طور پر شیرشاہ کے زمانے میں غالباً یہی

محفوظ و پُرامن تھیں۔

شیر شاہ اپنی فوج پر بہت توجہ دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فوجیں قبائلی بنیادوں پر تھیں۔ افغانوں کے لیے قبائلی رسوم کا نظر انداز کرنا مشکل تھا اور شیر شاہ جیسا بادشاہ بھی ان کو ایسا کرنے پر مجبور نہ کر سکا۔ کسی قبیلے کے سپاہی عام طور پر اُسی قبیلے کے سردار کے ماتحت ہوتے اور شاید وہ اس کے علاوہ کسی اور کو اپنا افسر ماننے کو تیار نہ ہوتے۔ لیکن شیر شاہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ ان قبائلی سرداروں کو کس طرح قابو میں رکھا جائے۔

فوج ملک کے مختلف حصوں میں وہاں کی ضروریات کے مطابق رکھی جاتی۔ کم از کم سولہ چھاؤنیوں کے نام تاریخ میں ملتے ہیں لیکن اس کا امکان ہے کہ چھاؤنیوں کی تعداد اس سے زیادہ ہو۔ قبائلی فوجوں کے علاوہ شیر شاہ نے ایک زبردست شاہی فوج بھی بنائی تھی جس میں ایک لاکھ پچاس ہزار سوار، پچیس ہزار پیادے، توپ خانہ اور پانچ ہزار جنگی ہاتھی شامل تھے۔ شاہی فوج کے علاوہ جاگیرداروں کی فوجیں بھی تھیں۔ ان دونوں قسموں کی کل تعداد چار لاکھ سے کم نہ ہوگی۔

شیر شاہ سپاہیوں کی بھرتی، تنخواہ کے تعین و ادائیگی اور ان کی ترقی کے سارے مسائل کی خود ہی دیکھ بھال کرتا۔ وہ اُن کے آرام و آسائش کا خیال رکھتا اور ان کو ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔ سپاہیوں کو اس تک رسائی حاصل تھی۔ علاء الدین خلجی کے زمانے کی طرح سپاہیوں کے گھوڑے داغے جاتے تھے اور قوانین کی پابندی کی دیکھ بھال کے لیے منصب مقرر کیے جاتے تھے۔

مغرب کی جانب سے شیر شاہ کو مستقل خطرہ تھا جس کی وجہ سے وہ شمالی مغربی سرحد کے معاملے کو سنجیدگی سے طے کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے اختیارات کو دریائے سندھ تک پھیلا دیا جو ہندوستان کی قدرتی سرحد سمجھی جاتی تھی۔ اس نے جاٹ، بلوچ اور خاص طور سے گکھڑ جیسے سرکش قبیلوں کو زیر کر لیا۔ مشرقی پنجاب میں امن برقرار رکھنے اور شمال مغربی سرحدوں کی حفاظت کے لیے گکھڑوں کی سخت مخالفت کے باوجود رہتاس کا مضبوط قلعہ تعمیر کرایا۔ اور ملتان و رہتاس کے قلعوں میں بڑی تعداد میں محافظ فوج متعین کی۔

اس میں شک نہیں کہ مضبوط اور پُرامن حکومت کی برقراری کی وجہ سے تجارت

کو بہت ترقی ہوئی۔ اس کے علاوہ شیر شاہ نے ملک کی تجارت کی ترقی کے لیے دوسرے اقدامات بھی کیے۔ اس نے ملک کے سکے کی قیمت بڑھائی جو ترک اور افغانوں کے دور حکومت کے اواخر میں بہت گر گئی تھی۔

پرانے معمولی اور مخلوط دھات کے بنے ہوئے سکوں کی جگہ عمدہ قسم کے سونے چاندی اور تانبے کے ایک معیاری سکے رائج کیے گئے۔ اس کا چاندی کا روپیہ اتنا کھرا تھا کہ اس کے بعد کئی صدی تک معیاری مانا جاتا رہا۔ روپے کے مختلف اجزا کے سکوں کے علاوہ تانبے کے سکے بھی مسکوک کیے جن کو دام کہتے تھے اور اس کے نصف، چوتھائی، آٹھویں اور سولھویں حصے کے سکے بھی ہوتے تھے۔

شیر شاہ کا دوسرا اقدام سڑکوں اور سرایوں کی تعمیر تھا۔ ڈھاکہ، لاہور، مانڈو اور برہان پور اور آگرہ، جودھ پور و چتوڑ کے طویل اور دور دراز فاصلوں کے درمیان عمدہ سائے دار سڑکیں تعمیر کرائیں۔ اس کے علاوہ جونپور و بیانہ، آگرہ اور دہلی اور ملتان و لاہور کو نسبتاً چھوٹی سڑکوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملادیا گیا۔ یہ سڑکیں فوجی ضروریات اور تجارت کے لیے بڑی مفید تھیں۔

ان سڑکوں کے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کنویں کھدوائے گئے اور ہر چار میل کے فاصلے پر سرائیں تعمیر کرائیں۔ جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے آرام کے لیے سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ ان سرایوں میں حکومت کی طرف سے ہندوؤں کو بھی گرم ٹھنڈا پانی بستر خام یا پختہ کھانا اور جانوروں کے لیے دانہ گھاس فراہم کیا جاتا۔

شیر شاہ نے تقریباً ایک ہزار سات سو کاروان سرائیں تعمیر کرائیں۔ یہ سرائیں بیشتر شاہی ڈاک کی سہولتوں کے لیے تعمیر کرائی گئی تھیں۔ ان بلا واسطہ اقدامات کے علاوہ اس نے تجارت کی ترقی کے لیے براہ راست طریقے بھی استعمال کیے۔ تاجروں اور دوکان داروں کو حکم دیا گیا کہ وہ معیاری اوزان رکھیں نیز قیمتوں میں یکسانیت برتیں۔ اور اشیائے تجارت معیاری ہوں۔ سرکاری ملازموں کو تاکید تھی کہ چیزوں کو بازار بھاؤ سے کم قیمت پر نہ خریدیں۔

شیر شاہ نے اپنی سلطنت کے مختلف صوبوں میں تجارت کو آزاد کردیا۔ ساری سلطنت میں صرف دو جگہوں پر چنگی لگائی گئی۔ ایک تو مقام داخلہ پر جو کہ مشرق میں درۂ

سیکری گارلی پر تھا اور مغرب میں رہتاس گڑھ اور دوسرے اس جگہ جہاں سامان فروخت ہوتا۔ بہرحال اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ اگر ایک ہی چیز مختلف مقامات پر یکے بعد دیگرے فروخت کی جائے تو اس پر محصول کی ادائیگی سے بچت کا کیا طریقہ اختیار کیا جاتا۔

اسلام نے خیر خیرات کو ہر حکمراں پر بحیثیت ایک مذہبی فرض کے عائد کیا ہے۔ اس معاملے میں بھی شیر شاہ کسی طرح غیر مذہبی نہ تھا۔ اس نے نئے مدارس و مساجد کی تعمیر کی اور پرانوں کی مرمت کرائی۔ اندھوں، بوڑھوں، ضعیفوں، بیواؤں، طالب علموں اور عالموں کی مدد کے لیے دل کھول کر رقم دی جاتی۔ اس کا دستور تھا کہ ہر ضرورت مند شخص کو کچھ نہ کچھ ضرور دیا جائے لیکن کسی کو بھی اس کی حاجت سے زیادہ نہ دیا جائے۔ اس نے اٹھارہ لاکھ پچیس ہزار روپیہ سالانہ کے خرچ سے بہت سے مقامات پر مفت لنگر اور دارالمساکین کھولے۔

مذہبی، ادبی اور تعمیراتی سرگرمیوں میں شیر شاہ کے روادارانہ رویے کا پتہ چلتا ہے اس کے عہد حکومت میں مسلمانوں نے ہندی ادب کی ترقی میں بڑی دلچسپی لی اور ان میں سے بعض نے بہت ہی قیمتی اور تخلیقی تصانیف تحریر کیں۔ اس میدان ادب میں ملک محمد جائسی کی پدماوت سب سے زیادہ قابل داد ہے۔ سور دور حکومت میں ویشنو مبلغ بڑے جوش و خروش سے اپنے مذہبی عقیدے کی تبلیغ کر رہے تھے۔ اور شمالی ہندوستان میں ضلع متھرا جدید ویشنو مسلک کا بڑا مرکز بن گیا تھا۔

شیر شاہ کے عہد کی تعمیرات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ فن و ہنر میں ہندوؤں و مسلمانوں یا افغانوں، ترکوں و ایرانیوں کے درمیان کسی فرق کا قائل نہ تھا وہ ایک ایسے مخلوط فن کی سرپرستی کرتا تھا جو ہندی و ایرانی دونوں مکاتب فن کی روایات کو جاذب نظر طریقے سے اپنے اندر سموئے۔ اس کی عمارات سے استحکام، متانت، وقار، عظمت اور شان ٹپکتی ہے۔ شیر شاہ کی شخصیت، اخلاق اور فراخدلی کی بہترین نمایندگی خود اس کے مقبرے سے ہوتی ہے جو سہسرام میں واقع ہے۔

اگر شیر شاہ اور زیادہ مدت تک زندہ رہتا تو وہ اکبر پر سبقت لے جاتا۔ اس کا شمار بلاشک و شبہ دہلی کے زبردست مدبر و سیاست داں سلاطین میں ہوتا ہے۔ اس نے اکبر کی اعلیٰ و ارفع روشن خیال طرز حکومت کے لیے راستہ ہموار کر دیا اور یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ وہ اس کا پیشرو تھا۔ مسٹر ڈبلیو کروکس نے یہ کہہ کر شیر شاہ پر کوئی احسان نہیں

کیا کہ "اس نے اپنے پانچسالہ دور حکومت کے مختصر عرصے میں جو وسیع اصلاحات کیں وہ اس کی انتظامی لیاقت کا حیرت ناک ثبوت ہیں" وہ اسی سلسلے میں کین کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ "کسی حکومت نے حتیٰ کہ برطانوی حکومت نے بھی اس قدر فہم و فراست کا ثبوت نہ دیا تھا کہ اس پٹھان نے"

کوئی مورخ شیر شاہ کے اس حق سے انکار نہیں کر سکتا کہ وہ اکبر سے پہلے کے سارے مسلمان حکمرانوں میں سب سے زیادہ معروف، روشن خیال اور بہادر تھا۔

شیر شاہ حقیقتاً دوسری افغان سلطنت کا بانی تھا۔ اس نے کم از کم اپنی حیات میں افغان قبیلوں کو ایک قوم میں تبدیل کر دیا اور ان کی کھوئی ہوئی سلطنت ان کو واپس دلا دی۔ لیکن وہ اتنے عرصے تک حکومت نہ کر سکا کہ ایسی نئی روایت قائم کر سکتا کہ افغانوں کے پاؤں جم جاتے اور وہ شاہی ڈھنگ پر سوچنے اور عمل کرنے کے قابل ہو جاتے گو اس نے اچھی طرح اور منصفانہ طور پر حکومت کی لیکن وہ بنیادی طور پر افغانوں کا سرغنہ تھا۔ بلا شبہہ اس کی اصلاحات کا مقصد یہ تھا کہ انتظامی امور میں یکسانیت اور سلطنت میں اتحاد پیدا ہو، صوبوں کے درمیان قریبی تعلقات بڑھیں اور ایک حد تک رواداری کو فروغ دے لیکن اس نے کوئی ایسا ٹھوس قدم نہیں اٹھایا کہ اس کی غیر مسلم رعایا میں اس کے لیے جوش و احترام کے جذبات پیدا ہوتے یا وہ اس کو وسیع معنوں میں قومی اتحاد کا علمبردار سمجھتی۔

باب 6

اسلام شاہ

جب شیر شاہ کی وفات ہوئی تو اس کے دونوں شہزادوں میں سے کوئی بھی اس کے پاس نہ تھا۔ بڑا شہزادہ عادل خاں رنتھنبور میں اور چھوٹا جلال خاں ریوا کے قریب تھا۔

شیر شاہ کے کیمپ میں موجود امرا میں سے بعض بڑے امراء نے شیر شاہ کی موت کی خبر کو پوشیدہ رکھا اور دونوں شہزادوں کو خط بھیج کر فوراً کیمپ میں بلا بھیجا جلال خاں جو کہ نزدیک تر تھا پانچویں روز آگیا اور کیمپ میں موجود مقتدر و با اثر امرائے اس کی پذیرائی کی اور اسے بادشاہ تسلیم کر لیا۔

شیر شاہ کے زمانے کے پرانے امراء نے سرد مہری کا اظہار کیا مگر جلال خاں کے طرفدار بازی لے گئے۔ اس سلسلے میں جو دلیل سب سے زیادہ کارگر واقع ہوئی وہ یہ تھی کہ عادل خاں عیش پسند، کاہل اور لاپرواہ تھا۔ اس کے برعکس جلال خاں "شان و شوکت، حوصلہ مندی کی آرزو میں اپنے باپ کی طرح ہے"۔ جلال خاں میں صرف ایک عیب ہے کہ وہ غضبناک اور کینہ پرور ہے لیکن یہ امید کی جاتی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی اس عادت میں کمی واقع ہوگی"۔

26 مئی 1545ء کو تخت نشین ہونے پر جلال خاں نے اسلام شاہ کا لقب اختیار

کیا۔ سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ کالنجر کے راجا اور اس کے ستر ساتھیوں کو جو گرفتار ہوئے تھے تہ تیغ کر دیا۔ اس نے افسروں اور سپاہیوں کو خوش کرنے کے لیے ہر ایک کو ایک ایک ماہ کی نقد تنخواہ بطور انعام بخشی۔ اپنے حامیوں کو اس نے اعلیٰ ترمراتب پر فائز کیا لیکن شیر شاہ کے زمانے کے بوڑھے امرا پر کوئی توجہ نہ دی۔ اسلام شاہ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ گو وہ اپنے بھائی پر سبقت لے گیا ہے مگر اس کا تخت پوری طرح محفوظ نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے یہی فیصلہ کیا کہ کالنجر میں ٹھہر کر ہی آنے والے حالات کا انتظار کرے۔

جب عادل خاں نے سنا کہ اس کا چھوٹا بھائی تخت نشین ہو گیا ہے تو اس نے عادل خاں سے دارالسلطنت آگرہ پر چڑھائی کر دی لیکن وہاں کے صوبے دار نے پھاٹک بند کر دیے اور اس کو اندر نہ آنے دیا۔ عادل خاں ان حالات کے لیے تیار نہ تھا۔ چنانچہ وہ رنتھنبور واپس گیا اور اس نے خواص خاں وعیسیٰ خاں نیازی سے گفت وشنید شروع کی۔ خواص خاں عادل خاں کا احترام بجالایا۔ گو اسے عادل خاں سے ہمدردی تھی مگر اس نے اسلام شاہ کی اطاعت قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ خواص خاں کے اس برتاؤ سے اسلام شاہ کا حوصلہ بڑھا کہ وہ آگرہ پہنچ کر ایک عظیم الشان دربار منعقد کرے اور اس سے خراج عقیدت حاصل کرے۔ اس موقع پر اسلام شاہ نے کہا "میں شہنشاہ اسی دن ہوں گا جس دن خواص خاں مجھ سے آملے گا۔"

جب تک عادل خاں آزاد تھا اسلام شاہ خود کو محفوظ نہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے عادل خاں سے کہلایا کہ وہ خود آکر خراج عقیدت پیش کرے۔ خواص خاں، عیسیٰ خاں اور دوسرے امرا کو اس یقین دہانی پر کہ عادل خاں کو پہلی ہی ملاقات کے بعد واپس جانے کی اجازت دے دی جائے گی اور گزارے کے لیے بیانہ کا علاقہ اس رنتھنبور کے بدلے دے دیا جائے۔ عادل خاں آگرے کے نزدیک سنگار میں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے حاضر ہوا۔

اسلام شاہ کا اپنے بھائی کا کام تمام کر دینے کا منصوبہ کامیاب ہو گیا ہوتا اگر متذکرہ بالا امرا جن کو دربانوں نے اندر داخل ہونے سے روک دیا تھا اپنے ہمراہیوں کے ساتھ شاہی خیمہ میں داخل نہ ہو جاتے۔ عادل خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد بخیریت بیانہ پہنچ گیا۔ جب اسلام شاہ اپنی پہلی کوشش میں ناکام ہو گیا تو اس نے غازی خاں

کو ایک سونے کی زنجیر دے کر عادل خاں کے پاس روانہ کیا اور یہ کہلا بھیجا کہ وہ اس زنجیر کو اپنے پاؤں میں ڈال کر آگرے آئے اور اس طرح اپنی وفاداری کا ثبوت دے، اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ چند روز بعد عادل کو آزاد کر دے گا اور واپسی کی اجازت دے دے گا۔ اس نامعقول تجویز نے عادل کو خطرے سے آگاہ کر دیا اور اس نے خود کو خواص خاں کی پناہ میں دے دیا۔ فراخ دل اور بہادر خواص خاں نے غازی خاں کو قید کر کے عادل خاں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے شمشیر بکف ہو جائے۔

شیر شاہ کے غیر مطمئن امرار ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھے۔ بلاشبہ افغان "اللہ سے مخلصانہ دعائیں مانگ رہے تھے کہ دونوں بھائیوں کے درمیان نزاع و نفاق پیدا ہو جائے"۔ خواص خاں اور عیسیٰ خاں کی شہ پاتے ہی طاقتور امرار کی ایک بڑی تعداد نے وعدہ کیا کہ اگر عادل اور اس کے ساتھی صبح ہونے سے قبل ہی آگرہ کی حدود میں داخل ہو جائیں تو وہ اس کا ساتھ دیں گے۔

ادھر اسلام شاہ نے اپنے ساتھیوں کے رویئے کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے یہ بتایا کہ میں چنار یا مشرقی رہتاس (بہار) جا کر جنگ کے لیے ایک بڑی فوج جمع کرنا چاہتا ہوں لیکن عیسیٰ خاں افغان نے جو کہ اس کا سب سے بڑا حامی تھا اس کو یہ معقول مشورہ دیا کہ اگر وہ آگرہ چھوڑ کر باہر گیا تو تباہی پھیل جائے گی۔ لوگ بڑے پیمانے پر فرار ہونے لگیں گے اور بغاوت کا روکنا محال ہو جائے گا۔ اس نے اسلام شاہ کو مشورہ دیا کہ دشمن سے بہت زیادہ خائف نہ ہو اور نہ ہی اپنی طاقت کو کم سمجھو۔

عیسیٰ خاں نے یہ دلیل پیش کی کہ قرملی سردار اور اس کے چھ ہزار سپاہیوں کی مسلح افواج پوری طرح وفادار ہے اور نیازی سردار بھی ابھی تک پوری طرح مخالف نہیں ہوئے ہیں۔ خواص خاں اور عادل خاں کے ہمدرد سرداروں نے اسلام شاہ کو ترک کرنے کا اس شرط پر فیصلہ کیا کہ خواص خاں دن نکلنے سے پہلے ان کے لشکر کے قریب پہنچ جائے لیکن خواص خاں نے وہ رات جو کہ شب قدر تھی فتح پور سیکری میں شیخ سلیم چشتی کی خانقاہ میں عبادت میں گزاری اور دوپہر تک اسلام شاہ کے پڑاؤ پر نہ پہنچ سکا۔ چنانچہ فرار کرنے والوں کا منصوبہ کامیاب نہ ہوا۔

اسلام شاہ نے عادل خاں و خواص خاں سے مرہاکر کے مقام پر جو کہ آگرہ سے

مغرب میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے مقابلہ کیا اور ان کو شکست دی۔ عادل خاں چند وار ہوکر پنا کی طرف بھاگا اور خواص خاں نے میوات کا راستہ اختیار کیا۔

اسلام شاہی امراء نے خواص خاں کا زبردست تعاقب کیا لیکن اس نے پیچھا کرنے والوں کو فیروز پور (جھرکا۔ نزد میوات) کے قریب شکست دی اور سرہند پہنچ گیا۔

اسلام شاہ نے اس فتحیابی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ان شیر شاہی امراء کو جن پر اس کو شبہ تھا ختم کر دیا۔ جلال خاں اور اس کا بھائی خداداد تہہ تیغ کر دیے گئے اور تقریباً تیرہ امراء کو گوالیار کے قیدخانے میں ڈال دیا گیا۔ سعید خاں نیازی جوکہ پنجاب کے بااثر گورنر اعظم ہمایوں کا بھائی تھا بھاگ کر اپنے بھائی کے پاس لاہور پہنچ گیا۔ پرانے امراء کے درمیان سراسیمگی اور مایوسی پھیل گئی

اس موقع پر اعظم ہمایوں کا لاہور سے اور شجاعت خاں کا مالوہ سے دربار میں بلایا جانا قدرتی طور پر ان کی بربادی کے مترادف تھا۔ شجاعت خاں دربار میں حاضر ہوا اور اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ یہ خیر مقدم شجاعت خاں کے متبنیٰ بیٹے دولت خاں اوجالا کی وجہ سے عمل میں آیا کیونکہ وہ بڑا بااثر سردار تھا اور اپنی کامیابیوں، سخاوت اور خوش تدبیری کی وجہ سے اسلام شاہ کا منظور نظر ہوگیا تھا۔

اعظم ہمایوں نیازی نے آنے سے انکار کر دیا۔ اس کے پاس تیس چالیس ہزار سواروں کی فوج تھی اور پھر خواص خاں کی شمولیت سے جو اس سے مل گیا تھا اس کی قوت میں اور اضافہ ہوگیا۔ اب ہمایوں نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور علم بغاوت بلند کر دیا۔ ان واقعات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم لودی کی تاریخ دہرائی جانے والی تھی۔

اب اعظم ہمایوں اپنی فوج لے کر پایۂ تخت کی جانب روانہ ہوا۔ اسلام شاہ ان دونوں بااثر سرداروں کے اتحاد سے خائف نہ ہوا اور اس نے بھی اپنی فوج کو تیار کرنا شروع کر دیا۔ دونوں فوجوں نے انبالہ میں پڑاؤ ڈالا۔

لڑائی شروع ہونے سے ایک روز قبل اعظم ہمایوں اور خواص خاں آپس میں بیٹھ کر اس بات پر گفتگو کرنے لگے کہ اگر وہ اس ناگزیر جنگ میں فتحیاب ہوا تو سلطنت کا مستقبل کیا ہوگا۔ خواص خاں جوکہ حق پرست تھا اس نے یہ تجویز پیش کی کہ عادل خاں کو تخت نشین

کیا جائے۔ لیکن وہ ششدر رہ گیا جب نیازیوں نے اس کی تجویز کا مضحکہ اڑایا۔ ان لوگوں نے صاف طور پر اعلان کر دیا کہ "بادشاہت کسی کی میراث نہیں، یہ اس کی ہے جو بزور شمشیر حاصل کرے۔"

خواص خاں کو عادل سے ہمدردی تھی لہٰذا اس نے ایک لفظ کہے بغیر دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ نیازیوں کا ساتھ چھوڑ دے گا۔ رات میں زبردست بارش ہوئی اور گرج و چمک کے طوفان کے بعد اعظم ہمایوں کے ہاتھی پر بجلی گری۔ اسلام شاہ کے مخالفین نے اس کو بدشگونی سمجھا اور ان کے حوصلے پست ہو گئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام شاہ کو مخالفین میں گہرا اختلافات پیدا ہو جانے کا علم ہو گیا تھا۔ لہٰذا وہ اگلے روز علی الصبح ان سے جنگ کرنے کے لیے میدان میں نکل آیا۔ جوں ہی جنگ شروع ہوئی خواص خاں میدان سے ہٹ گیا۔ اس بات سے نیازی بہت برہم ہوئے لیکن انھوں نے ہمت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ آخر کار فتح اسلام شاہ ہی کو نصیب ہوئی اور نیازیوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جو لوگ انبالہ کے مغرب میں ندی کے سیلاب میں غرقابی اور قتل و غارت گری سے جان بچا کر بھاگے وہ اندھا دھند بھاگتے ہی چلے گئے۔ اسلام شاہ نے رہتاس تک ان کا تعاقب کیا اور خواجہ ویس شروانی کو فراریوں کا پیچھا کرنے کے لیے روانہ کیا۔ یہ واقعہ 1547ء میں وقوع پذیر ہوا۔

اسلام شاہ نے عارضی طور پر گوالیار کو اپنی حکومت کا مرکز مقرر کر لیا تھا۔ یہاں سے اس کا ایک سردار شجاعت خاں بھاگ کر مالوہ چلا گیا تھا۔ اس کے ناگہاں فرار ہونے کا سبب یہ تھا کہ عثمان نامی ایک افغان نے جس کو اس نے کچھ عرصے قبل سزا دی تھی قاتلانہ حملہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام شاہ نے عثمان کو بھڑکایا کہ وہ شجاعت خاں سے انتقام لے۔

جب اسلام شاہ نے شجاعت خاں کے فرار ہونے کی خبر سنی تو اس نے عیسیٰ خاں کو اس کے تعاقب میں روانہ کیا اور پھر فوراً ہی خود بھی اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ شجاعت خاں نے شیر شاہ کے بیٹے کے خلاف ہتھیار اٹھانے سے انکار کر دیا اور 1547ء میں گجرات بھاگ گیا۔ بہرحال دولت خاں کے اثر و رسوخ سے اس کو معافی مل گئی اور مالوہ کے کچھ علاقوں کا صوبے دار مقرر کر دیا گیا۔

خواص خاں انبالہ سے لاہور اور پھر وہاں سے کماؤں پہنچا جہاں کے راجا نے اس کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ اسلام شاہ نے تاج خاں کرانی کو یہ ہدایت دے کر روانہ کیا کہ

جس طرح ہو سکے خواص خاں کو دستیاب کرے۔ راجا کو کئی مرتبہ پیغامات بھیجے گئے کہ وہ خواص خاں کو حوالے کر دے۔ راجا نے بڑے طیش میں آ کر جواب دیا: "جو شخص میری پناہ میں آ گیا ہے میں کس طرح اس کو بیڑیاں پہنا سکتا ہوں۔ جب تک میرے دم میں دم ہے میں ایسی کمینی حرکت نہیں کر سکتا۔"

جب اسلام شاہ اپنی کوششوں میں ناکام رہا تو اس نے خواص خاں کو بلا قید و شرط جان بخشی کا پیغام بھیجا' سرپرستی کا وعدہ کیا اور اس کے مذہبی اور وطن پرستانہ جذبات کو برانگیختہ کرتے ہوئے اس سے یہ درخواست کی کہ وہ اس کے پاس واپس آئے اور اودے پور کے رانا کے خلاف جہاد کرے جس نے ہر افغان سالار کا کھلم کھلا مقابلہ کیا ہے' ملک میں غارت گری کر رہا ہے اور مسلمانوں کو غلام بنانے کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ راجا کے امراء نے دوستانہ طور پر خبردار کر دیا تھا مگر خواص خاں دھوکے میں آ گیا۔ وہ پہاڑی پناہ گاہ سے باہر آ گیا۔ تاج خاں کرانی نے اسے دھوکہ دے کر قتل کرا دیا اور اس کا سر اور دھڑ دہلی روانہ کر دیا۔ شقی القلب بادشاہ نے اس کی نعش کو دہلی کے بازار میں پھنکوا دیا تاکہ لوگ درس عبرت حاصل کریں۔

دہلی کے باشندے گوڑ کے فاتح کی وسیع القلبی' سخاوت اور درویشانہ عادات سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے اپنے جذبۂ احترام کا ثبوت اس طرح دیا کہ شاہی محافظین کی روک تھام کے باوجود تین راتوں تک اس کی نعش پر پھول چڑھاتے رہے۔ یہ واقعہ 1552ء کا ہے۔

اعظم ہمایوں اور دوسرے نیازی سردار خواجہ ویس شروانی کو لاہور واپس لانے میں کامیاب ہو گئے۔ اسلام شاہ نے فوراً ہی تازہ دم فوج خواجہ کی مدد کے لیے روانہ کی جنھوں نے نیازیوں کو دنکوٹ کے قریب سنبھل میں شکست دی اور نیازیوں کو گکھڑوں کی پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ گکھڑ وہی تھے جنھیں شیر شاہ بھی مغلوب نہ کر سکا تھا۔ ان دونوں کا اتحاد بڑی اہمیت رکھتا تھا' خاص طور سے اس وجہ سے اور بھی خطرناک ہو گیا تھا کہ افغانستان میں ہمایوں کی پوزیشن روز بروز مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ اسلام شاہ ایک بڑی فوج لے کر ان سے جنگ کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ دو سال تک (1548-50) اسلام شاہ نے گکھڑ علاقے میں قتل و غارت گری کا بازار گرم رکھا لیکن ناقابل تسخیر گکھڑوں کو

مغلوب نہ کر سکا۔

نیازیوں نے اب یہ محسوس کیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے گکھڑوں کی مہمان نوازی پر زندگی بسر نہیں کر سکتے جو کہ خود بھی خستہ و پریشان حال ہو چکے تھے۔ اس لیے انھوں نے کشمیر میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن مرزا حیدر دوغلات نے ان کا مقابلہ کیا۔ دونوں فریقوں کے درمیان بڑی خوف ناک جنگ ہوئی جس میں اعظم ہمایوں کی بیوی بی بی رابعہ نے بہادری کے جوہر دکھائے۔ بہر حال نیازی جن کی تعداد دشمن کے مقابلے میں بہت ہی کم تھی مغلوب ہو گئے۔ اعظم ہمایوں، اس کی بیوی اور بھائی قتل ہو گئے، اور اُن کے سر کاٹ کر اسلام شاہ کو بھیج دیے گئے۔

اس جنگ میں سب سے زیادہ مکروہ بات وہ سلوک تھا جو نیازی سرداروں کی عورتوں کے ساتھ روا رکھا گیا۔ کچھ عورتوں کو مہینوں تک برہنہ رکھا گیا اور کچھ عورتیں طوائفوں کو دے دی گئیں۔ شیر شاہ نے راجپوت عورتوں کے ساتھ جو بدسلوکی کی وہ اسلام شاہ کے اس وحشیانہ سلوک کے سامنے جو نیازی عورتوں کے ساتھ روا رکھا گیا بالکل ہیچ نظر آتی ہے۔

اسلام شاہ نے گکھڑوں اور پہاڑی راجاؤں کے روک کے لیے اور دوسرے دفاع کی تعمیر کے خیال سے پانچ نئے قلعوں کی تعمیر کا حکم دیا۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور قلعہ مانکوٹ ہے۔

1552ء میں مرزا کامران اسلام شاہ کے پاس اس امید میں آیا کہ وہ اس کی مدد کرے گا لیکن اس کے ساتھ کسی گرم جوشی کا اظہار نہ کیا گیا۔ کچھ عرصے تک وہ اپنے پڑاؤ میں پڑا رہا کیوں کہ نہ تو اس کو مدد کا وعدہ دیا گیا اور نہ ہی واپسی کی اجازت ملی۔ جب اسلام شاہ نے پنجاب سے اپنا پڑاؤ اٹھایا اور دہلی کی طرف روانہ ہوا تو وہ کامران کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ مچھی واڑہ پہنچ کر کامران خفیہ طور پر فرار ہو گیا۔ کچھ عرصے تک اِدھر اُدھر بھٹکتے رہنے کے بعد سلطان آدم گکھڑ کے ہاتھ لگ گیا جس نے اسے اپنی حراست میں رکھا اور ہمایوں کو اطلاع دے دی۔

1552ء میں ہمایوں نے اس خیال سے دریائے سندھ کو عبور کیا کہ شکست دے کر گکھڑوں سے کامران کو حاصل کرے گا۔ جس وقت ہمایوں کے نیلاب پہنچنے کی خبر اسلام شاہ

کو ملی اُس وقت وہ جونکیں لگوا رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی جونکوں کو نکال پھینکا اور خود دہلی سے باہر نکل کھڑا ہوا اور فوج کو پیچھے پیچھے آنے کا حکم دیا۔ بدقسمتی سے اس کے توپ خانے کو جس میں ساٹھ توپیں تھیں کھینچنے کے لیے مویشی دستیاب نہ ہو سکے۔ چنانچہ اسلام شاہ نے افغان سپاہیوں کو ان توپوں کو کھینچنے کا حکم دیا۔ اس کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی اور پورا توپ خانہ بارہ میل یومیہ کی رفتار سے حرکت میں آگیا۔ اس کام کے لیے کم وبیش ساٹھ ہزار سپاہی لگائے گئے۔ لدھیانہ پہنچ کر اسلام شاہ کو پتہ چلا کہ ہمایوں واپس ہو گیا۔ چنانچہ وہ بھی واپس ہو کر گوالیار چلا گیا۔

اسلام شاہ کا نیازیوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک اور افغان سپاہیوں کی سخت روی کی وجہ سے اس پر دو دفعہ قاتلانہ حملے ہوئے۔ پہلا حملہ پنجاب میں اور دوسرا حملہ گوالیار میں ہوا۔ دوسرے حملے کی وجہ اس کی عدم ہردلعزیزی تھی کیونکہ اس نے سپاہیوں سے بہت ہی سخت کام لیا تھا اور دو سال تک ان کو کوئی تنخواہ نہیں دی گئی تھی۔ اتنی جرات تو کسی میں نہ تھی کہ کھلے بندوں اس کے خلاف ہتھیار اٹھائے لہذا یہ سازش کی گئی کہ شکار کے دوران اسے قتل کر دیا جائے۔

اسلام شاہ کو اس کا اشارہ مل گیا اور اس نے حکم دیا کہ دو دن کے اندر سپاہیوں کی تنخواہیں ادا کر دی جائیں۔ لیکن اس کا غصہ اتنا بڑھ گیا کہ ذرہ برابر شک پر کسی کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہ کرتا۔

سکندر لودی کے عہد میں جونپور کے ایک فصیح خوش بیان درویش منش عالم سید محمد نے گجرات میں اپنے مہدی موعود ہونے کا اعلان کیا۔ کہا جاتا تھا کہ اسلام کے پہلے ہزار سال ختم ہونے پر مہدی کو مبعوث کیا جائے گا تاکہ وہ دین کو زوائد وحواشی سے پاک کرے، اسے استحکام بخشے اور اس کی سچی تعلیمات اور صحیح اصول زندگی کی تبلیغ کرے۔ سید محمد کے گرد بہت سے ممتاز مرید جمع ہو گئے۔ ان مریدوں نے نئے اصول وتعلیمات کے ماننے والے چند جوشیلے پیروؤں کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ان میں سے ایک نیازی افغان ملا عبداللہ تھا جس نے اپنی راست بازی، کسر نفسی، بردباری، غریب پروری، خلق اللہ کی خدمت اور سب سے بڑھ کر روحانی بلندی کے سبب بے حد شہرت حاصل کی تھی۔ اس نے بیانہ میں اپنا مرکز قائم کر لیا اور مہدوی اصولوں کی تبلیغ کرنے لگا۔ ملا عبداللہ کا

نیازی افغان ہوتا اور ایسے عقائد کی تبلیغ کرتا جو علم اور حکومت کے تسلیم شدہ عقائد سے مختلف تھے بادشاہ کے لیے خطرناک تھا۔ وہ مہدوی طریقت کے ماننے والوں کو مسلح ہونے کی ترغیب دیتا تھا۔ اس سے اسلام شاہ اور اس کے دربار کے متقدر و بااثر عالم مخدوم الملک شیخ عبداللہ سلطان پوری کے دل میں شکوک پیدا ہو گئے۔

1548ء میں اسلام شاہ نے ملا کو دربار میں طلب کیا اور درباری طریقے پر بادشاہ کو سلام کرنے سے انکار کرنے پر اس قدر پٹوایا کہ جاں بلب ہو گیا۔ اس کے بعد ملا عبداللہ کے ساتھیوں نے اس کی تیمارداری کی۔ صحت یاب ہو جانے پر وہ مکہ چلا گیا۔

مہدویہ تحریک اصلاحی تحریک نہ تھی بلکہ احیائے اصول دین کی تحریک تھی۔ اس تحریک کے مبلغین تبلیغ کرتے کہ وہ صحابہ کرام کی زندگی اور ان کے اصول و نظریات کی پیروی کریں جو کہ صحابہ کرام نے حضرت رسول ﷺ کی رہنمائی میں سیکھے تھے۔ ان کے نزدیک زندگی کا بہترین اصول مکمل قناعت اور توکل علی اللہ تھا۔

ان لوگوں کا فرض تھا کہ دنیوی امور اور ان کی جستجو سے دور رہیں اور اپنا وقت اور اپنی توانائی کو عبادت الہٰی اور نیک کاموں میں صرف کریں، اصول اسلام کی تبلیغ کریں اور اس کے اخلاقی قواعد و احکامات کی نشر و اشاعت میں کوشاں رہیں۔ اس فرقہ سے تعلق رکھنے والے نہ جائداد رکھیں اور نہ بھیک مانگیں۔ وہ لوگ دو دو تین تین وقتوں سے بھوکے رہتے لیکن بھیک نہ مانگتے۔ البتہ ضروریات زندگی کے لیے عطیات قبول کر لیتے۔ ان پر واجب تھا کہ ضرورت پوری ہونے کے بعد جو کچھ بچے اس کو غریبوں اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیں۔ کل کے لیے اٹھا رکھنا ان کا شیوہ نہ تھا اور ایسا نہ کرنا خدا پر بھروسہ نہ کرنے کے مترادف ہے۔ ان کے فرائض خاص میں صرف یہی نہ تھا کہ وہ اسلام کے اصولوں پر پابند رہیں بلکہ یہ بھی شامل تھا کہ جہاں تک ہو سکے دوسروں کو بھی حتی المقدور ان اصولوں کو توڑنے سے روکیں۔

سید محمد کے پیرو پوری طرح مسلح رہتے اور لوگوں کو شریعت کی سخت پابندی کرنے پر مجبور کرنے کے لیے ہتھیاروں کے استعمال سے بھی گریز نہ کرتے۔ سب مسلمان خواہ وہ کتنے ہی ثروت مند یا عالم کیوں نہ ہوں برابر سمجھے جاتے۔ اس طرح بادشاہ، غلام، پیشہ ور عالم اور جاہل مسلمان سب برابر تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ بڑائی اور بزرگی ایمان کی استواری

تقویٰ اور اصول دین کی صدق دلانہ اطاعت و فرمانبرداری میں مضمر ہے۔ جو لوگ ان کی مخالفت کرتے وہ مستقل خطرے میں رہتے۔

اس سلسلے کے پیروں کا جوش و خروش، دیانت داری اور نفس کشی کا لوگوں پر بڑا اثر ہوتا اور معاشرے کے مختلف طبقے اور عقیدے کے لوگ مختلف طریقے پر ان کی حمایت کرتے۔ جو لوگ کہ اپنی روزمرہ کی دنیوی زندگی سے کنارہ کشی اختیار نہ کرسکتے یا فقیرانہ زندگی نہ گزار سکتے ان سے یہ مطالبہ کیا جاتا کہ وہ اپنی آمدنی کا دسواں حصہ خیرات کریں اور پورے خلوص کے ساتھ فرائض پنجگانہ ادا کریں۔

خواجہ حسین نامی ایک بہت ہی بلند پایہ عالم دین اور اسلام کے سچے پیرو مکہ سے واپس آکر بیانہ میں مقیم ہوئے۔ ان پر عبداللہ نیازی کا بہت اثر ہوا اور وہ مہدوی تحریک میں شامل ہوگئے عبداللہ کے چلے جانے کے بعد خواجہ حسین نے مہدوی تحریک کو بڑے جوش و خروش، لیاقت اور قابلیت کے ساتھ چلایا۔

خواجہ کو لوگ شیخ علائی کے نام سے پکارنے لگے۔ ان کی زبردست عالمانہ لیاقت، اثر آفریں جدوجہد اور غیر معمولی قوت مناظرہ و مباحثہ نے لوگوں کے دلوں میں جوش پیدا کردیا۔ ان کی پرجوش اور روح پرور رہنمائی میں مہدویت ایک وسیع تحریک کی شکل اختیار کرنے لگی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علماء و طلباء، شہری اور فوجی، امراء و عوام سب ہی اس سے متاثر تھے۔ مسلمانوں کے دلوں میں احساس اور ضمیر میں ایک خلش پیدا ہوگئی۔ خانگی زندگی کا سکون درہم برہم ہوگیا۔ باپ بیٹے، بھائی بھائی اور میاں بیوی کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے۔

مہدوی تحریک صرف مذہبی یا دینی نقطۂ نظر ہی سے اتنی اہم نہ تھی بلکہ اس کے سیاسی، سماجی اور معاشی اثرات بھی بہت گہرے اور دوررس تھے۔ اس نے ملکیت و جائیداد کو مردود قرار دیا اور موجودہ سماجی و سیاسی، طبقہ بندی اور فرجی حکومت کو ماننے ہی سے انکار کردیا۔ اور امن و امان کی برقراری کی ذمہ داری علما اور حکومت کے کندھوں سے ہٹا کر عوام کے شانوں پر منتقل کردی۔ یہ ایک زبردست چیلنج تھا۔ امن و قانون کے محافظ اور وہ لوگ جو کہ اپنی شخصی زندگی، عیش و عشرت و دیگر دلچسپیوں میں غیروں کی مداخلت برداشت نہ کرسکتے تھے چشم پوشی کو تیار نہ تھے۔

شیخ علائی کو دربار میں طلب کیا گیا۔ شیخ نے بھی اپنے مرشد عبداللہ نیازی کی طرح بادشاہ کو درباری قاعدے کے مطابق سلام کرنے اور اس کے لیے شاہی القاب استعمال کرنے سے انکار کر دیا جس سے بادشاہ ناراض ہو گیا۔ شیخ نے بادشاہ کو اسی طرح سلام کیا جس طرح کہ عام مسلمانوں میں قاعدہ ہے۔

مخدوم الملک شیخ عبداللہ سلطان پوری نے شیخ علائی پر کافر انقلابی اور بدعتی ہونے کا الزام لگایا۔

بادشاہ نے شیخ علائی کا معاملہ ممتاز علمائے دین کی ایک مجلس کے سپرد کر دیا۔ یہ علما ملک کے مختلف حصوں سے مدعو کیے گئے تھے جس طرح یورپ میں پچیس سال قبل لوتھر کو مختلف طبقات کے افراد پر مشتمل ایک مجلس کے سامنے پیش کیا گیا تھا اسی طرح شیخ علائی کو اپنے عقائد کی صفائی کے لیے علما کے ایک بڑے مجمع میں پیش کیا گیا۔ شیخ کی مؤثر و فصیح تقریر، قاطع دلائل، حاضر جوابی اور گہری علمیت نے علما کو حیرت میں ڈال دیا۔ شیخ علائی نے چبھتے ہوئے الفاظ میں علما کو مخاطب کر کے ان پر یہ الزام لگایا کہ "آپ لوگ کتمان حق کرتے ہیں اور بادشاہوں اور شہنشاہوں کو اپنی خواہشات کا نشانہ بناتے ہیں اور انہی خواہشات کی خاطر در بدر بھٹکتے پھرتے ہیں۔"

اسلام شاہ شیخ علائی کی دیانت، عقیدے کی پختگی، دلائل کی قطعیت اور گہری علمیت سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے شیخ علائی کو مبارک باد دی اور یہ وعدہ کیا کہ اگر وہ اپنے مہدویہ خیالات کو ترک کر دینے کا اعلان کر دے تو ان کو سلطنت کا محتسب اعلیٰ مقرر کر دے گا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دھمکی دی کہ اگر شیخ نے اسلام شاہ کی تجویز پر عمل نہ کیا تو وہ بادل ناخواستہ مجبور ہو گا کہ علما کے قتل کے فیصلے کو نافذ کر دے۔

شیخ نے نتائج کی پرواہ کیے بغیر کہا کہ میں اپنے طریقے سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ باوجودیکہ شیخ عبداللہ سلطان پوری نے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا تھا اسلام شاہ نے شیخ علائی کو اپنی سلطنت کی جنوبی سرحد پر ہندیا میں ملک بدر کر دیا۔

شیخ نے جلاوطنی کے زمانے میں بھی اپنی تبلیغ جاری رکھی۔ چنانچہ یہ اطلاع ملی کہ بہار خاں اور اس کے ماتحت سپاہی اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ مہدویت کا فوج میں پھیلنا زبردست خطرات سے خالی نہ تھا۔ اس وجہ سے حکومت کے حکام میں فکر و تردد

اورخطرے کا احساس پیدا ہوگیا۔ عبداللہ سلطان پوری نے صورت حال کا فائدہ اٹھایا اور اسلام شاہ کے دل میں شکوک وخطرات کو اور اُبھارا۔

آخرکار شیخ علائی کو حکم دیا گیا کہ وہ بہار کے شیخ بدھا کے پاس جائے جن کی شیر شاہ بہت عزت کرتا تھا اور ان سے فتویٰ حاصل کرے۔ شیخ بدھا نے اس بات کی موافقت کی کہ شیخ علائی کو الزام سے بَری کیا جائے لیکن کہا جاتا ہے کہ شیخ بدھا کے لڑکوں نے شیخ کے نام سے ایک جعلی خط تیار کیا اور اس میں عبداللہ سلطان پوری کے فیصلے کی تائید کی۔ واپسی میں شیخ علائی پر طاعون کا حملہ ہوا اور ان پر ادویات کا اثر ڈالا گیا۔ وہ جب دربار میں پہنچے تو اس طول طویل سفر کی وجہ سے اس قدر کمزور اور خستہ حال تھے کہ بڑی مشکل سے آواز نکلتی۔

اسلام شاہ نے ان کے کان میں کہا کہ وہ مہدویت کو ترک کر دے۔ ورنہ وہ فتوے کے نفاذ کے بے مجبور ہو جائے گا لیکن شیخ نے بادشاہ کے کہنے کی پرواہ نہ کی۔ چنانچہ اسلام شاہ نے حکم دیا کہ کوڑے لگائے جائیں۔ جب تیسرا کوڑا جسم پر لگا تو شیخ علائی نے اپنی روح فرشتۂ اجل کو سونپ دی۔ یہ واقعہ 1549-50ء کا ہے۔ شیخ علائی کا جسم کھلے میدان میں ڈال دیا گیا۔ باوجودیکہ لوگوں کو منع کر دیا گیا تھا کہ کسی قسم کے احترام وعزت کا اظہار کریں لیکن پھر بھی ہر رات نعش پھولوں سے ڈھک جاتی۔

1553ء میں اسلام شاہ کو ناسور ہوگیا۔ بہترین طبی علاج کے باوجود مرض بڑھتا ہی گیا اور وہ صاحب فراش ہوگیا۔ اس نے ان تمام لوگوں کو جو اس کے بیٹے کی تخت نشینی میں روڑا اٹکا سکتے تھے تہ تیغ کر دیا۔ البتہ وہ مبارز خاں کو قتل نہ کر سکا جو شیر شاہ کے بھائی نظام خاں کا بیٹا اور اسلام شاہ کی بیوی بی بی بائی کا بھائی تھا۔ اس میں بی بی بائی کی لاپروائی کو بھی دخل تھا کیونکہ جب اسلام شاہ پر اختناق کی شدید تکلیف ہوئی اور وہ بستر مرگ پر پہنچ گیا تو اس نے بی بی بائی کو بلایا اور اس سے یہ کہا کہ اگر وہ یہ چاہتی ہے کہ اس کا بیٹا تخت نشین ہو تو وہ مبارز خاں کے قتل کی اجازت دے دے لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئی۔ 1553ء میں اسلام شاہ آٹھ سال نو مہینے نو دن حکومت کرکے گوالیار میں فوت ہوگیا۔

اسلام شاہ اپنے باپ کا لائق جانشین تھا۔ وہ ادب کا شائق اور ادیبوں کا مربی

تھا۔ اپنی صلاحیت، حاضر جوابی، متقدمین کے اقوال کے نقل اور عمدہ تصانیف کی داد و تحسین کی وجہ سے اس نے ادبی حلقوں میں ایک بلند مقام پیدا کر لیا تھا۔ کبھی کبھی وہ خود بھی برجستہ اور عمدہ اشعار کہہ لیتا تھا۔ اس نے شریعت اور فقہ کی تعلیم حاصل کی تھی اور ان موضوعات پر عالمانہ بحث میں حصہ لے سکتا تھا۔

اس کی شخصی زندگی بڑی منضبط تھی۔ وہ کوئی نشہ استعمال نہ کرتا تھا اور مسخروں، ڈوموں، رقاصوں یا قابل اعتراض چال چلن والی عورتوں کی صحبت پسند نہ کرتا تھا۔ وہ خوش اخلاق، مہذب اور شائستہ تھا۔ اس نے اپنی شہزادگی کے زمانے ہی میں ایک عمدہ سپاہی اور لائق سپہ سالار کے جوہر دکھائے اور جب وہ بادشاہ ہوا تو اس نے اپنے ماضی کے کردار کی خصوصیات میں اور اضافہ کیا۔ بحیثیت قائد وہ اپنے ماتحتوں کے دلوں میں جوش و شجاعت کے جذبات ابھارتا۔

بحیثیت بادشاہ کے وہ خدا ترس، رعیت پرور، سخت گیر، محتاط اور زبردست منتظم تھا۔ ان خوبیوں کے باوجود اس میں کچھ خامیاں بھی تھیں۔ وہ تند مزاج، اشکی، انتقام جو اور شقاوت کی حد تک ظالم تھا۔ اس نے نیازی خاندان کی عورتوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ وحشیانہ اور شرم انگیز تھا۔ چنانچہ لوگ اس سے ڈرتے ضرور تھے لیکن ان کے دلوں میں اس کے لیے محبت کا جذبہ نہ تھا۔

اسلام شاہ نے افغانوں سے نبٹنے کے لیے بڑی جرات بلکہ تند خوئی کا ثبوت دیا۔ وہ اس بات پر تلا ہوا تھا کہ ان کے دماغوں سے سرکشی، خود اور قبائلی احساسات کو نکال دے۔ اس نے اپنے مخالفین کو سنگ دلی سے قتل کیا اور جو بھی اس کی حکم عدولی کی ہمت کرتا اس کو وہ بے دریغ سزا دیتا یا برباد کر دیتا۔ اس نے افغانوں کی قوت کو کچل دیا اور ان کو شاہی اختیارات پر دست درازی کرنے سے باز رکھا۔ مسخروں اور رقاصاؤں کو جو اکثر امراء کو گھیرے رہتیں نکال باہر کیا۔ اس نے سپاہیوں کی دو سال تک تنخواہ بند کر کے ان کو اس درجے تک پہنچا دیا کہ وہ مویشیوں کی طرح ہنکائے جا سکتے تھے۔

ایک مرتبہ شاہ محمد فرملی نے حالات کو بڑی ہوشیاری سے اسلام شاہ کے سامنے اس طرح پیش کیا۔ "اے میرے ولی نعمت میں دو راتوں سے یہ خواب دیکھ رہا ہوں

کہ تین تھیلے آسمان سے اترے۔ ان میں سے ایک میں راکھ تھی دوسرے میں سونا اور تیسرے میں کاغذات۔ راکھ فوجیوں کے سروں پر بکھر گئی، سونے کی بارش ہندوؤں کے گھروں پر ہوئی اور کاغذات خزانے میں پہنچ گئے۔"

ممکن ہے اسلام شاہ کی یہ خواہش کہ افغان امراء کو نئے ڈھنگ سے منظم کرنے کے لیے راستہ ہموار کر کے ان کے اور بادشاہ کے درمیان جدید قسم کے تعلقات قائم کرے مفید ثابت ہوتی لیکن اس کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر تھا کہ ایسی تعمیری طرز پر کافی طویل عرصے تک عمل کیا جاتا رہے جیسے کہ برطانیہ میں ٹیوڈر دور میں ہوا تھا بدقسمتی سے اسلام شاہ وقت سے پہلے مرگیا۔ اور اس کے ورثاء نکمے نکلے اور اس کا مقصد نہ صرف ادھورا ہی رہ گیا بلکہ نتائج غیر مطلوب نکلے۔ افغانوں کے حوصلے پست ہوگئے اور ان کے وقار و شرافت اور جذبات و احساسات کو ٹھیس لگی جن کو شیر شاہ نے اپنی کامیاب لیڈر شپ سے ازسر نو زندہ کیا تھا۔

بہرحال اسلام شاہ کے دوران حیات میں اعلیٰ درجے کا ضبط و نظم قائم رہا۔ اس کے احکامات کی پوری طرح تعمیل کی جاتی رہی۔ بدایونی اس سلسلے میں اپنے ناقابل تقلید انداز بیان میں یوں اظہار خیال کرتا ہے، افسران حکومت بادشاہ کے سامنے آنے سے کانپتے، وہ بادشاہ کے احکامات وصول کرنے کے لیے، اپنے مرکز سے کئی میل دور تک چل کر آتے اور احکامات کو اپنے سروں پر رکھ کر لے جاتے حتیٰ کہ سرکاری اجتماعات میں اس کے جوتیں تک کا احترام کرتے۔

قدرت نے اسلام شاہ کو بلند خیالات سے نوازا تھا۔ اس نے اس بات کی کافی کوشش کی کہ ساری سلطنت میں قوانین اور ان کے نفاذ میں یکسانیت پیدا ہو۔ قانون شریعت موجود تھا اور وہ مذہبی قانون ہونے کے سبب حکومت کی دسترس سے کاملاً آزاد تھا۔ حالانکہ اہم مسائل میں قاضی اور فقیہوں میں عام طور پر اتفاق رائے پایا جاتا تاہم متعدد امور میں کافی حد تک اختلاف نظر پیدا ہوجاتا۔ قاضیوں کو اپنے فیصلے صادر کرنے میں آزادی کی کافی گنجائش نکل آتی۔

شاید اسلام شاہ یہ چاہتا تھا کہ قانون کی بنیاد حکومت کی منظوری پر مبنی ہو۔ اس سلسلے میں اس کا طرز ترقی پسندانہ تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ قانون کے نظریات کو

ضروریاتِ زمانہ کے مطابق ڈھالا جاسکے۔ اس نقطۂ نگاہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے انتظام مملکت کے تقریباً ہر شعبے کے لیے احکامات جاری کیے تھے خواہ وہ فوجی ہوں یا مالیاتی، تجارتی ہوں یا کاروباری۔ ان احکامات میں اس کے ملحوظ نہیں رکھا گیا تھا کہ "وہ قانونِ اسلام کے مطابق ہیں یا نہیں"۔

بقول بدایونی "یہ ایسا اقدام تھا جس نے اس سلسلے میں قاضی یا مفتی سے رجوع کرنے کی ضرورت کو کالعدم کر دیا"۔

قوانین کے جمع کرنے، ان کی تدوین اور ان کو سادہ و آسان بنانے کا خیال اور ان کو حکومت کی منظوری دینے کا کام ایک بہت ہی دور اندیشانہ و حوصلہ مندانہ اور جرارت مندانہ اقدام تھا۔ اس نے جس قدر وسیع النظری، بصیرت اور نظریات کو نافذ کرنے کی لیاقت کا مظاہرہ کیا اس قدر استعداد نہ تو علاءالدین خلجی میں تھی نہ محمد بن تغلق میں اور نہ خود اس کے باپ میں تھی۔

اسلام شاہ نے عام طور پر اپنے باپ کی انتظامی و زراعتی پالیسی کی پیروی کی۔ اس نے ان کی اصلاح کرنے اور ان کو زیادہ تر مؤثر بنانے کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر اس نے اور زیادہ سرائیں تعمیر کرائیں اور ان میں زیادہ سہولتیں فراہم کیں۔ لنگر کے انتظامات کو مرکز کے اختیار سے خارج کر دیا۔ وظائف اور مدد معاش کو وسیع پیمانے پر جاری کیا اور ان حالات میں جہاں تک ممکن ہو سکا جاگیرداری نظام کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

افغان عام طور پر دو طبقوں میں منقسم تھے۔ ان میں سے ایک طبقہ صاحبِ جاگیر تھا اور دوسرا اس سے محروم تھا۔ لہذا یہ دوسرا طبقہ بھی جاگیر حاصل کرنے کا خواہشمند تھا۔ اسلام شاہ نے تبدیلی کی خاطر پہلے طبقے سے جاگیریں لے کر دوسرے طبقے والوں کو دے دیں۔ اس تبدیلی سے عام حالات پر بظاہر کوئی فرق نہ پڑا کیوں کہ اس کا نتیجہ محض یہ ہوا کہ جاگیر زید کے ہاتھوں سے نکل کر بکر کو مل گئی۔ تاہم اس سے دو فائدے ضرور ہوئے۔ اوّل تو یہ کہ اسلام شاہ نے اس طرح پرانے امراء کو جن کی جڑیں مضبوط ہو چکی تھیں کمزور کر دیا اور نئے امراء کا طبقہ وجود میں آیا جو بادشاہ کا ممنونِ احسان تھا۔

دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اب یہ بات ظاہر ہو گئی کہ یہ خیال کہ ملک کی حفاظت اور استحکام کا دارومدار جاگیرداروں پر منحصر ہے بے حقیقت اور محض وہم تھا۔ ان تمام کارروائیوں کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ نفسیاتی طور پر افغان نظام جاگیرداری کے خاتمے کے لیے تیار ہونے لگے۔ جاگیرداری کا خاتمہ کرنے کے منصوبے کے ساتھ ساتھ اسلام شاہ نے "رعیت کی حالت بہتر بنانے کے لیے انتھک کوشش کی۔"

ابوالفضل بھی اسلام شاہ کی اس بات کی تعریف کرتا ہے کہ وہ کاشت کاروں کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کرنے کا خواہشمند تھا۔

شیر شاہ کے زمانے کا پولیس کا نظام انتقاد سے مبرا نہ تھا۔ اس نے گاؤں کے مقدم کو اس کے حلقۂ اختیار میں ہونے والے جرائم کا ذمّے دار ٹھہرایا لیکن سرکاری ملازمین جو امن و امان قائم رکھنے کے لیے ملازم تھے کسی قسم کے ضرر و زیاں کے تاوان کی ادائیگی کے ذمّے دار نہ تھے۔ اسلام شاہ نے گاؤں کے مقدم کی ان شکایات کو دور کر دیا اور سرکاری ملازمین کو ذمّے داری اور جرمانے میں اُن کے ساتھ شریک کر دیا۔

اسلام شاہ نے فوج کی کارگزاری کو برقرار رکھنے کے لیے نہ صرف اپنے باپ کے طرز پر عمل کیا بلکہ بعض نئی اصلاحات بھی عمل میں لایا۔ اس نے رسالوں میں مختلف درجے مقرر کر کے سوار فوج کو از سرِ نو منظم کیا۔ فوج کو پچاس، دو سو، دو سو پچاس اور پانچ سو کی ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ اسلام شاہ فوج کو اور زیادہ مستعد بنانے کے لیے یہ چاہتا تھا کہ پرانے اعشاری طریقے میں نئے درجوں کا اضافہ کرے تاکہ افسروں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے اور ان کی کارکردگی بہتر ہو جائے۔ بعد میں اس نظام کو اکبر نے بھی پسند کیا اور اس طریقے کو ترقی دی۔ ہر پچاس آدمیوں کی ٹکڑی کے حسابات و کاغذات کی دیکھ بھال کے لیے دو محرّر بھی مقرر کیے جاتے۔

فوج کی بہتر تنظیم کے لیے پانچ ہزار، دس ہزار اور بیس ہزار سپاہیوں کے بڑے بڑے ڈویژن بھی قائم کیے گئے۔ ان میں سے ہر ایک ڈویژن کے لیے ایک عملے کا بھی تقرر ہوتا جس میں ایک سردار، ایک افغان اور ایک ہندوستانی جج اور دو دوسرے کارکن بھی ہوتے۔ سوار فوج کی از سرِ نو تنظیم کرنے کے علاوہ اس نے توپ خانے کو بھی مضبوط بنا دیا۔

سلطنت کی حفاظت کے لیے اسلام شاہ نے شیر شاہ کی مقرر کردہ دفاعی صف پر دوسری دفاعی صف کا بھی اضافہ کیا۔ شیر شاہ نے دریائے سندھ کی بالائی سرحد کی حفاظت کے لیے رہتاس کا قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ اسلام شاہ نے پہاڑیوں پر متواتر پانچ قلعے بنوا کر اس کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ یہ پانچ قلعے شیر گڑھ، اسلام گڑھ، رشید گڑھ، فیروز گڑھ اور مانکوٹ میں تھے۔ اور ان سب کو مشترکاً 'مانکوٹ کے قلعے' کہا جاتا تھا۔ جب ہمایوں اپنی گم شدہ سلطنت کو دوبارہ فتح کرنے ہندوستان آیا تو افغانوں نے ان قلعوں کو بڑے موثر طریقے پر استعمال کیا۔

اسلام شاہ نے نہ صرف شیر شاہ کی چھوڑی ہوئی سلطنت کو بحال رکھا اور بغاوت کی ہر کوشش کو کچل دیا بلکہ حدود سلطنت کو تھوڑا سا مشرقی بنگال کی طرف اور بڑھا لیا۔ اگر مغل خطرہ سر نہ اٹھاتا تو شاید وہ اپنی سلطنت کی سرحدات کو اور بھی زیادہ وسیع کرتا۔ اگر اسلام شاہ کچھ وقت اور زندہ رہتا تو شاید ہمایوں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے کی جرأت نہ کرتا۔

باب 7

دوسری افغان سلطنت کا انحطاط

شیر شاہ نے جس حبّ الوطنی کے جذبے کے ماتحت افغان امرا کو ابھار اور متحد کیا تھا اس کو اسلام شاہ کے ہاتھوں زبردست صدمہ پہنچا اور عملاً وہ جذبہ نیست و نابود ہو گیا اور جب اسلام شاہ کی بارعب شخصیت بھی اٹھ گئی تو افغان امرا کی گھٹی ہوئی خواہشات اور احساسات کو آزادی کا موقع ہاتھ آگیا۔ اسلام شاہ کے ایک فرزند فیروز کو سلیم شاہی امرا نے تخت پر بٹھا دیا۔ چند ہی دن بعد مبارز خاں نے اس کو نہایت بے دردی کے ساتھ اس کی ماں کے سامنے، جو کہ مبارز خاں کی بہن تھی قتل کر دیا۔

مبارز خاں ایک ناواقف اور عیاش آدمی تھا اور اس میں سوائے ماہر موسیقی ہونے کے کوئی اور خوبی نہ تھی۔ پھر بھی اس کو امرا کے ایک گروہ نے جن میں خواص خاں کا سب سے چھوٹا بھائی شمس خاں پیش پیش تھا تخت نشین کر دیا۔

مبارز خاں ایک کمینہ، نکما اور اوباش آدمی تھا جس کو امورِ مملکت سے قطعاً دلچسپی نہ تھی اور نہ حکومت کا سربراہ ہونے کے لائق تھا۔ وہ ناعاقبت اندیشانہ فضول خرچی اور بے جا داد و دہش کے ذریعے کمینوں اور اوچھے لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہتا۔ اس نے عادل شاہ کا لقب اختیار کیا لیکن افغان اس کو اندھلی (اندھا) اور ہندو اس کو ادلی (احمق) کہہ کر پکارتے تھے۔

جب فیروز کے قتل کی خبر دور دراز صوبوں کے امراء کو ملی تو ان میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ گاؤں گاؤں شہر شہر ہر جگہ بغاوت نے سر اٹھایا" اور امراء اس موقع سے اپنی آزادی کا فائدہ اٹھانے لگے۔

سب سے پہلے سلیم خاں سور نے علم بغاوت اٹھایا۔ اس کی بغاوت ابھی مشکل سے دبی تھی کہ جنید خاں فوجدار نے اجمیر میں سر اٹھایا۔ اس کو ہیمو نے شکست دی جو کہ ایک ہندو افسر تھا اور جس نے آگے چل کر اپنے آقا کی ملازمت میں بڑی شہرت حاصل کی۔ اس لائق فوجی افسر کا نام ہیمو یا ہیمراج تھا۔ اس کا سلسلۂ نسب پردہ خفا میں ہے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہ دھوسر قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ دھوسر گوڑ برہمنوں ہی کی ایک ذات ہے۔ ہیمو ریواڑی میں شورہ کا بیوپاری تھا۔ اتفاقاً اسلام شاہ اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کو بازار کا نگراں مقرر کر دیا۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ اپنی لیاقت سے ترقی کرنا شروع کی۔ کچھ عرصے تک تو وہ شاہی مطبخ کا داروغہ رہا لیکن بعد میں اس کا نام سلطنت کے فوجی امراء کی فہرست میں آگیا۔

اسلام شاہ کی وفات کے بعد اس نے عادل شاہ کا ساتھ دیا۔ جنید خاں کے مقابلے میں کامیابی حاصل کر کے عادل شاہ کی نظروں میں اس کا رتبہ بہت بلند ہو گیا اور وہ عملاً سلطنت کے وزیر اعظم اور ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں فوجی اور انتظامی صلاحیت تھی مگر افغان امراء نے اسے کوئی اہمیت نہ دی بلکہ اُلٹے اس سے حسد کرنے لگے۔

عادل شاہ سرکش و مفسد افغانوں سے بہت عاجز آچکا تھا۔ چنانچہ اس نے بھی اسلام شاہ کی تقلید کی۔ اس کی حکمت عملی کے دو پہلو تھے۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ شیر شاہی اور اسلام شاہی زمانہ کے باقی ماندہ امراء کی بجائے اپنے پسندیدہ امراء کو برسر کار لائے۔ دوسرے یہ کہ سرکش قبائلی سرداروں کی قوت اور غرور کچل ڈالے۔

ایک مرتبہ جب کہ وہ دربار عام میں جاگیروں میں رد و بدل کر رہا تھا یہ اعلان کیا گیا کہ شاہ محمد فرملی کی قنوج کی جاگیر سرمست خاں شروانی کو عطا کر دی گئی تو شاہ محمد فرملی کا بیٹا سکندر خاں جو کہ ایک تند مزاج جوان تھا یہ سن کر بپھر گیا اور ایک دم برہم ہو کر بولا: "اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ہم سے ہماری جاگیریں چھینی جا رہی ہیں اور ان کو سرطانی

سنگ فروشوں کو دیا جا رہا ہے:

اسی گرما گرمی میں جھگڑا بڑھ گیا۔ تلواریں سونت لی گئیں اور سرمست خاں کو وہیں اور اسی وقت قتل کر دیا گیا۔ سکندر اس وقت غصے سے پاگل ہو رہا تھا اور اگر عادل شاہ فوراً ہی بھاگ کر اپنے حرم میں نہ چلا جاتا اور اندر سے دروازہ مقفل نہ کر لیتا تو سکندر اس کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ اس وقت سکندر کو ابراہیم خاں نے اور اس کے بوڑھے باپ کو دولت خاں نے قتل کر دیا۔

دربار میں جو کچھ ہوا اس سے تاج خاں کرانی نے جو کہ اسلام شاہ کے زمانے میں ایک بہت ہی گستاخ امیر تھا اور جس نے خواص خاں کو گرفتار کیا تھا یہ صحیح نتیجہ اخذ کیا کہ امور سلطنت میں بہت ہی تیزی سے تبدیلی آ رہی ہے۔ چنانچہ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے ہمراہیوں کو لے کر گوالیار سے مشرق کی طرف فرار ہو جائے۔

عادل شاہ نے اس باغی سردار کا تعاقب کیا۔ ہیمو نے چھبرامؤ کے مقام پر اس کو جا لیا اور شکست دی۔ تاج خاں کرانی بھاگ کر چنار میں پناہ گزیں ہوا۔ وہ راستے میں لوٹ مار کرتا گیا۔ چنانچہ اس نے چنار پہنچ کر ایک مرتبہ پھر مقابلہ کیا لیکن ہیمو نے اس کی فوج کو شکست دی۔ پھر بھی وہ نکل بھاگا اور اپنے بھائی احمد خاں صوبیدار قنوج کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

ہیمو نے عادل شاہ سے درخواست کی کہ وہ خود چنار میں قیام کرے اور کرانیوں کا معاملہ اس پر چھوڑ دے۔ اب ہیمو آگے کی طرف بڑھا۔ کرانی آگے آگے بھاگتے جا رہے تھے۔ انھوں نے جب تک کہ وہ صوبہ بنگال کے خواص پور ٹانڈا نہ پہنچ گئے جہاں کہ تاج خاں کے بھائیوں کی جاگیریں تھیں، دم نہ لیا۔

دولت خاں جلوانی اور فیروز خاں کاکر جیسے افغان سرداروں کے قتل نے دوسرے سرداروں کو اپنے مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں سرداروں کو راستے سے ہٹا کر عادل شاہ نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی سلطنت کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکا۔

عادل شاہ کی بڑی بہن کا شوہر ابراہیم خاں سور جو اس کے خاص معاونین میں سے تھا اس سے الگ ہو گیا۔ جس وقت عادل شاہ چنار میں تھا ابراہیم خاں گوالیار سے بھاگ کر

دہلی پہنچا اور ابراہیم شاہ کا لقب اختیار کرکے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس نے آگرہ پر قبضہ کرکے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ جلد ہی بہت سے سردار اس سے مل گئے اور اس کی طاقت کافی بڑھ گئی۔

ابراہیم کے اس عمل سے عادل شاہ کی چھوٹی بہن کے شوہر احمد خاں کی بھی ہمت بڑھی۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس نے ابراہیم شاہ سے درخواست کی کہ پنجاب اس کو دے دے جس کے عوض میں وہ ابراہیم کا وفادار رہے گا۔ ابراہیم نے یہ بات قبول نہ کی اور ارادہ کر لیا کہ فیصلہ شمشیر کے ذریعے ہی کیا جائے گا۔

آگرہ سے اٹھارہ میل شمال مغرب کی طرف فراہ نامی مقام پر جو کہ ضلع متھرا میں واقع ہے۔ ایک جنگ ہوئی جس میں ابراہیم خاں کو شکست ہوئی اور وہ سنبھل کی طرف فرار ہو گیا۔ احمد شاہ نے وقت ضائع کیے بغیر سکندر شاہ کا لقب اختیار کرکے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس طرح شیر شاہ کی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ختم ہو گئی۔ محمد خاں سور نے بنگال میں اور باز بہادر نے مالوہ میں خود مختار سلطنتیں قائم کر لیں۔

اس طرح سلطنت پانچ حصوں میں منقسم ہو گئی۔ احمد خاں سور یا سکندر شاہ پنجاب میں اور ابراہیم شاہ سنبھل و دوآبہ میں خود مختار ہو گئے۔ عادل شاہ کی حکومت چنار سے بہار تک رہ گئی۔ مالوہ میں باز بہادر اور بنگال میں محمد خاں حکمراں تھے۔ ان میں سے ہر شخص پوری سلطنت پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ سکندر نے دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا۔ محمد خاں اپنی سرحدوں کو پار کرکے عادل پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ ساری افغان سلطنت میں افراتفری پھیل گئی۔ یہ موقع ہمایوں کے لیے سازگار تھا۔

ہمایوں نے قزنی سے فرار ہونے کے بعد بادل ناخواستہ ایران کے شاہ طہماسپ کے پاس پناہ لی۔ شاہ ایران نے اس کو خوش آمدید کہا اور اس کے ہر قسم کے آسایش و آرام کا خیال رکھا۔

جولائی 1544ء میں ہمایوں اور شاہ طہماسپ کی سورلیق کے مقام پر ملاقات ہوئی اور جب شاہ طہماسپ نے اس کو شیعہ بنانے کی ناکام کوشش کی تو دونوں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔

ہمایوں نے باوقار طور پر وسیع المشربی اور آزاد خیالی کا رویہ اختیار کیا اور اس

بات کی پوری کوشش کی کہ شاہ طہماسپ کے احساسات کو کسی قسم کی ٹھیس نہ پہنچے۔ اس نے حالات کا لحاظ رکھتے ہوئے شیعوں کا لباس پہننا شروع کر دیا اور بعض ایسے کاغذات پر بھی دستخط کر دیے جن میں شیعہ عقائد کا ذکر تھا۔

اسی دوران ہمایوں کو شاہ طہماسپ کے چھوٹے بھائی بہرام مرزا کی سازشوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ایک بار بہرام مرزا نے بلا وجہ ایک معمولی سی بات پر اپنی بے عزتی کا سوال کھڑا کر دیا۔ ان سازشوں کو کامران کے حامیوں نے جو کہ ایرانی دربار میں سرگرم عمل تھے اور بھی ہوا دی لیکن ہمایوں کی خوش تدبیری اور شاہ کی بہن سلطانم بیگم اور دیوان قاضی جہان کی حمایت نے اس کو بربادی سے بچا لیا۔

آخرکار شاہ نے ہمایوں کو اس شرط پر فوجی مدد دینے پر رضامندی کا اظہار کیا کہ وہ شاہ کی ہمشیرہ کی لڑکی سے شادی کر لے اور قندھار، کابل اور غزنی کی فتح کے بعد قندھار ایران کو دے دے۔ تیرہ ہزار سواروں کی ایک فوج شاہ کے کم عمر لڑکے مرزا مراد کی برائے نام سرکردگی میں ہمایوں کی مدد کے لیے روانہ کی گئی

ہمایوں نے قندھار پر حملہ کیا۔ جہاں اس وقت کامران کی طرف سے عسکری قابض تھا۔ پانچ مہینے سے زیادہ کے محاصرے کے بعد عسکری نے 30 ستمبر 1545ء کو قلعہ سونپ دیا۔ اس وقت ایرانیوں نے تین مطالبات پیش کیے۔ اول تو یہ کہ شہر ان کے سپرد کر دیا جائے دوئم یہ کہ جتنا خزانہ ہاتھ آیا ہے وہ سب ایرانیوں کو دے دیا جائے اور تیسرے یہ کہ عسکری مرزا کو ان کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ اس کو قیدی بنا کر شاہ کے پاس روانہ کر دیں۔

ہمایوں نے پہلے دو مطالبات تو مان لیے لیکن اپنے بھائی کو سپرد کرنے سے صاف انکار کر دیا کیوں کہ اس طرح بابر کے پورے خاندان کی بے عزتی ہوتی۔ ہمایوں اور ایرانیوں کے درمیان تعلقات اس قدر کشیدہ ہو گئے کہ ایرانیوں نے نہ صرف یہ کہ ہمایوں کے خاندان کو کابل کی مہم کے دوران قلعہ میں پناہ دینے سے انکار کر دیا بلکہ اس قدر کبر و غرور کا مظاہرہ کیا کہ مغل شہنشاہ ان لوگوں سے فوری طور پر نمٹنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔

شاہ طہماسپ کے لڑکے مرزا مراد کی موت سے فائدہ اٹھا کر ہمایوں نے شہر کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ایرانیوں پر ناگہانی حملہ کر دیا۔ شہر کے گلی کوچوں میں تھوڑی سی

لڑائی کے بعد ایرانیوں کو شہر سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا۔ آخرکار قندھار کا قلعہ بھی اکتوبر ۱۵۴۵ء میں ہمایوں کے ہاتھ آ گیا۔ ایرانیوں کے ظلم و ستم اور تعصب کی اتنی داستانیں پھیلیں کہ شاہ ایران کو اس معاملے میں خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ شاہ ایران کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے ہمایوں نے بیرام خاں کو جو کہ شیعہ تھا قندھار کا صوبےدار مقرر کر دیا۔

بعض مورخین نے قندھار کے معاملہ میں ہمایوں پر دھوکا بازی کا الزام عائد کیا ہے لیکن ان کے دلائل کمزور ہیں اور ان میں قطعیت نہیں پائی جاتی۔ برخلاف اس کے ہمایوں کی دفاعی کوششوں کے مضبوط دلائل ہیں۔ ایرانیوں نے اپنے اس وعدے کو پورا نہیں کیا کہ وہ کابل، غزنی اور بدخشاں کو فتح کرنے میں اس کی مدد کریں گے اور اس طرح ہمایوں اس ذمے داری سے بری الذمہ ہو گیا کہ قندھار ایرانیوں کو دے دے۔

اس کے علاوہ قندھار کے سُنّی باشندے ایرانیوں کے غرور اور ظلم و ستم سے سخت نالاں تھے۔ ہمایوں کا بحالت مجبوری ایرانیوں کی مدد حاصل کرنا اس بات کی دلیل سمجھا جانے لگا کہ وہ اپنی رعایا کی حفاظت کا اہل نہیں۔ اس وجہ سے اس کو اپنی رعایا کی ہمدردی اور اعتماد سے ہاتھ دھونا پڑا لیکن ہمایوں اس اعتماد کو ہمیشہ کے لیے گنوانا نہ چاہتا تھا۔

ایرانیوں کے مخالفانہ رویّہ نے، کہ ہمایوں کے خاندان کے افراد کو افغانستان فتح ہونے تک قلعہ میں نہ رہنے دیں، ہمایوں کو بہت مایوس کر دیا تھا۔ اس وقت ہمایوں کو اس بات کی ضرورت تھی کہ فوجی کارروائیوں کے لیے ایک مضبوط مرکز قائم ہو اور ایسا مرکز جس کی پشت بھی پوری طرح محفوظ ہو محض قندھار ہی ہو سکتا تھا۔ ایسے مرکز کو ایرانیوں کے سپرد کرنا عقل کے خلاف تھا۔

ایرانیوں نے ابتدا میں ہی بغیر کسی معقول وجہ کے قلعہ پر پوری طرح تسلط کر کے ہمایوں کو ناراض کر دیا تھا۔ ان کا قندھار پر حق اسی حالت میں بے چوں و چرا قبول کیا جا سکتا تھا جب کہ ہمایوں ان کی مدد سے افغانستان و بدخشاں پر کامیابی کے ساتھ فتح حاصل کر لیتا۔ ان دلائل کی روشنی میں ہمایوں پر غداری کا الزام قابلِ قبول نہیں۔

ہمایوں نے قندھار کو اپنی فوجی کارروائیوں کا مرکز قرار دے کر کابل کی طرف رُخ کیا۔ ہندال مرزا کابل سے بھاگ کر ہمایوں سے آملا۔ دوسری طرف بدخشاں کے لوگوں نے

خود کو کابل سے علیحدہ کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ہمایوں تقریباً چار پانچ ہزار سپاہیوں کو لے کر کامران سے جنگ کرنے کے لیے روانہ ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ کامران کے پاس ہمایوں کی فوج سے چار گنا زیادہ فوج تھی۔ لیکن ہمایوں کو کامران کے ساتھیوں کی اخلاقی حمایت بھی حاصل تھی۔ کیوں کہ وہ لوگ اتنے عرصے میں کامران کی سخت گیر اور خود غرضانہ حکومت سے تنگ آچکے تھے۔ جب ہمایوں کابل پہنچا تو لوگ جوق در جوق اس کی فوج میں شامل ہونے لگے۔ جونہی کامران نے اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو ساتھ چھوڑتے دیکھا تو اس نے خود کو قلعہ کابل میں بند کر لیا۔ وہاں بھی خود کو محفوظ نہ پا کر اس نے غزنی کی طرف راہِ فرار اختیار کی لیکن وہاں کے فوجی افسروں نے بھی اس کو داخل نہ ہونے دیا۔ چنانچہ وہ اپنے خسر شاہ حسین کے پاس سندھ چلا گیا۔

نومبر ۱۵۴۵ء میں ہمایوں شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ کابل میں داخل ہوا اور وہاں کے باشندوں نے خوب خوشیاں منائیں۔ یہاں وہ اپنے بیٹے اکبر سے ملا جو کہ اس وقت تین سال کا ہو چکا تھا۔ رفتہ رفتہ سارے ملک نے ہمایوں کی حکومت تسلیم کر لی۔

ہمایوں سختیاں برداشت کرتے کرتے جفاکش ہو گیا تھا اور اس کے مزاج میں کافی تبدیلی آگئی تھی۔ جونہی اس کو پتہ چلا کہ یادگار ناصر مرزا اس کے خلاف سازش کر رہا ہے۔ اس نے فوراً اسے قید کر دیا اور بعد میں قتل کرا دیا۔ ۱۵۴۶ء کے موسم بہار میں وہ سلیمان مرزا کو سزا دینے کے لیے کابل روانہ ہو گیا۔ اس نے نہ صرف اپنے آزاد حکمراں ہونے کا اعلان کر دیا تھا بلکہ کابل کے متعلقہ علاقوں پر قبضہ کرنے کی جرات کی تھی۔ ہمایوں کے سپاہی زبردست مشکلات کے باوجود اس بہادری سے لڑے کہ بدخشاں تقریباً پوری طرح تسخیر ہو گیا۔ اور سلیمان خوست کی طرف بھاگ گیا۔

بدقسمتی سے ہمایوں بدخشاں میں سخت بیمار پڑ گیا۔ چاروں طرف دور دور تک یہ افواہ پھیل گئی کہ ہمایوں کا انتقال ہو گیا۔ ہر جگہ بد امنی پھیل گئی اور ہمایوں کے سارے کرے دھرے پر پانی پھر گیا۔

اس موقع پر کامران بھی بڑی تعداد میں مال و دولت اور فوج لے کر سندھ سے نکل پڑا اور کابل پر حملہ آور ہوا اور بغیر کسی مزاحمت کے اس پر قابض ہو گیا۔ جونہی ہمایوں دوبارہ تندرست ہوا اس نے سلیمان سے صلح کر لی۔ بدخشاں اس کو واپس کر دیا اور زبردست

سردی اور برف باری کے باوجود کابل کی راہ اختیار کی۔ جب وہ افغانستان کے درّے کے قریب پہنچا تو کامران کا فوجی سالار شیر افگن ایک بڑی فوج لے کر اس کا مقابل ہوا۔ جنگ میں شیر افگن کو شکست ہوئی اور گرفتار کر لیا گیا۔ ہمایوں آگے بڑھا اور قلعۂ کابل کا محاصرہ کر لیا۔

کامران نے پہلے تو اس بات کی کوشش کی کہ وہ ہمایوں کو واپس ہونے پر مجبور کر دے لیکن جب وہ اس کوشش میں ناکام رہا تو اس نے اپنا غصہ ہمایوں کے ساتھیوں کے بیوی بچّوں پر نکالا اور اُن کے ساتھ بڑا وحشیانہ سلوک کیا۔ معصوم بچّوں کو قلعہ کی دیواروں پر اس طرح لٹکا دیا گیا کہ وہ محاصرین کی آتش باری کی زد میں آجائیں۔ ان بدنصیب بچّوں میں شاہزادہ اکبر بھی شامل تھا لیکن خوش قسمتی سے اس کو بروقت دیکھ لیا گیا اور گولہ باری کا رخ موڑ دیا گیا۔ آخرکار کامران قلعہ سے نکل کر پہاڑیوں کی طرف فرار ہو گیا۔ اور اپریل 1547ء میں ہمایوں ایک بار پھر کابل کا حکمراں بن گیا۔

کامران خاموش بیٹھنے والا نہ تھا۔ وہ اوّل تو بدخشاں کے حاکم سلیمان کے پاس گیا لیکن وہاں سے مدد نہ پاکر ازبکوں کے پاس گیا۔ تیموریوں کے ان خاندانی مخالفین نے بڑی خوشی سے کامران کی مدد کرنا قبول کر لی۔ اسی طرح جس طرح ایرانی مخالفین نے ہمایوں کی حمایت کی تھی۔ کامران ایک زبردست ازبک فوج کے ہمراہ راستے میں غارت گری کرتا ہوا واپس آیا۔ اس نے سلیمان مرزا اور ہندال کو جن کے پاس کابل سے مدد پہنچ چکی تھی زبردست شکست دی اور پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ جولائی 1548ء میں ہمایوں اور کامران کے درمیان جنگ ہوئی۔

اس لڑائی میں ہندال مرزا کی بہادری نے شکست سے نجات دلائی اور کامران مجبوراً تالقان کی طرف بھاگ گیا۔ محاصرہ اس قدر شدید تھا کہ کامران آخرکار 17 اگست 1548ء کو اس شرط پر سر تسلیم خم کرنے پر تیار ہو گیا کہ اس کو مکہ جانے کی اجازت دے دی جائے۔ ہمایوں نے یہ شرط مان لی اور عام معافی کا حکم دے دیا۔ بھائیوں کے ملاپ کی خوشی منانے کے لیے ایک زبردست دعوت کا انتظام کیا گیا۔ اب ہمایوں ازبکوں کو سزا دینے کے لیے آگے بڑھا۔ مغل فوج نے ازبکوں کے مقابلے میں کافی برتری حاصل کر لی تھی لیکن ایک بے بنیاد خوف و دہشت کے سبب ان میں افراتفری پھیل گئی اور ہمایوں

اپنے ساتھیوں کی ایک مختصر تعداد کے ساتھ کابل واپس آگیا۔

کامران اس موقع سے جب کہ ہمایوں کے وقار اور عظمت کو دھکا پہنچ چکا تھا فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہوگیا۔ کامران نے جس قدر اپنے پرانے ساتھیوں کو جمع کرسکتا تھا جمع کیا اور ازبکوں سے مدد طلب کی لیکن قلعہ ظفر اور قندوز کو فتح کرنے کی کوششیں کامیاب نہ ہوسکیں۔

ہندال کے جعلی خطوط کی بنا پر ازبکوں کے دل میں کامران کی طرف سے شکوک پیدا ہوگئے اور انھوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ ہر طرف سے مایوس ہوچکا تھا کہ کابل سے اسے بلاوا پہنچا۔ چنانچہ وہ فوراً کابل روانہ ہوگیا۔

ہمایوں نے اس کو راستے میں دیر ایک کے مقام پر روکنے کی کوشش کی لیکن کامران کی کثیر تعداد فوج سے ہار گیا۔ اس کو خود بھی سخت چوٹ آئی لیکن بچ کر نکل بھاگا۔ اس کا لبادہ اس قدر خون آلود ہوگیا تھا کہ اس نے اسے اتار پھینکا۔ یہ لبادہ کامران کے ہاتھ لگ گیا اور ہمایوں کے ساتھیوں کو یہ لبادہ دکھا کر انھیں یہ یقین کرا دیا کہ شہنشاہ کام آگیا ہے اور اس طرح کابل ایک بار پھر کامران کے قبضے میں آگیا۔

ہمایوں بیکار نہ بیٹھا۔ اس نے اپنے سارے ساتھیوں کو جمع کیا اور ان میں سے ہر ایک شخص سے فرداً فرداً وفاداری کی قسم لی تاکہ آیندہ روز روز کی روگردانی سے جس سے کہ وہ اکتا چکا تھا نجات مل سکے۔

امرا نے اس بات کو اس شرط پر ماننا قبول کیا کہ شہنشاہ بھی اس بات کی قسم کھائے کہ وہ اپنے بہی خواہوں کے مشورے کو قبول کرے گا۔ ہمایوں نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔

شہنشاہ اور امرا کے درمیان باہمی پابندیوں کا قول و قرار ایک ایسا بے نظیر واقعہ ہے جس پر پوری توجہ سے غور کرنا چاہیے۔ کیوں کہ یہ بات "ہمارے دلوں میں شک پیدا کرسکتی ہے کہ آیا مشرق کے مطلق العنان سلاطین کی روایتی آمریت کم از کم اہم لمحات میں عملی طور پر محض واہمہ تو نہ تھی؟" یہ واقعہ ہمایوں کی زندگی میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہمایوں وفاداری کے اس عہد و پیمان کے بعد آگے بڑھا اور اشترگرام میں

کامران سے مٹھ بھیڑ ہوئی۔ کامران اس کو کابل کی طرف سے روکنے کے لیے آیا تھا۔ ہمایوں نے کامران کو یہ تجویز پیش کی کہ وہ کابل حوالے کردے اور ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے اس کے ساتھ چلے۔ کامران نے یہ تجویز منظور نہ کی۔

چنانچہ شہنشاہ نے اس بات پر رضامندی کا اظہار کیا کہ کابل کو اکبر کی ماتحتی میں دے دیا جائے تاکہ دونوں فریق راضی ہو جائیں۔ کامران اس تجویز کو ماننے کے لیے کچھ آمادہ ہو گیا تھا لیکن قرچہ بیگ اور دوسرے ساتھیوں نے کامران کو ایسا نہ کرنے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گفت و شنید ختم ہو گئی اور ایک زبردست جنگ ہوئی جس میں کامران کو پوری طرح شکست اٹھانی پڑی۔ قرچہ بیگ کو گرفتار کر کے فوراً قتل کر دیا گیا۔ کامران بھاگ گیا اور اب ہمایوں کے سامنے کابل کا راستہ بلا روک ٹوک کھلا ہوا تھا۔ ہمایوں کابل کی طرف بڑھا اور بغیر کسی مزاحمت کے اس پر قبضہ کر لیا۔

کامران نے بڑی مستعدی کے ساتھ جلد ہی آزاد افغان قبائلیوں پر مشتمل ایک فوج تیار کر لی اور جلال آباد کا محاصرہ کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ جب ہمایوں جلال آباد کو بچانے پہنچا تو کامران ایک پیچیدہ راستے سے کابل کی طرف چل پڑا۔ خوش قسمتی سے بیرم خاں قندھار سے کابل پہنچ چکا تھا۔ اس کی موجودگی اور مخالفت نے کامران کے حوصلے پست کر دیے اور اس نے محاصرہ اٹھا کر راہِ فرار اختیار کی۔

بیرم خاں کو کامران سے نبٹنے کے لیے بھیجا گیا۔ بیرم نے کامران کا اس سختی سے تعاقب کیا کہ وہ دریائے سندھ عبور کرنے پر مجبور ہو گیا اور بیرم خاں قندھار واپس آ گیا۔ 1551ء میں کامران ایک مرتبہ پھر کابل کے آس پاس نمودار ہوا اور اس نے کئی ماہ تک ایک قسم کی گوریلا جنگ جاری رکھی۔ ایک شبخون میں بہادر شہزادہ مرزا ہندال قتل ہو گیا۔

اب ہمایوں کامران کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کرنے کے لیے قلعہ سے باہر نکل آیا۔ یہ دیکھ کر کامران کے ساتھی خوف زدہ ہو گئے اور اس کو چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ کامران کو زبردست شکست ہوئی اور اس نے اسلام شاہ کے دربار میں پناہ لی۔

اسلام شاہ نے مفرور شہزادے کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ کامران کو یہ جان کر سخت مایوسی ہوئی کہ افغان بادشاہ مدد دینے والا نہیں بلکہ اس کا تماشہ بنانے کے طور پر ڑکے

ہوئے ہے۔ چنانچہ وہ کیمپ سے نکل کھڑا ہوا ہے اور بھیس بدل کر پہاڑی راستوں سے ہوتا ہوا گھکروں کے علاقے میں پہنچ گیا۔ سلطان آدم نے اس کو ڈھونڈ نکالا اور قید کر لیا۔

ہمایوں گھکر سردار کے کہنے پر اس خطرناک دشمن کو لینے آیا۔ امرا اور ماہرین قانون نے یک زبان ہو کر کامران کو قتل کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ لیکن ہمایوں اس بات پر آمادہ نہ ہوا۔ چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ کامران کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر دی جائیں۔

نومبر دسمبر 1553ء میں اس فیصلے پر عمل درآمد کیا گیا۔ ہمایوں نے کامران کو اس کی خواہش کے مطابق اس کی وفادار بیوی اور خدمت گار کلما کوکا کے ساتھ مکہ جانے کی اجازت دے دی جہاں پر وہ 15 اکتوبر 1557ء کو راہی ملک عدم ہوا۔

ہمایوں گھکر کے علاقے سے کشمیر جانا چاہتا تھا لیکن اس کے امرا نے اس کی مخالفت کی۔ مجبوراً اس کو اپنا منصوبہ ترک کر کے کابل واپس ہونا پڑا۔ راستے میں اس نے پشاور کے قلعہ کی مرمت کا حکم دیا۔ اب ہمایوں کا کوئی بھائی اس سے لڑنے کے لیے باقی نہ بچا تھا۔ اس کی فوج مضبوط اور ہتھیاروں سے آراستہ تھی اور امرا فرمانبردار تھے۔ اب اس کے لیے سب سے اہم کام یہ تھا کہ اپنی کھوئی ہوئی ہندوستانی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرے۔ اس کے لیے وہ سخت کوشاں تھا۔ موقع نہایت مناسب تھا کیوں کہ عادل شاہ کے ہاتھوں میں افغان سلطنت بہت تیزی سے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی۔ اس کی درخواست پر بیرم خاں اس منصوبے میں شریک کر لیا گیا۔

12 نومبر 1554ء کو ہمایوں کابل روانہ ہوا اور 31 دسمبر کو دریائے سندھ کے کنارے پہنچ گیا جہاں بیرم خاں اس سے آملا۔

سلطان سکندر شاہ ابھی تک اپنی سلطنت کو مضبوط و مستحکم نہ کر پایا تھا کہ ہندوستان پر ہمایوں کے حملے کی خبر ملی۔ رہتاس کا قلعہ جو کہ شیر شاہ نے مغلوں کی واپسی پر روک تھام کے لیے تعمیر کرایا تھا اس وقت تاتار خاں کاشی کے قبضے میں تھا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مغلوں اور گھکروں کے ممکنہ گٹھ جوڑ سے خوف زدہ ہو گیا اور کیوں کہ افغان سلطنت میں افراتفری کے باعث مدد کے امکانات موہوم تھے۔ لہذا تاتار خاں قلعہ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس طرح ہمایوں کا کام اور بھی آسان ہو گیا۔ فوج کا دستہ بھیج کر قلعہ پر قبضہ کر لیا گیا اور بقیہ فوج بغیر کسی مزاحمت کے آگے بڑھ گئی۔

اسس دوران میں گھکڑ تقریباً غیر جانب دار رہے۔ ہمایوں 24 فروری 1555ء کو لاہور پہنچ گیا۔ لاہور کو اپنا مرکز قرار دے کر شاہ ابوالمعالی کی سرکردگی میں ایک دستہ دیپالپور کی طرف روانہ کیا جو شہباز خاں کے قبضے میں تھا۔ افغان فوج تھوڑی دیر جنگ کرنے کے بعد ہیبت زدہ ہوکر بھاگ کھڑی ہوئی۔ اب ہمایوں کی اصل فوج ہریانہ کی طرف بڑھی جہاں پر نصیب خاں افغان نے کسی قدر مقابلہ کیا اور پھر پیچھے ہٹ گیا۔

مغل فوج جالندھر کے قریب جمع ہوگئی۔ مچھواڑہ کے نزدیک مغلوں نے دریائے ستلج کو عبور کیا تاکہ افغان سالار تاتار خاں کاشی کی فوج سے مقابل ہو جس کو سکندر سور نے پچاسس ہزار سوار دے کر بھیجا تھا۔ ابتدا میں تاتار خاں کو تھوڑی سی برتری حاصل رہی۔ کیوں کہ مغل فوج کے سردار نے سرہند کو خالی کر دیا تھا اور اصلی فوج سے جا ملا تھا۔ افغانوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے کیونکہ وہ تعداد میں بھی زیادہ تھے اور مغلوں سے مٹھ بھیڑ کے لیے بے قرار نظر آرہے تھے لیکن مغل تیراندازوں نے رات ہونے تک ان کو دور ہی رکھا۔

بدقسمتی سے ایک بڑے گاؤں کے خس پوشس مکانوں میں آگ لگ گئی جس کی روشنی میں افغان فوج صاف نظر آنے لگی۔ مغل تیراندازوں نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور افغانوں پر تیروں کی اتنی زبردست بوچھار کی کہ وہ ٹک نہ سکے اور گھبرا کر اپنا سامان اور ہاتھیوں کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اب مغل فوج بیرم خاں کی سرکردگی میں سرہند کی طرف بڑھی۔

سکندر سور ما بھی خاموشس نہ تھا۔ تقریباً اسّی ہزار سواروں کی فوج لے کر سرہند پہنچ گیا۔ بیرم خاں نے خود کو اچھی طرح مستحکم کیا اور ہمایوں کو مدد کی درخواست بھیجی۔ شہزادہ اکبر کو حکم دیا گیا کہ وہ فوراً آگے بڑھے۔ شہنشاہ اسس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ 29 مئی کو ہمایوں سرہند میں فوج سے جا ملا۔ مغلوں نے افغانوں کو پریشان کرنا شروع کیا۔ اور رسد بند کرنے کی کوشش کی۔ ایک حملے میں تردی بیگ افغانوں پر غالب آگیا۔ اس نے ایک اہم رسد کا کارواں کو گھیر لیا اور سکندر سور کے بھائی کو قتل کر دیا۔ افغان غصے سے مشتعل ہوکر حملہ آور ہو گئے۔

22 جون کو آخری فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ ابتدا میں افغانوں کا پلہ بھاری رہا۔ کچھ دیر جم کر جنگ ہوئی پھر مجبور ہوکر بیرم خاں کو ایک محصور مورچے میں پناہ گزیں ہونا پڑا لیکن

مغلوں نے افغانوں کی اس کوشش کو کہ وہ اس پر قابو پالیں ناکام بنادیا۔

اب موسلادھار بارش شروع ہونے لگی اور ہوا کے جھکڑ چلنے لگے لیکن اس کے باوجود جنگ زور و شور سے جاری رہی۔ اس وقت سب سے زیادہ خطرناک زد اس مورچے پر پڑ رہی تھی جہاں سکندر سور کا بھائی کالا پہاڑ افغانوں کی سرکردگی کر رہا تھا اور ولیعہد کی فوجیں اس کے ماموں خواجہ معظم اور اتکا خاں کی سرکردگی میں جنگ آزما تھیں۔ اس موقع پر کمین گاہ سے پشت کی طرف سے ایک حملہ ہوا جس نے بھرپور جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ مغلوں کی اس عقبی فوج کی سرکردگی تردی بیگ اور شاہ ابوالمعالی کر رہے تھے۔

افغانوں میں سراسیمگی پھیل گئی اور راہ فرار اختیار کی۔ سکندر سور بڑی مشکل سے جان بچاکر شوالک کی پہاڑیوں کی طرف بھاگ گیا۔ دو سو پچاس ہاتھی، تین سو گھوڑے، خزانہ، سونے چاندی کے ظروف اور محل کا سارا سامان مغلوں کے ہاتھ آیا۔ یہ فتح ہر طرح سے مکمل تھی۔ اس جنگ میں سب سے زیادہ قابلِ تعریف بات یہ تھی کہ "دونوں فریقوں نے انسانیت و شرافت کا ثبوت دیا یہاں تک کہ ان لوگوں کی نعشیں جو جنگ میں مارے گئے تھے بڑے احترام کے ساتھ ان کے ساتھیوں کو دے دی گئیں"۔

سرہند کی فتح سے دہلی کا راستہ کھل گیا۔ مغلوں کے سامنے موانع حائل نہ تھے۔ ہمایوں سامانہ کے راستے دہلی کی طرف چل پڑا۔ 20 جولائی 1555ء کو وہ سلیم گڑھ کے قلعہ میں داخل ہوا جو کہ ہمایوں کے دین پناہ کے گرد تعمیر کیا گیا تھا۔

ہمایوں کا دہلی کی طرف بے روک ٹوک کوچ اس کے احمد آباد اور گوڑ کے سابقہ سفروں سے کافی مناسبت رکھتا تھا۔ اس کی دہلی کی آمد کو کسی طرح بھی فتح ہندوستان کی لازمی شرط نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں تک کہ پنجاب کا صوبہ جہاں سے کہ وہ کامیابی کے ساتھ گزر چکا تھا پوری طرح سے مغلوب نہ ہو سکا تھا اور سکندر سور کی طرف سے اندیشے تھے جو شوالک کی پہاڑیوں میں سرگرداں تھا۔

مانکوٹ کا مضبوط قلعہ ابھی تک سکندر کے قبضے میں تھا۔ دوسرے صوبوں میں بھی افغانوں کا اقتدار ابھی تک برقرار تھا اور وہ لوگ بغیر قوت آزمائی کے ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار نہ تھے حقیقتاً فتح ہندوستان کا کام تو اب شروع ہوتا تھا۔ مغل فوجی سالار پنجاب، میرٹھ اور روہیل کھنڈ کے علاقوں میں مصروف تھے۔ ان کی پیش قدمی گو سست تھی

لیکن مضبوط و مستحکم تھی۔

اس دفعہ کسی قسم کی غداری کا خوف نہ تھا۔ ہمایوں کو اب ان مشکلات کا سامنا نہ تھا جن سے کہ وہ ہندوستان میں اپنے دور اول میں گزر چکا تھا۔ اب نہ تو بہادر شاہ ہی تھا اور نہ شیر شاہ یا اسلام شاہ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے بھائیوں میں سے بھی کوئی باقی نہ بچا تھا جو اس کے لیے حالات کو مشکل تر اور پیچیدہ تر بنا دیا کرتے تھے۔ علاوہ بریں بدبختی کے دور نے اس کو پختہ کار اور مستحکم بنا دیا تھا۔

اب ہمایوں کے دماغ میں کچھ پختہ منصوبے بھی تھے۔ وہ اس بات کا پکا ارادہ کیے ہوئے تھا کہ شیر شاہ کے بنائے ہوئے انتظامی قواعد کو پوری طرح بروئے کار لائے۔ وہ فی الحال شیر شاہ کے انتظامی امور میں کسی قسم کا اضافہ کرنا نہ چاہتا تھا لیکن اس نے صوبائی حکومتوں کو از سر نو تنظیم کرنے اور اپنے قابو میں رکھنے کی ایک قطعی تجویز سوچ رکھی تھی۔ اس نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ ایک وسیع سلطنت کی مؤثر کارکردگی کے لیے لازمی ہے کہ صوبائی حکومت مضبوط ہو اور مرکزی حکومت کا اس پر پورا قابو ہو۔ مختصراً اس کا منصوبہ یہ تھا کہ پنجاب سے جونپور اور مالوہ تک کا علاقہ چھ صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان کے صدر مقام لاہور، دہلی، آگرہ، قنوج، جونپور اور مانڈو مقرر کر دیے جائیں۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ خود ہی ان صوبوں کے صوبے داروں کا تقرر کرے جن میں سے ہر ایک کے پاس اس قدر فوج رہے کہ وہ اپنے فرائض منصبی اچھی طرح انجام دے سکیں مگر مرکزی حکومت کے لیے خطرے کا باعث نہ بنیں۔ صوبے دار کی مدد کے لیے صوبہ کے با اثر اشخاص کی ایک مجلس مقرر کی جائے۔

شہنشاہ یہ بھی چاہتا تھا کہ وقتاً فوقتاً صوبوں کا دورہ کرے اور وہاں کے حالات بچشم خود دیکھے، خرابیوں کی اصلاح کرے۔ اس منصوبے کو مد نظر رکھتے ہوئے اس نے شاہ ابوالمعالی کو لاہور کا اور تردی بیگ کو دہلی کا صوبے دار مقرر کیا۔

لیکن قدرت نے کچھ اور ہی فیصلہ کر رکھا تھا۔ اس کی قسمت میں یہ نہ تھا کہ اپنے منصوبے کی کامیابی کو دیکھ سکتا۔ ہمایوں نے شیر منڈل پر کتب خانہ تعمیر کرایا تھا تاکہ اس کی چھت پر سے تازہ ہوا کا لطف اٹھایا کرے اور جب دربار عام لگانا ہو تو اس سے قبل زہرا ستارے کو طلوع ہوتا دیکھ سکے لیکن 24 جنوری 1556ء کی شام کو جب ہمایوں کتب خانے

کی چھت سے اتر رہا تھا اور ابھی دوسرے زینے پر ہی پہنچا تھا کہ موذن نے اذان دی۔ ہمایوں نے عقیدتاً اذان کے احترام میں جہاں تھا وہیں بیٹھ جانا چاہا کہ یکایک پاؤں قبا کے دامن میں پھنس گیا اور عصا پھسل گیا جس کے سبب وہ سر کے بل گرا۔ اس کے داہنے کان سے خون کے چند قطرے گرے۔ بہرحال اسے اتنا ہوش تھا کہ اس نے ولیعہد کو بلوانے کے لیے فوراً ہی سوار روانہ کیا۔ چوٹ شدید تھی۔ اس پر بے ہوشی طاری ہوگئی۔ اسی حالت میں سکون کے ساتھ 26 جنوری 1556ء بروز اتوار ہمایوں راہی ملک عدم ہوا۔

شیر شاہ و اسلام شاہ کے واقعات بسلسلۂ تاریخ

نمبر	واقعہ	تاریخ
1	شیر شاہ کی پیدائش	1472 یا 1486
2	شیر شاہ جونپور میں	1494
3	شیر شاہ کا اپنے باپ کی جاگیر کا ناظم مقرر ہونا	1497 تا 1518
4	سلطان ابراہیم کے دربار میں ملازمت کے لیے حاضری	1518
5	بہادر خاں نوہانی کی ملازمت	1526
6	جنید برلاس کی ملازمت	1527
7	چندیری کی مہم میں بابر کی ہمراہی	1528
8	بابر کا اس کی جاگیر واپس دلانا	1528-29
9	بہار کے نائب گورنر کی حیثیت سے تقرر	1529
10	ہمایوں سے وفاداری کا اعلان	جنوری 1533
11	سورج گڑھ کی جنگ	1534
12	شیر شاہ گوڑ کے دروازے پر	1536
13	بنگال پر دوسرا حملہ	جون 1537
14	ہمایوں کا شیر شاہ کے خلاف اقدام	1537
15	محاصرۂ چنار	اکتوبر 1537 تا مارچ 1538
16	شیر شاہ کی قلعہ رہتاس گڑھ پر فتح	1538
17	جنگ چوسا	26 جون 1539
18	شیر شاہ بادشاہ بنگال و بہار	1539-40
19	جنگ قنوج	17 مئی 1540
20	شیر شاہ بادشاہ ہندوستان	1540 تا 1545
21	گورنر بنگال کی برطرفی	1541

22	فتح مالوہ و رنتھنبور	1542
23	پٹنہ کا سنگِ بنیاد	1542
24	قلعہ رائے سین کی فتح	1543
25	پنجاب پر غلبہ	1542-43
26	فتح راجستھان	1544
27	کالنجر پر حملہ	نومبر 1544
28	شیر شاہ کی وفات	22 مئی 1545
29	اسلام شاہ کی تخت نشینی	26 مئی 1545
30	جنگ انبالا	1547
31	گھکر علاقے پر قبضہ	1548-50
32	شیخ علائی کا قتل	1548-50
33	کامران پنجاب میں	1552
34	اسلام شاہ کی وفات	30 اکتوبر 1553

ہمایوں کی زندگی کے واقعات بسلسلہ تاریخ

ہندال کی وفات	1551
کامران کی آنکھوں میں سلائی پھیرا جانا	نومبر دسمبر 1553
ہمایوں کی فتح لاہور	24 فروری 1555
ہمایوں کا افغانوں کو شکست دینا	1555
جنگ سرہند	22 جون 1555
ہمایوں کا دہلی میں داخل ہونا	20 جولائی 1555
ہمایوں کا گرنا	20 جنوری 1556
ہمایوں کی وفات	26 جنوری 1556
کامران کی مکہ میں وفات	1557

شیر شاہ اور اُس کے جانشین

مزید مطالعے کے لیے مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیے:

فارسی:

عباس خاں۔ تاریخ شیر شاہی۔ ایلیٹ وڈاوسن کی تاریخ جلد چہارم کے انگریزی ترجمے کے متعلقہ حصے۔

نعمت اللہ۔ تاریخ افاغنہ۔ ڈارن کے انگریزی ترجمے کے متعلقہ حصے

عبداللہ۔ تاریخ داؤدی۔ ایلیٹ وڈاوسن کی تاریخ جلد چہارم وپنجم کے انگریزی ترجمے کے متعلقہ حصے۔

انگریزی:

کوئی مکمل کتاب دستیاب نہیں البتہ حسب ذیل کتب کا مطالعہ فرمائیے:

Erskine, W. : History of India, Vol. I & II

Campos: The Portuguese in Bengal

History of Bengal, Vol. II

Qanungo, K.R. : Sher Shah

Zulfiqar Ali : Sher Shah Suri

Tripathi, R.P. : Some Aspects of Muslim Administration

P. Saran : The Provincial Administration of the Moghals

Roy, N.B. : The Success of Sher Shah

باب 8

اکبر اعظم - دَورِ اتالیقی

ہمایوں کی ناگہانی موت مغلوں کے لیے ایک عظیم حادثہ تھا۔ اس وقت بہت سے اعلیٰ افسر پنجاب اور یوپی میں افغانوں سے جنگ میں مشغول تھے۔ دہلی میں جو افسر موجود تھے وہ اس بات سے پوری طرح باخبر تھے کہ اگر ہمایوں کے جانشین کا اعلان اور حکومت کے کاروبار کا مناسب انتظام کیے بغیر بادشاہ کی موت کا اعلان کر دیا گیا تو ملک میں افراتفری پھیل جائے گی۔

چنانچہ انھوں نے ہمایوں کی وفات کی خبر کو سترہ دن تک پوشیدہ رکھا اور اس دوران ملا بیکاسی کو جو کہ ہمایوں سے بہت مشابہت رکھتا تھا شاہی لباس پہنا کر محل کے جھروکے سے عوام کے درشن کے لیے بھیجتے رہے۔ اسی عرصے میں شہزادہ ولیعہد اور بعض خاص امرا کو اطلاع کر دی گئی۔ 14 فروری 1556ء کو دہلی میں مقیم امرا جمع ہوئے اور جلال الدین محمد اکبر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ (بعد میں جب اکبر نے سال شمسی کا آغاز کیا تو اس کی تخت نشینی کی تاریخ سرکاری طور پر 11 مارچ 1556ء مقرر ہوئی)۔

کلانور (ضلع گورداسپور) کے مقام پر شہزادہ ولیعہد کے خیمے میں رسمی طور پر اکبر کی تخت نشینی کر دی گئی۔ اور وہاں جتنے امرا و افسر موجود تھے انھوں نے بیعت کی۔ اس وقت اکبر کی عمر صرف تیرہ سال چار ماہ تھی۔

بیرم خاں کو جو کہ شہزادہ کا اتالیق اور ہمایوں کا وفادار اور پسندیدہ افسر تھا

خان خاناں اور وکیل سلطنت مقرر کیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ عہدہ اس کے لیے بہت ہی مناسب تھا کیونکہ وہ شہزادے کا محض اتالیق ہی نہ تھا بلکہ شاہی کیمپ میں موجود امراء میں سب سے زیادہ با اثر تھا۔

اس بارے میں کہ آیا وہ اس بلند مرتبے کے لائق تھا یا نہیں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہمایوں کے خاندان سے اس کی وفاداری ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ اس نے ہر مصیبت میں اپنے آقا کا ساتھ دیا تھا۔ اعلیٰ تہذیب، ادبی لیاقت، حاضر دماغی، ہوشیاری، حُسنِ اخلاق، سیاسی مہارت، انتظامی تجربات، اعلیٰ فوجی قابلیت اور غیر معمولی بہادری کے سبب وہ اتالیقی کے بلند منصب کے لیے بہت ہی موزوں اور مناسب تھا۔ اس وقت اس کو جوان شہزادے کا پورا پورا اعتماد بھی حاصل تھا۔ لیکن بیرم خاں نسلاً ایرانی اور مذہباً شیعہ تھا اور بہت سے پرانے ترکی النسل سنی امراء سے کم عمر تھا۔ زمانۂ مستقبل ہی اس امر کا فیصلہ کر سکتا تھا کہ اتالیق کے ساتھ اُن امراء کا کیا رویہ ہوگا۔

ابتدا ہی سے بیرم خاں نے احتیاط اور مستعدی سے کام لیا۔ اس کے ممکنہ رقیبوں میں سے ایک شاہ ابو المعالی تھا جو بارگاہ میں موجود تھا۔ یہ جوان سردار ترمز کے سیدوں کے خاندان سے تھا۔ یہ خاندان سارے وسط ایشیا میں بہت ہی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کی بے حد جاذب نظر تندرستی، خوش اطواری، جاں بازانہ دلیری اور صاف گوئی نے اس کو ہمایوں کی نظر میں مخصوص شخصیت بنا دیا تھا۔ ہمایوں اس کو فرزند کہہ کر مخاطب کرتا اور مجلس مشاورت اور ضیافتوں میں ہمیشہ عزت کی جگہ بٹھاتا۔

بیرم خاں اس مغرور، چنچل اور شیعوں سے متنفر سردار سے خطرے کی بو محسوس کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر شاہ ابو المعالی کو اکبر کے جشن تخت نشینی کی ضیافت میں گرفتار کر لیا اور اس طرح شاہی کیمپ میں کسی فوری خطرے کی پیش آمد وقتی طور پر ٹل گئی۔

اکبر کی تخت نشینی کے تین چار دن بعد جب کہ فوج جالندھر میں خیمہ زن تھی کابل سے یہ خبر آئی کہ سلیمان مرزا نے ایک بڑی فوج سے کابل کا محاصرہ کر لیا ہے اور اگر کافی تعداد میں مدد نہ بھیجی گئی تو اس کا مؤثر طریقے سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ مغل فوج تعداد میں زیادہ نہ تھی اور اس کو ہندوستانی فتوحات کے لیے خطرہ مول لیے بغیر مزید کم نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اب شاہی حکومت کابل کے حالات کے سلسلے میں پریشان تھی کہ تردی بیگ صوبیدار دہلی کی طرف سے یہ پیغام ملا کہ ہیمو گوالیار ہوتا ہوا آگرے پر قابض ہوگیا ہے اور دہلی پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور اگر کافی تعداد میں وقت پر مدد نہ پہنچی تو دہلی کا اچھی طرح دفاع نہ کیا جا سکے گا۔

حکومت اب شش و پنج میں مبتلا تھی کیوں کہ یہ بات تقریباً یقینی تھی کہ اگر اصل فوج کو کابل یا دہلی کسی بھی طرف روانہ کیا گیا تو سکندر لودی کو جو شوالک کی پہاڑیوں میں چھپا ہوا تھا موقع مل جائے گا اور پنجاب کو فتح کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ تشویش ناک حالات آگرہ و دہلی میں وحشتناک قحط اور طاعون پھیل جانے کے سبب اور بھی بدتر ہو گئے اور رسد کا مسئلہ بہت ہی مشکل و پیچیدہ ہو گیا۔

بیرم خاں نے گورنر دہلی کی درخواست کے جواب میں اپنے سب سے لائق سردار پیر محمد شروانی کو کچھ اور لوگوں کے ساتھ تردی بیگ کے پاس روانہ کیا تاکہ اس کی ہمت بندھائیں اور مشورہ دیں کہ موجودہ حالات میں سب سے بہتر طریقۂ کار کیا ہو سکتا ہے۔ ادھر تردی بیگ بھی بیکار نہ بیٹھا۔ اس نے آگرہ اور دہلی کے صوبوں کے سب امراء کو حکم بھیجا کہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دہلی آکر جمع ہو جائیں۔ چنانچہ بڑی تعداد میں امراء جمع ہو گئے۔ اور بعض کی آمد متوقع تھی۔ علی قلی خاں شیبانی کی آمد کا بے چینی سے انتظار کیا جا رہا تھا لیکن اس کی آمد سے قبل ہی ہیمو دہلی کے نواح میں پہنچ چکا تھا۔ جنگی مجلس مشاورت منعقد ہوئی جس میں جنگ و پسپائی کے موضوع پر پوری طرح بحث کی گئی اور بالاتفاق یہ فیصلہ طے پایا کہ ہیمو سے کھلے میدان میں جنگ کی جائے۔

تعداد کی کمی کے باوجود مغلوں نے جان توڑ مقابلہ کیا۔ افغانوں کے ہراول دستے کو پیچھے ہٹنا پڑا اور ہیمو کے میمنہ کو کچل دیا گیا۔ اگر ایک جسارت مندانہ حملہ اور ہوا ہوتا تو فتح مغلوں کو نصیب ہوتی لیکن ان کو دو وجوہ سے شکست ہوئی۔ مغلوں کا بایاں دستہ اپنے مقابل کی افغان فوج کو ہرا کر اس کے تعاقب میں اس قدر دور تک نکل گیا کہ اس کا رابطہ اپنی اصل فوج اور میدانِ جنگ سے منقطع ہو گیا۔ یہ غلطی ایسی نہ تھی جس کی تلافی ہو سکتی۔ ہیمو نے جو سواروں اور ہاتھیوں کے ایک مضبوط محافظ دستے کو لیے منتظر کھڑا تھا مغل فوج کے قلب پر ایک سخت حملہ کر دیا۔ اسی وقت الور سے حاجی خاں کی تازہ دم فوج نے آکر ہیمو کی طاقت میں

مزید اضافہ کر دیا۔ اس نازک وقت میں کچھ مغل سالار جن میں پیر محمد خاں بھی شامل تھا میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے جس پر تردی بیگ کو بہت تعجب ہوا اور سخت غصہ بھی آیا ان کے فرار کی وجہ سے اب مقابلہ کرنا ناممکن ہوگیا اور تردی بیگ بھی اپنی جان بچانے کی خاطر بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ واقعہ 7 اکتوبر 1556ء کا ہے۔ جب تعاقب کرنے والی فوج واپس ہوئی تو انھوں نے دیکھا کہ میدان کا نقشہ ہی بدل چکا ہے۔ علی قلی خاں جنگ کے ایک دن بعد پہنچا اور میدان خالی پایا۔

تردی بیگ اور دوسرے امراء شاہی فوج سے جا ملے۔ دہلی کا ہاتھ سے نکل جانا بہت ہی افسوسناک واقعہ تھا۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک لائق افسر کو سکندر سوری کی نقل و حرکت کو دیکھنے کے لیے چھوڑ دیا جائے اور اصل فوج دہلی کی طرف روانہ ہو۔

بیرم خاں نے تردی بیگ کو ختم کرنے کا منصوبہ بنالیا تھا لہٰذا اس کو غافل رکھ کر بیرم خاں نے اس سے بے انتہا پر تکلف راہ و رسم بڑھائی۔ چنانچہ ایک دن شام کو اس نے تردی بیگ کو اپنے خیمے میں مدعو کیا اور وہیں قتل کرا دیا۔ ترکی النسل سرداروں میں سے ایک اہم سردار کے اس طرح قتل کیے جانے سے ترکوں میں خوف و ہراس پیدا ہوگیا اور اس طرح بیرم خاں کی پوشیدہ اغراض کے متعلق ان کے دل میں جو خدشات تھے وہ درست ثابت ہوئے اس میں شک نہیں کہ بیرم خاں کے مقابلے میں تردی بیگ کی وفاداری میں ثبات نہ تھا۔ تاہم اس نے سلطنت کے قیام و بقا کے لیے جو خدمات انجام دی تھیں وہ اس کی تقصیرات اور فروگذاشتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھیں۔ بظاہر اس کے خلاف یہ الزام کہ اس نے دہلی کو دشمنوں کے ہاتھوں میں جانے دیا معقول معلوم ہوتا ہے لیکن اس کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

یہ کہنا بھی درست نہ ہوگا کہ یہ سزا اس لیے دی گئی ہے کہ دوسرے سرداروں کے لیے درس عبرت ہو اور وہ خوف کے مارے پوری اطاعت و فرماں برداری کے ساتھ فرائض کو انجام دیں۔ ممکن ہے بعض امراء اور سردار خود کو کیقباد اور کیکاؤس کے برابر سمجھتے ہوں لیکن کیمپ یا فوج میں کسی قسم کی پھوٹ یا نافرمانی کی کوئی علامت نظر نہ آتی تھی۔ اکبر کے امراء کا فائدہ اسی میں تھا کہ وہ مشترکہ خطرے کے مقابلے میں متحد ہو جائیں۔

شاہی افواج اب تیزی سے دہلی کی طرف روانہ ہوئیں۔ علی قلی خاں ازبک کو جو کہ

ایک بہادر سپاہی اور لائق سردار تھا دس ہزار سوار دے کر ہراول دستہ کے ساتھ روانہ کر دیا گیا۔ خوش قسمتی سے علی قلی خاں ہیمو کے توپ خانے پر قابض ہو گیا۔ اس توپ خانے کی اس طور پر پوری طرح حفاظت نہیں کی جا رہی تھی کہ وہ علی قلی خاں کے سپاہیوں کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر سکتی۔

اس میں شک نہیں کہ یہ ہیمو کی زبردست بھول چوک تھی کہ اس نے اپنا توپ خانہ ایک کمزور دستے کے ساتھ فوج کے آگے آگے روانہ کر دیا تھا۔ ہیمو اس نقصان سے خوفزدہ ہوئے بغیر جنگی تنظیم کے ساتھ پانی پت کے میدان کی طرف تیزی سے روانہ ہو گیا۔ اگلے روز یعنی 5 نومبر 1556ء کو وہ مغل فوج سے مقابل ہوا۔ فریقین نے جان توڑ مقابلہ کیا اور کامیابی آہستہ آہستہ ہیمو کے قدموں کی طرف بڑھنے لگی۔ مغل تیر اندازوں اور سواروں نے اپنی مہارت اور بہادری کا اچھا مظاہرہ کیا لیکن ہیمو نے میمنہ و میسرہ کو پیچھے دھکیل دیا اور قلب پر زبردست دباؤ ڈالا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی پسپا ہو گیا۔

ہیمو نے قلب کو روندنے کے لیے اپنے جنگی ہاتھیوں اور محافظ سوار دستہ کو آگے بڑھایا۔ خود ہیمو ایک ہاتھی پر سوار بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنے جوشیلے سپاہیوں کی ہمت بڑھا رہا تھا۔ مغل فوج بس بھاگنے ہی والی تھی کہ ایک تیر اڑتا ہوا آیا اور ہیمو کی آنکھ میں پیوست ہو گیا۔ جس کے سبب وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ جوں ہی ہیمو ہودہ کے اندر گرا اس کے مرنے کی خبر پھیل گئی۔ ایسی افواہوں اور اس قسم کے حالات نے اکثر جیتنے والی فوجوں کو شکست دی ہے۔ ایسا خاص طور پر اس وقت ہوتا ہے جب جنگ کسی مقصد کے بجائے اشخاص کے لیے لڑی جاتی ہے۔ ہیمو کی فوج بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہ تھی۔ فوج میں افراتفری پھیل گئی جس سے مغلوں نے فوری فائدہ اٹھایا۔ ہیمو کی فوج منتشر ہو گئی اور راہ فرار اختیار کی۔

ہیمو کے سپاہی بڑی تعداد میں فاتحین کی تلواروں کا نشانہ بنے۔ ہیمو کے فیلبان نے یہ کوشش کی کہ وہ اپنے آقا کو نکال لے جائے لیکن اس کو روک لیا گیا اور ہاتھی شہنشاہ کے سامنے لے جایا گیا۔ بیرم خاں نے شہنشاہ سے کہا کہ ہیمو کا سر اپنے ہاتھ سے قلم کرے لیکن اس نے مرتے ہوئے آدمی پر تلوار کا وار کرنے سے انکار کر دیا تاہم ترغیب دینے پر اتنی بات مان لی کہ جب بیرم خاں اس کا سر قلم کرے تو اکبر اپنی تلوار سے اس کے سر کو چھو لے۔ ہیمو کا سر

کابل روانہ کر دیا گیا اور اس کا تن دہلی کے ایک دروازے پر لٹکا دیا گیا۔

اس طرح سولھویں صدی کے ممتاز اشخاص میں سے ایک شخص کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ ہیمراج نے ایک بہت ہی معمولی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا تھا۔ ابتدا میں وہ ایک معمولی افسر مالگذاری مقرر ہوا۔ اس کے بعد ادنیٰ درجے کا فوجی افسر بنا اور آخر کار عادل شاہ کی افواج کا سپہ سالار ہو گیا۔ وہ سارے افغان سالاروں سے سبقت لے گیا اور چنار سے دہلی تک اپنے آقا کے لیے جو بائیس لڑائیاں لڑیں ان میں کامیابیاں حاصل کیں۔

وہ افغان سپاہیوں میں بھی بہت ہی ہر دلعزیز تھا اور وہ لوگ بھی بے انتہا وفاداری کے ساتھ اس کے ماتحت جنگ میں شریک ہوتے۔ اس کی آخری شکست کے بارے میں بہت سے وجوہات بیان کیے گئے ہیں لیکن یہ سب وجوہات اگر بدنیتی پر مبنی نہیں تو پھر یا تو فرضی ہیں یا اُن میں خوش خیالی کا دخل ہے۔ اس کی شکست کی وجہ اول تو اس کے توپ خانے کا چھین جانا ہے اور دوسرے اس کے اڑتے ہوئے تیر کا اس کی آنکھ میں پیوست ہو جانا ہے جس کے سبب وہ بے ہوش ہو گیا اور فوج میں ابتری پیدا ہو گئی اس کی شکست ایک اتفاقی امر تھا اور اکبر کی فتح من جانب اللہ۔

دہلی کی فتح کے بعد مغل چین سے نہ بیٹھے۔ مختلف جگہوں پر فوجی مہم روانہ کی گئیں۔ علی قلی خاں کو سنبھل، عبداللہ خاں کو کالپی، تیا خاں کو آگرہ اور پیر محمد کو الور بھیجا گیا الور کے افغان صوبے دار حاجی خاں نے راہِ فرار اختیار کی اور شہر کو مغلوں کے لیے چھوڑ دیا۔ ہیمو کا خاندان جو ماکاری میں رہتا تھا پیر محمد کے قبضے میں آ گیا۔ ہیمو کے بوڑھے باپ سے کہا گیا کہ اگر وہ زندگی چاہتا ہے تو اسلام قبول کرے لیکن اس نے جواب دیا "اسی سال تک میں نے اپنے عقیدے کے مطابق اپنے خدا کی پرستش کی ہے۔ اب جب کہ میری زندگی کا سورج ڈوبنے ہی والا ہے۔ اس عقیدے کو موت کے ڈر سے کیوں ترک کر دوں۔ میں یہ بھی سمجھنے سے قاصر ہوں کہ میرا طرزِ عبادت آپ کی عبادت میں کس طرح رخنہ ڈالتا ہے۔" ہیمو کے باپ کے اس منطقی جواب نے سنگدل عمار پر کوئی اثر نہ کیا اور انھوں نے اس کو فوراً ہی قتل کرا دیا۔ ہیمو کی بیوی اپنی جان بچانے کی خاطر جنگلوں کی طرف بھاگ گئی اور اس کا مال و دولت لوٹ لیا گیا۔

ہیمو کی شکست نے عادل شاہ کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ ہیمو کی عدم موجودگی سے محمد شاہ حاکم بنگال کے بیٹے خضر خاں نے فائدہ اٹھایا۔ محمد شاہ عادل شاہ کے مقابلے میں جنگ میں مارا گیا تھا۔ خضر خاں نے اپریل 1557ء میں عادل شاہ پر حملہ کیا۔ اس کو شکست دی اور قتل کر دیا۔

اس نے اپنے احساس نفرت کو تسلی دینے کی خاطر مقتول بادشاہ کی نعش کو ہاتھی کے پاؤں سے بندھوا کر گھمایا۔ عادل شاہ کی موت کے بعد مغل افواج کے لیے میدان صاف ہو گیا۔ وہ علی قلی خاں کی سرکردگی میں جو کہ اب خان زماں کے لقب سے نوازا جا چکا تھا مصروف عمل ہو گئیں۔

ادھر سکندر سور کے حالات بھی کچھ زیادہ اطمینان بخش نہ تھے۔ دہلی اور آگرہ پر قبضہ کرنے کے کچھ عرصے بعد بیرم خاں نے شہنشاہ کے ہمراہ سکندر سور کا مقابلہ کرنے کے لیے کوچ کر دیا۔

سکندر سور اب پہاڑیوں سے نکل کر میدان میں آ گیا تھا اور پنجاب میں مالگزاری وصول کر رہا تھا۔ جب اس نے یہ سنا کر شاہی فوج اس کے مقابلے کے لیے آ رہی ہے تو خود کو مانکوٹ کے قلعہ میں بند کر لیا۔

قلعہ پر یکایک حملہ کر کے فتح کرنا ممکن نہ تھا لہذا مغل فوج نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ سکندر نے چھ مہینے تک محاصر فوج کو روکے رکھا لیکن جب اس کو دو بڑے افغان سالاروں رکن خاں نوہانی اور حسن خاں باچگوتی کو علی قلی سے شکست کی اطلاع ملی تو وہ بہت پریشان ہوا۔ اس کے بعد جب اس کو عادل شاہ کی موت کی اطلاع پہنچی تو اس کو بچاؤ کی کوئی امید باقی نہ رہی اور اس نے اس شرط پر صلح کرنا قبول کر لیا کہ بہار میں اس کو جاگیر دے دی جائے۔

24 مئی 1557ء کو اس کی شرائط منظور کر لی گئیں اور قلعۂ مانکوٹ کو مغلوں کے حوالے کر دیا گیا۔ سکندر کو بہار جانے کی اجازت دے دی گئی جہاں وہ چند سال بعد فوت ہو گیا۔

کابل میں بھی حالات بادشاہ کے حق میں رُخ بدل رہے تھے۔ کئی مہینے کے ناکام محاصرے کے بعد سلیمان مرزا نے سوچا کہ منعم خان کے ساتھ کسی فیصلے پر پہنچ جانا ہی عقلمندانہ

اقدام ہوگا۔ وسط ایشیا میں ازبکوں کی نقل و حرکت، سردیوں کی آمد اور برف باری کے سبب راستے بند ہو جانے کا خطرہ، ہندوستان سے مدد پہنچنے کی افواہ، ان سب نے مل کر سلیمان مرزا کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ محاصرہ اٹھالے اور واپس چلا جائے۔ بشرطیکہ اس کے نام کا خطبہ خواہ وہ ایک ہی دفعہ کیوں نہ ہو پڑھ دیا جائے۔ چنانچہ خطبہ پڑھ دیا گیا۔ اور سلیمان مرزا واپس ہو گیا۔ اب کابل آزاد تھا۔

شکست کی خبر ملنے پر شاہی خاندان کی مستورات منعم خاں کی حفاظت میں ہندوستان کی طرف روانہ ہو گئیں۔ جلال آباد پہنچ کر منعم خاں کو تردی بیگ کے قتل اور بیرم خاں کی بالادستی کا حال معلوم ہوا چنانچہ اس نے آگے بڑھنے کے ارادے کو ترک کر دیا اور کابل واپس آ گیا۔

اس طرح مغل حکومت بڑی آزمائش کے دور سے گزر رہی تھی۔ لیکن مغل افسروں کی کوششوں اور بادشاہ کی خوش قسمتی سے اس میں کوئی تزلزل واقع نہ ہوا حالانکہ کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ قندھار کے گورنر شاہ محمد نے شہر کو ایرانیوں کو سونپ دیا۔ شاہ محمد نے یہ قدم اس بات سے مجبور ہو کر اٹھایا کہ خان زماں علی قلی کے بھائی بہادر خاں نے بغاوت کر رکھی تھی۔

بیرم خاں کے چار سالہ عہد میں نہ صرف یہ کہ بدترین خطرات پر قابو پا لیا گیا بلکہ مغل فوج نے کافی اطمینان بخش پیش رفت کی۔ کابل سے جونپور تک اور شمالی پنجاب کی پہاڑیوں کے نواح سے اجمیر تک اکبر کی حکومت تسلیم کی جا چکی تھی۔ گوالیار فتح کیا جا چکا تھا اور رنتھنبور و مالوہ کی فتح کرنے کی پُرزور کوشش جاری تھی۔ گکھروں کو بھی مغل شہنشاہ کی برتری تسلیم کرنے کے لیے رضامند کیا جا چکا تھا۔

بیرم خاں کی طاقت اور وقار بظاہر حدِ کمال پر پہنچ چکے تھے لیکن بہت سے عوامل اس کے اثرات کو کم کرنے کے لیے کوشاں تھے اور آخرکار 1560ء میں اس کا اثر ختم ہو کر رہا۔ اس کے سخت ترین مخالفین عموماً ترکی امراء اور خصوصاً اکبر کے رضاعی والدین تھے ان کی خاص شکایتیں یہ تھیں کہ شیعہ وزیرِ اعظم کا برتاؤ ان لوگوں کے ساتھ بہت ہی نامناسب تھا۔ اس نے تیموری امراء اور شاہی خاندان کے ملازمین کو افلاس کی حالت کو پہنچا دیا تھا۔ بیرم خاں یا تو اپنے ہی ہم عقیدہ لوگوں کی حمایت کرتا تھا یا پھر ایسے امراء کو جو

میں لا رہا تھا جو پوری طرح اسس کے فرماں بردار ہوں۔ اسس کے علاوہ سارے امرار مستقلاً خوف و شبہ کی حالت میں بسر کر رہے تھے۔ انھیں اس بات کا بھی یقین تھا کہ بیرم اپنے اثر و رسوخ کو سنی عقائد کی تخریب اور شیعہ عقائد کی ترویج کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ باوجودیکہ یہ الزامات پوری طرح صحیح نہ تھے لیکن بے بنیاد بھی نہ تھے۔ تردی بیگ و مصاحب بیگ کا قتل اور شمس الدین اتکہ سے بار بار جواب طلبی کرنا ترکی امرار سے دشمنی کی واضح دلیلیں تھیں۔ پھر شیخ گدائی کا حکومت کے صدر کی حیثیت سے تقرر اور شیخ محمد غوث کی اہانت پر اہانت نے جن کو سنی ان کی روحانیت کے سبب بہت احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، سنی عقیدے کی تخریب کے الزام کو اور تقویت پہنچائی کچھ عرصے بعد اکبر گوالیار جاکر شیخ غوث سے ملا اور اُن کے مریدوں میں شامل ہوگیا۔

اگر اکبر رفتہ رفتہ بیرم خاں سے کشیدہ نہ ہوگیا ہوتا تو امرار کا غم و غصّے سے پیچ و تاب کھانا بے کار ہی ثابت ہوتا۔ اکبر جوں جوں بڑا ہوتا گیا وہ اپنی شخصیت منوانا چاہتا لیکن بیرم بعض امور میں اکبر کی خواہشات کو بالکل ہی نظر انداز کر جاتا۔ اکبر نے شاہی ہاتھیوں کے سانڈ خانے کے اختیار کو اپنے ہاتھ سے نکل جانے پر بڑی برہمی کا اظہار کیا۔ ادھر اکبر کو صرف خاص کی رقم بھی ادا نہیں کی جا رہی تھی۔ چار سال تک زیر اتالیقی رہنا کافی تھا ہمیشہ کے لیے شکار اور تفریحات میں مشغول رکھنے کی سیاست بادشاہ کو پسند نہ تھی اور وہ امور سلطنت کو اپنے ہاتھوں میں لینے کے لیے مضطرب تھا۔

اکبر یہ بھی جانتا تھا کہ وزیر اعظم سے کھلم کھلا ناچاقی اس کے لیے مضر ثابت ہو سکتی ہے اور اس سلسلے میں اپنے دادا بابر کی مثال اس کی نظروں کے سامنے تھی لہٰذا وہ مناسب موقع کا انتظار کر رہا تھا۔

جب بیرم خاں نے پیر محمد خاں غزنوی کو ملازمت سے برطرف کر کے ملک بدر کر دیا تو اکبر کو موقع ہاتھ آگیا۔ اگرچہ پیر محمد بیرم کا ہی پروردہ تھا لیکن اس میں کردار کی بلندی تھی اور وہ ایک متعصب سنی تھا۔ اس نے کئی مرتبہ بیرم کے بعض امور کے برخلاف احتجاج کرنے کی جرارت کی اور ان ہی وجوہ سے یہ خیال کیا جانے لگا کہ سنی ترکوں کا حامی و مددگار ہے۔ چنانچہ بیرم خاں کے خلاف پیر محمد کو جو کہ انتقام جو، متعصب، تندخو، دلیر اور سخت دل تھا۔ ایک ہتھیار کی حیثیت سے کام میں لایا جا سکتا تھا۔

پیر محمد کی معزولی اور اس کی جگہ ایک ایرانی کے تقرر سے بادشاہ کے حواریوں
میں خوف دہراس پیدا ہوگیا اور اکبر نے بیرم کے اس عمل کو کر اس نے شاہی اختیارات
کا استعمال کیا ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ چنانچہ بادشاہ شکار کا بہانہ کر کے چند معتمدین
کے ہمراہ 19 مارچ 1560ء کو آگرے سے دہلی کی طرف چلا گیا اور 27 مارچ کو شہاب الدین
صوبے دار دہلی نے جو اس منصوبے سے واقف تھا بادشاہ کا دہلی میں استقبال کیا۔

باب 9

اُمراء کے ساتھ کشمکش

دہلی پہنچ کر اکبر نے بیرم خاں کی معزولی کے احکامات صادر کر دیے اور امرائے سلطنت کو یہ ہدایات صادر کیں کہ وہ اپنی وفاداری کے ثبوت میں دہلی آکر حلف وفاداری اٹھائیں۔ پیر محمد کو جو کہ مغربی راجپوتانہ میں بھٹک رہا تھا واپس آنے کی دعوت دی گئی بیرم خاں سے ناراض اور دل برداشتہ امراء دہلی آکر جمع ہو گئے۔

بیرم اس ناگہانی تبدیلی کے لیے آمادہ نہ تھا۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ اکبر کو اس پر پورا پورا اعتماد ہے اور وہ یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اکبر اس کو اس غیر رسمی طریقے سے نظر انداز کر دے گا۔

بیرم کو ان حالات پر سخت تعجب ہوا اور وہ یہ بات باور نہ کر سکا کہ خود بادشاہی اس منصوبے کا محور ہے۔ اس کو یقین تھا کہ اگر وہ ایک مرتبہ بادشاہ سے مل سکے تو پھر سے اس کو اپنا طرفدار بنا لے گا لیکن اس کی درخواست ملاقات نرمی کے ساتھ رد کر دی گئی۔

بیرم نے بادشاہ کو استعفا دینے کی دھمکی دی لیکن اس کو یہ معلوم کر کے بہت تعجب ہوا کہ اس کا استعفا منظور کر لیا گیا۔ چنانچہ بیرم نے یہ محسوس کیا کہ جب تک شرکائے منصوبہ کی قوت اور اثر کو پوری طرح ختم نہ کر دیا جائے، اس وقت تک بادشاہ کا اعتماد

دوبارہ حاصل نہ کیا جا سکے گا اور جب پیر محمد کو بیرم خاں کی نقل و حرکت کی دیکھ بھال کے لیے مقرر کیا گیا تو اس کے فیصلے میں اور بھی پختگی آگئی ۔ بیرم خاں کو اس بات کا خیال نہ رہا کہ اگر اس نے اس گروہ کے خلاف جو بادشاہ کے ساتھ وابستہ ہے کسی قسم کا فوجی مظاہرہ کیا تو اس کا یہ فعل بغاوت ہی کہا جائے گا۔ شہنشاہ اور اس گروہ کے درمیان جس نے شاہی مفاد کے لیے خود کو وقف کر رکھا تھا کسی قسم کی بھی تفریق بے کار تھی۔

بیرم خاں کا خیال یہ تھا کہ بادشاہ سازشیوں کے ہاتھوں میں آلۂ کار بنا ہوا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے حالات کا صحیح جائزہ لینے اور اکبر کے کردار کو سمجھنے میں زبردست غلطی کی۔

کچھ تردد اور پس و پیش کے بعد اپنے جذبۂ وفاداری کے خیال سے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی لاج رکھنے کے لیے اور اپنے دشمنوں کو سزا دینے کے لیے ہتھیار اٹھا لئے ۔ چنانچہ وہ بیکانیر سے پنجاب کی طرف ان لوگوں کے پاس مدد حاصل کرنے کے لیے روانہ ہوا ۔ جنھوں نے اس کے عروج کے زمانے میں اس سے فائدے اٹھائے تھے لیکن مصیبت کے اس دور میں وہ لوگ کام نہ آئے ۔ ادھر بادشاہ بھی بنظرِ غائر اس کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا اور اس نے پہلے ہی شمس الدین محمد اتکہ کو بیرم کو روکنے کے لیے روانہ کر دیا تھا اور خود اگست 1560ء میں اس کی مدد کے لیے پایۂ تخت سے نکل کھڑا ہوا۔

شمس الدین نے گوناکور کے مقام پر بیرم خاں کو جا لیا اور اس کو شکست دی ۔ بیرم شوالک کی پہاڑیوں میں جا چھپا۔ اکبر نے یہاں بھی اس کا سخت تعاقب کیا اور کابل سے منعم خاں بھی اس کی مدد کو آپہنچا۔

بیرم جو کہ بے دلی کے ساتھ بغاوت پر آمادہ ہوا تھا اپنے دوست حسین جلائرکی موت کی خبر پاکر اور اپنی کمزور حالت پر بہت مایوس اور ناامید ہوا چنانچہ اس نے اکتوبر 1560ء میں خود کو بادشاہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اکبر بیرم کی ان تمام بیش بہا خدمات کو جو کہ اس نے سلطنت اور شاہی خاندان کے لیے انجام دی تھیں بھولا نہ تھا چنانچہ جب بیرم اس کے سامنے آیا تو اکبر اپنے تخت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ اخلاق سے پیش آیا، گلے لگایا اور اپنے دائیں جانب بٹھایا۔ اس غیر متوقع پذیرائی کو

دیکھ کر بیرم کا دل اس اعزاز اور ساتھ ہی اپنے عجز کے مخلوط جذبات سے اتنا متاثر ہوا کہ اس کے آنسو نکل پڑے۔

بادشاہ نے محبت بھرے الفاظ سے اس کو تسلی دی اور اپنی قبا اس کو عنایت فرمائی۔ اکبر نے اس کے سامنے تین تجویزیں رکھیں۔ "اگر بیرم کو فوجی زندگی کا شوق ہے تو کالپی اور چندیری کی حکومت اس کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے کافی مواقع فراہم کر سکتی ہیں۔ اگر وہ دربار میں ہی رہنا پسند کرے تو ہمارے خاندان کے محسن پر مراحم خسروانہ سے دریغ نہ کیا جائے گا لیکن اگر اس نے ملازمت سے دستبردار ہو کر عبادت کا ہی ارادہ کر لیا ہے تو پھر وہ حج کرنے مکہ چلا جائے۔ اس کے عالی مقام رتبے کی مناسبت سے سفر میں اس کی ہمراہی کا معقول انتظام کیا جائے گا۔"

بیرم خاں کو پہلی دو تجاویز مشکل سے پسند آ سکتی تھیں کیوں کہ چار سال تک سلطنت کے کاروبار کو پوری طرح اپنے اختیار میں رکھنے کے بعد وہ خود کو اس بات کے لیے راضی نہیں کر سکتا تھا کہ کسی کا دست نگر ہو کر کام کرے حالانکہ اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود تھیں کہ وزرائے اعظم کو صوبائی حکومتوں میں صوبے دار بنا کر بھیجا گیا۔ اس کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اپنے دشمنوں سے اب بھی خوف تھا۔ چنانچہ وہ ایسی جگہ رہنا پسند نہ کرتا تھا جہاں کا ماحول مخاصمانہ ہو۔ اگر اس کو وکالت پیش کی گئی ہوتی تو شاید وہ قبول کر لیتا لیکن موجودہ حالات میں یہ بات ناممکن العمل تھی۔ آخر اس نے پریشان ہو کر مکہ جانا قبول کر لیا۔ اکبر نے اس کی ہمراہی کے لیے ایک محافظ دستہ دیا۔

بیرم کی قسمت میں مکہ پہنچنا نہ تھا۔ گجرات میں پٹن کے مقام پر بیرم وہاں کے مشہور قدیمی تالاب کی سیر کرنے گیا۔ وہاں ایک نیم دیوانہ مبارک خاں نوہانی کی سرکردگی میں افغان غنڈوں کا ایک گروہ اس پر حملہ آور ہوا۔

مبارک خاں کی بیرم سے دشمنی کی دو وجوہ تھیں۔ اول تو یہ کہ بیرم نے اس کے باپ کو مچھی واڑہ کی لڑائی میں قتل کر دیا تھا۔ دوسرے یہ کہ بیرم اپنے ہمراہ اسلام شاہ کی ایک کشمیری بیوی کو بھی لیے جا رہا تھا جس کی لڑکی کے ساتھ وہ اپنے بیٹے کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ گویا اس طرح بیرم نے افغانوں کی توہین کی تھی۔ 31 جنوری 1561ء کو مبارک نے پیچھے سے بیرم خاں پر خنجر سے وار کیا اور دوسرے افغان نے بڑھ کر اس کا سر کاٹ لیا۔

کچھ درویش اور فرار اس کی نعش لے گئے، اور شیخ حسام کے مقبرے کے جوار میں سادہ طور پر دفن کر دیا۔

گو بیرم کے ساتھی اس کی نعش کو اپنے ساتھ نہ لے جا سکے لیکن رستہ بھر لڑکر بیرم کی بیوی سلیمہ بیگم اور اس کے لڑکے عبدالرحیم کو حفاظت سے احمد آباد پہنچا دیا۔ چند ماہ بعد ان کو اکبر کے پاس پہنچا دیا گیا جس نے بڑی شفقت کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ شہنشاہ نے سلیمہ بیگم سے شادی کر لی اور عبدالرحیم کی اپنے بیٹے کی طرح پرورش کی۔

اکبر نے خود کو بیرم خاں کے اختیار سے اس لیے آزاد کرایا تھا کہ آیندہ وہ کسی کے پنجے میں گرفتار نہ ہو۔ ان امراء میں سے بعض اشخاص جنھوں نے بیرم خاں سے کشمکش کے دوران بادشاہ کا ساتھ دیا قدرتاً خود کو اہم سمجھنے لگے تھے۔ ان کی توقعات بہت بلند ہو گئی تھیں لیکن اکبر کا خود اپنا منصوبہ تھا اور اپنے منتخب لوگوں کی ایک جماعت تھی۔ چنانچہ اس نے ایسے امراء کو دور کرنے کے لیے جو اس کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے نیز اپنی سلطنت کی حدود کو وسیع کرنے کے لیے اور اس کے کمزور پہلوؤں کو مضبوط بنانے کے لیے بہت سی مہمیں شروع کیں۔ ان امراء میں سے ایک کو کابل کی حکومت کی حمایت کے لیے روانہ کیا گیا کیوں کہ یہاں پر افسروں کی بد انتظامی کے سبب بدامنی اور بغاوت پھیل رہی تھی اور ایک کو ادہم خاں، پیر محمد خاں اور قیا خاں کی سرکردگی میں مالوہ فتح کرنے کے لیے روانہ کیا۔

شہنشاہ نے ان خطرناک دوستوں سے نجات حاصل کرنے کے بعد مرکزی حکومت کی از سرِ نو تنظیم شروع کر دی اور ماہم انگہ کو سیاست سے دست برداری کی اجازت دے دی گئی۔

مالوہ کی مہم کامیاب رہی۔ یہاں شجاعت خاں کے لڑکے باز بہادر نے اپنے سب حریفوں کو شکست دے کر آزاد حکومت قائم کر لی تھی۔ باز بہادر نے جو کہ جوان اور مستعد آدمی تھا شروع شروع میں تندہی سے کام کیا لیکن بعد میں شراب اور عورت کی لذتوں میں منہمک ہو گیا۔ وہ بہت شکیل چھیل تھا۔ اس کا ذوقِ جمالیات بلند اور وہ خود موسیقی میں اعلیٰ دسترس رکھتا تھا۔ اس کو صنفِ نازک کی صحبت بہت پسند تھی۔ ظاہر ہے ایسا آدمی زیادہ عرصے تک مغل فتوحات کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اس نے کچھ مقابلہ کیا لیکن شکست کھا کر برہانپور کی طرف راہِ فرار اختیار کی۔

مالوہ کی بآسانی فتح نے ادہم خاں کو مغرور بنا دیا اس نے ظلم و جور کا بازار گرم کر دیا۔ ادہم اسیرانِ جنگ کے ساتھ بے رحمی کا برتاؤ کیا حتیٰ کہ شیوخوں وسیدوں کے بیوی بچوں کو بھی نہ بخشا۔ اس نے باز بہادر کی عورتوں اور سارے مال غنیمت کو اپنے قبضے میں کر لیا اور بادشاہ کو محض چند ہاتھیوں کا تحفہ بھیج کر مطمئن کرنا چاہا۔ بادشاہ اس بات سے ناراض ہو گیا۔ اکبر ادہم خاں کی وصلہ مندیوں کو کچلنے کے لیے 27 اپریل 1561ء کو ایک چھوٹے سے محافظ دستہ کو ساتھ لے کر شکار کے بہانے آگرے سے روانہ ہوا اور تیزی سے ادہم خاں کو گاگرون کے مقام پر ناگہانی طور پر جا لیا۔ ادہم تعظیم بجا لایا۔

اکبر سارنگ پور گیا جہاں ادہم خاں نے سارا مال غنیمت اور باز بہادر کے حرم کی حسیناؤں کو بادشاہ کے ملاحظہ کے لیے پیش کیا۔ بادشاہ کو جو کچھ پسند آیا اسے رکھ لیا اور کی واپسی کا حکم دیا۔

ادہم دو عورتوں کو پوشیدہ رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب اکبر کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے ان دو عورتوں کو پیش کرنے کا حکم دیا۔ ادہم خاں کی ماں ماہم جو اس وقت ادہم کے کیمپ میں پہنچ چکی تھی ڈری کہ اگر ان عورتوں کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا تو وہ اس کے بیٹے کی شرارتوں کا پردہ فاش کر دیں گی۔ چنانچہ اس نے خاموشی سے ان کو قتل کرا دیا۔ اکبر نے اس وقت تو اس ظلم پر چشم پوشی کی اور تقریباً 28 دن کی غیر حاضری کے بعد 4 جون 1561ء کو آگرہ واپس آ گیا۔

بیرم خاں کی معزولی نے بہار کے افغانوں کے حوصلے بڑھا دیے اور انھوں نے ایک دفعہ پھر قسمت آزمائی کی ٹھان لی۔ انھوں نے عادل شاہ کے بیٹے شیر خاں کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا 1561ء میں بیس ہزار سوار، پچاس ہزار پیادہ اور پانچ سو ہاتھیوں کو لے کر جونپور پر چڑھائی کر دی۔

اس جنگ میں مغلوں کے پیر اکھڑ چکے تھے کہ خان زماں آندھی کی طرح آیا اور پیچھے سے افغانوں پر حملہ آور ہو کر ان کو پسپا کر دیا۔ ادہم خاں کی طرح خان زماں نے بھی وہ سارا مال غنیمت جو اس کے ہاتھ آیا اپنے قبضے میں کر لیا۔ یہ افواہ بھی اڑ چکی کہ وہ بادشاہ کے خلاف بغاوت کرنا چاہتا ہے اور اپنے رشتہ داروں کی مدد سے ایک آزاد حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔

۲۲ جولائی 1561ء کو اکبر منعم خان کو ساتھ لے کر مشرق کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ کڑہ پہنچا تو خان زماں اور اس کا بھائی بہادر خان اظہار عقیدت مندی کے لیے حاضر ہوئے اور اپنے کچھ بہترین ہاتھی اور دوسری بیش بہا چیزیں بطور پیش کش نذر کیں۔ اکبر نے ان لوگوں کے ساتھ مہربانی کا سلوک کیا اور 20 اگست 1561ء کو آگرہ واپس ہو گیا۔

14 جنوری 1562ء کو اکبر خواجہ معین الدین چشتی کے مقبرہ واقع اجمیر کی زیارت کے لیے پہلی مرتبہ روانہ ہوا۔ اس نے ہندوستانی مغنیوں کی زبانی خواجہ کی بزرگی و عظمت کی داستانیں سن رکھی تھیں۔ امبیر سے چند میل کے فاصلے پر سنگانیر کے مقام پر راجہ بھارہ مل کچھواہ کو چغتائی خان نے بادشاہ سے متعارف کرایا۔

راجہ محض عرض ارادت و تعظیم کے لیے ہی حاضر نہ ہوا تھا بلکہ وہ محمد شرف الدین حسین صوبے دار میوات کے مقابلے میں اکبر کی پناہ حاصل کرنے کے لیے آیا تھا کیوں کہ شرف الدین راجہ کے بھتیجے سوجا کی مدد کر کے بھارہ مل کو اس کے موروثی شہر امبیر سے نکال باہر کرنے اور اس کے خاندان کو برباد کرنے کے درپے تھا۔

کچھواہہ خاندان ایک طرف تو مارواڑ کے راجہ اور شرف الدین کے درمیان خوف و ہراس کی حالت میں بسر کر رہا تھا اور دوسری طرف باہمی نزاع میں مبتلا ہو کر آہستہ آہستہ بربادی کی سمت بڑھ رہا تھا۔ کچھواہوں کی یہ چھوٹی سی ریاست چھوٹے چھوٹے راجاؤں کے درمیان بٹی ہوئی تھی اور ان کی حیثیت دوسری ریاستوں کے جاگیرداروں سے زیادہ نہ تھی۔ یہ لوگ خاموشی اور بزدلی کے ساتھ بابر ہمایوں شیر شاہ اور شرف الدین حسین کے سامنے سر تسلیم خم کر چکے تھے کیوں کہ ان کا نہ تو اتنا اثر تھا اور نہ ہی ان میں اتنی فوجی قوت تھی کہ ان کا مقابلہ کر سکتے۔ ان کا وطن دہلی، آگرہ اور میدانی علاقوں سے قریب ہونے کی وجہ سے دہلی و آگرہ کے حکمرانوں کے حملوں کی آماجگاہ بنا رہتا۔ اچھے جنگجو ہونے کے باوجود دوسرے پہاڑی یا ریگستانی علاقوں کے حکمرانوں کی طرح اکبر کی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ اکبر راجہ کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آیا اور اس کی مشکلات کو حل کرنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ راجا بھارہ مل نے یا تو خود ہی یا کسی اور کے مشورے سے اپنی سب سے بڑی بیٹی کو اکبر سے بیاہ دیا۔

تاریخ اس بات پر روشنی نہیں ڈالتی کہ آخر یہ تجویز کس نے پیش کی تھی۔ بہرحال

یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اپنی ذاتی غرض، احسان مندی اور شاید شہنشاہ کی طرف سے کچھ دباؤ کے سبب یہ شادی انجام پائی۔ مسلمان حکمرانوں اور راجپوت عورتوں کے درمیان اس سے پہلے بھی شادیاں ہوئی تھیں۔ لیکن یہ بات مشکوک ہے کہ آیا وہ شادیاں بھی اسی طرح حسن نیت اور صدق دلی کے ساتھ انجام پائیں۔

اس شادی کے عوض راجہ کا لڑکا جگن ناتھ اور اس کے دو بھتیجے جو کہ شرف الدین کے پاس ضمانت کے بطور یرغمال تھے راجہ کو واپس مل گئے اور اس کا دوسرا لڑکا راجہ بھگوان داس اور پوتا مان سنگھ شاہی ملازمت میں داخل کر لیے گئے۔ یہ اکبر کی راجپوت شہزادی سے پہلی شادی تھی اور یہیں سے ہی اس کی وہ سیاست شروع ہوتی ہے جو ہندوستان پر مغل حکومت کے دوران بہت ہی اثر انداز رہی۔

اکبر کا سفر اجمیر محض زیارت کی غرض سے نہ تھا بلکہ راجپوتانہ کے بارے میں اکبر کے آئندہ منصوبوں سے اس کا گہرا تعلق تھا۔ یہ بات امبر کے گھرانے سے رشتہ داری اور میرتا کی فتح سے ظاہر ہوتی ہے۔ میرتا راجپوتانہ کی سب سے بڑی ریاست تھی جو مارواڑ کا دروازہ سمجھا جاتا ہے۔ شرف الدین نے میرتا کا محاصرہ کر لیا اور جے مل و دیوداس کے بہادرانہ دفاع کے باوجود ناگہانی حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا۔

راجپوت رسم کے مطابق مارواڑ کے راجہ مالدیو نے چندرسین کو اجمیر بھیجا کہ وہاں جا کر اکبر کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کو تحفے تحائف پیش کریں اور کسی قسم کا معاہدہ کریں لیکن اکبر کا اصرار تھا کہ مالدیو بذات خود حاضر ہو کر تعظیم بجا لائے۔ وہ "ریگستانی بادشاہ کے اس متکبرانہ طرز عمل" پر برہم ہوا چنانچہ 1562ء میں یہ گفت و شنید کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ہی ختم ہو گئی۔

اکبر نے احتیاطاً اس وقت مارواڑ پر حملہ نہ کیا۔ علاوہ بریں اس وقت اس کی توجہ مالوہ کی طرف تھی۔ مالوہ کے صوبے دار پیر محمد خاں نے بادشاہ کی اجازت کے بغیر برہان پور اور بیجا گڑھ پر حملہ کیا تھا۔ یہ حملہ محض خاندیش کے خلاف اپنے قدیمی عناد کو نکالنے کی خاطر انجام دیا تھا۔ چنانچہ خاندیش کے حکمران اور مالوہ کے ملک بدر حکمران باز بہادر دونوں نے مل کر پیر محمد کا مقابلہ کیا۔ اور چونکہ اس کی طاقت کافی نہ تھی لہذا اس کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

پیر محمد دریائے نربدا پار کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ گھوڑے سے گر کر ڈوب گیا۔ باز بہادر

نے پھرتی سے اس کی موت سے فائدہ اٹھایا اور مالوہ میں داخل ہوگیا جہاں پر لوگوں نے
گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ کیوں کہ پیر محمد کی حکومت کے دوران رعایا کو بڑے ظلم و
ستم کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

قبل اس کے کہ باز بہادر اپنی طاقت اور حکومت کو مضبوط کر سکے اس کو عبداللہ خاں
سے 1562ء میں مقابلہ کرنا پڑا۔ جس کو اکبر نے مالوہ کا صوبے دار بناکر روانہ کیا تھا۔ باز بہادر
ایک بار پھر مالوہ سے بے دخل کیا گیا۔ اب اس کو ہمیشہ کے لیے اپنی سلطنت کو چھوڑ کر میواڑ کی پہاڑیوں
میں پناہ لینی پڑی اور عبداللہ خاں نے مانڈو پر قبضہ کر لیا۔

ادہم خاں مالوہ سے واپس بلائے جانے کے بعد سے شمس الدین محمد اتکہ سے دشمنی رکھنے
لگا کیونکہ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ قانوناً شمس الدین ہی وکیل ہے۔ منعم خاں نے ادہم خاں کے
مفسدانہ منصوبے میں اس کی مدد کی تاکہ شہاب الدین کے لیے راستہ ہموار ہو جائے
شہاب الدین احمد نے بھی چونکہ ماہم انگہ کا رشتہ دار کسی زمانے میں اکبر کا وکیل رہا تھا
ادہم کی نفرت کو ہوا دی۔

ادہم خاں نے ایسے حامیوں اور اپنی ماں کے اثر و رسوخ کے بل بوتے پر شمس الدین
پر حملہ کر کے اس کو زخمی کر دیا اور اپنی موجودگی میں قتل کرا دیا۔ ادہم خون میں رنگی تلوار لیے
اکبر کی اقامت گاہ کی طرف چل پڑا لیکن ایک خواجہ سرا نے اس کو روک لیا اور شور و غل
برپا ہوا۔

اکبر نے جب وزیر اعظم کے قتل کی خبر سنی تو وہ اپنی خواب گاہ سے ہاتھ میں تلوار لے کر
باہر نکلا۔ ادہم خاں اس کو راستے میں ہی مل گیا۔ بادشاہ کو دیکھ کر ادہم بہانے بازی کرنے
لگا اور اس کی تلوار پکڑ لی۔ ادہم کی اس گستاخانہ حرکت پر برہم ہوکر اکبر نے ایک ایسا بھرپور
مکا رسید کیا کہ ادہم بے ہوش ہوکر زمین پر گر پڑا اور شہنشاہ کے حکم سے اس کو فوراً چھت
سے نیچے گرا دیا گیا۔ یہ واقعہ 16 مئی 1562ء کا ہے۔

اکبر خود ماہم کے پاس بیٹے کی خبر بد سنانے گیا۔ وہ صاحب فراش تھی۔ ماہم نے
بظاہر اطمینان سے یہ خبر سنی لیکن اس کو اس قدر زبردست صدمہ پہنچا کہ وہ جانبر نہ ہو سکی۔
اور چالیس دن بعد اپنے بیٹے سے جا ملی۔

ادہم خاں کو زبردست سزا مل جانے سے مزید کشت و خون ہونے سے بچ گیا۔

شمس الدین کا سب سے بڑا لڑکا مرزا یوسف خاں اپنے قبیلے کے ساتھیوں کو لے کر انتقام کی آگ سے مشتعل ہو کر آگیا۔ اس نے مطالبہ کیا کہ ادہم خاں اور اس کے حامیوں کو اس کو سونپ دیا جائے لیکن جب ان کو ادہم خاں کی سرگذشت کا پتہ چلا تو ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور واپس ہو گئے۔

ادہم خاں اور اس کی ماں کو شہنشاہ کے حکم سے قطب مینار دہلی کے قریب شان دار طریقے سے دفن کر دیا گیا۔ منعم خاں و شہاب الدین کو پنجاب میں گرفتار کر کے دہلی دربار میں لایا گیا۔ کیوں کہ قتل میں ان کی شرکت مصدقہ نہ تھی اس لیے ان کو بری کر دیا گیا۔ یہ واقعہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ سلطنت کے بڑے سے بڑے امراء اور افسران شہنشاہ سے کس قدر خائف رہتے تھے۔

منعم خاں کے کابل سے واپس آنے کے بعد سے وہاں کے حالات ابتر ہوتے جا رہے تھے۔ منعم خاں کے لڑکے غنی خاں اور دوسرے افسروں کی نااہلی، بداعمالی اور غیر ہر دلعزیزی سے فائدہ اٹھا کر اکبر کے چھوٹے بھائی مرزا حکیم کی ماں ماہ چوچک بیگم نے جو کہ ایک سازشی اور تیز عورت تھی غنی خاں کو کابل سے نکال دیا۔

چنانچہ اکبر نے منعم خاں کو کابل کے حالات سدھارنے کے لیے روانہ کیا۔ ماہ چوچک بیگم منعم خاں کا مقابلہ کرنے جلال آباد پہنچ گئی۔ جنگ میں منعم خاں کو شکست ہوئی اور وہ اپنا سارا ساز و سامان چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ وہ پریشان و شکست خوردہ اکبر کے دربار میں واپس ہوا۔ باوجودیکہ منعم خاں شکست کھا کر آیا تھا مگر شہنشاہ نے اس سے مہربانی کا سلوک کیا۔ اس وقت سے کابل عملاً دہلی سے بالکل آزاد ہو گیا اور مرزا محمد حکیم کی حکومت قائم ہو گئی۔ یہ بات ایک لحاظ سے اچھی ہی ہوئی کیوں کہ اب شاہی حکومت جو کابل، وسط ایشیا اور مغربی سرحد کی پیچیدہ سیاست کے باعث ہمیشہ پریشان رہتی بری الذمہ ہو گئی۔ اب اکبر اپنی پوری توجہ ہندوستان کے معاملات کی طرف مبذول کر سکتا تھا۔

سلطان سارنگ گھکر کے بیٹے کمال خاں نے مغلوں کی ملازمت اختیار کر لی اور افغانوں کے خلاف لڑائیوں میں بہادری کے جوہر دکھائے۔ اس نے بادشاہ کے حضور میں یہ درخواست پیش کی کہ اس کا چچا سلطان آدم اور اس کے لڑکے لشکری نے گھکر علاقہ پر قبضہ کر لیا ہے اور اس کے حق کو بالکل ہی فراموش کر دیا ہے۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کے آبائی علاقے

میں سے اس کو کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملنا چاہیے۔ اکبر نے پنجاب کے صوبے دار خان کلاں کو حکم دیا کہ وہ سلطان آدم سے کہے کہ آدھا علاقہ کمال خاں کے لیے چھوڑ دے۔ سلطان آدم نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا مغل گورنر نے گکھڑ علاقے پر حملہ کر دیا اور ہیتان کی جنگ میں آدم کو شکست ہوئی۔ آدم خاں اور اس کا بیٹا لشکری گرفتار ہوئے اور کمال خاں کو پورا علاقہ عطا کر دیا گیا۔

جب اکبر نے میرتا کے فاتح شرف الدین حسین کے باپ خواجہ معین الدین کے ساتھ جو کہ حال ہی میں مکہ سے واپس آیا تھا۔ مہربانی کا برتاؤ کیا تو شرف الدین کو اس بات سے بہت تشویش ہوئی کیونکہ باپ بیٹے کے تعلقات بہت ہی کشیدہ تھے۔ شرف الدین خطرہ محسوس کر کے اکتوبر 1562ء میں دربار سے فرار ہو کر اپنی جاگیر کی طرف چلا گیا جو اجمیر و ناگور میں تھی۔ اکبر نے حسین قلی خاں کو اس کے تعاقب میں بھیجا۔

شرف الدین شاہی سرحد سے باہر نکل گیا اور اس کی جاگیر پر حسین قلی خاں نے قبضہ کر لیا۔ اس کے فوراً ہی بعد حسین قلی نے جودھ پور پر حملہ کیا۔ جہاں راجہ مالدیو کا چھوٹا لڑکا چندر سین حکومت کرتا تھا۔ مالدیو کا بڑا لڑکا رام رائے مغلوں سے آملا اور تھوڑے عرصے بعد ہی جودھ پور پر حسین قلی کا قبضہ ہو گیا۔ چندر سین بھاگ کر سوانا پہنچا اور اس نے مارواڑ کی آزادی کے لیے جنگ کرنے کا عہد کر لیا۔

11 جنوری 1564ء کو اکبر نظام الدین اولیاء کے مزار سے شہر واپس جا رہا تھا کہ راستے میں مدرسہ ماہم انگہ کے قریب ایک شخص قتلغ فولاد نے جو کہ مرزا شرف الدین کے غلام کا ملازم تھا شہنشاہ پر تیر چلایا اور اس کا شانہ زخمی ہو گیا۔ مجرم کو فوراً ہی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ زخم زیادہ کاری نہ تھا۔ ہفتہ بھر میں مندمل ہو گیا۔ مجرم کا مقصد بالکل واضح تھا۔ اس کے باوجود یہ افواہ اڑ گئی کہ اس حملے کا تعلق اکبر کی اس مبینہ خواہش سے تھا کہ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر شریف خاندان کی خوب صورت عورتوں سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

پندرھویں صدی کے آخری پچیس سالوں میں امن داس نامی ایک شخص کی سرکردگی میں موجودہ مدھیہ پردیش کے شمالی علاقے پر جس میں ساگر، داموہ، مانڈلا، سیونی، دریائے نربدا کی وادی اور شاید بھوپال کے کچھ علاقے بھی شامل تھے مل کر ایک ریاست وجود میں

آئی۔ اس ریاست کا نام ضلع جبلپور کے دو شہروں گڑھا اور کٹنگی کی مناسبت سے گڑھا کٹنگا پڑ گیا۔ اس کے شمال میں پنا کا علاقہ تھا۔ مشرق میں رتن پور اور مغرب میں مالوہ تھا۔ اس ریاست کا رقبہ [illegible] مربع میل تھا اور اس کا پایۂ تخت چوراگڑھ تھا جو کہ ضلع نرسنگھ پور میں واقع ہے۔ اس کے قدرتی تحفظ و استحکام کے پیاس قلعہ کے علاوہ [illegible] دوسرے چھوٹے چھوٹے قلعے بھی اس ریاست میں موجود تھے۔

امن داس نے گجرات کے بادشاہ بہادر شاہ کو رائے سین فتح کرنے میں مدد دی تھی چنانچہ بادشاہ نے اس کو سنگرام شاہ کے خطاب سے نوازا تھا۔ اس کا لڑکا دلپت شاہ ایک بہت ہی خوبصورت شہزادہ تھا جس کو خدا نے شجاعت بھی بخشی تھی۔ دلپت شاہ مہوبا کے چندیل راجہ شالی بھان کی لڑکی درگا وتی سے شادی کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ شادی ہندوستان کی عشقیہ داستانوں میں بہت ہی دلچسپ اور معروف ہے۔ دلپت شاہ نے ریاست کا پایۂ تخت چوراگڑھ سے سنگور گڑھ تبدیل کر دیا۔

سنگور گڑھ جبیرا کی وادی کے اوپر ایک پہاڑی کی قوس پر واقع ہے اور ان پہاڑیوں کا سلسلہ جبلپور دامودہ اور ساگر کے درمیان سے گزرتا ہے۔ دلپت شاہ شادی کے چار سال بعد اپنی بیوی درگا وتی اور تین یا پانچ سالہ لڑکے ویر نارائن کو چھوڑ کر فوت ہو گیا۔ رانی نے اپنے بیٹے کو باپ کے تخت پر بٹھا دیا اور اس کے نام سے حکومت کرنے لگی۔

درگا وتی جتنی حسین تھی اتنی ہی بہادر اور حوصلہ مند بھی تھی۔ وہ بندوق اور تیر کمان کا نشانہ لگانے میں ماہر تھی اور سیر و شکار کی بھی شوقین تھی۔ "اس کا یہ طریقہ تھا کہ اگر خبر مل جائے کہ کہیں شیر نظر آیا ہے تو جب تک وہ اس کا شکار نہ کر لیتی پانی نہ پیتی۔"

اس کے کارہائے نمایاں اور ہنگامہ آرائی کی داستانیں ہندوستان بھر میں مشہور تھیں۔ اس کے دورِ حکومت میں ریاست مستحکم اور خوش حال ہو گئی۔ مالوہ کا حکمران باز بہادر اور رائے سین کے حکمران میانے کئی دفعہ اس سے لڑائیوں میں شکست کھا چکے تھے اور ڈرنے لگے تھے۔ اس کی فوج میں بیس ہزار سوار، بہت سے پیدل سپاہی اور تقریباً ایک ہزار عمدہ ہاتھی شامل تھے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں سے کتنے مستقل اور قابلِ اعتماد تھے۔

گڑھا کٹنگا کی ریاست کی سرحدیں مالوہ میں مغل سلطنت کی سرحدوں سے ملتی تھیں اور جب خواجہ عبدالمجید آصف خاں صوبیدار کڑہ (الٰہ آباد) نے بھٹا فتح کر لیا تو ریاست کی سرحدیں

بالواسطہ مغل سلطنت سے ملنے لگیں۔ اس میں شک نہیں کہ بڑھتی ہوئی مغل سلطنت کا دباؤ اس ریاست کو جلد یا بدیر برداشت کرنا پڑتا لیکن آصف خاں کی حرص و آز نے اس واقعہ کو جلد تر رونما ہونے میں مدد دی۔ آصف خاں نے رانی کی دولت کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ وہ اس کو فتح کرنے کا بہت خواہش مند تھا اور اکثر سرحدی علاقوں میں غارت گری کرتا رہتا تھا۔

رانی نے اپنے وزیر آدھر کایتھ کو شہنشاہ کے پاس بھیجا لیکن گفت و شنید کامیاب نہ ہوئی۔ شاید اکبر یہ چاہتا تھا کہ رانی اس کی اطاعت قبول کرلے۔ اور کچھ علاقہ بھی سپرد کر دے اُدھر رانی نے آصف خاں کی غارت گری کا انتقام لینے کے لیے بھیلسا اور مالوہ میں ہنگامہ آرائی شروع کردی۔ اُدھر آصف خاں نے جو کہ شاہی حکومت پر اس بات کی اجازت حاصل کرنے کے لیے دباؤ ڈال رہا تھا کہ گرا کتنگا پر حملہ کردیا جائے اپنے منصوبوں کو بروئے کار لانے کا فیصلہ کرلیا۔

آصف نے ریوا میں بھاٹھا کے بھاگیل راجہ رام چندر کو پہلے ہی شکست دے دی تھی اور گرہا پر حملہ کرنے کے لیے بے قرار تھا۔ چنانچہ اس نے دس ہزار سوار اور بڑی تعداد میں پیادہ فوج جمع کرکے حملے کی تیاریاں شروع کیں اور دامودہ پہنچ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رانی کی ریاست میں غداری اور بے اطمینانی پھیل چکی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ گرہا ریاست کے چھوٹے چھوٹے سرداروں کی غداری کے سبب سے آصف خاں کی سوار فوج کی تعداد پچاس ہزار سے بھی زیادہ ہوگئی لیکن رانی کی فوج کے لیے اس کا وزیر آدھر چند ہزار فوجیوں سے زائد جمع نہ کرسکا۔ یہ صورت حال دیکھ کر آدھر نے اس بات کی کوشش کی کہ رانی کو اسباب و وسائل جنگ کی کمی کے سبب لڑائی سے باز رکھے لیکن رانی نے جواب دیا کہ آدھر کی حماقت کے سبب جو بدنظمی وجود میں آئی ہے اس کی خاطر وہ اپنی آبرو پر بٹہ نہیں لگا سکتی اور نہ وہ ایک چھچھورے مغل سردار کے سامنے جو اس کے مقام و منزلت کو سمجھنے سے قاصر ہے اطاعت کی پیش کش کرسکتی ہے البتہ اگر شہنشاہ خود آیا ہوتا تو دوسری بات تھی۔ لہٰذا رانی نے دو ہزار آدمیوں کے ساتھ نرہی کے مقام پر پڑاؤ ڈال دیا۔ یہ مقام تین طرف سے پہاڑیوں اور دریائے گوڑ نرھا سے گھرا ہوا تھا۔ یہاں سے باہر آنا جانا بہت دشوار تھا۔

جب آصف خاں کو رانی کی جائے وقوع کا پتہ چلا تو وہ اُسی طرف بڑھا۔ رانی نے مزید فوج جمع کرنے کے انتظار سے انکار کر دیا اور جنگ کو ٹالنے کے لیے راضی نہ ہوئی اُس نے کہا۔ "آخر میں کب تک درختوں میں پناہ لیے پڑی رہوں"۔

چنانچہ وہ پانچ ہزار آدمیوں کے ساتھ مغلوں کو جنھوں نے گھاٹی کے دہانے پر قبضہ کر رکھا تھا اکھاڑنے کے لیے نکل آئی۔ رانی کو فتح ہوئی۔ مغلوں نے راہِ فرار اختیار کی۔ رانی نے تعاقب کیا۔ اس کا یہ مشورہ تھا کہ اسی رات کو اس سے پہلے کہ آصف خاں مدد سے کر پہنچے باقی دستے کو بھی حملہ کر کے ختم کر دیا جائے لیکن اُس کے افسروں نے اس کی بات سے اتفاق نہ کیا۔ یہ منصوبہ وہیں ختم ہو کر رہ گیا۔

اگلے روز آصف خاں پہنچ گیا اور جنگ چھڑ دی۔ لڑائی میں طرفین نے سخت مقابلہ کیا۔ ویر نارائن، شمس خاں اور مبارک خاں بہت ہی بہادری سے لڑے اور تین دفعہ مغلوں کو دھکیل دیا۔ بدقسمتی سے تیسرے معرکے میں ویر نارائن زخمی ہو گیا اور اُسے کو محفوظ جگہ پہنچا دیا گیا۔ اس کے میدانِ جنگ سے ہٹائے جانے سے افراتفری پھیل گئی اور فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ یہاں تک کہ رانی کے ساتھ محض تین سو آدمی رہ گئے لیکن رانی بزدلوں کی بھگدڑ سے متاثر نہ ہوئی اور جنگ جاری رکھی۔

آخرکار اُس کی دائیں کنپٹی میں ایک تیر آ لگا جسے اس نے نکال پھینکا لیکن بدقسمتی سے تیر کی نوک اندر ہی رہ گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک اور تیر اُس کے گلے میں آ کر لگا اور گو اُس نے اُس کو بھی نکال پھینکا لیکن بے ہوش ہو گئی۔ جب اسے ہوش آیا تو پتہ چلا کہ اُس کو جنگ میں شکست ہو چکی ہے۔

رانی نے اپنی عزت پر حملے کے خوف سے آدھر سے کہا کہ وہ اس کو قتل کر دے لیکن اس بات کے تصور سے ہی آدھر کا دل کانپ اُٹھا اور اس نے رانی کا حکم ماننے سے انکار کر دیا البتہ اُس کو محفوظ جگہ پہنچانے کا وعدہ لیکن دلاور راجپوت خاتون نے یہ مناسب نہ سمجھا چنانچہ اُس نے اپنا خنجر نکال کر سینے میں پیوست کر لیا اور اُس شاندار طریقے سے خود کو موت کی آغوش میں سونپ دیا۔ رانی کی نعش کو جبلپور سے تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر ایک تنگ گھاٹی میں دفن کر دیا گیا

بعض لوگ رانی کے اُس افسوسناک واقعۂ خودکشی کے لیے اکبر پر غیر ضروری اور

ناجائز الزام تھوپتے ہیں حالانکہ اس پر کوئی ذمے داری عائد نہیں ہوتی۔ اکبر کسی تنہا عورت سے برسرپیکار نہ تھا۔ اس کا مقابلہ ایک طاقت ور ریاست سے تھا جو افغانوں کی حامی و دوست تھی۔ یہ محض ایک اتفاق ہے کہ اس وقت ریاست کی حکومت کی باگ ڈور ایک بہادر شجاع اور دلیر عورت کے ہاتھوں میں تھی۔ علاوہ ازیں اس وقت تک اکبر اپنی قوت کو اس قدر مستحکم نہ کر پایا تھا کہ آصف خاں کو مجبور کر دیتا کہ وہ اپنے منصوبے کو درگزر کرے بلکہ اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو بھی نہ کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اکبر اس بات کی کس طرح پیش بینی کر سکتا تھا کہ حالات اس طرح کروٹ بدلیں گے اور رانی خودکشی پر مجبور ہو جائے گی۔

اگر تاریخ کو اس سلسلے میں کوئی فیصلہ صادر کرنا ضروری ہوا تو وہ یہی ہو سکتا ہے کہ قابل نفرین ہیں وہ بزدل جنھوں نے اپنی دلیر اور ہر دلعزیز رانی کا ایسی سخت مصیبت کے وقت ساتھ چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کی۔

اس جنگ کے بعد آصف خاں چوراگڑھ کی طرف روانہ ہوا۔ قلعہ پر مغلوں کا اس وقت تک قبضہ نہ ہو سکا جب تک کہ ویر نارائن بہادری سے لڑتا ہوا کام نہ آگیا اور جوہر کی رسم ادا نہ ہو گئی۔

رانی کی پاکباز بہن کملا وتی گرفتار ہوئی اور دو سو ہاتھیوں کے ہمراہ دربار میں پہنچا دی گئی۔ آصف خاں کی دلی مرادیں بر آئیں یعنی اسے بے انتہا سونا چاندی اور جواہرات اور 1000 ہاتھی ہاتھ لگے۔ اس نے ان سب چیزوں پر خود ہی قبضہ کر لیا اور شہنشاہ کو بالکل ٹال دیا۔ یہ واقعہ 1564ء کا ہے۔ اکبر نے 1567ء میں ازبک بغاوت کو دبانے کے بعد یہ محسوس کیا کہ اب اس کی طاقت اس قدر مضبوط ہو چکی ہے کہ وہ آصف خاں کو واپسی کا حکم صادر کر سکے۔ چنانچہ شہنشاہ نے گڑھ کٹنگا کی ریاست دلپت شاہ کے ایک بھائی چندر شاہ کو واپس کر دی اور صوبہ مالوہ کی مناسب حد بندی کی خاطر دس قلعے لے لیے۔

اکبر نے آصف خاں کی گستاخی پر شاید اس وجہ سے چشم پوشی کی کہ اس وقت مالوہ اور مشرقی اضلاع میں بغاوت کے بادل منڈلا رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ شہنشاہ نے طاقت ور امرا کی کمر توڑ دی تھی لیکن ابھی اس کو سیستان کے ازبک قبائلیوں سے نبٹنا تھا جو کہ سلطنت مغلیہ کے ساتھ بے وفائی سے پیش آرہے تھے۔ اس

کے باوجود ازبک سرداروں نے سلطنت مغلیہ کے لیے بیش بہا خدمات انجام دی تھیں پھر بھی ان کا رویہ شک و شبہ سے بالاتر نہ تھا۔ خان زماں کے بھائی بہادر خاں نے ایک شاہی ملازم کا سر قلم کر دیا۔ یہ ملازم بیرم خاں کے سالے اور باغیوں کے سرغنہ ولی بیگ کا سر لے کر بھیجا گیا تھا۔ پھر جب 1562ء میں اکبر مال غنیمت کے ناجائز تصرف سے ناراض ہو کر اسے حاصل کرنے کے لیے کڑا جانے پر مجبور ہوا تو دونوں بھائی حاضر ہو کر تعظیم بجا لائے جس سے فوری طور پر مصیبت ٹل گئی۔

بہرحال یہ افواہ گشت کر رہی تھی کہ خان زماں بنگال کے افغان حکمران سلیمان کرانی کے ساتھ دوستی کی پینگ بڑھا رہا ہے۔ اکبر کو یہ خیال تھا کہ جلد یا بدیر اس کو ان لوگوں سے مؤثر طریقے پر نبٹنا ہی پڑے گا۔ چونکہ ابھی اس کو کئی اور ضروری باتوں کی طرف توجہ مبذول کرنی تھی لہٰذا اس نے اس مسئلے کو حل کرنے میں عجلت نہ کی۔

لیکن جب عبداللہ خاں ازبک صوبے دار مالوہ نے آزادی اور خود مختاری کا خواب دیکھنا شروع کیا تو صورت حال اور بھی نازک ہو گئی۔ دوسرے امراء کی طرح اس نے بھی مال غنیمت خود ہی رکھ لیا اور اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے لگا۔

جولائی 1564ء میں اکبر نروار میں شکار کے بہانے مالوہ روانہ ہوا لیکن وہ در اصل عبداللہ کے کو اس ٹھکانے لگانا چاہتا تھا۔ جب عبداللہ نے شہنشاہ کی آمد کی خبر سنی تو وہ مالوہ سے فرار ہو گیا اور معافی و مہربانی کے وعدے کے باوجود واپس آنے سے انکار کر دیا۔

شہنشاہ نے عبداللہ خاں کے فرار سے یہ صحیح اندازہ لگایا کہ ممکن ہے اس واقعے کی بنا پر مشرقی اضلاع میں جہاں پر اسکندر خاں، خان عالم، بہادر خاں اور ابراہیم خاں جیسے ازبک سردار مقرر تھے فسادات اٹھ کھڑے ہوں۔ چنانچہ اکبر نے فیصلہ کیا کہ ان کو منتشر کر دے۔ شہنشاہ نے اپنے منشی خاص اشرف خاں کو خان عالم اسکندر خاں جاگیردار اودھ کے پاس روانہ کیا کہ اس کو اپنے ساتھ دربار میں حاضر کرے۔ اسکندر خاں اشرف کے ہمراہ مشورہ کرنے ابراہیم کے پاس پہنچا اور پھر وہ سب مل کر خان زماں سے مشورہ کرنے جونپور روانہ ہوئے۔ ازبک اس کے لیے تیار نہ تھے کہ مشرق میں اپنے عہدوں سے دستبردار ہو جائیں کیوں کہ اس طرح ان کو اپنی طاقت اور اتحاد کے کمزور

ہو جانے کا خطرہ لاحق تھا۔ ان لوگوں نے نہ صرف دربار میں جانے سے انکار کر دیا بلکہ اشرف خاں کو بھی جیل میں ڈال دیا اور مشرقی اضلاع میں اکبر کے جو افسر موجود تھے ان سے حکومت کی باگ ڈور چھین لی۔ اسکندر خاں اور ابراہیم خاں لکھنؤ کے راستے قنوج روانہ کر دیے گئے اور علی قلی و بہادر نے کڑا مانک پور کا رخ کیا جس پر اس وقت مجنوں خاں قاقشال کا قبضہ تھا۔

ضلع سیتاپور میں نیمکھار کے مقام پر اسکندر خاں اور اکبر کی وفادار فوجوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ اسکندر نے مخالفین کو پسپا کر دیا اور انھوں نے نیمکھار کے قلعہ میں پناہ لے کر شہنشاہ سے مدد کی درخواست کی۔ اسی طرح بہادر خاں نے مجنوں خاں کو مانک پور کے قلعہ میں محصور ہونے اور گڑھا کٹنگا کے صوبے دار آصف خاں سے مدد کی درخواست کرنے پر مجبور کر دیا۔ آصف خاں روپیہ اور فوج لے کر مدد کو پہنچا لیکن اس کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ وہ بہادر ازبک برادران سے نپٹ نہ سکے گا۔

جب شہنشاہ کو پتہ چلا کہ ازبک قبیلہ مسلح بغاوت پر آمادہ ہے اور افغان سردار عوض خاں پسر اسلام شاہ ان کی حمایت پر کمربستہ ہے تو اس نے منعم خاں کو آگے روانہ کیا اور خود بھی جون 1565ء میں اس سے جا ملا۔ جونہی دریائے گنگا پایاب ہوا شہنشاہ اس کو تیزی سے عبور کر کے لکھنؤ کی طرف روانہ ہو گیا اور ناگہانی طور پر اسکندر خاں کو جا لیا۔

اکبر کی فوجیں ابھی تھکی ہاری پہنچی ہی تھیں کہ ابراہیم اور اسکندر بھاگ کر خان زماں اور بہادر خاں کے پاس پہنچ گئے۔ ازبک سرداروں نے یہ سمجھ کر کہ مقابلہ کرنا مشکل ہوگا جونپور کی طرف راہ فرار اختیار کی اور پھر وہاں سے گنڈک کے راستے سے پٹنہ کے مقابل حاجی پور پہنچ گئے اور سلیمان کرانی سے مدد طلب کی۔ 11 جولائی کو شہنشاہ نے جونپور کا قلعہ فتح کر لیا۔ آصف خاں یہاں آکر بادشاہ سے ملا۔ اسی وقت آصف خاں کو یہ افواہ سن کر کہ شہنشاہ اس سے چوراگڑھ کے مال غنیمت کا حساب لینا چاہتا ہے بہت ہی فکر ہوئی اور وہ واپس گڑھا کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے فرار ہونے سے شاہی فوج کمزور ہو گئی خان زماں کی ہمت بندھی اور اس نے اسکندر خاں اور بہادر خاں کو سامارا دگور کھپور اور فیض آباد کے علاقوں میں بغاوت کی آگ بھڑکانے کے لیے روانہ کیا۔ شہنشاہ نے فوراً

ہی ان کو دبانے کے لیے ایک فوج روانہ کی۔ اسی دوران علی قلی نے منعم خاں سے معافی کی بات چیت شروع کی۔ اکبر نے منعم خاں کے کہنے پر باغیوں کو معاف کر دیا لیکن ان کی نیک نیتی پر شبہ کا اظہار کیا اور یہ شرط عائد کی کہ جب تک اکبر مشرقی اضلاع میں موجود ہے خان زماں دریائے گنگا کے اس پار نہ آئے۔ خان زماں کی ہدایت کے بموجب بہادر خاں نے بھی اطاعت اختیار کی۔ حالانکہ اس نے خیر آباد کے مقام پر شاہی فوج کو شکست دی تھی۔

اب اکبر نے جونپور سے کوچ کا حکم دیا اور پایۂ تخت کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں کچھ عرصہ ہاتھی کے شکار کے لیے چنار کے جنگلات میں گزارا۔ ابھی اکبر شکار میں مصروف تھا کہ خبر ملی کہ خان زماں نے خیر آباد میں بہادر خاں کی فتح کی خبر سن کر اپنا ارادہ بدل دیا ہے اور شہنشاہ سے کیے گئے وعدے کے برخلاف دریائے گنگا پار کر کے غازی پور اور جونپور کی فتح کے لیے افواج روانہ کر دی ہیں۔

2 فروری 1566ء کو اکبر نے خاموشی سے فیصلہ کیا اور بغیر کسی اطلاع کے گھوڑے پر سوار ہو کر باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہو گیا اور فوج کو پیچھے آنے کا حکم دیا۔ خان زماں نے گورکھپور کی طرف راہِ فرار اختیار کی۔ شاہی افواج نے سختی سے اس کا تعاقب کیا لیکن وہ جنگلوں میں غائب ہو گیا۔

اکبر جب ضلع اعظم گڑھ میں مئو کے مقام پر پہنچا تو اس کو پتہ چلا کہ جونپور پر بہادر خاں کا قبضہ ہو گیا ہے اور اس نے بنارس میں غارت گری کی ہے لہٰذا اکبر واپس ہوا اور اس نے جونپور کو فتح کر لیا۔ زمانیہ کے مقام پر بہادر کو شہنشاہ کی واپسی کا علم ہوا اور وہ حاجی پور لوٹ آیا۔ اکبر نے اپنے اس ارادے کا اعلان کر دیا کہ جب تک وہ ازبک بغاوت کو پوری طرح کچل نہ دے گا جونپور ہی میں رہے گا۔

اکبر کے اس ارادے سے علی قلی خاں کی ہمت پست ہو گئی اور اس نے ایک بار پھر رحم کی درخواست کی۔ اس دفعہ پھر منعم خاں بیچ میں پڑا اور شہنشاہ کو اس پر راضی کر لیا کہ وہ ایک دفعہ پھر اس کو معاف کر دے۔ شہنشاہ کو اب اس امر کا پورا احساس ہو چکا تھا کہ منعم خاں اور دوسرے شاہی افسر باغیوں کے لیے اپنے دل میں ہمدردی کا پوشیدہ جذبہ رکھتے ہیں اور دشمن عناصر کو کچلنے کے لیے اس کے پاس کافی طاقت نہیں ہے۔ چنانچہ شہنشاہ نے ان حالات میں یہی بہتر جانا کہ باغیوں کو معاف کر دے۔ 2 مارچ 1566ء کو وہ آگرے کے قریب کرالی

کی طرف روانہ ہوا تاکہ نگرچین نامی مضافاتی محل میں جا کر جو کہ بہت ہی سلیقے اور خوش ذوقی سے تعمیر کیا گیا تھا قیام کرے۔

اکبر کا بھائی مرزا حکیم جس کو بدخشاں کے حاکم سلیمان مرزا نے حملہ کر کے کابل سے نکال دیا تھا اکبر سے مدد حاصل کرنے ہندوستان آیا۔ اکبر نے بخوشی پنجاب کے افسروں کو حکم دیا کہ وہ اس مصیبت کے وقت حتی المقدور مرزا کی مدد کریں۔ اسی عرصے میں مرزا نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اس نے اپنے ماموں فریدوں کے بہلانے پھسلانے پر ازبک بغاوت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پنجاب پر حملہ کر دیا۔ چونکہ حملہ ناگہانی تھا اس لیے شدید مزاحمت نہ ہو سکی مرزا راستے میں بھیرا کو لوٹتا ہوا لاہور کا محاصرہ کرنے پہنچ گیا۔

یہ خبر پا کر اکبر غصے سے بے تاب ہو گیا اور اس نے 17 نومبر 1566ء کو آگرہ سے اپنے بھائی کی بغاوت کو کچلنے کے لیے کوچ کر دیا۔ ابھی اکبر مشکل سے دریائے ستلج کے قریب پہنچا تھا کہ اس کو خبر ملی کہ مرزا لاہور کا محاصرہ توڑ کر کابل واپس چلا گیا۔ مرزا ایک ساتھ سلیمان اور اکبر دونوں سے لڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کی ساری امیدیں اس فرضی خیال پر لگی ہوئی تھیں کہ اس کو امراء کی حمایت حاصل ہو گی کیوں کہ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ امراء غیر مطمئن ہیں۔ لیکن لاہور میں جس مخالفت کا اس کو سامنا کرنا پڑا اور جس سرعت سے اکبر اس کے مقابلے پر روانہ ہوا اس سے مرزا حکیم گھبرا گیا اور وہ بسرعت واپس ہوا۔ اس کے باوجود اکبر لاہور کی طرف بڑھتا گیا اور اس نے ایک فوج مرزا کو تلاش کرنے اور گرفتار کرنے کے لیے روانہ کر دی۔ مغل فوج دریائے سندھ کے کنارے پر رک گئی کیونکہ اکبر کابل کے خلاف جنگ کرنا نہ چاہتا تھا۔

مرزا حکیم کی فوری واپسی اکبر کے لیے خوش قسمتی کا باعث ثابت ہوئی۔ اگر وہ ہندوستان میں کچھ عرصے اور رہ جاتا تو حالات اس کے لیے اور بھی سازگار ہو جاتے اس کی وجہ یہ تھی کہ اب جب کہ اکبر پنجاب کی طرف متوجہ تھا تو یوپی میں سنبھل سے لے کر جونپور تک بغاوتیں بھڑک اٹھیں۔

ایک طرف تو سنبھل کے مرزا کھلی بغاوت پر آمادہ تھے دوسری طرف ازبکوں نے ایک بار پھر ہتھیار اٹھا لیے اور گرا کٹنگا کا فاتح آصف خاں بھی ان کے ساتھ مل گیا۔ ازبک پہلے ہی مرزا حکیم کے نام کا خطبہ پڑھ چکے تھے۔ اب اکبر دونوں طرف سے گھرا ہوا

آگ میں گھرا ہوا تھا اور حالات خطرناک ہو چکے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہیمو کے زمانے کے بعد سے اکبر نے اس قدر مشکل حالات کا کبھی سامنا نہیں کیا تھا۔ لیکن اکبر کی قسمت کا ستارہ بلند تھا۔ باغیوں کے پاس کوئی ٹھوس منصوبہ نہ تھا لہٰذا وہ اپنے عمل میں متحد نہ ہو سکے۔

محمد سلطان مرزا باپ کی طرف سے براہ راست تیمور کے لڑکے عمر شیخ کی نسل سے تھا اور اس کی ماں سلطان حسین بایقرا کی لڑکی تھی۔ وہ الغ بیگ مرزا اور شاہ مرزا کے ماتحت رہ چکا تھا۔ انھوں نے اپنی باغیانہ سرگرمیوں کے سبب ہمایوں کو کچھ پریشان بھی کیا تھا لیکن ہمایوں نے ان کو معاف کر دیا۔

الغ مرزا کو ہزارا کے افغانوں نے قتل کر دیا۔ اس نے دو لڑکے سکندر مرزا اور محمد سلطان مرزا چھوڑے۔ ہمایوں نے ان دونوں لڑکوں کو الغ مرزا اور شاہ مرزا کے القاب سے نوازا۔ جب اکبر تخت نشین ہوا تو اس نے محمد سلطان مرزا کو جو اب بوڑھا ہو چکا تھا سنبھل میں اعظم پور کی جاگیر عنایت کی۔ اس ضعیف العمر سردار نے ایک اور شادی کر لی اور اس سے کئی بچے ابراہیم حسین مرزا، محمد حسین مرزا، مسعود حسین اور عقیل حسین پیدا ہوئے۔ شہنشاہ نے ان میں سے ہر ایک کو جاگیریں بخشیں۔ لیکن شاہی خاندان کے شہزادے ہونے کے سبب ان کے اخراجات ان چھوٹی چھوٹی جاگیروں سے پورے نہ ہوتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ تلوار کی مدد سے اپنی قسمت کو بدل ڈالیں۔

مرزا حکیم کے حملے، یوپی میں بدامنی اور اکبر کی پائے تخت سے غیر حاضری نے ان شہزادوں کو یہ موقع فراہم کیا کہ شہنشاہ کے خلاف ہتھیار اٹھا لیں۔ الغ مرزا، شاہ مرزا، ابراہیم حسین اور محمد حسین نے سلطنت کے بعض علاقوں پر ہاتھ ڈالا لیکن جاگیرداروں نے ان کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔

اب یہ لوگ خان زماں کے پاس گئے لیکن اس نے ان کے ساتھ اتنی زیادہ بے توجہی برتی کہ وہ لوگ اس کو خیرباد کہہ کر راستے میں لوٹ مار کرتے ہوئے آگے بڑھے اور نیکھار کے جاگیردار کو شکست دے کر دہلی کی طرف قدم بڑھایا۔ چونکہ دہلی ایک زبردست قلعہ بند اور مستحکم شہر تھا اس لیے انھوں نے مالوہ پر چڑھائی کر دی۔ مالوہ کا صوبے دار اس وقت وہاں سے غیر حاضر تھا اور شہنشاہ کے پاس پنجاب گیا ہوا تھا۔ ان باغیوں نے جنگ کرنے کے بعد مالوہ پر قبضہ کر لیا۔

ازبک کھلے بندوں بغاوت پر آمادہ تھے۔ انھوں نے مرزا حکیم کے نام کا خطبہ پڑھا تھا اور وسیع پیمانے پر منصوبہ بنا چکے تھے۔ انھوں نے مرزاؤں کی لامحدود طاقت اور آصف خاں کی لیاقت اور وسائل سے جس کو اکبر نے گڑھا کٹنگا کی صوبے داری سے علیحدہ کر دیا تھا اور وہ ازبکوں کے ساتھ مل گیا تھا اپنے حق میں فائدہ نہ اٹھا کر غلطی کی۔ مرزا مالوہ کی طرف چلے گئے اور آصف خاں بھاگ کر شہنشاہ سے آملا۔ شہنشاہ نے کشادہ پیشانی کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

باغی ازبک برادران اب اپنے ہی بل بوتے پر کھڑے تھے۔ لکھنؤ میں سب ازبک سرداروں نے مل کر ایک جلسے میں جنگ کا ٹھوس منصوبہ تیار کیا۔ ان کے اقدامات بڑی حد تک کامیاب رہے کیوں کہ جونپور سے قنوج اور اودھ سے کڑا تک کا سارا علاقہ ان کے رحم و کرم پر تھا۔ خان زماں نے خود قنوج کے صوبے دار کا محاصرہ کر لیا۔

اکبر کو اس خبر سے بہت زیادہ پریشانی نہ ہوئی۔ مرزا حکیم کے چلے جانے سے اکبر کی پریشانی کم ہو گئی تھی۔ اب وہ داخلی خطرات سے نبٹنے کے لیے اپنی پوری توجہ مبذول کر سکتا تھا مارچ 1567ء میں اکبر لاہور سے چل کر آگرے آیا اور یہاں اس کو ازبکوں کی بغاوت کی تفصیلات کا علم ہوا۔ وہ 6 مئی کو باغیوں کو کچل دینے کا مصمم ارادہ کر کے آگرے سے روانہ ہو گیا۔ اس مرتبہ اس نے منعم خاں کو آگرے میں ہی چھوڑ دیا کیوں کہ اس کے دل میں ازبک برادران کے لیے ہمدردی کا جو جذبہ تھا اس کی وجہ سے اکبر کے پچھلے معرکوں میں کمزوری پیدا ہو گئی تھی۔

جب خان زماں نے شہنشاہ کی آمد کی خبر سنی تو اس نے قنوج کا محاصرہ اٹھا لیا اور اپنے بھائی بہادر خاں سے جو کہ آصف خاں و مجنوں خاں کا مانک پور میں محاصرہ کیے ہوئے تھا جا ملا۔ شہنشاہ 20 جون کو چھ ہزار سواروں کا ایک دستہ محمد قلی اور راجہ ٹوڈر مل کی سرکردگی میں اسکندر خاں کے مقابلے میں اودھ بھیج کر خود خان زماں کی تلاش میں روانہ ہوا۔ اسے راستے بریلی پہنچ کر آصف خاں کے ایک خط سے پتہ چلا کہ ازبک برادران محاصرہ اٹھا کر چلے گئے تھے اور چاہتے تھے کہ مالوہ جاتے ہوئے گوالیار پر قبضہ کر لیں۔ شہنشاہ نے باگیں موڑ دیں اور ساری رات اور آدھے دن چل کر مانک پور پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس کو پتہ چلا کہ ازبک برادران گنگا پار کر چکے تھے۔ شہنشاہ چند سو گھڑ سواروں اور ہاتھیوں کو ساتھ لے کر

فوراً تیزی کے ساتھ دشمن کے تعاقب میں روانہ ہوگیا۔ اس وقت دریائے گنگا میں سیلاب آیا ہوا تھا لیکن شہنشاہ نے اپنا ہاتھی دریا میں ڈال دیا اور دریا پار کر لیا۔ ازبکوں کو اس بات کی قطعاً خبر نہ تھی کہ شہنشاہ ان کے پڑاؤ کے اس قدر قریب آچکا ہے۔ چنانچہ وہ لوگ رات بھر عیاشی اور مستی میں گزارا کیے۔ دن نکلنے سے پہلے شہنشاہ کی فوجیں پوری طرح لڑائی کے لیے صف آرا ہو چکی تھیں اور طبل جنگ بجا دیا گیا تھا۔ اب ازبک برادران کو پتہ چلا کہ وہ کس کے مقابلے میں کھڑے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ خود کو بدترین انجام کے لیے آمادہ کر کے سخت ترین جنگ پر کمربستہ ہو گئے۔ 9 جون 1567ء کو فتح پور پرسوکی کے مقام پر (جو کہ کڑا سے جنوب مشرق میں سات میل کے فاصلے پر واقع ہے) زبردست جنگ ہوئی۔ جنگ کی گرما گرمی میں بہادر خاں اتفاقاً گھوڑے سے گر گیا اور گرفتار کر لیا گیا۔ خان زماں کے دو کاری زخم آئے اور وہ گھوڑے سے گر گیا۔ بدقسمتی سے اس کو کوئی پہچان نہ پایا اور وہ نین سکھ نامی ہاتھی کے پاؤں تلے جس کا فیلبان سومناتھ تھا کچل گیا۔ بہادر خاں کو شہنشاہ کے حضور پیش کیا گیا لیکن بہادر نے کسی قسم کی ندامت کا اظہار نہ کیا اور گستاخانہ لہجے میں بات کی چنانچہ اسے قتل کرنے کا حکم دے دیا گیا۔

جو دستہ کو ٹوڈرمل کی قیادت میں اودھ بھیجا گیا تھا وہ اسکندر خاں کو برابر دباتا رہا۔ خان زماں اور بہادر خاں کی موت کی خبر نے باغیوں کے حوصلے پست کر دیے اور شاہی افواج کی ہمت بڑھ گئی۔ آخرکار اسکندر رات کی تاریکی میں فرار ہو گیا۔ اس کا تعاقب کیا گیا لیکن وہ گورکھپور ہوتا ہوا بہار کی جانب نکل گیا۔ چونکہ شاہی افواج کو سرحد پار کرنے کا حکم نہیں ملا تھا لہٰذا وہ واپس آگئیں۔ جب اسکندر خاں کو بنگال میں اپنی جان کا خطرہ نظر آیا تو وہ منعم خاں کے پاس پہنچا جس کی درخواست پر شہنشاہ نے اسکندر کو معاف کر دیا اور لکھنؤ کی جاگیر عطا کی (1571ء) اگلے سال اسکندر کا انتقال ہوگیا۔

شہنشاہ الٰہ آباد سے بنارس کے راستے جونپور چلا گیا: خان زماں کی جاگیریں منعم خاں کو عطا کیں اور اس کو پلٹے تخت سے بلا کر ان پر قبضہ کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ اب مشرقی اضلاع میں امن قائم ہو گیا تھا چنانچہ اکبر 18 جولائی کو پائے تخت کی طرف واپس ہو گیا۔

ازبکوں کی بغاوت کے خاتمے کے ساتھ ساتھ شہنشاہ اور امراء کے درمیان کش مکش کا طویل دور ختم ہو گیا۔ یہ سلسلہ 1560ء میں بیرم خاں کی برطرفی کے بعد شروع ہوا تھا۔

پورے سات سال تک جاری رہا۔ شہنشاہ نے اس کش مکش کے دور میں اپنی عزت، وقار اور اقتدار کی حفاظت کی۔ اس نے اپنے ماہرانہ سیاسی تدبر، صبر، حوصلے اور بے انتہا قوت اور عزم راسخ سے کام لے کر دشمنوں پر قابو پا لیا۔

اس کش مکش کے آخری دو سال (1566-67) سخت پریشانی اور آزمائش میں گزرے اور یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ پانی پت کے بعد سے شہنشاہ نے اتنی مصیبت کے دن کبھی نہ گزارے تھے۔ اگر اکبر ان مصائب کے سامنے جھک جاتا تو ہندوستان کی تاریخ پوری طرح بدل گئی ہوتی لیکن قدرت کو یہی منظور تھا کہ وہ مغل سلطنت کو پائدار بنانے کے لیے طویل عرصے تک زندہ رہے۔

باب 10

اکبر کی فتوحات - میواڑ و مالوہ

اندرونی خطرات سے فارغ ہو کر اکبر ایک ایسی وسیع سلطنت کا بلا شرکت غیرے مالک بن چکا تھا جس کی وسعت دریائے سندھ سے جونپور تک پھیلی ہوئی تھی اور جس کی حدود میں بندیل کھنڈ، گونڈوانہ اور مشرقی راجپوتانہ کے وسیع علاقے داخل ہو چکے تھے۔ اور اب شہنشاہ سلطنت کی منظم و بتدریج توسیع کی طرف توجہ دے سکتا تھا۔ راجپوتانہ میں اس کی پیش قدمی کو جو کہ اب تک ازبک بغاوت و دیگر اندرونی خطرات کے سبب رک گئی تھی اب کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔

کچھواہہ خاندان تو پہلے ہی سر تسلیم خم کر چکا تھا۔ جودھ پور و بیکانیر کا رویہ بھی خاصا عاجزانہ تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کو کسی وقت بھی زیر کیا جا سکتا تھا لیکن اکبر کو اس کا علم تھا کہ جب تک میواڑ کا حکراں شاہی اقتدار کے خلاف برسرپیکار رہے گا۔ راجپوتانہ اس کے تبضۂ قدرت میں نہ آ سکے گا۔

راجپوتانہ کے قلب میں واقع ہونے کے سبب ریاست میواڑ سارے راجپوت راجاؤں کے لیے دوامی آزادی اور حوصلہ مندیوں کا سرچشمہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ میواڑ اپنی درخشاں روایات، قدیم تواریخ، شاندار کامیابیوں اور اعلیٰ سماجی معیار کے سبب راجپوتانہ کی سب سے اہم اور برتر ریاست سمجھی جاتی تھی۔ ایسے وہ لوگ زندہ تھے جنھوں نے

رانا سنگرام سنگھ کے پرچم کے نیچے جمع ہو کر جنگ آزادی میں شرکت کی تھی۔ یہ وہی رانا تھا جو راجپوتانہ کے فرمانرواؤں کا رہنما تھا جس کے سامنے آگرہ کے تخت کی بنیادیں ہل جاتی تھیں۔ باوجودیکہ میواڑ مصیبت کے دور سے گزر رہا تھا لیکن کون کہہ سکتا تھا کہ یہ پریشانیاں دائمی ہیں۔ اس کا امکان تھا کہ مصیبت کے بادل چھٹ جائیں... اور امید کی کرنیں پھوٹ پڑیں۔ کیا میواڑ نے علاء الدین، بہادر شاہ اور شیر شاہ کے حملوں کے بعد اپنے آپ کو سنبھالا نہیں لیا تھا؟

میواڑ کے حکمرانوں کا رویہ مغلوں کے ساتھ کم از کم دوستانہ نہ تھا۔ بابر کے زبردست مخالف رانا سانگا کی موت ہو چکی تھی لیکن اس کے ورثا میں سے کسی نے بھی بابر یا اس کے جانشینوں میں سے کسی کے آگے سر نہ جھکایا تھا۔

یہ میواڑ ہی تھا جس نے ابراہیم لودی کے لڑکے محمود لودی کو اس وقت تک پناہ دی جب تک اس نے وہاں رہنا چاہا۔ شاید ان ہی وجوہ کی بنا پر ہمایوں نے چتوڑ کو بہادر شاہ کے ہاتھوں بے آبرو ہونے، لٹنے اور مسمار ہونے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ ہمایوں نے اپنی مصیبت کے دنوں میں بھی میواڑ جانے کا تصور تک نہ کیا حالانکہ وہاں کی جنگلی پہاڑیوں میں مارواڑ کی جلتی ریت کی بہ نسبت اس کو زیادہ آرام نصیب ہو سکتا تھا۔

اکبر نے مشرقی مہم سے واپسی کے کچھ عرصے کے بعد ہی راجپوتانہ پر معرکہ آرائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ بھاتھا اور گڑھا کٹنگا کے فاتح آصف خاں کو بیانہ کا صوبیدار مقرر کر دیا گیا اور یہ ہدایت کی گئی کہ فوج کے لیے رسد اور ساز و سامان مہیا کرے۔

30 اگست 1567ء کو اکبر شکار کے بہانے آگرہ سے چتوڑ پر قبضہ کرنے اور مالوہ سے مرزاؤں کے نکالنے کے ارادے سے روانہ ہوا۔ دھولپور پہنچتے پہنچتے سکت سنگھ اپنی مرضی سے ریاست چھوڑ کر اکبر کی ملازمت میں شامل ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ سکت سنگھ اودے سنگھ کا لڑکا تھا۔ شہنشاہ کے ارادے کی اس کو خبر نہ ہو سکی۔ اس کو اس بات کی خبر اس وقت ہوئی جب اس سے دریافت کیا گیا کہ اگر چتوڑ پر حملہ کیا جائے تو وہ کیا خدمات انجام دے سکتا ہے۔ سکت سنگھ اتنا پست اور کمینہ نہ تھا کہ میواڑ پر ناگہانی حملے سے اطمینانِ قلب کے ساتھ چشم پوشی کر کے ہمیشہ کے لیے اپنے دامن کو داغدار کر لیتا اور اپنے اوپر یہ الزام لا تا کہ اس نے مغلوں کو اپنے باپ کے خلاف لا کھڑا کیا چنانچہ وہ مغل

کیمپ سے بھاگ کھڑا ہوا۔

سکت سنگھ کے فرار نے اکبر کے ارادے کو اور زیادہ مستحکم کر دیا اور وہ اس خوف سے کہ کہیں رانا کو دفاعی انتظامات مکمل کرنے کا موقع نہ مل جائے تیزی سے آگے بڑھا۔ راجپوتوں نے سیوی سوپور اور کوٹہ کے قلعوں کو خالی کر دیا اور مغلوں نے آسانی سے ان پر قبضہ کر لیا۔ چتوڑ سے سومیل مغرب میں بمقام گاگروں اکبر نے اپنی فوج کو کئی حصوں میں منقسم کر دیا۔ ایک مضبوط دستے کو شہاب الدین احمد خاں کی سرکردگی میں مرزاؤں کو نکالنے کے لیے مالوہ بھیجا گیا آصف خاں کو منگل گڑھ کے قلعہ پر حملے کے لیے روانہ کیا جو کہ چتوڑ کے شمال میں واقع ہے۔ خود اکبر بقیہ فوج لے کر چتوڑ کی طرف چل دیا۔ رانا اودے سنگھ نے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا سب نے متفقہ طور پر یہ رائے دی کہ وہ عورتوں اور شہزادوں کو اپنے ہمراہ لے اور قلعہ کو سردار جے مل کی سرکردگی میں پانچ ہزار راجپوتوں پر چھوڑ کر خود راج پیپلی چلا جائے جو کہ میواڑ کی جنوبی پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے۔ شاید اس کو اس بات کا خیال نہ آیا کہ وہ اپنی پناہ گاہ سے مغلوں کی فوج کا قافیہ تنگ کر سکتا ہے اور اس طرح باہر رہ کر محصور شدہ افراد کی مدد بھی کر سکتا ہے۔

دریائے بانس کے بل کھاتے ہوئے مشرقی کنارے پر چتوڑ کی پہاڑی ہے جو کہ سطح مرتفع سے اوپر اٹھتی چلی جاتی ہے۔ اس کی اونچائی تقریباً پانچ سو فٹ ہے اور درمیان میں اس کی چوڑائی سوا تین میل کے قریب ہے۔ اس پہاڑی کی چوٹی پر چتوڑ کا مشہور تاریخی قلعہ واقع ہے جس کی فصیل دوہری ہے۔ اس قلعہ میں کافی مقدار میں شیریں پانی اور سرسبز میدان و باغات ہیں۔ اس کی اصلی راہ ایک نشیبی پیچدار راستے سے ہو کر گزرتی ہے جو کہ پہاڑی کو کاٹ کر نکالی گئی ہے اور اس کے سات دروازے ہیں۔

اکبر نے رانا اودے سنگھ کو پہاڑیوں میں بند کر دینے اور ملک کو تاراج کرنے کے لیے ایک دستہ حسین قلی خاں کی سرکردگی میں روانہ کیا۔ اکتوبر کے آخری ہفتہ میں اکبر نے چتوڑ کی ناکہ بندی شروع کر دی۔ جب غیر منظم حملوں کا کوئی اثر نہ ہوا تو باقاعدہ اور منظم طریقے سے محاصرہ کر لیا گیا اور تین جگہوں کو حملے کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ خود شہنشاہ نے لکھالا باڑی کے سامنے پڑاؤ ڈالا جس کے شمالی دروازے کی حفاظت اندر کی طرف سے جے مل راٹھور کر رہا تھا یہاں پر دیوار کو مسمار کرنے کی غرض سے زبردست بمباری کی گئی۔ جب محاصرے کو اور زیادہ

تنگ کر دیا گیا تو محصور افواج کو پریشانی لاحق ہوئی اور انھوں نے سندا اور صاحب خاں نامی دو قاصدوں کو اس تجویز کے ساتھ روانہ کیا کہ وہ ہتھیار ڈالنے اور سالانہ خراج ادا کرنے کو تیار ہیں۔

شہنشاہ کے بہت سے مشیروں نے یہ مشورہ دیا کہ تجویز مان لی جائے لیکن اکبر نے کسی بھی تجویز کو اس وقت تک ماننے سے انکار کر دیا جب تک کہ رانا خود حاضر نہ ہو رانا تو قلعہ میں موجود نہ تھا اور ظاہر ہے محصور فوجیں اس کو کہاں سے لاتیں۔ ادھر شہنشاہ نے یہ خیال کیا کہ حکمران کے بجائے اس کے ملازمین کے ساتھ عارضی سمجھوتہ کر لینا اور ایسی تجویز کو مان لینا جس میں قلعہ سپرد کرنے کا کوئی ذکر نہ تھا بے سود ہوگا۔ اکبر اس معاملے میں بہت ہی سنجیدہ تھا کیوں کہ اس کو اس بات کا احساس تھا کہ اگر وہ اس قلعے کو فتح کرنے میں ناکام رہا جسے بہادر شاہ اور شیر شاہ زیر کر چکے تھے تو اس کے وقار کو ٹھیس لگے گی' اور بہت ممکن ہے کہ راجپوتانہ اور گجرات میں اکبر کی فتوحات کو اس اقدام سے نقصان پہنچے۔ اکبر نے قلعہ کو ہر قیمت پر فتح کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ قلعہ کا بچاؤ کرنے والوں کو بھی اب اپنی حالت نازک ہوتی نظر آرہی تھی چنانچہ انھوں نے اپنی پوری طاقت سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کے بعد موت وزیست کی کش مکش شروع ہوگئی۔ محصور افواج کے پاس ماہر افغان توڑے دار بندوقچیوں اور کچھ توپچیوں کا ایک دستہ تھا جنھوں نے محاصرین پر خوف ناک گولہ باری شروع کر دی۔ مغلوں نے جو کاریگر خندق کھودنے اور ثبات بنانے کے لیے مقرر کیے تھے وہ ہر طرح دو سو یومیہ کی رفتار سے مارے جا رہے تھے لیکن ان کو بڑی بڑی رقمیں انعام و مزدوری میں دے کر اس کام کو جاری رکھا گیا۔ ثبات ایک پیچ در پیچ راستہ ہوتا ہے جس کے دونوں طرف مٹی کی دیوار کھڑی کر دی جاتی ہے اور اس پر گولہ باری کا اثر نہیں ہوتا۔ ان کے ساتھ سرنگ کھودنے والے بھی اس کام میں مصروف تھے کہ سرنگ کو قلعہ کی دیوار تک پہنچا دیں۔ آخر کار دو سرنگیں جو بارود کے ایک ہی سلسلے سے جڑی ہوئی تھیں۔ 120 اور 180 من بارود بھر کر اڑائی گئیں 17 دسمبر کو ان میں آگ لگائی گئی اور فوجوں کو حکم دے دیا گیا کہ دھماکہ ہوتے ہی اک دم حملہ کر دیں۔ ایک سرنگ کے دھماکے سے ایک برج گر گیا اور چالیس آدمی مارے

گئے۔ مغل سپاہی جوش میں بھاگتے چلے گئے، لیکن دوسری سرنگ کے پھٹنے سے وہ سب بھسم ہو گئے۔ اس دھماکے سے مرنے والوں میں تقریباً سو ممتاز فوجی افسران بھی شامل تھے۔

جب سرنگوں کا بوجوہ عمل ناکام رہا تو اکبر نے اپنی توجہ ثبات کی تعمیر کی طرف مبذول کر دی۔ یہ کام ٹوڈرمل اور قاسم خاں کی اہم زیر سرپرستی میں انجام پا رہا تھا۔ ثبات جو کر شاہی توپ خانہ کے پاس سے شروع ہوتی تھی اس قدر چوڑی تھی کہ دس گھڑ سوار اس میں آسانی سے گزر سکتے تھے اور اس کی بلندی اس قدر تھی کہ ہاتھی پر سوار نیزہ بردار سپاہی اس کے نیچے سے نکل سکتا تھا۔

ایک روز جب کہ اکبر شاہی دروازے کے سامنے ایک دیوار کی آڑ میں کھڑا تھا تو اس کی توجہ قلعہ کے ایک بندوقچی کی طرف مبذول ہوئی جس کا نشانہ بے خطا تھا اس نے بندوق اٹھائی اور اس نقطہ کی طرف بندوق چلائی جہاں سے گولیاں آ رہی تھیں اس کا نشانہ ایسا ٹھیک بیٹھا کہ بندوقچی ہلاک ہو گیا۔ یہ شخص بندوقچیوں کا سردار اسمٰعیل خاں تھا۔ آخر ثبات کی تعمیر کا کام مکمل ہو گیا۔

دو دن دو رات تک جنگ مسلسل جاری رہی۔ دیواروں میں کئی جگہ شگاف پڑ گئے۔ ان میں ایک شگاف اتنا بڑا تھا کہ مغل سپاہی اس میں داخل ہونا چاہتے تھے مگر راجپوتوں نے اس شگاف کی بڑی جانبازی سے محافظت کی اور اس میں روئی، لکڑی، مسل اور تیل بھر دیا تاکہ اگر مغل اس طرف سے داخل ہوں تو اس میں آگ لگائی جا سکے۔ اس معرکے کی قیادت جے مل نولادی سینہ بند پہنے ہوئے کر رہا تھا۔ اکبر نے جو کہ جے مل کو ثبات کی چھت پر کھڑا دیکھ رہا تھا اپنی مشہور بندوق سنگرام سے نشانہ بنایا اور یہ نشانہ اس قدر صحیح بیٹھا کہ جے مل سخت مجروح ہو گیا۔ اسمٰعیل خاں کی موت اور جے مل کے زخمی ہو جانے سے قلعہ کی فوج کے حوصلے پست ہو گئے، جو پہلے ہی محاصرہ کی تنگی اور رسد کی کمی کے سبب پریشان تھی۔

جب راجپوتوں نے کوئی چارۂ کار نہ دیکھا تو انھوں نے جوہر کی رسم ادا کی اور آٹھ ہزار افراد اپنی جانوں کی قربانی کے لیے آمادہ ہو گئے، قلعہ کے دروازے کھول دیے گئے۔ دست بدست گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی اور طرفین بہادری کے جوہر دکھانے لگے۔ سب

سے زیادہ بہادرانہ حملہ پتّا کی ماں اور بیوی کر رہی تھیں۔ یہ دونوں پہاڑوں سے اتر کر جنگ میں شریک ہوئیں اور لڑتے ہوئے ماری گئیں۔ اکبر بھی ان عورتوں کی بہادری کا کارنامہ دیکھ کر سخت متعجب ہوا اور اس معرکے کو زندگی بھر فراموش نہ کر سکا۔ تین سو جنگی ہاتھی راجپوتوں پر چھوڑ دیے گئے جنھوں نے زبردست کشت و خون کیا۔ آٹھ ہزار سپاہیوں کے علاوہ تیس ہزار کسان بھی اپنے گھر بار کی محافظت کرتے ہوئے مارے گئے۔ یہ واقعہ 23 فروری 1568ء کا ہے۔

مغلوں کو جو زبردست جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا اس کی وجہ سے وہ اور خود اکبر اس قدر غضب ناک ہو گئے تھے کہ انھوں نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ اس قسم کا بے رحمانہ سلوک اکبر کی زندگی کا پہلا اور آخری واقعہ ہے اور اس کے اخلاق پر ایک بدنما دھبہ کہا جا سکتا ہے ویسے بالطبع کردار کے اعتبار سے وہ وسیع الاخلاق تھا۔ اس ظالمانہ رویے نے میواڑ والوں کی ہمت کو پست کرنے کے بجائے اُن کے رویے کو تیموریوں کی طرف سے اور بھی سخت بنا دیا۔ اگر اکبر کی عقل پر اس وقت الرحا و صند غیظ و غضب کا پردہ نہ پڑ جاتا تو کتنا اچھا ہوتا! چتوڑ کو خاک میں ملا دیا گیا لیکن اس عظیم حادثے کے سبب میواڑ والوں کا سر آج تک بلند ہے۔

اکبر نے بڑی خونریزی کے بعد فتح حاصل کی۔ چتوڑ کو سرکار بنا کر آصف خان کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ اکبر نے معین الدین چشتی کی درگاہ تک پیدل جانے کی منت مانی تھی درگاہ کی زیارت کے بعد اکبر آگرہ روانہ ہو گیا۔

اکبر نے اس عظیم فتح کی یادگار قائم کرنے کے لیے حکم دیا کہ قلعۂ آگرہ کے صدر دروازے کے باہر پتھر کے دو ہاتھی نصب کیے جائیں جن پر پتّا اور جے مل بیٹھے ہوئے ہوں۔ اس طرح ان بہادر راجپوتوں کے لیے بالواسطہ طور پر خراجِ تحسین ادا کیا گیا۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو اس کو اپنی اہانت محسوس کرتے اور ناگواری کا اظہار کرتے۔

جب چتوڑ پر قبضہ ہو گیا تو پھر رنتھنبور کو جو چتوڑ ہی کی طرح مشہور و معروف تھا فتح کر لینا چنداں مشکل کام نہ رہا۔ 10 فروری 1569ء کو محاصرہ کیا گیا۔ ایک ماہ کی مزاحمت کے بعد سرجن ہڈا نے 22 مارچ کو شکست تسلیم کر لی۔

مالوہ کو جو مہم بھیجی گئی وہ کامیاب رہی۔ مرزاؤں نے اندازہ کر لیا کہ وہ شاہی افواج کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا وہ تیزی سے بھاگ کر گجرات میں چنگیز خاں کے پاس پہنچ گئے۔ چنگیز خاں نے ان سے مہربانی کا سلوک کیا اور ان کی مدد سے اعتماد خاں کو شکست دے کر احمد آباد پر قابض ہو گیا۔

چنگیز خاں نے مرزاؤں کو ان کی قابل قدر قربانیوں کے عوض بھروچ میں جاگیریں عطا کیں لیکن حرص و طمع کے سبب چنگیز خاں سے اَن بَن ہو گئی اور اس نے ان کو شکست دے کر گجرات چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

وہ لوگ ایک بار پھر مالوہ کی طرف لوٹے اور مانڈو فتح کرنے کی ناکام کوشش کے بعد گجرات فرار ہو گئے۔ اس وقت چنگیز مر چکا تھا۔ اس کی ریاست میں خانہ جنگی شروع ہو گئی تھی۔ مرزاؤں نے تیزی سے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور چمپانیر، سورت بڑودہ اور بھروچ پر اپنا قبضہ جما لیا۔

امید کے مطابق چتوڑ کی فتح نے حکمرانوں اور رعایا سب پر اچھا اثر ڈالا۔ سلیمان کرانی گورنر بنگال نے اکبر کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا۔ اس کے نام کا خطبہ پڑھا اور سکّوں پر بھی اس کا نام کندہ کرایا۔

کالنجر کے راجا رام چندر نے جلدی سے 1569ء میں مجنوں خاں کو قلعہ حوالے کر دیا مارواڑ کے راجا چندر سین اور بیکانیر کے رائے کلیان مل نے 1570ء میں خود حاضر ہو کر اطاعت قبول کی۔ یہاں تک کہ مالوہ کے سابق حکمراں باز بہادر نے بھی دکن، گجرات اور میواڑ میں بھٹکنے کے بعد یہی فیصلہ کیا کہ اطاعت قبول کر لے۔

اکبر کا ستارہ عروج پر تھا اور قسمت ہر طرف سے اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اکبر سلطنت کے کاروبار کی طرح اپنی گھریلو زندگی میں بھی خوش نصیب واقع ہوا تھا سیکری میں اس کا پہلا فرزند 30 اگست 1569ء کو مریم الزمانی کے بطن سے پیدا ہوا مریم الزمانی خاندان کچھواہا کی شہزادی تھی۔ اسی سال 21 نومبر کو ایک دختر تولد ہوئی اور 7 جون 1570ء کو دوسرا فرزند مراد سلیمہ بیگم کے بطن سے تولد ہوا۔

اکبر جو نہ صرف سلطنت کا بانی تھا بلکہ ممتاز بانیانِ سلطنت کی نسل سے بھی تعلق رکھتا تھا زیادہ عرصے تک خاموش نہ بیٹھ سکا۔ راجپوتانہ تقریباً پوری طرح زیر

ہو چکا تھا۔ البتہ میواڑ کا ملک بدر راجا اب بھی مغلوں کی تلوار کا لوہا ماننے کو تیار نہ تھا اور اراولی پہاڑ کی وادیوں میں گوگوندہ کے مقام پر آزادی کی دیوی کی پوجا کر رہا تھا۔ شہنشاہ نے دفاع کو مضبوط کرنے اور داخلی معاملات کو درست کرنے کے لیے راجپوتانہ اور پنجاب کا دورہ کیا اور پھر اپنی توجہ گجرات کی طرف مبذول کی۔

گجرات و بنگال

بہادر شاہ کی موت کے بعد سے گجرات کے حالات آہستہ آہستہ خراب تر ہوتے جاتے تھے۔ بہادر شاہ کا ایک بھتیجہ تیرہ سال کی عمر میں محمود شاہ سوم کا لقب اختیار کرکے تخت نشین کرا دیا گیا۔ اس نے سترہ سال تک حکومت کی۔ اس کی یہ حکومت برائے نام تھی اور اقتدار دراصل چند امرا کے ہاتھ میں تھا۔

بہادر شاہ سوم عیش و عشرت کی زندگی کا دلدادہ اور کمینوں کی صحبت کا مشتاق تھا۔ باغ آہو خانہ میں جس کے درختوں کے تنے زربفت سے ڈھکے رہتے معشوقان آہو چشم کے ساتھ رنگ رلیوں میں مصروف رہتا۔ اس نے اپنی آزادی کی مختصر مدت مالوہ پر قبضہ کرنے اور ہندو رعایا پر ظلم ڈھانے کے بے ہودہ کاموں میں صرف کی۔

محمود شاہ کی قابلِ نفرت زندگی میں محض ایک ہی قابلِ تعریف پہلو تھا اور وہ یہ کہ اس نے مکہ میں ایک سرائے بنوائی اور مسلم علماء و فضلاء کی سرپرستی کی۔ 1553ء میں اس کے ایک نالائق منظورِ نظر برہان نے اس کو زہر دے دیا۔ امراء نے مشتعل ہو کر برہان کو قتل کر دیا۔

محمود سوم کے امرا میں عبدالکریم ایک طاقت ور سردار تھا۔ 1540ء میں اس کو اعتماد خاں کا خطاب دیا گیا۔ اعتماد نے ایک لڑکے کو جو کہ اپنی قمیص کے دامن میں کبوتروں کا دانہ لیے جا رہا تھا پکڑ لیا اور اس کو بادشاہ کا رشتہ دار ظاہر کرکے احمد شاہ دوم کے لقب سے تخت نشین کر دیا۔ اس کے رونے پیٹنے کے باوجود اس بدنصیب کو سخت نگرانی میں رکھا جاتا حتیٰ کہ اس نے جھلانا اور کڑھنا شروع کر دیا۔ وہ غصے میں کیلے کے درختوں کو اعتماد خاں کہہ کر مارتا۔

احمد شاہ کے برائے نام حکومت کے سات سالہ دور میں گجرات کی ریاست

اعتماد الملک رومی (ترک)، اختیار الملک حبشی (افریقی)، سرداروں، بخارا کے سیدوں، شیخ موسیٰ خاں اور نووارد افغانوں کے درمیان بٹ گئی یہاں تک کہ باہر والے بھی اس ریاست کی طرف حریص نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

خاندیش کے حکمراں مبارک شاہ نے دو مرتبہ گجرات پر حملے کی دھمکی دی اور پرتگالیوں نے دمن اور سوجان پر قبضہ کرلیا۔ 1560ء میں احمد شاہ دوم کو اعتماد خاں کے حکم سے پُراسرار طور پر قتل کر کے خندق میں ڈال دیا گیا۔ اعتماد خاں نے ایک مجہول النسب بارہ سالہ لڑکے نتھو یا حبیب کو فراہم کیا اور اس بات کی قسم کھائی کہ وہ شاہی خاندان کا فرد ہے اور اس کو مظفر شاہ سوم کا لقب دے کر بادشاہ بنادیا۔

اعتماد خاں کی ان ناموزوں حرکات کے سبب سازشوں نے زور پکڑا اور اس ملک میں انقلاب، قتل اور غارت گری شروع ہوگئی۔ ریاست کے مقامی جماعتوں اور مفسد سرداروں کے علاوہ مرزاؤں نے جوکہ مالوہ سے نکال دیے گئے تھے مداخلت کر کے حالات کو بد سے بدتر بنادیا تھا۔ ریاست میں مرکز اقتدار باقی نہ رہا۔ گجرات کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے اور نام نہاد بادشاہ خودغرض امرار کے ہاتھوں میں کھلونے سے زیادہ کی حیثیت نہ رکھتا تھا۔

اکبر راجپوتانہ اور پنجاب کے معاملات سے فارغ ہونے کے کچھ عرصے بعد گجرات کی طرف متوجہ ہوا۔ وہاں کے ناگفتہ بہ حالات اور مرزاؤں کی موجودگی نے جوکہ وہاں پناہ لینے پہنچ گئے تھے اکبر کو اس طرف متوجہ کیا۔ اس کے علاوہ چونکہ ہمایوں نے ایک مرتبہ پہلے بھی گجرات کو فتح کیا تھا لہٰذا اکبر گجرات پر خاندانی حق رکھتا تھا۔ گجرات کی سیاسی اور تجارتی اہمیت شمالی ہند اور دکن دونوں کے لیے اس قدر واضح تھی کہ ایک بانی سلطنت شہنشاہ اس بات کو ہرگز برداشت نہ کرسکتا تھا کہ یہ ریاست ٹکڑوں میں بٹ جائے اور اس پر نالائق جھگڑالو، بے اثر سردار اور بیشتر نووارد حوصلہ مند قابض ہوجائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ گجرات کے بڑے سردار اعتماد خاں نے اکبر کو دعوت دی کہ گجرات آکر بدنظمی کا استیصال کرے اور ریاست کی بدبختی کا خاتمہ کرے۔

20 نومبر کو شہنشاہ احمدآباد پہنچا۔ اکبر اپنے باپ ہمایوں سے بھی زیادہ آسانی کے ساتھ احمدآباد پہنچ گیا لیکن مصیبتوں کا سامنا تو اب ہونا تھا کیوں کہ بعض امراء اور خاص

طور سے مرزا جنوبی گجرات میں مقیم تھے۔ کچھ گجراتی امرا اس بات سے بھی پشیمان ہوئے کہ انھوں نے اکبر کی برتری کیوں تسلیم کرلی۔ مغل سپاہیوں نے یہ افواہ سُن کر کہ اکبر نے گجراتی امرا کی گرفتاری کا حکم دے دیا ہے ان امرا کے خیموں کو لوٹ لیا۔ اس واقعے کے بعد باوجودیکہ مجرمین کو عبرت ناک سزائیں دی گئیں لیکن گجراتیوں کا اعتماد جاتا رہا۔

علاوہ ازیں گجراتیوں کو یہ بات بھی ناگوار ہوئی کہ مغل امرا ان کے ساتھ مغرورانہ رویہ اختیار کرتے تھے۔ اس رویّے سے دل برداشتہ ہوکر اختیار الملک احمد آباد سے بھاگ کر ایدر کی پہاڑیوں میں جا چھپا۔

اکبر احمد آباد سے 12 دسمبر کو کیمبے پہنچا اور جلد ہی مرزاؤں کا قلع قمع کرنے کا کام شروع کردیا۔ اس نے چمپانیر اور سورت پر بیک وقت چڑھائی کرنے کی غرض سے دو مضبوط فوجیں روانہ کیں۔ یہ فوجیں ابھی زیادہ دور نہ گئی تھیں کہ یہ خبر ملی کہ ابراہیم حسین مرزا ایک ہزار سپاہیوں کے ساتھ بھاگا جا رہا ہے اور ممکن ہے شاہی ڈیرے سے آٹھ میل کے فاصلے پر اس کا گزر ہو۔ اسی رات چار بجے شہنشاہ چالیس آدمیوں کو لے کر مرزا کے تعاقب میں نکلا۔ بارہ گھنٹے کی لگاتار تلاش کے بعد پتہ چلا کہ مرزا سرنال میں ہے۔ اکبر صرف دو سو سپاہیوں کو لے کر دریائے ماہی عبور کرکے ڈھالو ساحل پر سیدھا چڑھتا ہوا دشمن پر آگرا۔

کچھ دیر دست بدست لڑائی ہوئی۔ ایک دفعہ تو اکبر بُری طرح پھنس گیا لیکن اس نے اپنے گھوڑے کو ایک خار دار جھاڑی پر سے کُدا کر اپنی جان بچائی۔ بدقسمتی سے اس کی ساری کوششیں ناکام ہوگئیں بدقسمتی سے جانی نقصان کے باوجود مرزا بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ اندھیرے کی وجہ سے تعاقب بھی نہ کیا جاسکا اور اکبر ناامید ہوکر اپنے خیمے پر واپس آگیا۔

شہنشاہ نے ۱۱ جنوری 1573ء کو سورت کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ یہ قلعہ بہت ہی مضبوط تھا کیوں کہ اس کو پرتگالیوں کے حملے کی روک تھام کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس قلعہ کو فوراً فتح نہیں کیا جا سکتا تھا اور کسی ایک جگہ طویل عرصے تک رکنے سے دشمنوں کو شمالی گجرات میں بدامنی پھیلانے کا موقع مل جاتا چنانچہ شہنشاہ نے مالوہ کے افسروں کو حکم دیا کہ وہ احمد آباد کے صوبے دار عزیز کوکا سے جا ملیں۔ ساتھ ہی اس نے بعض

افسروں کو اس بات پر تعینات کیا کہ وہ شمالی راستوں کی حفاظت کریں تاکہ کہیں مرزا ہندوستان پہنچ کر وہاں بدامنی نہ پھیلائیں۔

سورت کے محاصرے نے طول کھینچا۔ قلعہ کی فصیل پر سے توپ کے گولوں کی باڑھ نے موت کا بازار گرم کر دیا تھا۔ اسی دوران خبر آئی کہ مرزاؤں نے شیر خاں فولادی کے ساتھ مل کر پٹن کا سختی سے محاصرہ کر لیا ہے۔ ادھر بنگال کے افغان بھی بے چین ہو رہے تھے اور اس کا امکان تھا کہ وہ مشرقی صوبوں میں ابتری پھیلا دیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمایوں کے دور کی تاریخ پھر سے دہرائی جانے والی ہے۔

اکبر نے امراء کے اس مشورے کے بعد کہ وہ جلد ہی شمال کو لوٹ جائے محاصرے کو بلا توقف تردید جاری رکھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی بھی دلیل کو نہ سنے گا اور قلعہ فتح کر کے ہی رہے گا۔ اسی دوران جنوری کے تیسرے ہفتے میں عزیز کوکا نے مرزاؤں اور افغانوں پر پٹن میں ایک شان دار کامیابی حاصل کی اور یہ افواہ اڑ گئی کہ وہ اب محاصرہ کرنے والی فوجوں کی مدد کو آ رہا ہے۔

آخر کار ایک ماہ سترہ دن کے محاصرے کے بعد سورت کا قلعہ 26 فروری 1573 کو فتح ہو گیا۔ اس قلعہ کے فتح ہو جانے سے وہاں کے والیانِ ملک پر بڑا اثر پڑا۔ بگلانہ کا راجا اور خاندیش کے راجا علی خاں شہنشاہ کے حضور میں حاضر ہوئے اور اظہارِ اطاعت کیا۔ پرتگالیوں نے بھی جو کہ محاصرے کے دوران آ گئے تھے تحفے تحائف پیش کیے اور اکبر کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔

13 اپریل کو اکبر احمد آباد واپس چلا گیا۔ انتظامی امور کے خیال سے گجرات کو ایک صوبہ بنا دیا گیا اور خان اعظم عزیز کوکا کو جو کہ ایک جوان آدمی تھا اس صوبے کا گورنر مقرر کر دیا۔ پٹن۔ ڈلقا' بھروچ اور بڑودہ کے علاقوں کے لیے الگ الگ افسر مقرر کیے گئے یہ انتظام ہمایوں کے منصوبے کی طرح تھا۔ البتہ فرق یہ تھا کہ ہمایوں کے زمانے میں بہادر شاہ آزادی سے گھومتا پھرتا تھا لیکن اکبر نے مظفر شاہ کو قتل کر دیا۔ اس کے علاوہ اکبر نے اپنے باپ کے مقابلے میں مالوہ اور راجپوتانہ پر بہتر طریقے سے قبضہ جما رکھا تھا۔ بہر حال شہنشاہ گجرات کے حالات سے مطمئن نہ تھا کیونکہ مرزاؤں کے علاوہ جو کہ چنگیز خاں کی اولاد تھے کاٹھیاواڑ کے شہزادے اور سروہی و ایدر وغیرہ کے ہندو راجاؤں نے

ابھی تک اس کی برتری اور حاکمیت کو قبول نہ کیا تھا اور اس کے خلاف کارروائی کرنے کو آمادہ تھے لیکن اس نے مزید گجرات میں رہنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شمال میں بے چینی و بدامنی پھیل رہی تھی۔

اکبر نے خان زماں کو واضح کر دیا کہ وہ دشمن کا مقابلہ کرنے کو تیار رہے لیکن ضروری احتیاط برتے بغیر لڑائی کا خطرہ مول نہ لے بلکہ اگر ممکن نہ ہو سکے تو اکبر کو پہلے سے مطلع کر دے۔ اس کے بعد اکبر پایۂ تخت کی طرف روانہ ہو گیا۔ ۵ جون کو وہاں پر اس کا گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ یہاں پر اس کو ابراہیم حسین مرزا کا سر پیش کیا گیا۔ ابراہیم پٹن سے شکست کھا کر سنبھل اور وہاں سے پنجاب کی طرف بھاگ گیا تھا۔ مغل افسروں نے اس کا سخت تعاقب کیا اور اس کو شکست دے کر قتل کر دیا۔

اکبر جونہی گجرات سے باہر نکلا، مغلوں کے سارے دشمن اپنی اپنی پناہ گاہوں سے نکل آئے۔ محمد حسین مرزا نے فوراً ہی سورت کا محاصرہ کیا اور بھروچ و کیمبے پر قبضہ کر لیا۔ خان اعظم نے چونکہ ایدر میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ سورت کو مدد بھیجی لیکن اس طرح اس کی اپنی فوج کمزور ہو گئی۔ جونہی اختیار الملک نے یہ بات سنی کثیر تعداد میں فوج لے کر اس سے لڑنے کو نکل آیا۔

اکبر کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے عزیز کوکا نے خود کو ایک مستحکم مقام پر محصور کر لیا اور کھلے میدان میں جنگ سے گریز کیا۔ اب اختیار الملک احمد آباد کی طرف روانہ ہو لیکن عزیز کوکا اس کو پیچھے چھوڑ کر پایۂ تخت میں داخل ہو گیا اور شہر کے بچاؤ کے انتظامات کر لیے۔ بہرحال اختیار الملک نے محاصرہ کر لیا اور محمد حسین مرزا بھی جلد ہی آملا۔ فوراً ہی سارے گجرات میں بغاوت کی آگ پھیل گئی۔

گجرات سے یہ پریشان کن خبریں شہنشاہ کے پاس فتحپور اس وقت پہنچیں جب کہ وہ بنگال کے افغانوں کے خلاف مہم کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ جونہی خان اعظم نے صفائی کے ساتھ اعلان کر دیا کہ وہ دشمن کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتا اکبر نے فوراً ہی گجرات جانے کا ارادہ کر لیا مالوہ کے امراء اور جاگیرداروں کو حکم دیا گیا کہ وہ بلا توقف و تردد گجرات کی طرف کوچ کریں۔ مان سنگھ کو یہ حکم ملا کہ وہ جتنے بھی گھوڑا سپاہی حاصل کر سکے انھیں لے کر گجرات کے راستے میں شہنشاہ سے جا ملے۔

اتوار 23 اگست کو اکبر فتحپور سے پانچ سو سپاہیوں کے ساتھ بادرفتار سانڈنیوں پر روانہ ہوا۔ 25 کی صبح کو وہ اجمیر پہنچا اور خواجہ کی درگاہ کا طواف کر کے آگے بڑھ گیا باسانا کے مقام پر اس نے فوج کا جائزہ لیا جس کی کل تعداد تین ہزار تھی گیارہویں دن اس نے احمد آباد سے چھ میل کے فاصلے پر اپنے خیمے نصب کرا دیے۔ یہاں سے اس نے خان اعظم کو یہ کہلا بھیجا کہ وہ دلیری سے تاخت کرتا ہوا قلعہ سے باہر آکر اس سے مل جائے لیکن خان اعظم کو اس بات کا یقین نہ آیا اور وہ تذبذب میں رہا۔

شہنشاہ کی آمد کی خبر دشمنوں کو بھی نہ ہوئی اور جب تک کہ شہنشاہ سابرمتی پار کر کے کنارے پر نہ پہنچ گیا اور طبل جنگ نہ بجایا دشمن بالکل بے خبر رہے۔ فوراً ہی محمد حسین مرزا جنگ کے لیے آگیا۔ لیکن اس پر اتنا زبردست اور پرجوش حملہ کیا گیا کہ وہ اندھا دھند بھاگا۔ اس کے گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور گر گیا۔ اور اس کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا اس لڑائی میں اکبر بھی محض اپنی حاضر دماغی اور چیلا گوجر کی بروقت امداد کے سبب بال بال بچ گیا۔

ابھی مشکل سے ایک گھنٹہ ہی گزرا ہوگا کہ اختیار الملک مرزا کی شکست کی خبر سن کر بھاگتا ہوا میدان جنگ میں آیا۔ شاہی سپاہ نے اس کے ہراول دستے کو پیچھے دھکیل دیا اس کی صفوں میں جو کہ پیچھے سے چلی آ رہی تھیں افراتفری پھیل گئی۔

اکبر نے دشمن کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر گھوڑ سواروں کے دستے سے اس قدر کامیاب حملہ کیا کہ دشمن کی فوج سخت گھبراہٹ میں تتر بتر ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی جس کی وجہ سے شاہی افواج کو بہت تعجب ہوا اور خوشی بھی ہوئی۔ اختیار الملک اپنے گھوڑے سے گر پڑا اور فوراً ہی اس کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ بے شک شاہی افواج کو عظیم فتح نصیب ہوئی اکبر نے محض تین ہزار سپاہیوں کی فوج سے تیس ہزار کی فوج کو کچل کر رکھ دیا۔ چند ہی گھنٹوں میں احمد آباد دشمنوں سے پاک ہو گیا۔

اکبر نے گجرات سے واپسی پر بنگال پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جب عادل شاہ نے محمد خاں سور کو شکست دی تو اس کا لڑکا بہادر تخت نشین ہوا۔ بہادر نے اپنے باپ کی موت کا انتقام لینے کے لیے عادل شاہ کو 1556ء میں سورج گڑھ کی جنگ میں شکست دی اور قتل کر دیا۔ بہادر کے بعد اس کا بھائی جلال شاہ تخت نشین ہوا اور اس کے بعد

اس کا بیٹا وارث تخت ہوا لیکن 1563ء میں غیاث الدین سوم نے اس کو قتل کر دیا۔ کرانیوں نے جن کے پاس صوبہ بہار میں جاگیریں تھیں، بنگال کے حکمران کے ساتھ میل کر لیا اور مقتول شہزادے کے حامیوں کا ساتھ دیا کیوں کہ اس میں ان کی ذاتی اغراض بھی شامل تھیں۔ تاج خاں نے غیاث الدین سوم کو قتل کر دیا اور اس کے بھائی سلیمان کی طرف سے حکومت کرنے لگا۔
1564ء میں تاج خاں کی موت کے بعد سلیمان نے حضرت علی کا خطاب اختیار کر کے ٹانڈہ کو پائے تخت قرار دیا۔ اور ازبک سردار خان زماں علی قلی خاں سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے۔ جب 1565ء میں ازبک بغاوت پھیلی تو اس نے کوشش کی کہ ازبکوں کی مدد سے فتح خاں سے رہتاس چھین لے لیکن شہنشاہ کے جونپور پہنچنے اور قلعہ کے محصور شدہ لوگوں کی مدد کے لیے قلی خاں کی روانگی نے سلیمان کے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ واپس چلا جائے۔ بہرحال سلیمان نے سمجھداری سے کام لے کر خود کو ازبکوں کی بغاوت میں ملوث نہ کیا۔

خان اعظم کی موت کے بعد اس کے ملازم اسد اللہ خاں نے جس کا زمانیہ پر قبضہ تھا، یہ تجویز پیش کی کہ وہ قلعہ کی باگ ڈور سنبھال لے۔ سلیمان نے اپنے ایک لائق فوجی سردار اور عاقل سیاستداں لودی خاں کو ایک فوج دے کر روانہ کیا لیکن لودی خاں کو اس بات سے بڑی مایوسی ہوئی کیوں کہ اس سے پہلے ہی منعم خاں نے اسد اللہ خاں کو مٹھی میں لے لیا تھا۔

سلیمان نے اب منعم خاں سے دوستانہ تعلقات پیدا کیے اور شہنشاہ کا اقتدار تسلیم کرتے ہوئے اس کے نام کا خطبہ پڑھا اور سکے جاری کر دیے اور پھر کبھی تخت پر نہ بیٹھا۔ سلیمان میں اس تبدیلی کا سبب یہ تھا کہ اکبر کی فتوحات کو دیکھ کر اس کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ اگر وہ جلد ہی اکبر سے جھگڑا مول لے گا تو اس کی محنت رائگاں جائے گی۔ اس کے علاوہ اس کو یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر اس نے مغلوں سے دشمنی مول لے لی تو مغل حکومت اس کی فتح اڑیسہ کے منصوبے میں حارج ہو گی۔ کیونکہ وہاں کا حکمراں شہنشاہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتا تھا۔

سلیمان کی تدبیر کامیاب رہی۔ اس نے 1568ء میں اڑیسہ پر قبضہ کر لیا اور راجا مکند دیو اور ابراہیم خاں سور جو کہ عادل شاہ سور کا رقیب تھا جنگ میں مارے گئے

اکبر کو یہ بات پسند نہ تھی کہ ایک دوستانہ ریاست کے کھنڈرات پر بنگال کی توسیع عمل میں آئے لیکن اس وقت اس کو اتنی فرصت نہ تھی کہ ایک اور جنگ اپنے سر مول لے۔

1572ء میں سلیمان کا انتقال ہوگیا۔ اس کا سب سے بڑا لڑکا اور وارث بایزید افغان امرا کے ہاتھوں مارا گیا اور اس کے دوسرے لڑکے داؤد کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ سلیمان کی موت کے فوراً بعد اس کے جانشینوں نے اس کی سیاست کو بدل دیا۔ اکبر کے نام کا خطبہ اور سکے بند کر دیے، اس کے اقتدار کو ماننے سے انکار کر دیا اور خود مختار ہو گئے۔ جوں ہی یہ بات اکبر کو معلوم ہوئی اس نے منعم خاں کو بنگال پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔

منعم خاں نے ایک افغان سالار گوجر خاں سے گفت و شنید شروع کی۔ گوجر نے مدد کا وعدہ بھی کیا لیکن لودی خاں نے گوجر کو اپنی طرف ملا لیا اور منعم خاں کو خوش رکھنے کے لیے لودی خاں نے اسے تین لاکھ روپے کا تحفہ پیش کیا۔ جوں ہی بنگال کے معاملات ذرا سدھرے لودی خاں اور داؤد نے زمانیہ پر حملہ کر کے قلعہ کو مسمار کر دیا۔

اگر بہار کے راجا جگ پتی نے افغانوں پر کامیاب حملہ کیا ہوتا اور منعم خاں کو غازی پور کے پاس اپنی افواج جمع کرنے کا کافی موقع مل جاتا تو مغل لڑائی میں زیادہ بہتر ہاتھ دکھاتے۔ افغان اور مغل فوجیں ایک دوسرے کے مقابل مورچہ ڈالے پڑی تھیں اور اکبر سورت کے قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔

منعم خاں نے جو کہ اب بوڑھا تھکا خستہ اور کمزور ہو چکا تھا یہ سوچا کہ اگر شہنشاہ بذات خود اس لڑائی میں شریک نہ ہو تو بنگال کے حکمراں سے جس کے پاس ایک بہت بڑی فوج تھی لڑائی لینا مناسب نہ ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ بنگال کی فوج میں چالیس ہزار تجربے کار سوار، ایک لاکھ چالیس ہزار پیادے، تین ہزار چھ سو ہاتھی، بیس ہزار بندوقیں اور ہزاروں جنگی کشتیاں موجود تھیں۔ چنانچہ منعم خاں نے گفت و شنید شروع کر دی لیکن افغانوں نے اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔

منعم خاں کی خوش قسمتی سے افغانوں میں تاج خاں کے بیٹے اور لودی خاں کے داماد یوسف کے قتل کے سبب پھوٹ پڑ گئی۔ اس بات سے لودی خاں کا رویہ بدل گیا اور اس نے فوراً ہی منعم خاں سے صلح کر لی۔ اگر لودی خاں کے ساتھی اس کو چھوڑ کر

بھاگ نہ جاتے تو وہ داؤد پر حملہ کر دیتا۔ اسی دوران شہنشاہ کے اصرار پر جس نے مدد بھیجنے کا حکم بھی صادر کر دیا تھا منعم خاں نے ایک بڑی فوج کو مسلح کر کے افغانوں کے خلاف ابتدائی کارروائی شروع کر دی اور اس میں کامیابی نصیب ہوئی۔

داؤد نے لودی خاں کے حب الوطنی کے جذبے کو ابھار کر اور خوشامدانہ الفاظ استعمال کر کے اس کو اس بات کے لیے رضامند کر لیا کہ مغلوں کو چھوڑ کر اپنے قدیمی آقا کی خدمت میں لوٹ آئے۔ یہ سب لودی خاں کو واپس بلانے کی تدبیریں تھیں۔ پھر قتلو خاں اور شری دھر کے اکسانے پر داؤد نے اس کو قتل کر دیا۔ اس وحشیانہ عمل سے افغان امرا کے درمیان خوف کی لہر دوڑ گئی۔

لودی خاں کے راستے سے ہٹ جانے کے بعد منعم خاں کو پٹنہ پر حملہ کرنے کی جرأت ہوئی لیکن جلد ہی داؤد پٹنہ کی حفاظت کے لیے پہنچ گیا۔ اگر اس نے مغلوں پر حملہ کیا ہوتا تو اس کو کامیابی نہ ہوتی لیکن خوش قسمتی سے اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ خود کو قلعہ میں محصور کر لے۔

منعم خاں نے اپنی ساری تدبیریں صرف کر دیں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا اور پٹنہ کی فتح کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ منعم خاں نے لاچار ہو کر شہنشاہ سے درخواست کی کہ وہ خود آ کر اس گتھی کو سلجھائے۔

20 جون 1574ء کو موسم برسات میں جب ہندوستان میں بارش زوروں پر ہوتی ہے شہنشاہ آگرے سے پٹنہ روانہ ہوا۔ شہنشاہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو کہ ہوا طوفان اور بارش کے سبب اپنے لازمی اور ضروری کاموں میں تاخیر کریں۔ کیونکہ یہ بات یقینی تھی کہ بارش کے زمانے میں دریاؤں کو عبور کرنا ناممکن ہوگا اس لیے اس نے کشتیوں پر جو کہ شاہی پارٹی اور اس کے ان گنت افسروں کو لے جانے کے لیے بنائی گئی تھیں سفر شروع کر دیا۔

ان کشتیوں کے بنانے میں بڑی مہارت سے کام لیا گیا تھا اور ان کو آرام دہ بنانے میں پوری کوشش کی گئی تھی۔ اس کے باوجود دریائے گنگا کا یہ سفر جبکہ اس میں باڑھ آئی ہوئی تھی بہت ہی دشوار اور تشویش ناک تھا۔ بہر حال اکبر نے مشکلات کا بہادری سے مقابلہ کیا اور سیدی پور پہنچ گیا جو کہ گنگا اور گومتی کے سنگم پر واقع ہے۔

یہاں پردہ فوج جو خشکی کے راستے آرہی تھی اس سے مل گئی۔ شہنشاہ نے اپنے خاندان کے افراد کو جونپور بھیج دیا اور ۸ اگست کو پٹنہ پہنچ گیا۔

شہنشاہ نے افسروں کی روداد اور ذاتی مطالعے کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جب تک حاجی پور فتح نہ کرلیا جائے پٹنہ کا فتح کرنا دشوار ہوگا کیوں کہ قلعہ کی رسد و سامان خوردونوش وغیرہ یہیں سے فراہم کی جاتی ہے۔

شہنشاہ نے فوراً ہی یہ فیصلہ کیا کہ ایک مضبوط دستہ حاجی پور روانہ کیا جائے ساتھ ہی ساتھ اس نے داؤد کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ یا تو قلعہ کو سونپ دے یا پھر قضیہ کو نبٹانے کے لیے جس ہتھیار سے بھی وہ چاہے دوبدو لڑکر فیصلہ کرے اس نے یہ بھی کہلایا کہ اگر یہ شرط منظور نہ ہو تو پھر دونوں کی طرف سے ایک ایک پہلوان میدانِ جنگ میں اتر آئے یا دونوں فوجوں کی نمایندگی کے لیے ایک ایک ہاتھی میدان میں چھوڑ دیں اور ان کی فتح و شکست پر لڑائی کا فیصلہ ہوجائے۔

ممکن ہے کہ شہنشاہ کی یہ تجویز شیر شاہ کے اس مغرورانہ دعوے کا جواب ہو کہ افغان دوبدو لڑائی میں مغلوں سے بہتر و برتر ہیں۔ یا پھر اکبر یہ چاہتا تھا کہ افغان حکمراں پر نفسیاتی دباؤ ڈالے یا اس کو کسی طرح فریب میں رکھے۔ اس سے قبل کہ اکبر کے پاس مراسلہ کا جواب آئے مغلوں نے ۷ اگست کو حاجی پور فتح کرلیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فتح ایک عالی شان کارنامہ تھا جو انتہائی خراب موسم، اندھیری رات، خوف ناک طوفانی ندی اور زبردست افغان مقاومت کے باوجود کامیاب رہا۔ حاجی پور کے سالار فتح خاں اور دوسرے سرداروں کے سرکاٹ کر اکبر کو پیش کر دیے گئے۔

حالانکہ داؤد کے پاس زبردست توپ خانہ تھا لیکن وہ راجا وکرما جیت کو ساتھ لے کر قلعہ کے عقبی دروازے سے رات کی تاریکی میں نکل بھاگا اور تیزی کے ساتھ کشتی سے دریا پار کرنے لگا۔ اسی وقت گوجر خاں خشکی کے راستے فوج اور ہاتھیوں کو لے کر فرار ہوگیا۔ قلعہ میں زبردست ہل چل مچ گئی۔ مغلوں کو اس کا اندازہ ہوگیا۔

اکبر چاہتا تھا کہ فوراً ہی دشمن کا تعاقب کیا جائے۔ لیکن منعم خاں نے رات کی زبردست تاریکی کے سبب شہنشاہ کو اس ارادے سے باز رکھا۔ اس کے علاوہ ندی نالے طوفانی حالت میں تھے اور اکبر کی فوج وہاں کے جغرافیائی حالات سے

اچھی طرح واقف نہ تھی۔ شہنشاہ اگلے روز 8 اگست 1574ء کو علی الصبح شہر پٹنہ میں داخل ہوا۔ اور چند گھنٹوں کے دوران اس نے بعض ضروری امور کے بابت احکامات صادر کیے اور افغانوں کے تعاقب میں روانہ ہوگیا اور منعم خاں کو پیچھے پیچھے آنے کی ہدایت دی۔

اکبر ساٹھ میل تک ایک ساتھ بغیر لگام کھینچے دشمنوں کے تعاقب میں چلتا چلا گیا لیکن اس کو داؤد کا کوئی سراغ نہ ملا۔ وہ دریا پور میں ٹھہر گیا۔ یہاں پر خان خاناں منعم خاں کی فوج اس سے آملی۔ اب ایک فوجی مجلس مشاورت منعقد کی گئی جس میں اس بات پر غور کیا گیا کہ موسم برسات میں مہم جاری رکھنا کہاں تک معقول ہوگا کافی بحث و مباحثے کے بعد یہی طے پایا کہ آگے ہی بڑھا جائے۔

منعم خاں کو فوج کی سپہ سالاری سونپ دی گئی اور اس کو بنگال کا صوبے دار نامزد کر دیا گیا۔ شہنشاہ واپس چلا گیا اور منعم خاں آگے بڑھتا رہا۔ کھڑک پور اور گدھور کے راجاؤں نے خاں خاناں کی مدد کی۔ تیلیا گڑھی جو کہ بنگال کا دروازہ کہلاتا ہے آسانی سے فتح ہوگیا اور اب مغل فوج بغیر کسی مزاحمت کے ٹانڈا (گوڑ کے نزدیک) میں داخل ہوگئی۔

ٹانڈا سے افغانوں کو نکالنے کے لیے مہمیں روانہ کی گئیں۔ مجنوں خاں ققشال کو (ضلع دیناج پور میں) گھوڑا گھاٹ کی طرف روانہ کیا اور ٹوڈرمل کو تعینات کیا گیا کہ وہ جنید خاں کرانی کو اپنے رشتے کے بھائی داؤد سے ملنے نہ دے۔ یہ سب مہمیں کامیاب ثابت ہوئیں۔ مغل فوجوں نے گھوڑا گھاٹ اور ست گاؤں فتح کر لیے لیکن داؤد ان سے بچ کر اڑیسہ بھاگ گیا لیکن جب محمد قلی خاں کی وفات کی خبر ملی تو داؤد کی ہمت بڑھی اور وہ دوبارہ ظاہر ہوگیا۔

منعم خاں اڑیسہ کے اجنبی علاقہ جات میں داؤد کا پیچھا کرنے سے ہچکچاتا تھا لیکن ٹوڈرمل نے فوری اقدام کے لیے شاہی فرمان حاصل کر لیا۔ آخرکار منعم خاں کو اڑیسہ میں داخل ہونا پڑا۔

3 مارچ 1575ء کو تکارو ئی (ضلع بالاسور) میں ایک گھمسان کی جنگ ہوئی۔ شروع میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فتح افغانوں کو نصیب ہوگی لیکن ایک بحرانی لمحے میں افغان سردار تیر لگنے سے مرگیا اور اس طرح سارا نقشہ مغلوں کے حق میں

بدل گیا۔ ٹوڈرمل فتح کے بعد کٹک تک یلغار کرتا ہوا پہنچ گیا۔ جب داؤد کے لیے کوئی چارہ کار باقی نہ رہا تو اس نے صلح کی درخواست کی۔ ٹوڈرمل صلح کرنے کی موافقت میں نہ تھا اور اس نے صلح کے معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا لیکن منعم خاں نے 12 اپریل کو اپنی ذمے داری پر دستخط کر دیے۔

اس صلح کے مطابق داؤد نے وعدہ کیا کہ اپنے بہترین ہاتھی شہنشاہ کو دے گا خراج عقیدت پیش کرنے اپنے بھتیجے شیخ محمد کو بطور یرغمال دربار میں بھیجے گا اور بعد میں خود اظہار اطاعت کے لیے حاضر ہوگا۔ منعم خاں صلح نامہ پر دستخط کرنے کے بعد ٹانڈا واپس آ گیا۔

اکتوبر 1575ء میں اسی سالہ خانخاناں ملیریا میں مبتلا ہو کر گوڑ میں جو کہ صوبہ کا پائے تخت بنایا گیا تھا اس دنیا سے چل بسا۔ اس کے مرنے کے فوراً بعد مغل فوج میں پھوٹ اور اختلافات کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس وقت فوری طور پر خاں خاناں کی جگہ پُر کرنے کے لیے کوئی نہ تھا۔

داؤد خاں نے پھرتی سے اس افراتفری کا فائدہ اٹھایا۔ اس نے صلح نامہ کو پھاڑ پھینکا اور بھدرک (اڑیسہ) کے صوبے دار کو قتل کر دیا۔ گھوڑا گھاٹ کے علاقے سے ققشالوں کو بھگا دیا گیا۔ داؤد نے ٹانڈا پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ مغل افسر بنگال کی آب و ہوا سے تنگ آ گئے تھے۔ ان کے پاس کوئی قابل اطمینان لیڈر نہ تھا۔ ادھر افغان ان کو برابر دبائے جا رہے تھے۔ ان حالات سے پریشان ہو کر وہ بڑی شرمناک حالت میں بہار کی طرف فرار ہو گئے۔ جب ان کو یہ پتہ چلا کہ بغاوت کے شعلے بہار میں بھی بھڑک اٹھے ہیں اور راجا گجپتی باغی ہو گیا ہے تو ان کو بہت تعجب ہوا۔ مفرور افسر بھاگلپور میں حسین قلی خان جہاں سے ملے جو کہ بنگال کا نیا صوبے دار تھا۔ اس نے راجا ٹوڈرمل کی مدد کر کے ان لوگوں کے حوصلے بڑھائے اور ان میں دوبارہ اعتماد قائم کیا۔ خان جہاں نے فوجی امور کی باگ ڈور سنبھالی اور جلد ہی تیلیا گڑھی پر قبضہ کر کے خود کو ایک محل (راج محل) میں محفوظ کر لیا۔ یہاں پر افغانوں نے اس کو بہت دبایا اور اس کو اپنی کمزوری کا احساس ہونے لگا لیکن مظفر خاں بہار سے پانچ ہزار سوار لے کر بروقت اس کی مدد کو پہنچ گیا۔

12 جولائی 1576ء کو جنگ ہوئی جس میں مغل کامیاب ہو گئے۔ اس جنگ میں "شمشیر افغاناں" جنید مارا گیا اور بدعہد مرتد ہندو کالا پہاڑ جس نے کہ جگن ناتھ کی بڑی بے حرمتی کی تھی زخمی ہو کر فرار ہو گیا۔ داؤد بھی بھاگ کھڑا ہوا۔ ٹوڈرمل نے اس کا سختی سے تعاقب کیا اور اس کو گرفتار کر لیا۔ خان جہاں داؤد جیسے شکیل آدمی کو ہلاک کرنے کو تیار نہ ہوا لیکن امراء نے اس کو داؤد کا سر قلم کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ سر شہنشاہ کو بھیج دیا گیا۔ داؤد کی موت نے بنگال کی آزاد حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

باب 11

رانا پرتاپ۔حکمران میواڑ

گجرات کی فتح کی پائیداری راجپوتانہ میں مغل طاقت کے استحکام پر مبنی تھی۔اس میں شک نہیں کہ چتوڑ کی شکست نے اکبر کے وقار کو اس علاقے میں قائم کر دیا تھا لیکن میواڑ کی ریاست میں امن قائم نہ ہوا تھا۔ فروری 1572ء میں رانا ادے سنگھ اٹھارہ رانیوں اور چوبیس بچوں کو چھوڑ کر فوت ہو گیا۔اس نے سب سے بڑے لڑکے پرتاپ سنگھ کو نظر انداز کر کے اپنے سب سے چہیتے بیٹے جگمل کو تخت کا وارث مقرر کیا۔لیکن پرتاپ کے ماموں رائے اکھائی، راجا جالور اور گوالیار کے سابق راجا نے کئی سرکردہ سرداروں کے ساتھ مل کر ایک ناگہانی حملہ کر کے جگمل کو تخت سے اتار دیا اور پرتاپ سنگھ کو راجا بنا دیا۔جگمل میواڑ چھوڑ کر اکبر کے دربار میں پہنچا۔شہنشاہ اس سے مہربانی سے پیش آیا اور اس کو جاگیر عطا کی۔

یہ قدرتی بات تھی کہ میواڑ کے نئے راجا کو اپنے وسائل از سر نو تنظیم کرنے اور اپنی طاقت کو جمانے کے لیے وقت درکار تھا وہ اس وقت تک مغل حکومت کی طرف کسی قسم کا سخت رویہ اختیار نہ کر سکتا تھا۔ اکبر نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور فتح گجرات کے اپنے منصوبے کو بغیر کسی خاص روک ٹوک کے انجام دیا۔ بہرحال اکبر اس بات سے پوری طرح واقف تھا کہ میواڑ کے حکمراں کے ساتھ معاملات کا قطعی فیصلہ ہونا چاہیے۔چنانچہ اس نے 1573عیسوی میں گجرات سے راجا مان سنگھ کو پرتاپ سنگھ

سے فیصلہ کی شرائط کے متعلق بات چیت کرنے کے لیے میواڑ بھیجا۔ رانا نے راجا مان سنگھ کا اچھی طرح استقبال کیا اور اکبر نے جو خلعت روانہ کیا تھا اس کو قبول کیا۔ اس طرح یہ بات واضح ہوگئی کہ اکبر اپنے دربار میں جگ مل کی موجودگی کے باوجود میواڑ کی ریاست کی جانشینی کے معاملے میں مداخلت کرنے کا ارادہ نہ رکھتا تھا اور نہ رانا اس کے لیے تیار تھا کہ جودھپور کے راجا راؤ چندر سین سے دوستی کے باوجود کم از کم فی الحال اکبر سے جھگڑا مول لے۔ بہرحال مان سنگھ کی سفارت پوری طرح کامیاب نہ ہوئی اور وہ مایوس ہو کر واپس ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رانا مان سنگھ کی اس تجویز پر متفق نہ تھا کہ وہ خود جا کر دربار میں حلف وفاداری اٹھائے۔

اکبر خود کو کسی ایسی جنگ میں جھونکنا نہ چاہتا تھا جس سے کہ وہ بچ سکتا ہو۔ کیونکہ اس قسم کا قبل از وقت اقدام اس کی فتح گجرات کے لیے جو کہ حال ہی میں حاصل ہوئی تھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ستمبر 1573ء میں اکبر نے راجا بھگوان داس کو اسی مقصد سے جس سے کہ مان سنگھ کو بھیجا تھا میواڑ روانہ کیا۔ راجا بھگوان داس نسبتاً کامیاب رہا۔ یہ بات قطعی طور پر کہنا مشکل ہے کہ آیا رانا پرتاپ اپنے اس فعل پر پشیمان تھا کہ اس نے جذبات کی رو میں بہہ کر مان سنگھ کے احساسات کو مجروح کر دیا تھا یا یہ کہ وہ فوری طور پر دہلی کے بارسوخ شہنشاہ سے جھڑپ لینے کے لیے تیار نہ تھا اور یا یہ کہ وہ اس وقت امن وامان کا خواہاں تھا اور چاہتا تھا کہ بغیر کسی روک ٹوک کے آزادی کی نعمت سے مستفید ہوتا رہے۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو رانا نے بھگوان داس کے ساتھ ساتھ حلف وفاداری اٹھانے اور اکبر کی ملازمت میں شامل ہونے کے لیے امر سنگھ کو بھیج دیا۔ رانا نے خود دربار میں حاضری سے معذرت کی درخواست کی۔ بھگوان داس امر سنگھ کے ساتھ نومبر 1573ء کو فتحپور پہنچ گیا۔

زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ٹوڈرمل بھی رانا کی ریاست سے ہو کر گزرا۔ رانا نے اس سے بھی بہت مہمان نوازی کا سلوک کیا اور وہ بھی یہی تاثر لے کر گیا کہ رانا اکبر سے کسی قسم کا جھگڑا کرنا نہیں چاہتا۔

دوستی کے ان تمام مراسم کے باوجود رانا کا برتاؤ آہستہ آہستہ سخت تر ہوتا گیا وہ شہنشاہ کے اس رویے سے مطمئن نہ تھا کہ اس نے رانا کی دوستی کے جذبات کا

گرم جوشی سے جواب نہ دیا اور اس بات پر مُصر رہا کہ رانا خود دربار میں حاضر ہو کر حلفِ وفاداری لے۔

رانا کو یہ بھی شکایت تھی کہ اکبر چتوڑ کے مفتوحہ علاقہ جات کو واگزار کرنے کی نیت نہیں رکھتا ہے۔ دوسری طرف اکبر رانا کے اظہارِ دوستی پر اُس وقت تک پورا بھروسہ نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ رانا گمایار کے غیر مطیع، راجہ اور برسرِاقتدار افغانوں کے ساتھ معاہدے میں بندھا ہوا ہے۔ علاوہ بریں رانا نے جودھپور کے چندر سین اور سروہی کے راؤ سُرتان کے ساتھ دوستی کر رکھی ہے جنہوں نے شہنشاہ کے اقتدار کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اکبر اس بات سے خوش نہ تھا۔ جب تک اکبر کو رانا کی مستقل دوستی کا یقین نہ ہو جاتا اس وقت تک وہ میواڑ کے مفتوحہ علاقوں پر سے اپنی گرفت کو ڈھیلا کرنے کے لیے تیار نہ تھا کیوں کہ یہی علاقہ ایسا تھا جہاں سے وہ گجرات کے راستے پر نگاہ رکھ سکتا تھا یا وہاں سے گزرنے والے مسافروں، قافلوں اور تاجروں کی حفاظت کر سکتا تھا۔

1576ء میں جودھپور کے راجا چندر سین نے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ اکبر نے یہ سمجھا کہ یہ بغاوت ایک سلسلے کی کڑی ہے لہذا اس نے چندر سین کو دبانے کے لیے ایک فوج بھیج دی اور خود پٹنہ کی طرف کوچ کیا۔ جلد ہی بوندی کے راجا ڈوڈا نے جو کہ سرجن ہاڑا کا بیٹا بھی تھا بغاوت کر دی۔ ابھی بغاوت کی آگ ان ریاستوں میں سلگ ہی رہی تھی کہ رانا پرتاپ نے اپنی رعایا کو جو میدانوں میں تھی پہاڑوں میں چلے جانے کا حکم دیا۔ رانا نے اس حکم کی تعمیل میں سختی برتی اور حکم کی اطاعت نہ کرنے والوں کو موت کی سزا دینے سے بھی گریز نہ کیا۔ اس اقدام کا یہ نتیجہ ہوا کہ "راجستھان کا چمن فاتح (اکبر) کے لیے بے کار ہو گیا اور مغل دربار و ممالکِ خارجہ کے درمیان میواڑ سورت اور گجرات کی دوسری بندرگاہوں کے راستے جو تجارت ہوتی تھی وہ لوٹ مار اور غارت گری کا شکار ہو گئی"۔

شاید ان واقعات نے اکبر کو یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کر دیا کہ شرارت کا سرچشمہ رانا کے باغیانہ رویے میں مضمر تھا اور اسی سے سب جگہ بغاوت کے جراثیم پھیلے ہیں۔

شہنشاہ مارچ 1576ء میں اجمیر پہنچا۔ اُس نے مان سنگھ کو خلعت فاخرہ اور ایک گھوڑا عنایت کیا اور پانچ ہزار عمدہ سواروں کے ساتھ رانا پرتاپ کے مقابلے کے لیے روانہ کردیا۔ اکبر کو مان سنگھ کی کامیابی پر قطعاً شک نہ تھا لہذا وہ خود پائے تخت کی جانب واپس ہوا۔

مان سنگھ منڈل گڑھ ہوتا ہوا ہلدی گھاٹ پہنچ گیا جو کہ گوگنڈا کے قلعے سے چودہ میل ہے۔ یہیں سے رانا پرتاپ نے 18 جون 1576ء کو مان سنگھ کو للکارا۔ جگن ناتھ اور آصف خاں کو جو کہ مغل فوج کے ہراول دستے کی قیادت کر رہے تھے۔ حکیم سور افغان نے مار بھگایا۔ مغلوں کے بائیں بازو کو بھی پیچھے دھکیل دیا گیا اور دایاں بازو بھی کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہ کرسکا۔ مختصر یہ کہ رانا پرتاپ کی افواج مغلوں پر حاوی رہیں۔ جس وقت مغل فوج میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی تو عقبی دستے کا کمانڈر مہتر خاں محافظ دستے کو ساتھ لے کر آگے بڑھا اور اُس نے ایک مرتبہ پھر فوج کی ہمت بڑھائی۔ بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ راجا رام شاہ جو کہ میواڑ کی فوج کے دائیں دستے کی قیادت کر رہا تھا مع اپنے بیٹے کے مارا گیا۔ جے مل کا لڑکا رام داس بھی جگن ناتھ کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ اس لڑائی کا سب سے دلچسپ پہلو ہاتھیوں کی لڑائی تھی۔ طرفین نے اپنے اپنے جنگی ہاتھی چھوڑ دیے۔ اس مقابلے میں بھی رانا کے ہاتھی ہی غالب رہے۔ مغلوں کی فوج میں بارہہ کے سیدوں نے بڑی خدمات انجام دیں۔ اگر یہ لوگ جرات و بہادری کے ساتھ دشمن کا مقابلہ نہ کرتے تو مغل فوج پہلے ہی حملے میں تتر بتر ہوجاتی۔

راجا مان سنگھ نے بھی "ناقابلِ بیان شدت عزمی کا اظہار کیا"۔ رانا پرتاپ مان سنگھ کا مدِمقابل ہوا اور دونوں نے دادِ شجاعت دی۔ حالانکہ رانا کا جسم تیروں سے چھلنی ہوگیا تھا لیکن اس کے باوجود نزدیک تھا کہ وہ راجا مان سنگھ پر غلبہ حاصل کرلے کہ اسی دوران مغل ہراول دستہ جو کہ ابتدا میں پسپا ہوگیا تھا دوبارہ میدانِ جنگ میں لوٹ آیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ افواہ بھی گرم ہوگئی کہ خود اکبر بھی مزید فوجی امداد لے کر پہنچ گیا ہے۔ اس افواہ سے رانا کی کوششیں سست پڑگئیں۔ اور وہ کوہ بارس کی طرف پہاڑیوں میں پناہ گزیں ہوگیا۔ دونوں طرف ہلاک شدگان کی تعداد

تقریباً برابر ہی تھی اور فریقین کے پانچ پانچ سو آدمی مارے گئے۔ مغل فوج گرمی کی شدت کے سبب بھاگتی ہوئی راجپوت فوج کا پیچھا نہ کرسکی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ وہ لوگ بہت ہی خستہ و ماندا تھے۔ اگلے روز مغل فوج نے آگے بڑھ کر گوگنڈا پر قبضہ کرلیا جسے بدقسمتی سے رانا نے بے بنیاد خوف کی وجہ سے خالی کردیا تھا۔ اگر رانا گوگنڈا کو خالی کرنے سے پہلے افواہ کی تصدیق کرالیتا اور وہاں رہ کر مغلوں کا مقابلہ کرتا تو شاید اتنی آسانی سے قلعہ پر قبضہ نہ ہو پاتا۔ گوگنڈا پہنچ کر مغل فوج مصیبت میں پھنس گئی۔ بارش شروع ہوگئی اور فوج قلعہ میں بے کار بیٹھی رہی۔ ادھر رسد و سامان خورد و نوش بھی کم ہوگیا۔ سپاہیوں نے اپنی جان بچانے کے لیے جانوروں کا گوشت اور آموں کا استعمال شروع کردیا۔

ان تمام مصیبتوں کے باوجود مان سنگھ اور آصف خاں نے رانا کے علاقے میں لوٹ مار کرنے کی اجازت نہ دی۔ شہنشاہ نے ان وجوہ کی بنا پر ان کو واپس بلالیا اور مان سنگھ کو دربار میں حاضر ہونے کی اجازت نہ ملی البتہ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد اس کو معاف کردیا گیا اور اس حکم کے ساتھ دوبارہ روانہ کیا کہ وہ رانا کے علاقے کو تاراج کردے۔

مان سنگھ کی عدم موجودگی میں رانا پرتاپ واپس آگیا تھا۔ اس نے مغل فوج کو پریشان کیا ان کی رسد بند کردی اور اس طرح ان کو واپس جانے پر مجبور کردیا تھا۔ اب گوگنڈا رانا کے قبضے میں آگیا تھا۔

رانا پرتاپ کی بہادری، زبردست استقلال مزاج، آزادی کی تمنا اور اس کے لیے مصائب و آلام برداشت کرنے کی ہمت اور کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کرنا ایسی خوبیاں ہیں جن سے متاثر ہوکر عصر حاضر کے لکھنے والوں نے اس کی جدوجہد کو وہ معنی پہنادیے ہیں جو سنجیدہ تواریخی شہادت سے پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتے۔ بعض فارسی مصنفین نے جن میں ابوالفضل بھی ہے۔ اس بہادر رانا کا ذکر بہت ہی سرسری طور پر کیا ہے۔ کچھ دوسروں نے اس کے مقابلے میں اکبر اور مان سنگھ کو مورد ملامت قرار دیا ہے۔ دراصل سوال ہندو مسلمان کا نہ تھا اور نہ یہ جنگ ہندو مذہب اور اسلام کے درمیان تھی۔ یہ تو سلطنت مغلیہ اور میواڑ کی ریاست کے درمیان کش مکش کا مسئلہ تھا۔ اگر مسئلہ اس کے

برخلاف ہوتا تو رانا پرتاپ اپنے ایک دستے کو حکیم خاں سور کی ماتحتی میں نہ رکھتا اور نہ اکبر اپنی ساری فوج کو مان سنگھ کی قیادت میں روانہ کرتا۔ اکبر نے جس نظریے کے تحت باز بہادر حکمران مالوہ، مظفر گجراتی، داؤد بنگالی، مرزا جانی بیگ سندھی اور یوسف کاشمیری کو زیر کیا تھا۔ اسی جذبے نے اسے میواڑ کے رانا سے جنگ پر ابھارا۔ اگر میواڑ پر کسی مسلمان کی حکومت ہوتی تب بھی اکبر اس سے اسی طرح پیش آتا۔ اس قسم کی ذرہ برابر شہادت موجود نہیں جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے کہ میواڑ کے خلاف جنگ کرنے میں محض سیاسی اغراض کے علاوہ اکبر کی کوئی اور غرض شامل تھی۔ شہنشاہیت اچھی ہو یا بری اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی یورپ والوں کی طرح اس کے حامی تھے۔

بہرحال رانا پرتاپ کی ہمت، عزم راسخ اور غیر متزلزل ارادے کی تعریف کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ یہ ماننا ہی پڑے گا کہ رانا پرتاپ جن اصولوں کے لیے لڑ رہا تھا، وہ ان اصولوں سے بالکل مختلف تھے جن پر راجپوتانہ کے دوسرے حکمران گامزن تھے۔ رانا پرتاپ تو میواڑ کی آزادی اور سسودیا خاندان کی حاکمیت و اقتدار کے لیے جنگ آزما تھا۔ دوسرے راجپوت حکمراں اس سلسلے میں زیادہ جوش و خروش نہ دکھاتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میواڑ کے حکمرانوں کی طرف سے ان کو ماضی میں تلخ تجربات ہو چکے تھے۔ اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ باقی راجپوت بزدل ہو چکے تھے یا ان کے حوصلے اس قدر پست ہو گئے کہ انھوں نے اپنی آزادی کو حقیر مادی مفاد کے بدلے بیچ ڈالا صحیح نہ ہوگا۔

تاریخ کے صفحات میں جو ان کے کارہائے نمایاں درج ہیں وہ اس قسم کے نادرست خیالات کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اگر راجپوتوں کو اس بات کا خدشہ ہوتا کہ ان کا گھر بار مذہب اور آزادی خطرے میں ہے تو وہ پہلے کی طرح رانا کے ساتھ مل کر اکبر کے مقابلے میں آجاتے۔

اکبر کا جو رویہ اور برتاؤ دوسرے راجپوت راجاؤں کے ساتھ رہا اس نے یہ بات واضح کر دی کہ وہ نہ تو ان کے سماجی اقتصادی یا مذہبی امور میں کسی قسم کی مداخلت کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی ان کی ریاستوں کو اپنی سلطنت میں ملانے کا خواہش مند تھا۔ وہ محض یہ

چاہتا تھا کہ راجپوت حکمران وفاقی سلطنت کے وفادار رہیں۔ اس کے لیے وہ چار باتوں کا خواہاں تھا۔ اوّل تو یہ کہ راجگان سلطنت کے خزانے میں بطور خراج کچھ رقم جمع کریں۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنی خارجی سیاست اور آپس کے جھگڑوں کو جنگ کے ذریعے طے کرنے کا حق سلطنت کو سونپ دیں۔ تیسرے یہ کہ اُن کو بروقت ضرورت سپاہیوں کی مقررہ تعداد وفاقی سلطنت کی خدمت کے لیے فراہم کریں اور چوتھے یہ کہ وہ خود کو مرکزی سلطنت کا جز تصور کریں اور یہ خیال نہ کریں کہ وہ محض انفرادی اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ تو معاملہ کا ایک رُخ تھا۔ دوسری طرف سلطنت کے سارے عہدے اور مرتبے ان کے لیے کھلے ہوئے تھے اور ان کو اس بات کا حق حاصل تھا کہ وہ اپنے ہم مرتبہ و ہم عہدہ افسروں کے ساتھ بلا تفریق مذہب و نسل برابری کے حق کا مطالبہ کریں۔ یہاں یہ ذکر کر دینا مناسب ہوگا کہ اکبر نے ہندوستان کی ہر مسلم ریاست کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا لیکن اس نے کسی بھی اہم ہندو ریاست کو ختم نہ کیا۔

اکبر نے جو منطقی اور فراخ دلانہ شرائط پیش کیں یعنی یہ کہ سماجی و مذہبی معاملات و داخلی انتظامات میں مداخلت نہ کی جائے گی ایسی شرطیں تھیں جنھوں نے مغلیہ وفاقی سلطنت میں شامل ہونے کے خلاف ہر ممکن استدلال کو بے اثر کر دیا۔

راجپوت حکمراں راجپوتانہ میں مسلسل جنگ و بد امنی سے تنگ آچکے تھے اور اس بات کے خواہاں تھے کہ نئے نظام کے ماتحت پریشان حالی سے نجات مل سکے اور امن و امان و خوشحالی میسر ہو۔ مغلوں کی برتری قبول کرنے میں ان کو وہ فائدے نظر آرہے تھے جو میواڑ سے ان کو حاصل نہ ہو سکتے تھے اور نہ حاصل ہوئے تھے۔

وفاقی حکومت کی یہ بھی پالیسی نہ تھی کہ راجپوت راجاؤں کو ان کی جنگجویانہ صفات یا انتظامی لیاقت کے اظہار کے مناسب مواقع سے محروم رکھا جائے۔ مغل شہنشاہ نے ازدواجی تعلقات کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس کو ہوا بنانا ممکن نہیں کیونکہ میواڑ کے بھاٹوں کی غیر ذمے دارانہ تصانیف کے علاوہ اور کوئی ایسی شہادت کافی

مقدار میں موجود نہیں جو اس بات کو ثابت کر سکے کہ مغل شہنشاہ نے ازدواجی تعلقات کی عام سیاست کو تمام راجپوت راجاؤں پر بہ زور مسلط کیا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ ازدواجی تعلقات کی یہ پالیسی کوئی نئی بات نہ تھی۔

گجرات، مالوہ اور دکن کی تاریخوں میں اس قسم کے بے شمار واقعات مندرج ہیں۔ اس بات کے ثابت کرنے کی کوئی مثبت دلیل نہیں کہ اکبر اپنی اس سیاست کو نافذ کرنے پر تُلا ہوا تھا یا کہ راجپوتوں کے درمیان اس قسم کی شادیوں کے خلاف کوئی تحریک یا جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا۔

ان تمام حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے راجپوت راجاؤں نے ایمان داری اور پورے اعتقاد کے ساتھ اس بات کو ترجیح دی کہ وہ مغلوں کی سرپرستی میں وفاقی سلطنت میں شامل ہو جائیں بجائے اس کے کہ سیسودیا خاندان کی برتری کے کبھی نہ پورے ہونے والے خواب دیکھیں جس کے لیے وہ کئی مرتبہ پہلے بھی ناکام کوششیں کر چکے تھے حقیقت پسندی اور عقل دونوں کا یہی تقاضا تھا کہ ان لوگوں کا ساتھ دیا جائے جو وفاق کے حامی ہیں لیکن جذبات اور احساسات اس بات کے خواہاں تھے کہ رانا کی حمایت کی جائے۔

حالانکہ جودھپور کی بغاوت دبا دی گئی تھی اور سوانہ کے قلعہ پر جو کہ باغیوں کی پناہ گاہ تھا قبضہ ہو گیا تھا تاہم راجپوتانہ کے حالات میں زیادہ تبدیلی نہ آئی۔ بغاوت کی آگ ابھی تک سروہی، ڈونگارپور، بانسواڑا، ایدور اور بوندی میں جو کہ میواڑ کے ساتھیوں کے قبضے میں تھے بھڑک رہی تھی۔ ہلدی گھاٹی کی جنگ سے شہنشاہ کو سوائے گوگنڈا کے اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ میواڑ ہمیشہ کی طرح سرکشی پر قائم رہا۔ جالور کے مسلم حکمراں تاج خاں نے بھی اطاعت سے روگردانی کر لی تھی۔ اگر کوئی غیر معمولی لیاقت کا رہنما ہوتا تو ان سب دشمن عناصر کو ایک جگہ جمع کر کے مغل سلطنت کے خلاف ایک پُرزور مخالفت برپا کر دیتا لیکن اکبر سے بڑھ کر کوئی سیاسی لیڈر نہ تھا۔

بنگال کی فتح کے بعد شہنشاہ نے راجپوتانہ کے معاملات کی طرف پوری توجہ مبذول کی۔ ستمبر 1576ء میں وہ اجمیر گیا۔ مان سنگھ کو اس کوتاہی کے لیے تنبیہہ

مقاومت بے کار ہوگی تو وہ خاموشی سے فرار ہوگیا لیکن قلعہ 6 جون تک ایک زبردست جنگ کے باوجود زیر نہ ہوا۔ اگلے روز گوگنڈا اور اودے پور پر قبضہ ہوگیا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ رانا ایدور اور بانسواڑا کی طرف چلا گیا ہے تو شہباز خاں نے اس کا تعاقب کیا اور پہاڑیوں میں پچاس اور میدانوں میں پنتیس تھانے قائم کر دیے تاکہ اودے پور سے پور منڈل تک کے علاقے کی نگرانی کی جا سکے۔

رانا کے وسائل پر اس قدر اثر پڑا کہ اس کا مستقبل بالکل تاریک نظر آنے لگا۔ وہ پہاڑیوں اور وادیوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگتا رہا اور بے حد دشواریوں اور تکلیفوں کا سامنا کرتا رہا۔ اگر رانا کو اپنے مقصد سے خلوص اور آزادی کی اتنی لگن نہ ہوتی تو وہ دل برداشتہ ہو جاتا۔ آخر کار جب شہباز خاں کو میواڑ سے بہار میں بغاوت دبانے کے لیے بھیجا گیا جہاں حالات نے بڑی نازک صورتِ حال اختیار کر لی تھی تو رانا کو موقع ہاتھ آگیا۔ حالانکہ میواڑ ابھی پوری طرح زیر نہ ہو پایا تھا پھر بھی اکبر کو اس کی طرف سے زیادہ خدشہ نہ تھا کیوں کہ اب راجپوتانہ کی تاریخ میں میواڑ کی حیثیت اس قدر مؤثر نہ رہی تھی کہ اس کو ایک اہم عنصر سمجھا جاتا اور مغلیہ سلطنت میں جو اہم تبدیلیاں ہو رہی تھیں ان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میواڑ کے معاملات کو مقامی حیثیت سے نپٹایا جا سکتا تھا۔

1579ء سے 1585ء تک اکبر کی توجہ مشرقی اتر پردیش، بہار، بنگال اور گجرات کی بغاوتوں کو دبانے اور پنجاب سے اپنے بھائی حکیم مرزا کے حملے کو ناکام بنانے میں مصروف رہی۔ 1585ء میں حکیم کا انتقال ہوگیا جس کی وجہ سے شمال مغربی سرحد کا معاملہ اس قدر پیچیدہ ہوگیا کہ اکبر کو اپنا پایۂ تخت 1585ء میں لاہور منتقل کرنا پڑا اور وہ 1598ء تک وہیں مقیم رہا۔ ابھی اکبر شمال مغربی سرحدوں سے چھٹکارا نہ پا سکا تھا کہ 1595ء میں برہان الملک کی موت کے بعد دکن میں حالات خراب ہو گئے۔ 1598ء میں عبداللہ خاں ازبک کی وفات سے قبل اکبر پنجاب کی طرف سنجیدگی کے ساتھ اپنی توجہ مبذول نہ کر سکا لہٰذا 1579ء سے 1598ء تک اکبر اپنے سارے اثر و رسوخ کے ساتھ بہت ہی ضروری مسائل کو حل کرنے میں مصروف رہا۔ ان مسائل کے سامنے میواڑ کا مسئلہ بہت ہی غیر اہم اور ناچیز تھا۔

رانا پرتاپ نے تیزی کے ساتھ موقع سے فائدہ اُٹھایا چونکہ اس کے وسائل بہت ہی محدود تھے لہذا وہ کوئی قابل توجہ پیش قدمی نہ کر سکا۔ اُدھر اجمیر کا صوبہ دار وقتاً فوقتاً تعزیری مہم بھیج کر پریشان کرتا رہتا۔ فوجی کارروائیاں بے دلی کے ساتھ جاری رہیں۔ اکتوبر 1585ء تک رانا سب کچھ کھونے کے باوجود گرفتار نہ کیا جاسکا اور 1587ء تک جب کہ اجمیر کا صوبے دار راجا جگن ناتھ کشمیر نہ بھیج دیا گیا کسی نہ کسی طرح وقت گزرتا رہا۔ اس کے بعد مغلوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اجمیر چتوڑ اور منڈل گڑھ جیسے فوجی اہمیت کے مقامات کو اپنے قبضے میں رکھیں اور دوسرے مقامات پر ڈھیل ڈال دیں۔ کہا جاتا ہے کہ رانا اپنی ریاست کے بیشتر علاقوں کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ رانا نے پچیس سال حکومت کی۔ اس نے اپنا بیشتر وقت آزادی اور اپنے عظیم خاندان کی قدیم روایات کی حفاظت میں صرف کیا۔ رانا ایک طویل عرصے تک زبردست سختیوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنے کے بعد عمر طبیعی کو پہنچنے سے قبل [illegible] سال کی عمر میں فوت ہوگیا لیکن اس نے اپنے پیچھے ایسی معرکہ آرا داستانیں چھوڑیں جو زیب تاریخ ہوکر آج بھی دنیا کے ہر آزادی خواہ انسان کے دل میں جوش کا طوفان اٹھا سکتی ہیں۔

استحکام سلطنت

۱۔ فوج

بیرم خاں کے زوال کے بعد سے اکبر رعایا کے معاملات میں بہت دلچسپی لینے لگا۔ اس کی عادت تھی کہ ہر معاملے میں احتیاط سے قدم اٹھاتا اور یہ کوشش کرتا کہ ہر مسئلہ اور اس کو حل کرنے کے متعلق پوری پوری معلومات حاصل کر لے۔ وہ 1561ء تک بھیس بدل کر آگرے کی گلی کوچوں میں فقیروں، سنیاسیوں اور عوام سے ملتا۔ اس نے 1562ء میں خود ہی راجپوتوں کے ساتھ ازدواجی تعلقات پیدا کرنے کا ایک تاریخی فیصلہ کیا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا اس وقت تک اس مسئلے کے سیاسی پہلو اور اس کے دوررس نتائج اکبر کے ذہن میں پوری طرح واضح ہو گئے تھے یا نہیں۔ بڑی حد تک یہ ممکن ہے کہ اس وقت تک راجپوتوں سے نزدیک ترین تعلقات قائم کرنے کا مقصد یہ ہو کہ اکبر افغانوں اور اپنے دربار کے ناقابل اعتماد امراء سے نجات حاصل کر سکے لیکن جب اس نے 1563ء میں متھرا سے یاتری ٹیکس (جو کہ ہندوؤں کے متبرک مقامات پر عائد تھا) ہٹا دیا اور 1564ء میں ہندوؤں سے جزیہ لینا بھی ختم کر دیا تو یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ کسی خاص مقصد اور منصوبے کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ احکامات جاری کر رہا تھا۔ ممکن ہے مزید اصلاحات اس کے بعد عمل میں

آئی ہوں لیکن ازبک بغاوت کے پھوٹ پڑنے کی وجہ سے جو پیچیدگیاں رونما ہوئیں انھوں نے شہنشاہ کی پوری توجہ لڑائیوں اور فتوحات کی طرف مبذول کردی۔ 1573ء میں گجرات کی فتح کے بعد ہی اکبر حکومت کے مختلف مسائل کی جانب توجہ دے سکا۔ اکبر کے دور حکومت میں 1573ء سے 1580ء بلکہ 1582ء تک کا زمانہ سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ اسی عرصے میں ہر قسم کی اصلاحات کی کوشش کی گئی اور ہر میدان میں حکومت کی سیاست پوری طرح بارآور ہوئی۔ اکبر نے بہار سے گجرات تک کا سفر کیا اور اپنی سلطنت کے مختلف علاقوں اور فوج کا بذاتِ خود معائنہ کر کے اُن کے حالات سے واقفیت حاصل کی۔ اس نے 1573ء میں طریقہ مالگذاری اور فوج کی از سرِ نو تنظیم کے لیے ایک قطعی منصوبہ تیار کرلیا۔ لیکن اس کا عملی نفاذ بنگال کے حالات کے سبب دو سال کے لیے ٹل گیا۔

1575ء میں پہلا فرمان جاری ہوا جس میں یہ اعلان کیا گیا کہ افسروں اور سرکاری ملازموں کو بجائے جاگیر کے نقد تنخواہیں دی جائیں۔ فوجی عہدوں کی از سرِ نو ترتیب دی گئی اور سرکاری گھوڑوں اور جانوروں کے داغنے کا طریقہ دوبارہ شروع کیا گیا۔ ان احکامات کا نفاذ 1578ء میں گجرات میں اور 1579ء میں مالوہ میں بھی کیا گیا۔ ان نئے قوانین کے مطابق افسروں کو یہ ہدایات صادر کی گئیں کہ وہ اپنے اپنے گھوڑوں کو ساز و سامان کے ساتھ بخشیوں کے پاس لے جائیں اور ان سے ان کو دغوالیں۔ یہ حکم بھی دیا گیا کہ سال میں کم از کم ایک مرتبہ یا پھر جب اُن کو جنگ پر جانے کا حکم ملے تب ہوں۔

شہنشاہ خود ہی ہر افسر کے ذاتی ملازموں اور ساز و سامان کا فیصلہ کرتا۔ داغ سے گر ان احکامات کا مقصد یہ تھا کہ آیندہ چل کر ایک بہت ہی منظم اور مستقل فوج وجود میں آجائے لیکن حریص افسر فوجی اجتماع یا قصرِ شاہی میں ماموریت کے موقع پر داغدار گھوڑوں کو قرض لے لیتے اور اس طرح بخشیوں کو دھوکے میں رکھتے۔

چنانچہ آخر میں یہ فیصلہ ہوا کہ ہر امیر کی فوج کے لیے ایک علیحدہ نشان مقرر کردیا جائے اور اگر کوئی گھوڑوں کو داغ کرانے میں تاخیر کرے تو اس کو سخت جرمانے کی سزا دی جائے۔

اکبر کو عربوں اور مغلوں کے رسم و رواج ورثے میں ملے تھے۔ اُسے خلفا ر چنگیز خاں اور تیمور کے آئین و رسوم سے اپنی سلطنت کے ملکی و فوجی انتظامات کے لیے مفید مواد ملا جس سے اسے نظامِ حکومت کے انتظام میں بڑی مدد ملی۔ ایک عملی انسان ہونے کی وجہ سے اُس سے اس بات کی اُمید کی جا سکتی تھی کہ وہ ہندوستان کے مروجہ طور طریقوں سے بھی پورا فائدہ اُٹھائے گا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر افسروں کے عہدوں کے تعین اور سپاہیوں کی درجہ بندی کے کام میں زیادہ تر ان اصولوں پر پابند رہا جن کو عباسیوں نے رومی و بازنطینی طریقے پر وضع کیا تھا اور چنگیز خاں و تیمور دونوں ہی نے ان کی تقلید کی تھی۔ ان کی فوجی تنظیم اعشاری طریقے پر ہوئی تھی۔ سب سے چھوٹا دستہ دس آدمیوں کا ہوتا۔ اس کے بعد سو، ہزار اور دس ہزار کے دستے ہوتے۔ عباسیوں نے دس اور سو کے درمیان پچاس پچاس کے دستے بھی مقرر کیے تھے۔

تیمور نے ہزاری، دو ہزاری، سہ ہزاری، چہار ہزاری یہاں تک کہ بارہ ہزاری عہدے مقرر کیے تھے لیکن سات ہزار تک کے دستوں کی قیادت عام طور پر بادشاہ کے لڑکوں کے ہاتھوں میں ہوتی۔ اس کا سب سے بڑا لڑکا جہانگیر مرزا بارہ ہزار کے دستے کا سالار تھا۔

ہندوستان میں بلبن کے زمانے تک ترکوں نے اعشاری طریقہ پر عمل کیا۔ سرخیل سے لے کر جو کہ دس سواروں پر تعینات ہوتا، سو، ہزار، دس ہزار اور یہاں تک کہ ایک لاکھ سواروں کے دستے کا ذکر پایا جاتا ہے۔ انھیں کے درمیان پچاس کا بھی افسر ہوتا ان دنوں ہزار سپاہیوں کا سالار امیر کہلاتا اور دس ہزار والا ملک کہلاتا۔

اسلام شاہ سور نے بھی تقریباً اسی نظام کی پیروی کی۔ البتہ اس نے کچھ درمیانے عہدے مثلاً 150 اور 500 کے بھی بنائے تھے۔ لہٰذا اکبر جس طریقے پر اپنا عشری نظام بنانا چاہتا تھا اس کی بنیاد اور قاعدے پہلے ہی سے موجود تھے۔ اکبر اپنی جدت پسندی کے سبب یہ چاہتا تھا کہ اللہ حروف کی رقم کے برابر فوجی منصب بھی 66 ہوں آئین میں جن منصبوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ دراصل 33 ہی تھے لیکن فہرست کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سے درمیانی مناصب جن کا ذکر موجود ہے ان کو یا تو

اس خیال سے کہ وہ بہت ہی غیر اہم تھے یا اس وجہ سے کہ ان کو ایک عمومی اور
قابلِ استعمال فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا تھا درج نہ کیا گیا۔ یہ بھی ممکن ہے
کہ یہ پورا منصوبہ آئین کے تحریر ہونے تک بروئے کار نہ لایا گیا ہو یا پھر اس میں
ضروری ترمیمات کر دی گئی ہوں۔ دس سے بارہ ہزار تک کے منصب موجود تھے۔
پانچ سو سے لے کر دو ہزار پانچ سو تک کے منصب دار امیر کہلاتے اور ڈھائی ہزار
سے بالاتر کے امیرِ اعظم۔ سب سے بڑا فوجی عہدہ خانِ اعظم تھا جو بعد میں خان خاناں
کہلایا جانے لگا۔ ایک وقت میں محض ایک ہی خانِ اعظم مقرر کیا جاتا۔ بعض مستثنا
کے علاوہ پانچ ہزاری سے بلند تر کے مناصب ان شہزادوں کو دیے جاتے جن کی
رگوں میں شاہی خون ہوتا۔ کبھی کوئی افسر سات ہزاری سے بلند تر درجے کو نہ پہنچا۔
اکبر کی سیاست یہ تھی کہ سب لوگ زینے کی نچلی سیڑھی سے شروع کریں اور اپنی
لیاقت یا خدمات کے مطابق ترقی کریں۔

مغلوں کے فوجی نظام کے سلسلے میں سب سے زیادہ متنازعہ فیہ مسئلہ یہ رہا
ہے کہ لفظ سوار اور ذات میں کیا فرق ہے۔ بلوخمن کا خیال ہے کہ لفظ ذات اعزازی
عہدے کو ظاہر کرتا اور لفظ سوار ہر ایک افسر کے تحت گھوڑوں کی مقررہ تعداد کو
بتاتا ہے۔ چنانچہ ایک ہزار ذات لیکن پانچ سو سوار والے افسر کا عہدہ تو ہزاری ہوا لیکن
حقیقت میں اس کے سواروں کی تعداد محض پانچ سو ہی تھی۔ اس کے برخلاف اروائن
کا خیال ہے کہ لفظ سوار کا تعلق افسر کے ماتحت سواروں کی واقعی تعداد سے نہ
تھا بلکہ وہ محض اعزازی تھا اور اس سے سواروں کی اس تعداد کا پتہ چلتا تھا جو
اس کے پاس ذات کے علاوہ ہوتے۔

اروائن کے نظریہ کی حمایت میں عمدہ شہادتیں موجود ہیں البتہ یہ بات مشکوک
ہے کہ آیا وہ طریقہ اکبر کے زمانے میں بھی رائج تھا یا نہیں 1923ء میں ہسٹوریکل
ریکارڈز کمیشن (Historical Records Commission) کے اجلاس میں ایک
مضمون میں یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ 1593-4ء سے پہلے سوار کے عہدے کا تصور نہ تھا۔
اس وقت تک سوار کے معنی و مقصد بہت محدود تھے۔ شاید اس لفظ کی اس سے
زیادہ اہمیت نہ تھی کہ اس کے استعمال سے اس بات کا پتا چلتا تھا کہ کسی افسر کو

اسس کی معمولی تنخواہ کے علاوہ اور کتنا بھتہ یا وظیفہ ملتا ہے۔ اس بھتے کی رقم دو دو روپیہ فی سوار کے حساب سے مقرر تھی۔ لہٰذا پانچ سو سوار کے معنی تھے کہ اسس کا بھتہ پورا پورا ہزار روپیہ ماہوار ہوتا۔ اسس نظریے کے مطابق لفظ ذات اسس عہدے کو ظاہر کرتا ہے جس کے لیے افسر کو اسس کی معمولی تنخواہ ملتی تھی اور سوار سے مطلب یہ تھا کہ اسس کو مزید بھتہ ملے گا۔ اس وقت سے اب تک اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن نہ تو کوئی نیا پہلو برآمد ہوا اور نہ کوئی بات ہی واضح ہو سکی۔

جہاں تک اسس بات کا تعلق ہے کہ ایک افسر کے ماتحت کتنے سوار ہوتے تو اسس کا جواب یہ ہے کہ پہلے تو اسس بات کا خود شہنشاہ ہی فیصلہ کیا کرتا لیکن بعد میں اسس کو "دہ بیستی" کے اصول پر طے کیا جانے لگا۔ اسس اصول کے معنی یہ تھے کہ دس سواروں کے منصب دار سے یہ توقع کی جاتی کہ وہ بیس سوار رکھے گا۔ لفظ دو اسپہ سے مراد وہ سوار ہے جس کے پاس دو گھوڑے ہوں اور یک اسپہ کی اصطلاح ان سواروں کے لیے استعمال کی جاتی جن کے پاس ایک گھوڑا ہوتا۔ کبھی کبھی نیم اسپہ کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک گھوڑا دو سواروں کے کام آتا۔

ہندوستانی خاندانی راجاؤں اور زمینداروں کے علاوہ سارے منصب داروں کے وجود کا دار و مدار شہنشاہ کی مرضی پر تھا۔ چنانچہ وہ جتنے وفادار ہو سکتے تھے اتنے ہی غدار بھی ہو سکتے تھے۔ منصب داری طرز میں وراثت کے طریقے کے نہ ہونے کو ایک طرف تو یہ کہہ کر سراہا گیا ہے کہ اسس میں سوشلزم بلکہ کیمونزم کی طرف رجحان پایا جاتا تھا اور دوسری طرف اسس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ سسٹم مغل شہنشاہ کی مطلق العنانیت پر پابندی عاید کرنے میں بالکل موثر ثابت نہ ہو سکا۔ دراصل یہ دونوں نظریے فضول اور خام خیالی کا نتیجہ ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ طرز تاریخ کے ایک طویل دور کی پیداوار ہے جس میں خانہ بدوشی کی زندگی سے لے کر قرون وسطیٰ تک کی جنگی ضروریات شامل ہیں۔ یہ طریقہ کار ایک سماجی و سیاسی طرز حکومت کی حیثیت سے وراثت میں ملا تھا اور اسس کو اسی شکل میں قبول کرنا پڑا۔ لہٰذا اسس طرز کے

وجود کے لیے نہ تو کسی حکمران کی تعریف کی جاسکتی ہے اور نہ کسی کو مورد الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے۔

منصب داروں کو اچھی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ مثال کے طور پر ایک تیسرے درجے کے سو سواروں والے افسر کو 500 روپیہ ماہوار، ہزار سواروں والے کو چار ہزار چار سو اور پانچ ہزار سواروں والے کو 28,000 روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ تنخواہ میں سے تقریباً نصف تو مقررہ معیار کے ہتھیاروں و سامان میں خرچ ہو جاتا اور بقیہ نصف منصب دار کے اخراجات کے لیے ہوتا۔ چنانچہ سو والے کو ڈھائی سو، ہزار والے کو دو ہزار دو سو اور پنجہزاری کو چودہ ہزار روپیہ ماہوار مل جاتے۔

اس زمانے میں روپے کی قیمت کا اندازہ اگر بہت ہی احتیاط سے بھی کیا جائے تو 1914ء میں جو روپے کی قیمت تھی اس سے کم سے کم سات گنا اور 1951ء کی قیمت کا اکیس گنا ہوگی۔ انہی اعداد و شمار سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ مغلیہ دور میں افسروں اور حتیٰ کہ سپاہیوں تک کو ناقابل یقین حد تک عمدہ تنخواہیں ملتی تھیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ شہنشاہ کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی اور مالی مفاد میں شریک ہوتے اور طبقہ حکام کا لاینفک جز بن جاتے۔ چنانچہ ان میں اس زمانے کے سماجی نظام کی خوبیاں اور کمزوریاں دونوں ہی پائی جاتی تھیں۔ کچھ عرصے تک تو یہ طرز صحیح نہج پر چلتا رہا لیکن بعد میں خرابیاں پیدا ہوتی گئیں کیوں کہ اس کی حیثیت ایک ایسے بدیشی پودے کی سی تھی جو ہندوستان کی زمین میں لگا دیا گیا ہو۔ اکبر نے کسی حد تک کامیابی کے ساتھ ترک و منگول طرز کو موروثی راجپوت تنظیم سے ملا کر ایک ملا جلا طرز ایجاد کیا۔

منصب داروں کے علاوہ سواروں کا ایک اور مختلف طبقہ تھا جن کو احدی کہتے تھے۔ احدی کے معنی ہیں ایک یا واحد۔ ان کو عام اصطلاح میں شریف فوجی کہا جاتا ہے ان کی تنخواہیں زیادہ تھیں۔ یہاں تک کہ احدی کو کبھی کبھی پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی جب کہ ایک معمولی سپاہی کی تنخواہ بارہ سے پچیس روپے ماہوار تک ہوتی۔ شروع شروع میں ایک احدی کے پاس آٹھ گھوڑے ہوتے لیکن بعد میں گھوڑوں کی زیادہ سے

زیادہ تعداد پانچ کردی گئی۔ احدیوں کی تعداد وقتاً فوقتاً کم یا زیادہ ہوتی رہتی۔ ایک دفعہ تو اُن کی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ گئی۔ احدیوں کا منصب داروں سے کوئی واسطہ نہ تھا لیکن میدانِ جنگ میں شہنشاہ کی واضح ہدایت کے بموجب وہ منصب داروں کے ساتھ شریک ہوتے۔ احدی شہنشاہ کے احکامات کے تابع تھے اور اُن کے دیوان و بخشی بھی الگ الگ ہوتے۔ اُن کا امتیازی نمبر ٥ تھا۔

ترکوں کی طرح مغل بھی زیادہ تر سواروں پر ہی بھروسہ کرتے اور ان کی فوج کی بڑی تعداد سواروں پر ہی مشتمل ہوتی۔ سوار خاص طور سے میدانی جنگ میں بہت کارآمد ثابت ہوتے کیوں کہ وہ تیزی سے نقل و حرکت کرسکتے تھے اور نسبتاً زیادہ سختی سے حملہ کرتے تھے۔ اس وقت تک ہندوستان میں توپوں کا استعمال اتنا عام نہ ہو پایا تھا کہ وہ سواروں سے جو فائدے تھے اُن کو بے اثر بنا دیتا۔ سوار ہی سلطنت کے فوجی نظام کی ریڑھ کی ہڈی سمجھے جاتے۔

بہرحال یہ نہیں کہا جاسکتا کہ پیادہ فوج کے فائدوں سے لوگ ناواقف تھے۔ ملک کے پہاڑی اور دشوار گذار علاقوں میں پیادہ فوج سواروں کی نسبت ہمیشہ زیادہ مفید ثابت ہوتی۔ شیر شاہ کی فوج میں بھی پیادہ دستے موجود تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے شیر شاہ کی نسبت پیادہ فوج پر زیادہ توجہ دی۔ جنگی نقطۂ نظر سے پیادہ فوج دو حصّوں میں منقسم تھی۔ ان میں سے ایک بندوقچی تھے اور دوسرے شمشیر زن۔ اکبر کی فوج میں بارہ ہزار بندوقچی تھے اور اُن کے سردار کو داروغہ توپچیاں کہا جاتا تھا۔

شمشیر زن فوج کئی دستوں میں منقسم تھی اور اُن میں سے ہر ایک دستہ الگ الگ اسلحے استعمال کرتا۔ مثلاً اگر کسی دستے کے پاس تلوار تھی تو کسی کا ہتھیار خنجر، کسی کا چاقو تھا تو کسی کا چوب و چاق۔

منصب دار اور احدی فوجوں کے علاوہ جو کہ مستقل فوج کا جزو تھے غیر مستقل فوج یا ملیشیا بھی ہوتی جس کو راجا بروقت ضرورت مہیا کرتے۔ اندازہ یہ ہے کہ اگر سب راجا پوری پوری مقررہ فوجی تعداد فراہم کرتے تو اُن کی کل تعداد ٤٤ لاکھ تک پہنچ جاتی۔ ان فوجوں کا انتظام اسی طرح ہوتا جس طرح کہ ان کے متعلقہ راجاؤں کا طریقہ تھا اور

یہ راجا اُن کی قیادت خود اپنے ہاتھ میں رکھتے۔ عام طور پر ان کو شاہی حکومت سے کوئی وظیفہ نہ ملتا تھا لہٰذا ان سے یہ توقع نہ رکھی جاتی کہ وہ مستقل فوج کے قوانین کی پابندی کریں گے۔

اکبر کو ہاتھیوں کا بہت شوق تھا۔ ہاتھی مال برداری اور جنگ دونوں میں کام آتے۔ اگر ان کو اچھی طرح استعمال کیا جاتا تو وہ جنگ میں فیصلہ کن ثابت ہوتے۔ البتہ کبھی کبھی اگر وہ ڈر جاتے تو خطرناک بھی ثابت ہوتے۔ ہزاروں ہاتھیوں کو جنگ کی تربیت دی جاتی۔

اکبر کے اصطبل خاص میں ایک ہزار اعلیٰ نسل کے ہاتھی موجود تھے جن کی تربیت وغذا کا بہت معقول انتظام تھا۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ ساری سلطنت میں تقریباً پچاس ہزار ہاتھی موجود تھے۔ البتہ وہ سلطنت کے مختلف علاقوں میں منقسم تھے اور اُن میں سے تقریباً پانچ ہزار جنگی تربیت حاصل کیے ہوئے تھے۔

بابر کے حملے کے بعد سے رفتہ رفتہ توپوں کا استعمال شمالی ہندوستان میں عام ہو گیا۔ ہمایوں اور شیر شاہ دونوں کے پاس توپ خانے تھے لیکن اکبر نے اس پر اُن دونوں سے زیادہ توجہ دی۔ اکبر کی سرپرستی میں لوہے اور تانبے کی بھاری بھرکم توپیں بنائی گئیں جن سے کہ ۰۰۰ پونڈ کے گولے برسائے جا سکتے تھے۔ یہ بھاری توپیں نقل وحمل کے قابل نہ تھیں لہٰذا قلعوں کے محاصروں اور بحری جنگ کے لیے بڑی تعداد میں ایسی توپیں تیار کی گئیں جو نسبتاً آسانی سے لے جائی جا سکتی تھیں۔

اکبر نے توپ خانے کی اصلاح کے لیے جو سب سے بڑا کام کیا وہ یہ ہے کہ اس نے ایسی سبک اور چھوٹے چھوٹے حصوں میں علیحدہ کی جا سکنے والی توپوں کو ایجاد کیا جن کو ہلکی ہلکی گاڑیاں ہاتھی، اونٹ یا آدمی لے جا سکتا تھا اور اس طرح توپ خانہ تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا تھا۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ توپوں کی صحیح تعداد کتنی تھی لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ اُن کی تعداد بہت زیادہ ہو گی۔ ترکی توپ خانے کو چھوڑ کر اکبر کا توپ خانہ سارے ایشیا میں کسی سے کم نہ تھا اور اکبر کے زمانے میں وہ اپنی افادیت کے اعلیٰ ترین معیار

پر پہنچ چکا تھا۔

اکبر کی سلطنت زمینی علاقوں پر مشتمل تھی۔ گجرات کی فتح کے بعد ہی اس کی سرحدیں ساحل سمندر تک پہنچ گئیں۔ اس وقت تک پرتگالی سمندر پر حاوی ہو چکے تھے اور وہ ہندوستان کے کسی بھی حکمران کے بحری بیڑے کی ترقی کو حاسد نگاہوں سے دیکھتے۔ ان حکمرانوں کے لیے پرتگالیوں سے لڑے بغیر اور اپنی بیرونی تجارت کو نقصان پہنچائے بغیر ایک ایسا طاقت ور بحری بیڑا بنانا ممکن نہ تھا جس کی مدد سے وہ سمندری راستوں پر قبضہ کر سکیں۔ جب تک کہ دکن سلطنت میں شامل نہ ہو جائے اس منصوبے کا کامیاب ہونا ممکن نظر نہ آتا تھا۔

اگر ہم شیواجی کی ان ناکامیوں کو مدنظر رکھیں جن کا اس کو بڑی کوششوں کے باوجود سامنا کرنا پڑا تو ہم اکبر اور بہادر شاہ کی مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اکبر کی دلی خواہشات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ بحیرۂ عرب میں پرتگالی بحری ڈاکوؤں کا قلع قمع کر دیا جائے لیکن اس سے قبل کہ وہ اس مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ عمل کرتا اس کے عمر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

دریائی لڑائیوں کے لیے جس کی ضرورت شہنشاہ کو اکثر پیش آتی اس کے پاس مؤثر دریائی بیڑے موجود تھے۔ یہ بیڑے خاص طور سے بنگال بہار اور سندھ میں متعین تھے۔ ان بیڑوں کی افادیت کو بڑھانے کے لیے اکبر نے ۱۰۰ اور ۱۱۱ فٹ کی بڑی بڑی کشتیاں بنوائیں جن میں ۳۰۰ ٹن وزن کا سامان لے جایا جا سکتا تھا لیکن اتنی بڑی کشتیاں زیادہ نہ تھیں کیونکہ ندیوں میں ان کشتیوں کا کھینا ممکن نہ تھا۔ اس نے لاہور اور الہ آباد میں جو کشتی سازی کے کارخانے بنائے وہ بہت ہی مفید ثابت ہوئے۔

اگر اکبر کچھ عرصے اور زندہ رہتا تو وہ یقیناً ہر قیمت پر بحری بیڑا تیار کر لیتا۔ بہرحال اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے زمانے میں کوئی ایسا بحری بیڑا نہ تھا جس کو قابل اہمیت سمجھا جا سکے۔

مغل فوجی تنظیم کی سب سے اہم خصوصیات میں سے ایک خصوصیت چھاؤنی تھی ترکوں اور مغلوں نے چونکہ صحرانشیں تھے خیمہ زنی کے سازو سامان کی تیاری میں بڑی

مہارت حاصل کر لی تھی۔ اگر خیمہ زنی کا یہ طریقہ نہ ہوتا تو کوئی حکمراں خواہ اس کی نیت کتنی ہی عمدہ کیوں نہ ہوتی فوج کو لوٹ مار، بربادی اور غیر ضروری تشدد آمیز اعمال سے روک نہ سکتا تھا۔

مغل چھاؤنی خصوصاً اُس وقت جب کہ شہنشاہ بھی سفر کر رہا ہو بہت ہی لمبی چوڑی ہوتی۔ خیمے اس ترتیب سے لگائے جاتے کہ چھاؤنی شہر کی شکل اختیار کر لیتی۔ یہ خیمے 6 سے لے کر 20 میل یا اس سے بھی زیادہ رقبہ گھیرتے۔ چھاؤنی میں ایک سے دو لاکھ آدمی تک رہتے۔ یہ متحرک چھاؤنی اس زمانے کے بڑے سے بڑے یورپی شہر کے برابر ہوتی اور اس میں تو شک ہی نہیں کہ لندن کی آبادی سے یقیناً بڑی ہوتی۔ اس بات سے مغلوں کی انتظامی لیاقت اور استعداد کا پتہ لگتا ہے کہ انسانوں کی اس قدر زبردست جماعت نظم و انتظام کی پوری طرح پابند تھی۔ جورڈین نے عہد جہانگیری میں اس ضمن میں یہ لکھا ہے کہ چھاؤنی میں "ہم لوگ اسی قدر حفاظت و اطمینان سے رہتے جیسے کہ ہم اپنے گھروں میں ہوں۔ میں نے چھاؤنی سے زیادہ بہتر نظم و نسق کہیں اور نہیں دیکھا۔ ہر چیز افراط سے موجود تھی"۔ خیموں کو اس ہوشیاری اور قابلِ تعریف طریقے سے لگایا جاتا کہ اگر کوئی شخص ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا چاہے تو بلا کسی تکلف کے آجا سکتا تھا گویا کہ وہ "مستقل اور تعمیر شدہ آبادی کے اندر ہوں"۔

سب سے زیادہ حیران کن بات تو یہ تھی کہ خیمے بڑی تیزی کے ساتھ نصب کیے جاتے تھے۔ اس کام میں چار گھنٹے سے زیادہ وقت صرف نہ ہوتا۔

موٹر گاڑیوں کی ایجاد سے قبل نقل اور فوجی رسد کے لانے لے جانے کا مسئلہ بہت دشوار تھا۔ فوجی پڑاؤ میں ہر عام استعمال کی چیز مناسب داموں پر مل جاتی۔ کھانے کا سامان بنجارے فراہم کرتے۔ یہ بنجارے فوج کے ساتھ ساتھ چلتے۔ امراء اور بڑے بڑے افسر اپنے ساتھ کھانے کا سامان رکھتے جو ان کی کئی دن کی ضروریات کے لیے کافی ہوتا لیکن عام سپاہی اور فوج کے ہمراہی اپنی روزمرہ کی ضروریات اردو یعنی بازار سے خریدتے تھے۔ اکبر جب حکیم مرزا کے خلاف مہم پر جا رہا تھا تو اس نے بذاتِ خود فوجی بازار میں بکنے والے کھانے پینے کے سامان کا معائنہ کیا۔ سامان کی

فراہمی کا طریقہ بہت ہی قدرتی، کم خرچ اور قابلِ اطمینان تھا۔
ایسا واقعہ اتفاق سے ہی کبھی پیش آیا ہو جب کہ رسد میں کمی پڑ گئی ہو ایسی اضطراری حالت میں حکومت سامان رسد بہم پہنچاتی اور اگر ایسا ممکن نہ ہوتا تو پھر اس کی فراہمی کے لیے زور و زبردستی کی جاتی۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ایسی صورت بہت کم پیش آتی۔ حالانکہ اسی زمانے میں یوروپ میں یہ باتیں عام تھیں۔
اکثر یوروپین مصنفوں نے اور اُن کی دیکھا دیکھی کچھ ہندوستانیوں نے بھی مغل فوج کو "فی نفسہٖ کمزور" بیان کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ وہ ایک "مسلح گروہ" سے کچھ ہی بہتر تھی۔ شاید یہ نظریہ بغیر سوچے سمجھے بیان کر دیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کو اکبر کی فوج پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ اکبر کی فوج کو بابر کی فوج سے بھی "مستعد اور فاتح" بتایا جاتا ہے اور وہ کسی طرح بھی سلیمان باشکوہ کی عثمانی فوج سے کم نہ تھی حالانکہ وہ یوروپ کی بہترین افواج میں شمار کی جاتی تھی۔

2- امور مالگذاری

گجرات کی فتح کے بعد فوجی اصلاحات کی طرح شہنشاہ نے امور مالگذاری کی طرف بھی توجہ کی اور اس سلسلے میں کئی تجربات کیے۔ اسلام شاہ کی موت کے بعد جب افراتفری پھیلی تو شیر شاہ کا نظام بھی کمزور ہو گیا۔
ہمایوں نے واپسی کے بعد ملک کو امراء اور افسروں کے درمیان تقسیم کرنے کا اصول قائم کیا۔ شاہی اراضیات و جاگیر کے درمیان کوئی واضح فرق نہ تھا اور امور مالیات بہت ہی خراب حالت میں تھے۔ بیرم خاں کی حکومت میں کوئی خاص اصلاح عمل میں نہ آئی۔ بیرم خاں کے دورانِ حکومت میں مرکزی سرکار ہر سال اپنے مطالبات غلہ کی پیداوار اور پرگنہ جات میں غلہ کی قیمت کی بنیاد پر مقرر کرتی۔ شاید یہ طریقہ سوریوں سے حاصل ہوا تھا۔ اس میں یہ خرابی تھی کہ ہر سال حکومت کا مطالبہ پیداوار اور غلہ کی قیمت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا اور جب تک کہ مرکز سے مطالبات کا نرخ حاصل نہ ہو جاتا اس وقت تک وصول یابی کا کام معطل رہتا۔

ان خامیوں کی وجہ سے مالگزاری کی وصول یابی میں اکثر تاخیر ہوجاتی جس کے سبب افسرانِ حکومت اور رعیت دونوں کو مشکلات کا سامنا کرنا ہوتا اور مال گزاری ہمیشہ کم زیادہ ہوتی رہتی۔ علاوہ ازیں غلہ کی پیداوار اور اس کے نرخ کی تفصیل حاصل کرنا بھی ایک خرچ طلب اور ناقابلِ اطمینان طریقہ تھا۔

1560ء میں عبدالمجید آصف خاں وزیر مال مقرر ہوا۔ اس کا زمانہ بیرم خاں کی بغاوت اور اس کے بعد کی افراتفری کا زمانہ تھا۔ اس نے افسروں کو خوش رکھنے کے لیے جاگیروں کی آمدنی کی رقم خوب بڑھا چڑھا کر لکھی تاکہ انھیں یہ احساس ہو کہ جو جاگیریں ان کو ملی ہیں وہ خوب آمدنی والی ہیں۔ یقیناً یہ ایک زبردست دھوکا بازی تھی جس سے وقتی طور پر تو سیاسی مطلب حل ہو سکتا تھا لیکن آگے چل کر یہ سیاست ملک کے لیے جاگیرداروں کے لیے اور سب سے زیادہ رعیت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ 1563ء میں اعتماد خاں (بہلول ملک) جو کہ شیر شاہ اور اسلام شاہ کی ملازمت بھی کر چکا تھا وزیر مالیہ مقرر ہوا۔ اس کی تفتیش سے یہ پتہ چلا کہ مالی کاغذات میں غلط اور ناقابلِ اطمینان اندراجات کرنے کے علاوہ شاہی اور جاگیرداری زمینوں کے درمیان واضح فرق نہ تھا۔ سکّے کی حالت غیر یقینی تھی اور اس وجہ سے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

چنانچہ اس نے سرکاری اراضیات کو جاگیری زمینوں سے علیحدہ کیا اور یہ حکم دیا کہ سکّوں کی ظاہری قیمت کو قبول کیا جائے۔ اس کے علاوہ اس نے مال اور خزانے کے دفاتر کی از سرِ نو تنظیم کی۔

1564ء میں مظفر علی خاں کو شاہی دیوان بنایا گیا۔ وہ آصف خاں کی جعلی کارروائیوں سے تنگ آگیا لہٰذا اس نے مقامی قانون گوؤں کے کاغذات سے فصلوں کے صحیح اندراج کی نقل کرنے کے لیے دس قانون گو مقرر کیے۔ ان اندراجات کی بنا پر مالگزاری کا ایک نیا رجسٹر بنایا گیا اور اس کا نام جمع حال حاصل رکھا گیا۔ یہ رجسٹر بھی پوری طرح اطمینان بخش نہ تھا کیوں کہ اس کی بنیاد بھی براہِ راست اطلاعات پر مبنی نہ تھی۔ یہ اطلاعات مقامی قانون گوؤں نے مہیا کی تھیں اور ان کی درستی بھی قابلِ اعتماد نہ تھی۔

1566ء میں شہاب الدین احمد خاں کو سرکاری اراضیات کا دیوان مقرر کیا گیا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ ہر سال فصلوں اور قیمتوں کا اندازہ لگانا نہ صرف خرچ طلب غلط طریقہ ہے بلکہ سلطنت کی وسعت کے سبب ممکن العمل بھی نہیں اور جب تک مناسب انتظامات نہ ہوں یہ طریقہ قابل اطمینان ڈھنگ سے انجام نہیں پا سکتا لہٰذا اس نے ضبط ہر سالہ کا اصول ختم کر دیا اور نسق کے طریقے کا آغاز کیا جس میں حکومت اور زمیندار کے درمیان آپس میں معاملہ طے پا جاتا۔ یہ ایک قسم کی اجارہ داری کا طریقہ تھا جو چنداں تسلی بخش نہ تھا۔

1570-71ء میں مظفر خاں کو ایک بار پھر وزارت مال کا کام سپرد کیا گیا اس نے وقت ضائع کیے بغیر نرخ مالگذاری کے تعین کے لیے اپنے پرانے طریقے کا آغاز کیا جس کی بنیاد حساب کتاب اور قیمت کے اندازے پر مبنی تھی۔

گجرات اور بنگال کی فتح کے بعد اکبر نے امور مالگذاری پر ذاتی توجہ مبذول کی۔ جاگیرداروں کے خاتمے کے اصول نے از سر نو تنظیم کو ضروری قرار دیا۔ 1575ء میں زمینوں کی پیمائش اور دوسری معلومات حاصل کرنے کے لیے ملازمین روانہ کیے گئے۔

پیمائش کے لیے اکبر نے یہ حکم دیا کہ بجائے طناب کے بانس کی چھڑیوں کو لوہے کے چھلوں سے ملا کر کام لیا جائے کیوں کہ یہ چھڑیاں طناب کی طرح سکڑتی یا بڑھتی نہ تھیں۔

جانچ کا یہ کام سلطنت کے سارے علاقوں میں انجام نہیں دیا گیا اور صرف پنجاب اتر پردیش، اجمیر، مالوہ اور مشرقی و جنوبی گجرات میں ہی پیمائش کی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راجاؤں کی پہاڑی ریاستیں، راجپوت حکومتیں، بہار، بنگال اور ملتان کے کچھ حصے چھوڑ دیے گئے۔

سلطنت کی صرف خاص کی اراضیات میں 182 کروڑی مقرر کیے گئے ہر کروڑی کا حلقۂ اختیار ایک کرور تنکہ یا 2,500,00 روپیے کی پیداوار کے علاقے کے برابر ہوتا۔ اس کا فرض تھا کہ وہ اپنے حلقۂ اختیار کے اندر اراضیات کی حدود کا تعین کرے۔ آمدنی کے مختلف وسائل کا اندراج کرے اور یہ دیکھے کہ مختلف ذرائع

آمدنی اور ہر قسم کی فصل سے کس قدر در آمد ہوئی۔ اس کی مدد کے لیے ایک کارکن اور ایک فوطے دار (خزانچی) مقرر کیا جاتا۔ نقد دام کے مطالبات مقامی قیمت کو مدنظر رکھتے ہوئے طے کیے جاتے۔

1580ء میں مرکزی حکومت کے دفاتر میں اتنا مواد جمع ہو چکا تھا کہ اس کی بنیاد پر کام کیا جاسکے۔ حالانکہ راجا ٹوڈر مل وزیر اعلیٰ مالیات تھا لیکن اصلاحات کے نفاذ کا کام اس کے ساتھی خواجہ شاہ منصور کے ہاتھوں میں تھا۔ پہلا کام یہ انجام دیا گیا کہ مختلف سرکاروں کو ملا کر صوبوں کی تشکیل کی گئی۔ چنانچہ سلطنت مندرجہ ذیل بارہ صوبوں میں منقسم ہو گئی۔ ملتان۔ لاہور۔ دہلی۔ آگرہ۔ الہ آباد۔ اودھ۔ بہار۔ بنگال معہ اڑیسہ کے مفتوحہ علاقہ جات۔ مالوہ۔ اجمیر۔ گجرات اور برائے نام کابل۔ ان میں سے ہر ایک صوبے میں مالگذاری کے کام کی دیکھ بھال کے لیے ایک ایک دیوان مقرر کیا گیا۔

لیکن سب سے زیادہ اہم اصلاح جس کے لیے اکبر کی خاص طور سے تعریف کی جانا چاہیے وہ اس کا دہ سالہ جدول نرخ نامہ ہے۔ ہر صوبے کے ایسے پرگنوں کو ملا کر جو کہ پیداوار کے لحاظ سے یکساں تھے حلقۂ محصول مقرر کیے گئے اور ہر حلقے کے لیے علیحدہ علیحدہ مالگذاری کے نرخ کا تعین کیا گیا۔ حالانکہ مالگذاری جنس پیداوار کی ایک تہائی کی بنیاد پر ادا کی جاتی لیکن مطالبے کو نقد میں تبدیل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ 1580ء سے دس سال قبل ہر جنس کی جو قیمتیں رائج تھیں یا ان کا اندراج سرکاری کاغذات میں تھا ان کا اوسط نکال کر مطالبے کی رقم مقرر کر دی جائے۔ مطالبے کی نقد رقم متعین ہوتی یعنی پہلے کی طرح پیداوار اور قیمتوں میں کمی بیشی سے مطالبے پر فرق نہ پڑتا۔

یہ خیال کرنا کہ دہ سالہ سے مراد یہ ہے کہ یہ انتظام دس سال کی مدت کے لیے ہوتا یا ہر دس سال بعد بدل جاتا درست نہ ہوگا۔ نہ اس انتظام کو بندوبست استمراری کہا جاسکتا ہے کیونکہ حکومت نے اس قسم کی کوئی ضمانت نہ دی تھی کہ یہ بندوبست ناقابل تغیر ہے۔ بہر حال عملی طور پر نیت یہی تھی کہ یہ بندوبست غیر معینہ مدت تک چلتا رہے گا اور یہ انتظام کم از کم اکبر کے دور حکومت میں بغیر کسی تبدیلی کے جاری رہا۔

وہ سارے بندوبست کے فوائد بالکل واضح تھے۔ اس کی وجہ سے مالگذاری کے تعین کا کام اس قدر آسان ہوگیا کہ مالگذاری جمع کرنے والوں کو اس قاعدے کے نفاذ کرنے اور حکام بالا کی ہدایات حاصل کیے بغیر مالگذاری وصول کرنے میں کوئی دقت نہ ہوتی۔ یہ بندوبست حکومت کے لیے بھی مفید ثابت ہوا کیوں کہ حکام کو ہر ذخیرہ پیداوار کے کاغذات کے انبار وں کو چھانٹنے، قیمتوں کے معلوم کرنے اور مطالبے کے تعین کے کام سے نجات مل گئی۔

اس کے علاوہ ایک فائدہ یہ ہوا کہ جوں ہی زیر کاشت زمینوں کی فہرست حکام کو پہنچ جاتی وہ حکومت کی آمدنی کا اچھا خاصا تخمینہ لگا سکتے تھے۔ کاشت کاروں نے بھی اس بندوبست کو پسند کیا کیونکہ اس طرح ان کو معلوم ہو جاتا کہ وہ جو جنس بونے والے ہیں اس کی کتنی مالگذاری سرکار کو دینا ہوگی اور اس طرح سے وہ ایک غیر یقینی حالت اور مالگذاری جمع کرنے والے حکام کی بے ایمانی و شرارت سے بچے رہتے۔ علاوہ ازیں کاشت کار کو یہ بندوبست مناسب اور عادلانہ معلوم ہوتا تھا۔ کیوں کہ قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کا فائدہ و نقصان دونوں ہی اب سرکار کے بجائے کاشت کار کی ذمے داری قرار پائی۔"

کسانوں کو حکومت کے اس وعدے سے اور بھی تقویت ملی کہ اگر پیداوار کو آفات ارضی و سماوی کے سبب بہت نقصان پہنچا تو حکومت اپنے مطالبات کم کر دے گی۔ دراصل "پیداوار کی بربادی کی صورت میں مطالبات میں خود بخود تخفیف ہو جاتی"۔ حکومت نے سارے مراحل طے کرنے کے بعد جو بندوبست نافذ کیا وہ ملک کی ساری زمینوں کے لیے تھا۔ وہ صرف خاص کی زمینیں ہوں یا بخشی ہوئی جائدادیں۔

زمین کی تقسیم بندی اس کی کاشت کی مدت کی بنا پر کی گئی۔ وہ زمین جو کہ مستقل طور پر جوتی جاتی اس کو پولج کہتے۔ جو زمین تین چار سال تک بغیر کاشت کے پڑی رہتی اس کو چچر کہتے۔ جو زمین پانچ سال یا اس سے زیادہ عرصے کے لیے زیر کاشت نہ آتی اس کو بنجر کہا جاتا۔ پولج، چچر اور پرتی زمینوں کو مزید تین درجوں میں تقسیم کیا گیا۔ عمدہ، خراب اور متوسط۔

زمین کے ان درجات کی پیداوار کا اوسط نکال کر اس کو حکومت کا حصہ

قرار دیا گیا۔ اگر پرتی زمین محض ایک سال بے کاشت پڑی رہتی تو پھر آیندہ جب اس میں کاشت ہوتی تو اس کا مطالبۂ مالگزاری پولج زمین کی شرح پر طلب کیا جاتا اور اگر یہی زمین دو سال تک بے کاشت رہتی تو اس کی مالگزاری پہلے سال کے مطالبے کی رقم کا تین چوتھائی ہوتی اور دوسرے سال پورا مطالبہ وصول کیا جاتا۔

اکبر کی سیاست یہ تھی کہ کاشت کار اس بات کی کوشش کریں کہ خراب قسم کی زمینوں کو بہتر بنایا جا سکے اور اس طرح اعلیٰ قسم کی پیداوار کو زیادہ وسعت دی جا سکے۔ اسی مقصد سے اس نے چچر اور بنجر زمینوں پر کم اور تدریجی محصول عاید کیے تاکہ وہ زمین اگلے چند سال کے عرصے میں پولج کی قسم کو پہنچ جائے اور اس کے بعد مالگزاری معمول کے مطابق وصول کی جا سکے۔

حکومت نے ایسی فصلوں کے سلسلے میں جن کی پیداوار کے لیے کافی رقم اور محنت کی ضرورت ہوتی محصولات کی شرحیں مختلف مقرر کی تھیں۔

نئی اصطلاحات کے استعمال کی تشریح ابھی تک قطعی طور پر نہیں ہو سکی ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ اس موضوع پر جو نظریات عام طور سے اب تک بیان کیے گئے ہیں ان ہی کو دہرایا جائے۔

عام طور پر مالگزاری کی تحصیل کے تین طریقے تھے۔ غلہ بخشی، نسق اور ضبط۔ غلہ بخشی شاید وہ "ابتدائی ہندوستانی طریقہ تھا جس میں پیداوار کا ایک حصہ حاکم لے لیا کرتا۔" اگر لوگ چاہتے تو یہ طریقہ سلطنت کے کسی بھی حصے میں نافذ کیا جا سکتا تھا لیکن عام طور سے یہ طریقہ سندھ، سفلی کابل کے کچھ علاقوں اور خاص طور سے قندھار و کشمیر میں رائج تھا۔ نسق بھی "مالگزاری کا ایک معروف اور قدیمی طریقہ تھا۔" اس زمین کی پیمائش و پیداوار کی تقسیم کو کوئی دخل نہ تھا۔ یہ ایک سیدھا سادا سمجھوتہ تھا جو سرسری تخمینوں اور فوری اندازوں کی بنیاد پر حکومت اور زمین کے مالک کے درمیان انجام پاتا خواہ وہ زمیندار ہوں یا کاشت کار۔

اگر معا۔۔ہ کاشت کار کے ساتھ ہوتا تو رعیت واڑی کہلاتا اور اگر اس میں دوسرا فریق زمیندار ہوتا تو ۔۔ں کو زمینداری کہا جاتا۔ یہ سلسلہ بنگال، کاٹھیاواڑ اور گجرات کے بعض علاقوں میں رائج تھا۔ جنبلی سسٹم کے مطابق "زمین کا ہر وہ قطعہ جس میں

تخم ریزی ہوئی ہو اس کی مالگذاری پیداوار ... یت کے مط ... ہونی چاہیے
اس نظم سے حکومت کو چند واضح فائدے تھے۔ اس اصول کے تحت مالگذاری عموماً
نقد وصول کی جاتی اور اس میں پیداوار کی کمی زیادتی کے سبب جو تبدیلیاں ہوتیں
ان کا خیال نہ کیا جاتا۔ انہی وجوہ کی بنا پر حکومت اس طریقے کو زیادہ پسند کرتی
لیکن یہ ان کسانوں پر زبردستی نافذ کیا جاتا جو اس کو پسند نہ کرتے۔

اصولاً یہ طریقہ بہار، الٰہ آباد، مالوہ، اودھ، آگرہ، لاہور، دہلی اور ملتان
میں رائج تھا۔ بہرحال اس بات سے یہ اندازہ نہ لگایا جائے کہ کسی صوبے میں کسی
ایک طریقے کے رائج ہونے کے سبب دوسرے طریقے کے لیے کوئی جگہ باقی نہ تھی۔ اگر
مقامی حالات کا تقاضا ہوتا تو دوسرے طریقے بھی ایک ہی ساتھ رائج ہو سکتے تھے۔
محض یکسانیت کی خاطر کاشت کاروں کی سہولت اور قدیم مقامی رواجوں کو قربان
نہ کیا جاتا۔

اکبر کی مقرر کردہ مالگذاری کے نرخ گو زیادہ نہ تھے مگر بہت ہلکے بھی نہ تھے۔
ان چند صدیوں کے دوران اکبر کو رعایا کے باپ کی طرح سمجھا جاتا رہا۔ اس کی
وجہ یہی ہے کہ اس نے ایک ایسا طرز رائج کیا جو مستقل تھا اور جس کو کاشت کار
سمجھ سکتے تھے۔ اس کے مطالبات کی شرحیں مقرر تھیں اور اس وجہ سے حکومت
اور کسان دونوں کو غیر یقینی اور امید و بیم کی حالت سے نجات مل گئی تھی۔ اس
کے علاوہ اکبر سوری حکمرانوں سے بھی سبقت لے گیا۔ کیونکہ اس نے کسانوں کو متعدد
چھوٹے چھوٹے اور تکلیف دہ ٹیکسوں اور محصولات سے نجات بخشی

اکبر نے جزیہ، زکوٰۃ اور زیارت ٹیکس کے علاوہ درختوں، مویشیوں کی فروخت،
بیلوں، نمک بازاروں، مچھواروں، سراؤں، کھالوں، تیل، کمبل، وزن کشی، رہائشی
جائداد، فصل کاٹنے کی اجازت پر جو ٹیکس لگائے جاتے تھے ان سب کو معاف کر دیا
اور تحصیلدار، وارد غہ، خزانے دار و سکہ کی جانچ پڑتال کرنے والوں کی فیس کو سختی سے
ممنوع قرار دیا۔ بغیر اس کے کہ اس بیان کو لفظ بہ لفظ درست سمجھا جائے یہ
خیال کیا جا سکتا ہے کہ ان ٹیکسوں کے معاف کر دینے کی وجہ سے غریبوں کو کافی حد
تک سہولت مل گئی ہوگی۔ کوتوالوں اور عمالوں کو ہدایت کی گئی کہ ان احکامات پر

پوری طرح عمل درآمد کیا جائے۔ اور جب بھی رشوت ستانی کا کوئی معاملہ ہاتھ آتا تو قرار واقعی سزا دی جاتی۔ اگر قحط سالی آفات ارضی و سماوی یا قیمتوں کے غیر معمولی اُتار چڑھاؤ سے کسانوں کو زیادہ نقصان ہوتا تو اکبر مالگذاری و محصولات میں چھوٹ دے دیتا۔ اس کے علاوہ غریب کاشت کاروں کو بیج، مویشی اور آلات کاشت کاری کی خریداری کے لیے پیشگی روپیہ بھی مل جاتا اور اس طرح ان لوگوں کی حالت میں استواری آجاتی جو اپنی معاشی زندگی کا آغاز کرتے۔

اسی طرح اکبر کے ان احکامات کو جو اس نے فائدہ مند مویشیوں کی دیکھ بھال کے لیے صادر کیے اور جن کے ذریعے گائے بیل اونٹ بھینس وغیرہ کے چرانے کے لیے مفت چراگاہوں کا انتظام کیا گیا۔ کسانوں نے پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ شاہی اور حکومتی اراضیات میں رعیت واڑی طرز کے قیام اور ساری سلطنت میں یکساں زراعتی طرز کا نفاذ رعایا کے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ کیوں کہ اس طرز کے بروئے کار آنے سے رعایا نے زمینداروں اور جاگیرداروں کی زیادتیوں اور لالچی چنگل سے نجات پاکر اطمینان کا سانس لیا ہوگا۔

3- سیورغال

مسلم ریاست کے قیام کے آغاز ہی سے اس کے فرائض میں علماء، فضلاء، دانش ور اور مفلس و نادار، خستہ و درماندہ افراد، بیواؤں اور باعزت غیر ملازمت یافتہ لوگوں کی پرورش شامل رہی ہے۔ حکومت یا تو ان کو نقد مالی مدد دیتی یا پھر زمین یا دونوں ہی چیزیں دیتی۔ نقد امداد کو وظیفہ کہتے اور اگر اس مقصد کے لیے زمین ملتی تو اس کو ملک، مدد معاش یا سیورغال کہتے۔

ابتدائی حکمرانوں نے مدد معاش میں بڑی بڑی زمینیں عنایت کیں۔ مثال کے طور پر صرف گجرات میں سلطنت کی کل آمدنی کا چھٹا حصہ اس قسم کے کاموں کے لیے وقف تھا۔ اس کے باوجود بھی مطالبات روز بروز بڑھتے ہی جاتے تھے۔ یہ قدرتی

بات تھی کہ اس قسم کی امداد سے فائدہ اٹھانے والے اپنے محسن کے حق میں دعائیں کرتے اور ضرورت پڑ جانے پر حاکم یا اس کے خاندان کی بھلائی کے لیے عملی کارروائی پر بھی آمادہ ہو جاتے۔

مالوہ کا حکمراں محمود خلجی کہا کرتا تھا کہ گجرات فتح کرنا مشکل ہے "کیوں کہ وہاں ایک فوج دن میں اور دوسری فوج رات میں سرگرم عمل رہتی ہے"۔ لہٰذا جب بھی کوئی نیا خاندان حکومت کی باگ ڈور سنبھالتا تو وہ نہ صرف ان عطیات کو جاری رکھتا بلکہ اس کو اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ اور اضافہ بھی کرنا پڑتا۔

خود شیر شاہ سور نے پرانے عطیات کو پہلے تو منسوخ کر دیا اور پھر ان کو از سر نو اپنے نام سے جاری کیا۔ عام طور پر سور حکمراں لودیوں ہی کی طرح عطیات کے معاملے میں سخاوت سے پیش آتے تھے۔

جب مغل ہندوستان میں آئے تو ان کو بھی ایسے عطیات دینے پڑے۔ ان امور کے لیے ایک علیحدہ محکمہ کھولا گیا جس کی باگ ڈور صدر کے ہاتھوں میں ہوتی۔ اکبر کے ابتدائی دور میں محکمۂ صدر بجائے خود قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ صدر کے اختیارات بہت وسیع ہوتے اور لوگ اس کا بڑا احترام کرتے۔

بیرم خاں کی اتالیقی کے دوران شیخ گدائی کا طرز یہ تھا کہ افغانوں کو عطیات سے محروم کر کے انھیں اپنے حامیوں کو منتقل کر دے۔ 1565ء میں مظفر خاں وزیر مالیات کی سفارش پر شیخ عبدالنبی کو صدر مقرر کیا گیا۔ اس کو ہدایت ملی کہ سیور غال کے مسئلے کا مطالعہ کرے اور اگر ضروری سمجھا جائے تو وزیر مال کی مدد سے از سر نو تقسیمات کی جائیں۔ شروع شروع میں اس نے بہت سے افغانوں کو عطیات سے محروم کیا اور ان کی اراضیات کو صرف خاص میں ضم کر لیا لیکن بعد میں جب اس کا اثر و رسوخ بادشاہ پر اچھی طرح قائم ہو گیا" تو اس نے وسیع پیمانے پر وقف، انعامات اور ادرارات" عطا کیے اور اپنے قدمار کی سخاوت و فیاضی کو پس پشت ڈال دیا۔

جب 1575ء میں کروریوں کو تحقیقات کے لیے بھیجا گیا تو سیور غال کا مسئلہ ایک بار پھر ابھرا۔ ان کو یہ ہدایت دی گئی کہ وہ عطیات کے کاغذات کو اس وقت تک قبول نہ کریں جب تک کہ ان پر صدر کے دستخط موجود نہ ہوں۔ اس اقدام نے وظیفہ داروں

کو مجبور کیا کہ وہ اسنادِ عطیات پر صدر کے دستخط کرانے کے لیے پائے تخت جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں کو اس وجہ سے بہت مشکلات اٹھانی پڑی ہوں گی اور طول طویل سفر اختیار کرنا پڑا ہوگا۔

دوسری طرف محکمۂ صدر میں لوگوں کا جمگھٹ ہو گیا ہوگا۔ عبدالنبی نے جو آرام طلب تھا بیشتر امور ایک دوسرے شخص عبدالرسول کے ہاتھوں میں سونپ دیے۔ عبدالرسول بدقسمتی سے بے ایمان اور رشوت خور تھا۔ وہ یا تو اپنے اختیارات کے گھمنڈ میں آکر یا وقت کی کمی کے باعث علماء، فضلاء اور مشائخ کے ساتھ عزت و احترام سے پیش نہ آتا۔ علاوہ بریں عبدالنبی بھی اپنی پہلے کی سی سخاوت و فیاضی کا مظاہرہ نہ کرتا کیوں کہ اس کو وزیر مال سے اس قسم کی ہدایات مل چکی تھیں۔ "کبھی کبھی تو وہ بڑے بڑے وظیفوں کی رقوم کو گھٹا کر کم کر دیتا اور اس کے بدلے دوسرے نئے آسامیوں کو وظائف جاری کرتا خواہ وہ لوگ غیر معروف ہی کیوں نہ ہوں۔" اس سے قبل کسی بھی شہنشاہ کے دورِ حکومت میں صدر کو اتنے وسیع اختیارات میسر نہ تھے۔"

اس بات کا بڑا امکان ہے کہ عبدالنبی یہ کام شہنشاہ کی ہدایت کے بموجب انجام دے رہا ہو اور شاید شہنشاہ کا یہ مقصد ہو کہ کسی کی دل آزاری یا بے عزتی کیے بغیر دوسرے غریب مستحق لوگوں کو بھی کچھ وظائف مل جائیں اور سرکاری خزانے پر بھی مزید بار نہ پڑے۔

محکمۂ صدر کے خلاف لوگوں کی شکایات اتنی بڑھ گئیں کہ اکبر نے فرید بخاری کو اس معاملے کی تفتیش کے لیے مقرر کر دیا۔ پتہ یہ چلا کہ وظائف و مدد معاش کی تقسیم بے ترتیبی سے کی گئی تھی۔ حالانکہ عطیات حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، پھر بھی بڑی تعداد میں ایسے مستحقین رہ گئے تھے جن کو کچھ بھی نہ ملا۔ دوسری خرابی یہ تھی کہ صرف خاص جاگیر اور سیورغال اراضیات کے اختلاط کے سبب سرکاری حکام اور ان لوگوں کے درمیان جن کے پاس سیورغال کی زمینیں تھیں مستقل کشمکش رہتی۔ ان سب کے علاوہ ایک بات کا اور بھی پتہ چلا کہ کچھ لوگوں کے قبضے میں مختلف مقامات پر زمینیں تھیں لیکن ان کی اسناد استحقاق جعلی تھیں۔ ان تمام مصائب کو دور کرنے کے لیے شہنشاہ نے حکم دیا کہ سیورغال کے لیے ہر پرگنہ میں زمینیں جدا رکھی جائیں اور

کسی وظیفہ خوار کو یہ اجازت نہ دی جائے کہ وہ مختلف جگہوں پر جائداد رکھے۔ شیخ عبدالنبی کو صدرِ کل کے عہدے سے ہٹا دیا گیا اور اس کی جگہ سلطان خواجہ کو ملی۔ ان تبدیلیوں کے سبب کام کا جو بوجھ بڑھ گیا تھا اسے کم کرنے اور مراجعین کی تکلیف کا خیال رکھتے ہوئے پنجاب اور گجرات کے لیے علیحدہ علیحدہ صدر مقرر کر دیے گئے۔ بڑی بڑی سیور غال زمینوں کے عطا کرنے کا معاملہ شہنشاہ نے خود اپنے ہاتھ میں لے لیا اور حکم دیا کہ پانچ سو بیگھہ سے زیادہ زمینوں کے مالک خود شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ہر وقت خیال رکھا جاتا کہ ان سب سے ملتا اور جس شخص کی لیاقت استعداد اور ضرورت سے جتنا مناسب ہوتا اسی لحاظ سے اس کا وظیفہ مقرر کر دیتا۔

بوڑھوں کے معاملے میں کافی رعایت برتی جاتی۔ جو لوگ خود حاضر نہ ہوتے ان کی جائدادیں سے 100 بیگھہ زمین سے زائد کا $\frac{3}{5}$ حصہ بطور سزا ضبط کر لیا جاتا لیکن یہ اصول ایرانی و تورانی خواتین کے لیے نافذ نہ تھا۔

1580ء میں سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کر دیا اور ان میں سے ہر ایک میں ایک صدر بھی مقرر کیا گیا۔ ان صدروں پر قابو رکھنے کے لیے سلطنت کو چھ حلقوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر طبقے کے لیے ایک نگران مقرر کیا۔

اکبر کی سیور غال پالیسی پر بہت اعتراضات کیے گئے ہیں۔ معترضوں کا کہنا ہے کہ اس کا مقصد صدر کے اختیارات کو جو بہت زیادہ قوی ہو گئے تھے ختم کرنا تھا تھا اور ان راسخ العقیدہ مسلمانوں سے انتقام لینا تھا جو اس کی مذہبی بدعات میں زبردست رکاوٹیں ڈالتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اس طریقے سے سرکاری خزانے کو بھی بھرپور رکھنا چاہتا تھا۔ اس بات کو ثابت کرنے کی مشکل ہی سے کوئی دلیل ہاتھ آئے گی کہ کسی خاص مذہبی عقیدے والوں کے ساتھ عام طور پر زیادہ سخت رویہ برتا جاتا یا یہ کہ کسی کم متعصب فرقہ پر بیشتر عنایات کی بوچھار ہوتی۔

یہ کہنا کہ سرکاری خزانے کو اس طرز کے سبب کوئی فائدہ ہوا بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کیوں کہ اس کے برخلاف تازہ درخواست دہندگان کے مطالبات کی وجہ سے خزانے پر روز بروز بار بڑھتا جاتا تھا۔ جہاں تک صدر کا تعلق ہے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس کے اختیارات کتنے ہی وسیع کیوں نہ ہوں شہنشاہ اپنی مرضی

سے اُس کو مقرر و معزول کر سکتا تھا اور اکبر کو بھی صدر کی جگہ کسی ایسے آدمی کے تقرر میں ذرا بھی زحمت نہ ہوئی جو اُس کا پوری طرح مطیع ہو۔ اُس محکمے کے کام کو مرکز سے ہٹا کر صوبوں میں منقسم کر دینے کا مقصد یہ تھا کہ کام زیادہ مستعدی سے انجام پائے اور اُس کی بہتر نگرانی کی جائے۔ اس کے علاوہ اس طریقے سے چھوٹے مالکان زمین کو اپنے جھگڑے فیصل کرانے کے لیے طول طویل سفر کی زحمت نہ اٹھانا پڑے۔ سیورغال کے طرز میں جو اصلاحات کی گئیں ان کا اصلاحِ مال گذاری سے قریبی تعلق تھا کیوں کہ یہ ایک ہی زنجیر کی دو کڑیاں تھیں۔ اکبر کی سیاست کا مقصد یہ تھا کہ خیرات جہاں تک ہو سکے منصفانہ طریقے پر تقسیم کی جائے اور جعل سازوں اور کاہل اہلکاروں کو شدید سزائیں دی جائیں۔

4- مذہب

اکبر ایک پیچیدہ لیکن ممتاز شخصیت کا مالک تھا۔ اُس کو بابر کی بہادری اور اور وسعتِ نظر، باپ کا صبر اور درویشانہ صفات اور ماں کا مذہبی لگاؤ اور اعتقاد ورثے میں ملا تھا۔ دوسرے تیموری شہزادوں کی طرح اکبر کو بھی چنگیز خاں کے کارہائے نمایاں سے یہ حوصلہ ملا چنگیز خاں کا عقیدہ تھا کہ خدا نے اس کو ساری دنیا کے لوگوں کے لیے خواہ وہ کسی بھی ملک میں رہتے ہوں اور کسی مذہب، رنگ یا ثقافتی وحدت سے تعلق رکھتے ہوں امن و آشتی اور انصاف قائم کرنے کے لیے مبعوث فرمایا ہے۔ اکبر کی رگوں میں ہمایوں کی صوفیانہ آزاد خیالی، حُسنِ اخلاق اور سخاوت موجود تھی۔ وہ بچپن ہی سے مغل ترک افغان اور ایرانی امراء سے ملتا جلتا رہتا اور اس طرح جماعتی تنگ نظری کی غلاظت سے جس میں پھنس کر آدمی دوسروں کے طور و طریق اور نظریات کو سمجھنے سے معذور ہو جاتا ہے محفوظ رہا۔ اُس کے معلمین میں منعم خاں اور بایزید جیسے ترک سنی اور بیرم خاں اور عبداللطیف قزوینی جیسے شیعہ بھی شامل تھے۔ عبداللطیف کو لوگ ایران میں سنّی اور ہندوستان میں شیعہ سمجھتے تھے اُس نے اکبر کے دل و دماغ کو صوفیانہ طرزِ زندگی سے روشناس کرایا اور اس کے

ذہن کو مولانائے روم اور حافظ کے اشعار و غزلیات سے مالا مال کر دیا۔ اکبر نے اتالیقی کے دوران ہی صوفیوں درویشوں اور مشائخ کرام سے عقیدت و احترام کے جذبے کے ماتحت ملنا شروع کر دیا تھا۔ پھر جب بیرم خاں کو معزول کر دیا گیا تو ان ملاقاتوں میں زیادتی ہو گئی اور وہ اکثر بھیس بدل کر فقیروں، یوگیوں اور سادھوؤں دشیتوں سے ملتا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا وہ اور زیادہ حسین، کم گو اور غور و فکر میں منہمک ہوتا چلا گیا۔ جب اس کو کوئی مشکل کام درپیش ہوتا تو وہ نہ صرف زندہ بلکہ گزرے ہوئے درویشوں اور اہل اللہ سے مدد طلب کرتا۔ وسط ایشیا کے عوام میں فقیر پرستی عام تھی۔ ایرانیوں میں بھی اس کا کافی رواج تھا۔ وہ چشتیہ مسلک اور شیخ سلیم کا بہت زیادہ معتقد تھا۔

تیرھویں صدی سے سولھویں صدی کے درمیان ہندو مسلم مذہبی تحریکوں کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے خیالات کو مذہب کے ظاہر ارسمی پہلو سے ہٹا کر اس کے باطنی و روحانی پہلو کی طرف متوجہ کیا جائے اور بجائے کھوکھلے عقائد کے حقائق زندگی سے روشناس کرایا جائے۔

یہ ساری تحریکیں ابہام، اوہام، نا قابل فہم اور عجیب و غریب عقائد کے باوجود مذہب کے خالص رسمی ظاہری آئینی اور سماجی پہلو کے بجائے اس کی روحانی نفسیاتی اور اخلاقی بنیادوں پر زور دیتیں۔ مذہبی اور روحانی مسائل کو حل کرنے کے طریقوں نے اس بات کو واضح کر دیا کہ مشترکہ تجربات، بنیادی مذہبی عناصر اور عقائد کو عقل سلیم، آزادیِ فکر اور برادرانہ جذبات کے فلسفے کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔

ان تحریکوں نے سماجی زندگی اور عوام پر کافی اثر ڈالا لیکن سیاست پر ان کا اثر بہت ہی دھندلا تھا۔ مسلمان سلاطین اور بادشاہوں میں اس بات کا احساس جڑ پکڑتا جا رہا تھا کہ وہ غیر مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں عدم مداخلت کی روش اختیار کریں اور ان میں سے کئی سلاطین نے اس طریقے کو کافی حد تک اپنا شعار بنا لیا تھا۔ حقیقی مذہبی اور روحانی تحریکوں کے ساتھ وسیع الخیالی اور مثبت ہمدردی کی پالیسی کا کبھی کبھی صوبجاتی ریاستوں میں مظاہرہ ہوتا لیکن دہلی اور آگرہ کے بادشاہوں

نے دیا بھی نہ کیا۔ یہ اکبر ہی تھا جس نے اپنے دور کے شروع ہی سے آہستہ آہستہ ایک مضبوط رواداری کی سیاست اور مذہبی تحریکوں سے مثبت ہمدردی کی روش اختیار کی۔ اکبر کی دماغی اُپج، سیاسی تجربات اور سماجی و ازدواجی تعلقات سب نے مل کر اس کو اس کے لیے ابھارا۔

اکبر اپنی متعدد سیاسی اور فوجی مہمات و مصروفیات کے باوجود مشاہدۂ نفس، غور و فکر اور اہل اللہ کے اجتماعات میں شرکت کے لیے وقت نکال لیتا۔ بہرحال وہ عام طور پر علماء کے مذہبی طور و طریق میں مداخلت نہ کرتا۔ اس وقت علماء کی جماعت شیخ عبدالنبی اور عبداللہ سلطان پوری کی سرکردگی میں ایک غیر روادارانہ سیاست کی پیروی کر رہی تھی۔ وہ لوگ آزادی سے ہر اس شخص کو جس کو کہ وہ رافضی، معتزلہ، شیعہ یا مہدوی سمجھتے سزائیں دیتے۔ البتہ اکبر ان سب حالات کو تماشائی نگاہوں سے دیکھتا اور دل ہی دل میں ایک نئی پالیسی اور منصوبے کا خاکہ تیار کرتا رہا۔

1573ء میں جب کہ اکبر گجرات کی مہم سے سیکری واپس آیا تو شیخ مبارک نے شہنشاہ سے یہ درخواست کی کہ سیاسی معاملات کی طرح وہ مذہبی امور میں بھی رعایا کی رہنمائی کرے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ اکبر خلیفہ کے وظائف انجام دے۔ اکبر نے اس مشورے پر فوراً ہی عمل شروع نہیں کیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا البتہ سوچ میں پڑ گیا۔ ہمیشہ کی طرح وہ اس وقت تک کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانا نہ چاہتا تھا جب تک کہ وہ ہر ایک بات کو تفصیلی طور پر اچھی طرح سمجھ نہ لے اور اس پر عمل کرنے کے لیے تیار نہ ہو جائے۔

اکبر نے خود کو اس نازک اور اہم ذمے داری سنبھالنے کے لائق بنانے کے لیے بہت ہی سنجیدگی سے ہندوستان کے بڑے بڑے مذاہب کے فلسفہ اور اندازِ فکر کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس نے اس کام کا آغاز اسلام سے کیا اور بہت ہی منظم طریقے پر اس کا مطالعہ کیا۔ اس نے مذہب کے جامع تصور اور صحیح پس منظر کو تفصیلی طور پر سمجھنے کے لیے اسلام کے اصول و عقائد، اخلاقیات، فلسفہ، تصوف، روایات، قانون اور تاریخ و سوانح کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ہندوستان کے بعض

بہت ہی معروف و مشہور علماء نے معیاری کتابیں اس کو پڑھ کر سنائیں اور اُن کی تفسیر و تشریح بیان کی۔ ان علماء میں سے شیخ عبدالنبی، ابوالفیض، ابوالفتح، نقیب خان اور شیخ تاج الدین قابلِ ذکر ہیں۔

1575ء میں اکبر نے عبادت خانے کی عمارت کی تعمیر کا حکم صادر کیا تاکہ علمائے دین، ماہرینِ قانون اور صوفیوں کے منتخبہ نمائندے وہاں جمع ہوا کریں۔ یہ عمارت مختصر عرصے میں مکمل ہو گئی۔ اس عمارت کے چار حصے تھے۔ مغربی حصے میں سید، جنوبی حصے میں علماء، شمالی حصے میں مشائخ و متصوفین اور مشرقی حصے میں اکبر کے دربار کے مشہور و معروف علماء و عقلاء بیٹھا کرتے۔

خیال یہ ہے کہ دو سال سے زیادہ عرصے تک عبادت خانے میں جو مباحثات ہوتے رہے وہ علمائے دینِ اسلام تک محدود تھے۔ ہر جمعرات کی شب میں اور کبھی کبھی جمعہ کی صبح کے وقت اکبر علماء کے بیانات کو جو وہاں جمع ہوتے سنتا اور اُن سے مذہبی اور روحانی معاملات کے سلسلے میں گفتگو کرتا۔ وہ اکثر یہ کہا کرتا "اے خرد مند ملاؤ میرا مقصد یہ ہے کہ حقیقت کا پتہ لگاؤں، مذہب کے اصولوں کا انکشاف کروں ان کو پھیلاؤں اور ان کی مقدس اصلیت تک پہنچوں لہٰذا آپ لوگ اس بات کا خیال رکھیں کہ کہیں آپ کے ذاتی جذبات آپ کو حق کے چھپانے پر مجبور نہ کریں۔ خدارا کوئی بات اللہ کے فرمان کے خلاف نہ کہیے۔"

عبادت خانے کی کارروائیاں نہ تو باوقار ہوتی تھیں اور نہ ہی پُرسکون۔ بحث مباحثے کے سیلاب میں بہہ کر آپس میں ناخوشگواری پیدا ہو جاتی اور اس طوفان کو محض شہنشاہ کی موجودگی حد سے آگے نہ بڑھنے دیتی۔ بجائے اس کے علماء آپس میں ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو بہتر طریقے پر سمجھنے کی کوشش کریں وہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف چغل خوری اور الزام تراشی پر اتر آتے۔ یہاں تک کہ اکبر بعض وقت بہت ہی مشہور و معروف علماء کے طرزِ عمل پر سخت متعجب ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنجیدہ و بزرگ منش حضرات ان مجالس سے آہستہ آہستہ الگ ہوتے گئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے یہ سوچا کہ غیر مسلم مذاہب کے علماء کی موجودگی مفید ماحول پیدا کرنے میں مفید ثابت ہو گی۔ لہٰذا اس نے 1578ء میں عبادت خانہ کے

دروازے عیسائیوں، زرتشتیوں، ہندوؤں، جینیوں، صابیوں اور دہریوں کے لیے بھی کھول دیے۔ ان لوگوں کی آمد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان موضوعات پر بھی بحث و مباحثہ ہونے لگا جن کے متعلق مسلمانوں میں کوئی بنیادی اختلاف نہ تھا۔ وحی، قرآن کی قطعیت، حضرت محمدؐ کی رسالت، قیامت، ماہیت، الوہیت، وحدت الٰہی کا تصور ایسے مسائل تھے جن کے متعلق تقریباً سارے مسلم فرقے ہم خیال تھے۔ لیکن اب یہ موضوعات بھی عبادت خانے میں تنقید کا نشانہ بن گئے جس کے سبب نیک اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کو بہت دکھ ہوا۔ بہت ممکن تھا کہ عبادت خانہ مذاہب کی پارلیمنٹ کی شکل اختیار کر جاتا لیکن بدقسمتی سے وہ محض ایک محفل مباحثہ اور مختلف و متنازع فیہ عقائد و فرقوں کا اکھاڑہ بن کر رہ گیا۔ کبھی کبھی تو فریقین غصے سے مغلوب ہو جاتے۔ ایک دوسرے کو دھمکاتے اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی کہ اگر شہنشاہ موجود نہ ہوتا تو وہ مار پیٹ پر اتر آتے۔

عیسائی پادری بالخصوص ماننسے رآت نے اپنی بے ہودگی کا مظاہرہ کیا۔ یہ لوگ اسلام پر گستاخانہ اور غیر مہذبانہ حملہ کرتے اور بانیٔ اسلامؐ پر حملہ کرنے سے پرہیز نہ کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے وہ اپنے مذہبی جوش و جرأت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اس سے شہنشاہ پر کوئی اچھا اثر نہ پڑا اور اس نے ان لوگوں سے کہلا بھیجا کہ وہ بہتر اور مناسب تر الفاظ کا استعمال کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ شہنشاہ نے ان کی حفاظت کے لیے پولس کا بھی انتظام کر دیا۔

عبادت خانے کی کارگزاری سے نہ صرف باہر والوں میں بلکہ ان لوگوں میں بھی جو کہ وہاں کی مجالس میں شریک ہوتے مختلف قسم کی افواہیں اور غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ اکبر کے صبر و تحمل اور اس کی آزاد خیالی کو مختلف مذاہب کے ماننے والوں نے مختلف ڈھنگ سے تعبیر کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عبادت خانے سے بجائے اس کے کہ اکبر کی شہرت و مقبولیت میں اضافہ ہوتا بدنامی بڑھتی گئی۔

اکبر کو عبادت خانے سے جو کچھ حاصل ہوا اس سے وہ مطمئن نہ ہو سکا۔ اس نے اپنی شبانہ محافل میں علمائے معیاری و ابتدائی کتابیں سننے کا کام جاری رکھا اور خود پورے حوصلہ اور ضبط و تحمل کے ساتھ اپنا کام انجام دیتا رہا۔ چار پانچ سال

میں اس نے اپنے دماغ میں معلومات کا ایک بیش بہا ذخیرہ جمع کر لیا۔ مشہور و معروف کتابوں میں سے شاید ہی کچھ ایسی ہوں جو اس کی محفل میں نہ پڑھی گئی ہوں۔ گذشتہ ادوار کا کوئی ایسا تاریخی واقعہ یا سائنس کی حیرت انگیز ایجادات یا فلسفے کے دلچسپ نکات ایسے نہ ہوں گے جن سے شہنشاہ آگاہ نہ ہو۔"

ابوالفضل کے اس بیان کی تصدیق ملا عبدالقادر بدایونی نے جو اکبر کا سب سے زیادہ نکتہ چیں تھا ان الفاظ میں کی ہے۔ "ہر قسم اور ہر ملک کے علما اور مختلف عقائد و مذاہب کے پیرو اس کے دربار میں جمع ہوتے اور اس سے گفتگو کرنے کے لیے باریاب ہوتے۔ رات دن لوگ صرف تحقیق اور چھان بین کے کام میں لگے رہتے۔"

26 جون 1579ء کو جو کہ حضرت محمدؐ کی پیدائش کا دن تھا اکبر نے اس مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر جو کہ اس نے خود چند سال قبل تعمیر کرائی تھی خطبہ پڑھا۔ اس کے اس عمل کو اس بات کا پہلا اشارہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ امام عادل کے فرائض انجام دینا چاہتا تھا۔ عالم اسلام اور تیموری حکمرانوں کے دور میں یہ بات کہ خطبہ خود حاکم اعلیٰ یا بادشاہ پڑھے کوئی نئی بات نہ تھی۔ بہت سے خلفا اور خود امیر تیمور، الغ بیگ مرزا نے جو کہ اکبر کے اجداد تھے ایسا کیا تھا لیکن ہندوستان میں یہ بات بالکل انوکھی تھی۔ اکبر نے منبر پر چڑھتے وقت فیضی کے لکھے ہوئے اشعار پڑھے جن کا مطلب یہ تھا:

"اس کے نام کے ساتھ جس نے ہم کو اقتدار بخشا
جس نے ہم کو بیدار قلب اور محکم بازو عنایت کیے
جس نے ہم کو مساوات اور انصاف کا راستہ دکھایا
جس نے ہمارے دل کو برابری کے علاوہ سب چیزوں سے پاک کر دیا
اس کی حد ہمارے وہم و گمان کی رسائی سے بہت پرے ہے
اس کی شان اعلیٰ و ارفع ہے۔ اللہ اکبر۔"

اس موقع کی نزاکت و سنجیدگی سے اکبر ذرا گھبرا گیا لیکن اس نے دعا اور قرآن کی چند آیات پڑھیں اور فاتحہ پڑھ کر خطبہ ختم کیا۔ منبر سے اتر آیا اور نماز جمعہ ادا کی۔

حالانکہ اس واقعہ سے مسجد یا شہر میں کسی قسم کی بے چینی نہ پھیلی لیکن بعض حلقوں میں لوگوں نے مبہم خدشات کا اظہار کیا اور شہنشاہ کے اس عمل کو مختلف معنی واغراض کا جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ جب یہ باتیں شہنشاہ کے کانوں تک پہنچیں تو اس نے ان کو بے ہودہ، شر انگیز اور چھچھورا کہہ کر ٹال دیا۔

جوں جوں اکبر کا تجربہ اور عمل بڑھتا گیا اس کو اس بات کا یقین اور اطمینان حاصل ہوتا گیا کہ وہ شیخ مبارک کی اس تجویز کو جو کہ اس نے کوئی پانچ سال پہلے پیش کی تھی بروئے کار لا سکتا ہے۔ چنانچہ ۲ ستمبر ۱۵۷۹ء کو ایک فرمان جاری ہوا جس پر شیخ عبدالنبی، قاضی جلال الدین، شیخ مبارک عبداللہ سلطان پوری، غازی خاں بدخشی جیسے مشہور و معروف علماء نے دستخط کیے۔ اس فرمان میں اکبر کے امام عادل ہونے کا اعلان ان الفاظ میں کیا گیا:

"ہم اعلان کرتے ہیں کہ پادشاہِ اسلام، بنی نوع انسان کا ملجا و مامن امیرالمومنین روئے زمین پر خدا کا سایہ ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر پادشاہ غازی سب سے زیادہ عادل اور عاقل پادشاہ ہے۔"

لہٰذا ہم لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ "ایک عادل بادشاہ کا رتبہ اللہ کی نگاہ میں ایک مجتہد سے زیادہ بلند ہے۔" اور وہ اپنی قانونی حیثیت کے لحاظ سے اس بات کا مستحق ہے کہ مجتہدین کے متنازع فیہ نظریات میں کسی ایسے نظریے کو "جو انسانوں اور نظامِ عالم کے مفاد میں ہو" منتخب کرے ..... اور اس سلسلے میں ایک فرمان جاری کرے جو اس کی ساری رعایا اور سارے باشندوں پر واجب الاذعان ہوگا۔" اگر اعلیٰحضرت یہ مناسب سمجھیں کہ قرآن (وحدیث) کے مطابق ایک نیا فرمان جاری ہو اور اس میں قوم کی بہبود پوشیدہ ہو تو سب اس کے پابند ہوں گے۔"

یہ بات واضح ہے کہ اکبر کے مجتہد ہونے کا اعلان نہیں کیا گیا یعنی کہ وہ مشکوک موضوعات کے سلسلے میں اجتہاد کا حق نہ رکھتا تھا۔ یہ کہنا قطعاً غلط ہوگا کہ اکبر کو مجتہد یا معصوم عن الخطا قرار دے کر اعلان کر دیا گیا۔ اس کو یہ حق تھا کہ اگر کسی بات پر مجتہدین کے درمیان اختلافِ نظر پیدا ہو جائے تو وہ ان مجتہدین کے نظریات میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے۔ جدت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے علاوہ اگر اکبر اپنی رعایا اور امن و امان کی

خاطر کسی نئے فرمان کو صادر کرنا چاہتا تو وہ فرمان محض اسی صورت میں نافذ ہو سکتا تھا جب کہ وہ قرآن (وحدیث) کے مطابق ہوتا۔ حاکم اعلیٰ کو جو اختیارات سونپے گئے وہ قانونی حدود کے اندر اور اسلامی قانون اور روایات کے مطابق تھے۔ چنانچہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مختلف قسم اور نوعیت کے علماء نے اس فرمان پر دستخط کر دیئے۔

جہاں تک کہ ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق ہے اس قسم کے ایک اعلان سیاست کا جاری کیا جانا ضروری تھا۔ یہاں کے شیعہ، سنی، مہدوی اکثر آپس میں اور غیر مسلمانوں کے ساتھ بھی خونی آویزش میں مصروف رہتے۔ احمد نگر و کشمیر میں حالات خاص طور پر تشویش ناک تھے۔ اکثر مذہبی لڑائیاں ہوتی رہتیں جن کے سبب جان و مال کا بہت نقصان ہوتا۔ ایک فرقے کے پیروؤں کا دوسرے فرقے والوں کو اذیت پہنچانا روز کا معمول ہو گیا۔ تلوار ہی ہر بات کا فیصلہ کرتی۔

عالم اسلام کے بین الاقوامی حالات بھی اس امر کے مقتضی تھے کہ مغل سلطنت اپنی سیاست کو واضح کرے۔ ایران کی شیعہ حکومت اور سنی ریاستیں سیاسی وجوہ سے زیادہ تر مذہب کی بنا پر ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتیں۔ شاہ ایران کو شیعوں کا سربراہ ہونے کا دعویٰ تھا۔ ادھر ترکی کا عثمانی سلطان مسلم حکومتوں اور خاص طور سے سنیوں کے خلیفہ ہونے کا مدعی تھا۔ یہ مخالف حکومتیں جاننا چاہتی تھیں کہ سلطنت مغلیہ کا کیا رویہ ہوگا۔

اکبر کے اعلان سے جس پر بعض مشہور و معروف علمائے دین نے دستخط کیے تھے اس کے طرز حکومت کی ہندوستان اور غیر ممالک میں پوری طرح وضاحت ہو گئی۔ مغل شہنشاہ نے کسی بھی فرقے کے ساتھ وابستہ ہونے سے انکار کر دیا اور اعلان کر دیا کہ وہ قرآن و حدیث کی روشنی میں رواداری پر عمل کرے گا اور علمائے معتبر کے درمیان جو معاہدے ہوئے ہیں ان کی حدود کے اندر رہ کر ایک آزاد روشن خیال اور روادارانہ سیاست کی پیروی کرے گا۔

اکبر کی سیاست درحقیقت چنگیز خاں کے طرز پر مبنی تھی جو کہ ہمیشہ مغلوں کے لیے ایک مثالی کردار رہا ہے۔ حالانکہ اکبر مسلمان تھا اور وہ غیر مسلم۔ یہ اعلان خاص کر مسلمانوں کے لیے تھا اور اس کا نفاذ ہندوؤں پر محض اتفاقی اور بالواسطہ طور پر ہوتا۔ یہ کہنا کہ اکبر

نے اس اعلان کے ذریعے خود کو شاہ ایران کی قانونی یا اخلاقی برتری سے آزاد رکھنا چاہا بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ اس قسم کی برتری کا وجود ہی نہ تھا۔

اکبر اپنی تعلیم و تربیت اور مزاج کی بنا پر تعصب و طرفداری کی پالیسی پر عمل پیرا نہ ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی غیر مسلم رعایا کے عقائد، قوانین اور مکاتب فکر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا بہت خواہش مند تھا۔ ہندو امراء کے ساتھ سماجی روابط و تعلقات قائم ہونے کے سبب اس کو ہندوؤں کے مذہبی نظریات سے روز بروز زیادہ دلچسپی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ہندو بیگمات کے مذہبی جوش، جذبۂ فداکاری اور سادگی نے بھی اکبر کے دماغ پر غیر ارادی طور پر اثر کیا۔ ان تمام تاثرات کے مجموعی اثر اور اس کے دماغ کی تحقیقی اپج نے اس کو اس بات کے لیے ابھارا کہ ہندو مذہب کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرے۔ اس نے پرشوتم اور دیوی کو ہندو مذہب کے اصول بیان کرنے کی دعوت دی اور خود یوگیوں اور سادھوؤں سے مل کر ہندو مذہب کے صوفیانہ پہلو کا مطالعہ کرنے لگا۔ وہ یوگ کو معرفت کا ایک اہم شعبہ سمجھتا تھا۔

1578ء میں اکبر نے مہیارجی رانا کو زرتشتی مذہب کی تشریح کے لیے طلب کیا۔ 1577ء میں اکبر کی خواہش پر ست گاؤں سے فادر گائلز ایوز پریرا (Father Giles Aves Pariera) حاضر ہوا لیکن وہ اکبر کو زیادہ متاثر نہ کر سکا۔ چنانچہ اکبر نے گوا کے وائسرائے کے پاس اپنا سفیر بھیج کر درخواست کی کہ دو عالموں کو اس کے دربار میں بھیجا جائے۔ اس خبر سے گوا میں خوشی کی زبردست لہر دوڑ گئی اور شہنشاہ کی تبدیلی مذہب کی بے بنیاد افواہیں اڑنے لگیں۔

اکبر کے دربار میں جانے کے خواہش مند مسیحی علماء کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ قرعہ اندازی کے ذریعے روڈولفو ایکوا ویوا Rodolfo Acqua Viva کو جو کہ مسیحی فلسفے کا گہرا علم رکھتا تھا اور فادر انٹونیو مانسیراٹے (Father Antonio Monserrate) کو دربار میں جانے کے لیے انتخاب کیا گیا ان کے ہمراہ اینری کویس (Enriques) کو جو کہ مسلمان سے عیسائی ہوا تھا اور فارسی جانتا تھا روانہ کیا گیا۔ فادر مانسیراٹے کو یہ ہدایت

ملی کہ وہ اس مشن کے واقعات نویس کے فرائض انجام دے۔ ۱۲ نومبر کو یہ لوگ بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنی تبلیغ کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگ کر گوا سے سیکری کی طرف روانہ ہوئے اور ۱۸ فروری ۱۵۸۰ء کو وہاں پہنچ گئے۔ حالانکہ اکبر نے ان لوگوں کے ساتھ احترام و مہربانی کا سلوک کیا لیکن عبادت خانہ کے مباحثات میں ان کے جھگڑالو رویّے کے سبب اکبر خوش نہ ہوا۔

۱۵۸۰ء میں شیخ عبد اللہ سلطان پوری اور عبد النبی صدر الصدور کو مکہ بھیج دیا گیا۔ اکبر عبد اللہ سلطان پوری کو اس وجہ سے پسند نہ کرتا تھا کہ وہ شرک کی حد تک افغانوں کی طرفداری کرتا۔ اس کے علاوہ جو کچھ عبد النبی کہتا وہ اس کی اندھا دھند مخالفت کرتا جس کے سبب شہنشاہ اس سے خوش نہ تھا۔ بہرحال بقول بدایونی کے جب عبد اللہ سلطان پوری کی خباثت، پست نظری اور نفرت انگیز عادات کا پتہ چلا تو اکبر مزید تحمل نہ کر سکا۔ اس کے خلاف یہ الزام تھا کہ وہ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے ادائیگی کے وقت حد نصاب سے زیادہ جائداد اپنی بیوی کو منتقل کر دیتا اور پھر کچھ عرصے کے بعد واپس لے لیتا۔ اس کے علاوہ عبادت خانے کے معاملات کے سلسلے میں ناراضگی کا اظہار کرتا اور اپنے حریف عبد النبی کی بڑھتی ہوئی عزت و حرمت سے خفا ہو کر وہ اکبر پر کبھی شیعہ کہہ کر کبھی ہندو یا عیسائی کہہ کر الزام لگاتا۔ اس کی یہ جرأت اس حد تک پہنچ گئی کہ اس نے یہ اعلان کر دیا کہ ہندوستان کافروں کا ملک اور ناقابل رہائش ہے۔

چنانچہ وہ خود ایک مسجد میں رہنے لگا۔ ادھر عبد النبی صدر الصدور بھی جو کسی زمانے میں بادشاہ کی عنایات سے مالا مال تھا اپنا اثر کھو بیٹھا۔ ہوا یہ کہ جب محکمہ صدر کے معاملات کی تحقیق و تفتیش شروع ہوئی تو پتہ چلا کہ وہاں کے نظم و نسق کی خرابی اور رشوت ستانی میں اگر عبد النبی کی نالائقی کو نہیں تو کم از کم اس کی بے توجہی کو ضرور دخل تھا۔ اکبر نے قانونی مسائل پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے عبد النبی پر پیادہ بازی کرنے کے شک کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ شیخ نہ صرف ہندوؤں بلکہ شیعوں کو سخت سزائیں دیتا حتیٰ کو موت کا حکم صادر کرنے کا شوقین تھا۔ صدر الصدور نے متھرا کے ایک برہمن کو موت کا حکم دیا۔ اس پر الزام یہ تھا کہ مسجد کی تعمیر کے لیے جو مسالہ اور سامان جمع کیا گیا تھا اس نے اس پر قبضہ کر کے مندر کی تعمیر میں استعمال کر لیا اور حضرت محمدؐ اور

مسلمانوں کے خلاف رکیک الفاظ بھی استعمال کیے۔ اکبر اس بات سے بہت ہی دل برداشتہ ہوا اور اس کو صدر کے احکامات کے عادلانہ اور عاقلانہ ہونے میں شک پیدا ہو گیا۔ عبدالنبی میں بھی شیخ عبداللہ کی طرح کبر و غرور اور نخوت و بدمزاجی پیدا ہو گئی۔

بقول بدایونی کے "اس سے قبل کسی صدر نے اس قدر ظالمانہ طریقے پر اختیارات کا استعمال نہ کیا ہوگا۔"

اس کی ان عادات کے سبب دوستوں سے زیادہ دشمن پیدا ہو گئے۔ شیخ عبداللہ کی طرح اس نے بھی اکبر پر بدعت کا الزام لگایا۔ ان تمام باتوں سے اکبر کی نظر سے ان دونوں شیخوں کا وقار گر گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ ان سے پیچھا چھڑایا جائے۔ تاہم ان کے خلاف کوئی تشدد آمیز اقدام نہ کیا گیا۔

80-1579ء میں بنگال میں بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی اور مشرقی علاقوں کے بعض قاضیوں نے بدعت کا فتویٰ صادر کر دیا۔ ایسے مشتعل ماحول میں ان لوگوں کا غیر ہمدردانہ رویہ بہت کچھ نقصان پہنچا سکتا تھا۔ چنانچہ اکبر نے یہی مناسب سمجھا کہ ان دونوں کو نرمی کے ساتھ دور کر دیا جائے۔ لہٰذا حاجیوں کے قافلے کے ساتھ ان دونوں کو حج بیت اللہ کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ دونوں کو کثیر مقدار میں روپیہ دیا گیا اور یہ ہدایت کر دی گئی کہ وہ اس رقم کو شاہی احکامات کے بموجب مکہ میں تقسیم کر دیں۔ ان سے یہ بھی کہہ دیا گیا کہ اگلی ہدایات ملنے تک وہ وہیں قیام پذیر رہیں۔ عبداللہ تو مکہ جانے کا کھلا مخالف تھا۔ ادھر عبدالنبی بھی زیادہ خوش نہ تھا لیکن ان میں شہنشاہ کے فرمان سے سرتابی کرنے کی مجال نہ تھی۔

ہر شاہی مملکت میں لیاقت کے ساتھ ساتھ شان و شوکت کا پہلو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے تاکہ لوگوں کے دلوں پر اثر و رعب قائم رہے اور رعایا کے دلوں میں بادشاہ کے لیے احترام کا جذبہ پیدا ہو اور قائم رہ سکے۔ شاندار دربار، عظیم الشان سرکاری ضیافتوں اور بھڑک دار بادشاہی ساز و سامان کا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں کہ بادشاہ اور حکومت کے رعب و دبدبے میں اضافہ ہو۔ ہندوستان کے ابتدائی ترک حکمرانوں نے اس ضرورت کا احساس کرتے ہوئے ایران کے کیانی

بادشاہوں کی طرح اپنے دربار کو آراستہ و پیراستہ کیا اور ان کے رسوم و آداب کی پیروی کی۔ بلبن کا دربار اس قدر عالی شان تھا کہ لوگ دو دو تین تین سو میل دور سے اس کو دیکھنے آتے اور اس کا چرچا بیرون ہند بھی پہنچ گیا تھا۔

عید، شب برات اور نوروز یہ تینوں سرکاری جشن بڑے زبردست پیمانے پر منائے جاتے اور دعوتوں، ضیافتوں، تحفے تحائف اور محفل عیش و عشرت پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا۔ دربار قیمتی زردوز لباسوں سے جگمگاتا اور جہاں تک انسانی تخیل اور مال و دولت کی کثرت اجازت دیتی دربار کو بارعب اور پرشکوہ بنایا جاتا۔ ان باعظمت درباروں میں سلطان پورے جاہ و جلال کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا اور سب چھوٹے اس کے حضور میں سجدہ بجالاتے۔

علمائے دین کی ناراضگی کے باوجود اس نظریے کو کہ بادشاہ خدا کا سایہ ہے پوری کوشش کے ساتھ پھیلایا جاتا اور آخرکار علماء کو بھی اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا کہ اس نظریے کو مان لیں۔ دراصل دہلی کے بادشاہوں پر ہندو عقیدہ اور ایرانی روایات کا اثر غیر ارادی طور پر ہوتا جا رہا تھا۔ تیمور کے حملے کے طوفان نے اس ساری شان و شوکت کو خاک میں ملا دیا تھا۔ سکندر لودی اور سور بادشاہوں نے اس کے از سر نو قیام کی کوشش کی لیکن ان کو بہت ہی مختصر کامیابی حاصل ہو سکی۔

دہلی کی سلطنت کی قدیم عظمت کو دوبارہ زندہ کرنے کا کام مغلوں کے کاندھوں پر آپڑا تاکہ وہ شہنشاہ اور سلطنت کے وقار کو ایشیائی قوموں اور عوام کی نظروں میں سربلند کریں۔ ابتدائی ترکوں کی بہ نسبت مغلوں کو جو کہ بادشاہوں کے آسمانی حقوق میں یقین رکھتے تھے اپنی اہمیت کا زیادہ احساس تھا۔

سولھویں صدی میں عالم اسلام میں شریعت کے طریقوں میں تبدیلی رونما ہوئی جس کی وجہ سے اقتدار اعلیٰ کے تصور میں تجدید نظر کی ضرورت پڑی۔ عثمانی ترک سلاطین نے خود کو مسلمانوں کا خلیفہ ہونے کا اعلان کیا لیکن اس دعوے کو نہ تو ایرانیوں نے تسلیم کیا اور نہ وسط ایشیا کے باشندوں نے مانا۔ ایرانیوں کا اپنا قومی بادشاہ تھا جس کو وہ شاہ کہتے تھے اور وسط ایشیا میں بھی خود مختار خانوں کی حکومت تھی۔

بابر نے بھی مرزا کا لقب ترک کر کے تیموریوں کی تاریخ میں پہلی مرتبہ بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔

اکبر کے دربار کو سلطنت مغلیہ کے رعب، دبدبہ اور وقار کو مدنظر رکھتے ہوئے مرتب کیا گیا تھا۔ شاندار قصر اور عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ شکار کے لیے بڑے زبردست پیمانے پر انتظامات کیے جاتے اور شاہی تخت و تاج کے وقار کو بڑھانے کے لیے دربار اور دربارداری کے مراسم کو بہت ہی وسیع اور شاندار بنایا گیا۔ ان ہی مراسم میں جشن نوروز کو دوبارہ 1580-81ء میں ایرانی طرز پر منایا جانے لگا۔ ہر سال مارچ کے مہینے میں جب کہ سورج برج حمل میں داخل ہوتا تو سالِ نو کا جشن بہاراں منایا جاتا۔ یہ جشن اور اس کے مراسم ۱۹ روز تک دن رات منائے جاتے۔ جن میں رقص و سرود کی محفلیں برپا کی جاتیں عیش و عشرت کے سامان مہیا ہوتے ضیافتیں اور چراغاں کیے جاتے۔ اس موقع پر دو مرتبہ عظیم الشان دربار لگتا جس میں خود شہنشاہ موجود ہوتا اور سلطنت کے زر و جواہرات، سونا چاندی، موتی اور نوادرات کی نمائش کی جاتی۔

ان درباروں میں امراء اپنے بہترین لباس پہن کر صف بستہ کھڑے ہوتے تاکہ شہنشاہ کے فرامین سنیں جن میں عوام کی بہبود کے اعلانات ہوتے اور القاب و خطابات عطا کیے جاتے۔ ان درباروں میں اس وقت کے بہترین موسیقی داں ہنر نمائی کرتے اور ہندوستان و ایران کے بہترین شعراء اپنے اشعار سناتے۔ شہنشاہ دربار ہی میں جاگیریں عطا کرتا اور افسروں کے عہدے بڑھاتا۔ اسی موقع پر ہنرمندوں و شاعروں کو بہترین کلام سنانے کے صلے میں انعامات سے نوازا جاتا۔ شاہی دربار کے علاوہ امراء بھی اپنی حیثیت کے مطابق محفلیں برپا کرتے جن میں سے بعض محفلوں میں شہنشاہ بھی شرکت کرتا۔ ایسے مواقع پر امراء میں رقابت کا جذبہ زور پکڑ جاتا اور ان میں سے ہر ایک اپنے رقیبوں سے شان و شوکت میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتا۔

اس جشن کے تیسرے دن وسط ایشیا کے طرز پر ایک مینا بازار لگایا جاتا جس میں شاہی حرم کی بیگمات شرکت کرتیں اور دیگر بیگمات کو بھی دعوت دی جاتی

تاکہ مستورات نے جو دکانیں لگائی ہیں ان سے سامان خریدیں۔ اس بازار میں محض شاہی خاندان کی عورتیں شرکت کرتیں اور شاید شہنشاہ کے علاوہ کسی اور مرد کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔

جب مینا بازار اٹھ جاتا تو درباریوں کے لیے بازار لگتا۔ چونکہ ان بازاروں میں بیشتر خریدار مالدار اور ثروت مند لوگ ہوتے لہٰذا سلطنت کے دور دراز حصوں یہاں تک کہ بیرونی ممالک سے لوگ بیش قیمت نوادرات لے کر اس امید میں آتے کہ ان کے سامان و اسباب کے اچھے دام وصول ہوں گے۔ شہنشاہ خود ایک ایک دکان پر جاتا۔

ایسے موقعوں پر بازار کے لوگ اپنی شکایات اعلیٰ حضرت شہنشاہ کے حضور میں پیش کر سکتے اور عصا بردار ان کو روک نہ سکتے تھے۔ وہ لوگ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنا سامان شہنشاہ کو دکھاتے اور اپنے حالات کا ذکر کرتے۔

تاجروں کو خوب نفع ہوتا۔ امراء جو کچھ خریداری میں خرچ کرتے اس کے علاوہ شہنشاہ ان بازاروں کی ترتیب و تنظیم اور سامان کی خریداری میں بہت رقم خرچ کرتا اس قسم کے جشن نمائش کا کام بھی دیتے۔

اس میں شک نہیں کہ نوروز سب سے زیادہ پُرشکوہ جشن ہوتا لیکن اس کے علاوہ اور بھی محفلیں برپا ہوتیں۔ ہر مہینے میں ایک مرتبہ اور دسمبر کے مہینے میں تین مرتبہ ضیافتیں ہوتیں۔

نوروز کے بعد ۹ رجب اور ۱۵ اکتوبر کے دن جو کہ قمری اور خورشیدی جنتری سے بادشاہ کی پیدائش کی تاریخیں تھیں زبردست جشن منائے جاتے۔ ان دنوں بڑی ضیافتیں ہوتیں۔ اعزازات عطا کیے جاتے، شہنشاہ مجرموں کی جاں بخشی کا اعلان کرتا اور ہر عہدے و رتبے کے لوگوں کو انعامات تقسیم کیے جاتے نیک اور ضرورت مندوں اور فقیروں کو تحفے تحائف اور خیرات دی جاتی۔ قیدیوں اور جانوروں کو آزاد کیا جاتا۔

شہنشاہ صرف ان درباروں اور جشن کے مواقع پر ہی عوام کے سامنے نہ آتا بلکہ اکبر کی یہ عادت تھی اور شاید اس کو یہ اپنے باپ سے ورثہ میں

ملی تھی کہ وہ ہر روز صبح اپنے محل کے جھروکے سے درشن دیا کرتا اور اگر دورے
پر ہوتا تو وہ منزل خیمہ کی کھڑکی سے درشن دیتا۔ لوگ جھروکے کے نیچے بڑی تعداد
میں محض اپنے بادشاہ کے درشن کرنے کے لیے یا چلا کر اپنی شکایات گوش گزار
کرنے کے لیے جمع ہوتے۔ اس طریقے کو ہندو خاص طور پر سراہتے تھے کیوں کہ ان کا
عقیدہ تھا کہ بادشاہ وشنو کا اوتار ہے۔ بعض ہندو درشن کی رسم کو اتنی اہمیت دیتے
کہ وہ شہنشاہ کے درشن سے قبل نہ کچھ کھاتے نہ پیتے۔

باب 13

اکبر کی کامیابی

1580ء میں سلطنت کو تاریخی وجغرافیائی بنیادوں پر بارہ صوبوں میں تقسیم کردیا گیا (1595ء میں تین اور صوبوں کا اضافہ ہوا) یہ صوبے کابل، ملتان، لاہور، دہلی، آگرہ، الٰہ آباد، اودھ، بہار، بنگال، اجمیر، مالوہ اور گجرات تھے۔ ان میں سے ہر ایک صوبہ میں ایک سپہ سالار (صوبے دار) یا وائسرائے، ایک دیوان (رئیس امور مال) ایک بخشی (خزانہ دار) ایک صدر (رئیس خیرات وامور دینی) ایک قاضی یا میر عدل، ایک کوتوال، ایک وقائع نویس اور ایک میر بحر (محکمۂ نہر کا رئیس) مقرر ہوتے۔ ان لوگوں کو حکم تھا کہ جو اصلاحات جاری کی جائیں ان کو نافذ کردیں۔

جس زمانے میں اکبر انتظامی امور کی اصلاح اور مذہبی وعقلی مباحثات میں مصروف تھا اسی وقت بنگال میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ یہ بغاوت رائے پتر داس دیوان اور مظفر خاں کی عدم تدبر کی وجہ سے رونما ہوئی۔ مظفر خاں اپریل 1579ء میں بنگال کا صوبے دار مقرر کیا گیا تھا۔ بنگال کے امرا جن میں اکثر وبیشتر سنی تھے اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ وہ شیعہ اور ہندوؤں کے ماتحت رہیں لہٰذا انھوں نے ان کے تقرر پر اظہار ناراضمندی کیا۔ شہنشاہ ان لوگوں کے غیر منطقی رویے کی بنا پر اپنی سیاست میں تبدیلی کرنے کو تیار نہ تھا۔

ان افسروں کو شہنشاہ نے یہ ہدایت دے کر روانہ کیا تھا کہ وہ تازہ ملکی اور فوجی

اصلاحات کو صوبے میں بروئے کار لائیں۔ بنگال کے فوجی افسر جو کہ اس وقت تک صوبہ میں بڑی بڑی جاگیروں کے مالک تھے اس کے لیے تیار نہ ہوئے کہ وہ اپنے غیر قانونی منافع کا جساب دیں، اپنے گھوڑوں کو داغ لگوائیں یا جاگیروں سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ بدقسمتی سے اس وقت محکمۂ مال کی صدارت خواجہ شاہ منصور کے ہاتھ میں تھی جو ایک ہوشیار اور لائق افسر تھا مگر ساتھ ہی ساتھ سخت مزاج اور نفاذِ اصلاحات کے سلسلے میں متشدد تھا۔

بنگال میں جس کی آب و ہوا مضر صحت تھی اور جس میں غیر تابع افغانوں کی بڑی تعداد رہتی تھی مقامی فوجی افسروں کی وفادارانہ حمایت کے بغیر نظامِ حکومت اچھی طرح نہ چل سکتا تھا۔ نئے افسروں نے ان حالات کو ملحوظ رکھے بغیر بڑی شدت کے ساتھ اصلاحات کو نافذ کرنا شروع کر دیا۔

بابا خان کہا کرتا تھا کہ اس نے خود ستر ہزار روپیہ خرچ کر دیا لیکن سو گھوڑوں کو بھی داغ نہ کروا سکا۔ دوسرے جاگیرداروں کی حالت تو اس سے بھی ابتر تھی۔ جب فوجی افسروں میں بے اطمینانی پھیلی تو پھر دوسرے عناصر میں بھی بے اطمینانی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ سیورغال جاگیردار بھی نئے قوانین سے ناخوش تھے کیوں کہ ان کے عطیات میں کمی آ گئی تھی۔

قاضی یعقوب نے جس کو سلطنت کے قاضی القضاۃ کے عہدے سے برخاست کرکے بنگال کا میر عدل مقرر کیا گیا تھا مسلمانوں کے درمیان بے اطمینانی کی لہر دوڑائی اور اس بات کو ہوا دی کہ شہنشاہ رافضی عقائد کی تبلیغ کر رہا ہے۔ حالات کو اور زیادہ خراب کرنے میں مرزا محمد حکیم کے کارندوں کا ہاتھ تھا جو کہ بنگال میں لوگوں کو بغاوت پر اکسا رہے تھے۔ ان کی رہبری معصوم خاں کابلی مرزا کا رضاعی بھائی اور روشن بیگ کر رہے تھے۔

بغاوت کی فوری وجہ یہ تھی کہ بنگال کا فوجی بھتہ سو فی صدی سے گھٹا کر پچاس فی صدی اور بہار کا پچاس سے گھٹا کر بیس فی صدی کر دیا گیا تھا اور جب اس قانون کو گذشتہ تاریخوں سے بروئے کار لایا گیا اور یہ حکم دیا گیا کہ جس قدر رقم اضافہ ادا ہو چکی ہے وہ واپس کی جائے تو حالات اور بھی بگڑ گئے۔ ان احکامات کے نافذ کرنے کے لیے

مقامی حکام نے زبردستی کی۔ بالیسور کے جاگیردار خالدین خاں کو قید کر لیا گیا اور بعد
سے اس کی خوب پٹائی کی گئی۔ اس بات سے جاگیرداروں کے درمیان غم و غصے
کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ شہنشاہی حکومت کی طرف سے یہ احکامات
صادر ہوئے کہ روشن بیگ کو جس نے ققشالوں کے پاس پناہ لی تھی گرفتار کر لیا جائے
مظفر خاں نے اس کو ققشالوں سے چھین لیا اور ان کے بڑے سردار بابا خاں سے
سخت لہجے میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ خود روشن بیگ کا سر اپنے ہاتھوں قلم کرے۔
اقتدار کے اس غلط مظاہرے نے ققشالوں میں زبردست ناراضگی پیدا کر دی۔
ققشالوں نے اپنے سر منڈا دیے۔ اپنی بلند ٹوپیاں پہن لیں اور بغاوت کا اعلان
کر دیا۔ باغی گوڑ کی طرف روانہ ہو گئے اور مظفر خاں کی جائداد کو لوٹ لیا۔

جونہی بغاوت کی خبر دارالسلطنت پہنچی شہنشاہ نے مظفر خاں کو ققشالوں کو
ٹھنڈا کرنے کا حکم دیا کیونکہ وہ شہنشاہ کے سب سے قدیمی اور وفادار سپاہی تھے
چنانچہ صوبے دار نے رضوی خاں اور پتر داس کو ققشالوں کے پاس روانہ کیا۔ ممکن
ہے مسئلے کا حل نکل آتا لیکن نارائن داس نے رائے پتر داس کو یہ مشورہ دیا کہ وہ ققشالوں
کے رہنما کو جو گفتگو کے لیے آیا ہوا تھا قتل کرا دے۔ پتر داس نے یہ بات رضوی خاں کو
بتلائی اور اس نے اس بات سے ققشالوں کو آگاہ کر دیا۔ یہ بات چاہے غیر سنجیدہ
اور نادرست ہی کیوں نہ ہو مگر باغی رہنما کو خوف زدہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس
نے رضوی خاں کو قید کر لیا اور تشدد کرنے لگے۔

بغاوت کی آگ بنگال سے ہوتی ہوئی بہار میں پھیل گئی جہاں کہ رائے پرشوتم
اور مولانا طیب اصلاحات کو زور و شور سے نافذ کر رہے تھے۔ باغیوں کی سرداری
معصوم خاں کابلی حکیم کے رضاعی بھائی اور ارباب بہادر کے ہاتھوں میں تھی۔ معصوم
ایک مستعد آدمی تھا جو اپنی بہادری اور کمال میں شہرت حاصل کر چکا تھا۔ ادھر
ارباب بہادر بھی باہمت و تجربہ کار آدمی تھا۔ ان کو مُلا محمد یزدی سے جو کہ شیعہ تھا
اور حال ہی میں جونپور کا قاضی مقرر ہوا تھا مدد ملی۔ مُلا نے ایک فتویٰ جاری کیا جس
میں "میدان میں نکل آنے اور شہنشاہ کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے پر زور دیا گیا۔"
کیونکہ "شہنشاہ نے اپنی سلطنت میں ایسی جاگیروں پر دست درازی شروع

کردی ہے جو ہماری اور خدا کی ملکیت ہے۔"

باغی اب پٹنہ کی طرف بڑھے، اس کو لوٹا، ملا طیب کو مار بھگایا اور رائے پرشوتم کو جب کہ وہ بکسر کے قریب دریائے گنگا کے کنارے عبادت میں مصروف تھا قتل کر ڈالا۔ معصوم خاں نے ارباب بہادر کو پٹنہ میں بہار کا انتظام سونپا اور خود بنگال کے باغیوں کی مدد کو چل پڑا۔ اس نے تیلیا گڑھی میں جو کہ بنگال کا دروازہ کہلاتی تھی خواجہ شمس الدین کو شکست دی اور بنگال کے باغیوں سے جا ملا۔

اب باغیوں کی مشترکہ فوج نے مظفر خاں کا محاصرہ کر لیا۔ وہ ٹانڈا کے مٹی کے قلعے میں جو زیادہ مضبوط نہ تھا محصور ہو گیا اور اُنیس روز تک بڑی بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ کچھ امراء وزیر خاں جمیل بیگ کی سرکردگی میں باغیوں سے جا ملے تو پھر وہ بہت کمزور پڑ گیا۔ اب مظفر خاں نے قلعہ کو سپرد کرنے کی شرائط پیش کیں اور یہ کہا کہ اس کو مکہ جانے کی اجازت اور خاندان والوں کی حفاظت کا یقین دلایا جائے۔

مظفر خاں کی اس تجویز اور مرزا شرف الدین کی رپورٹ نے جو حال ہی میں قلعہ سے فرار ہو کر آیا تھا باغیوں کو اس بات پر اکسایا کہ وہ قلعہ پر دھاوا بول دیں اور فتح یاب ہو کر واپس ہوں۔ مظفر خاں کو ہر قسم کی ایذا رسانی کے بعد قتل کر دیا گیا اور اب بنگال و بہار باغیوں کے قدموں میں تھے۔ باغیوں نے مرزا شرف الدین حسین کو اپنا سردار منتخب کیا۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے یہ بھی کیا کہ 10 اپریل 1580ء کو اکبر کے بھائی مرزا محمد حکیم کے نام کا خطبہ پڑھا اور آپس میں عہدے اور القاب تقسیم کر لیے۔

مرزا بے نوشش بزدل تھا اور اس کا مقابلہ کسی طرح اکبر سے نہیں کیا جا سکتا۔ جب شہنشاہ کو بنگال اور بہار کی بغاوت کا علم ہوا تو اس نے راجہ ٹوڈر مل اور شیخ فرید بخشی کو باغیوں سے مقابلے کے لیے روانہ کیا اور اودھ، الہ آباد اور جونپور کے جاگیرداروں کو حکم دیا کہ ان لوگوں کی مدد کریں۔ اسی طرح صادق خاں وغیرہ کو ہدایت ملی کہ چندیری سے مشرقی صوبجات کی طرف بڑھیں۔

جس وقت شاہی فوج بہار پہنچی محب علی خاں نے ارباب بہادر سے پٹنہ چھین لیا۔

پٹنہ پہنچ کر ٹوڈرمل نے اپنے افسروں کے ساتھ تبادلہ خیال کیا اور جنگی صف آرائی کی شکل میں بنگال کی طرف چل دیا۔ معصوم خاں فرنخودی (نہ کہ کابلی) نے ٹوڈرمل کو قتل کرنے کی سازش کی لیکن ٹوڈرمل کو اس کی اطلاع مل گئی اور اس نے معاملے کو مزید پیچیدہ کیے بغیر اپنی حفاظت کا انتظام کرلیا اور فرنخودی کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔

بنگال میں باغی بیکار بیٹھنے والے نہ تھے۔ ان کے پاس تیس ہزار سوار، پچاس ہاتھی اور توپ خانہ وکشتیاں تھیں۔ چونکہ ٹوڈرمل کو فرنخودی اور بعض دیگر امرار کی وفاداری پر شک ہوگیا تھا۔ اس نے مونگھیر میں اپنی پوزیشن مضبوط کرلی۔ یہاں پر اس نے باغیوں کو گھیر لیا۔ محاصرہ کئی ماہ تک جاری رہا اور اس دوران میں فوج میں کچھ سرداروں کے فرار ہوجانے سے کمزوری آگئی اور روپیہ پیسہ اور رسد کی کمی کے باعث سپاہیوں کو تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ اکبر نے روپیہ اور رسد ارسال کیا اور خان اعظم عزیز کوکا کو بنگال کی حکومت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے کا حکم دیا۔ شہباز خاں کو میواڑ سے بلاکر خان اعظم کی مدد کے لیے روانہ کردیا۔

جونہی شہباز خاں میواڑ سے روانہ ہوا رانا پرتاپ اپنی پہاڑی پناہ گاہ سے باہر نکل آیا اور اس نے ایک ایک کرکے مغل تھانوں پر قبضہ کرلیا اور فوج کو بھگانا شروع کردیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے میواڑ کے بڑے حصے کو دوبارہ حاصل کرلیا۔ ادھر میواڑ میں چندرسین نے آزادی کا پرچم پھر سے بلند کردیا اور صوبہ اجمیر میں مار دھاڑ اور غارت گری شروع کردی۔

میواڑ کے افسروں کی طرح مالوہ کے افسروں کو بھی بلایا گیا۔ یہاں پر چونکہ سپاہیوں کو بھتہ کے اضافے کی رقم نہیں ملی تھی اس لیے بعض افسروں نے شہاب الدین کی سرکردگی میں شورش کردی اور شجاعت خاں صوبے دار اور اس کے بیٹے کو قتل کردیا خوش قسمتی سے بغاوت زیادہ نہ پھیلی اور جلد ہی اس پر قابو پالیا گیا۔

ایک ساتھ ہی شورشوں اور بغاوتوں کے پھیلنے کی وجہ سے شہنشاہ پر بہت ہی زبردست [illegible] اس نے تو مشکلات کے مکتب میں بچپن ہی سے درس حاصل کیا تھا اور سخت جان اور سخت کوش ہوگیا تھا۔ اس نے ان حالات کا بڑے ٹھنڈے دل اور قابل تحسین حوصلے سے مقابلہ کیا۔

مونگیر کے افسروں نے درخواست روانہ کی کہ شہنشاہ بذات خود آئے لیکن اکبر آگرہ چھوڑنے کے لیے اس وجہ سے تیار نہ تھا کہ وہ ایک قلب سلطنت تھا دوسرے یہ کہ وہاں سے اکبر باقی سلطنت کے حالات کا بغور مطالعہ کرسکتا تھا اور اپنے بھائی کی نقل و حرکت کو زیر نظر رکھ سکتا تھا۔ ادھر چونکہ مشرقی باغیوں نے حکیم کے نام کا خطبہ پڑھ دیا لہذا یہ خیال کیا جاسکتا تھا کہ وہ اکبر کے خلاف جارحانہ کاروائیاں شروع کردے۔

اس کے علاوہ جو اطلاعات اکبر کو حاصل ہوئیں ان سے پتہ چلا کہ باغی بجائے اس کے کہ مزید پیش رفت کرتے کافی حد تک نقصان اٹھا چکے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے مونگیر کا خشکی کا راستہ بند کردیا تھا لیکن اُن کی یہ کوششیں کہ دریا کے ذریعے رسل ورسائل کو بند کردیں ناکام رہیں پھر بھی انھوں نے بارود سے بھری تین سو کشتیوں کو ڈبو دیا۔ اکبر نے حوصلے سے کام لیا اور اس کو یقین ہوگیا کہ عزیز کوکا اور شہباز خاں کی آمد سے بہار میں بغاوت کی کمر ٹوٹ جائے گی لیکن اکبر نے راجا ٹوڈرمل کا مشورہ مان لیا کہ وہ خواجہ شاہ منصور کو جس کی سختی کے سبب ہی بغاوت بھڑک اٹھی تھی معطل کردے۔

یہ بھی امید کی جاتی تھی کہ شاہ منصور کے ہٹائے جانے سے باغیوں کے جذبات ٹھنڈے ہوجائیں گے اور انھیں حالات کی بہتری کی امید بندھ جائے گی۔

شہنشاہ کا اندازہ غلط ثابت نہ ہوا۔ عزیز کوکا اور شہباز خاں کی آمد کی خبر، صادق خاں کی سرکردگی میں محصورین کے محاصرہ کرنے والوں پر کامیاب حملے، اڑیسہ میں افغان سردار قتلو کے حملوں پر کامیاب دھاوے، قاقشالوں کے سردار بابا خاں کی سرطان کی وجہ سے موت اور باغی کیمپ میں رسد کی اس وجہ سے کمی کہ مقامی ہندو آبادی ان لوگوں کے ظلم وستم سے تنگ آگئی تھی ان سب باتوں نے مل کر باغیوں کے حوصلے پست کردیے۔ باغی کوئی ٹھوس کامیابی حاصل نہ کرسکے تھے جس کے سبب ان کے ہمراہی اکتا گئے اور شاہی مدد پہنچنے سے قبل آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگے۔

ارباب بہادر پٹنہ کی طرف روانہ ہوا لیکن جب وہ اسے فتح کرنے میں ناکام رہا

تو حاجی پور کی طرف فرار ہو گیا۔ محب علی خاں نے اس کا تعاقب کر کے شکست دی۔ معصوم کابلی بہار کی طرف واپس ہوا لیکن ٹوڈرمل اور صادق خاں نے اس کا پیچھا کیا اور [illegible] ستمبر [illegible] کو اس کو شکست دی لیکن وہ خود بچ نکلا۔

اسی وقت عزیز کوکا اور شہباز بھی آ پہنچے اور ٹوڈرمل کی فوج میں شریک ہو گئے اگر شہباز خاں، عزیز اور ٹوڈرمل سے مل کر پوری طرح کام کرتا تو بغاوت نسبتاً جلد ہی ختم ہو جاتی لیکن شہباز ضدی تھا اور اس نے یہی فیصلہ کیا کہ اپنے منصوبوں پر جا سکے ایک دوسری پیچیدگی جس کے سبب بغاوت کو دبانے کا کام طول پکڑ گیا یہ تھی کہ معصوم خاں فرنخودی نے جو جونپور کی طرف چلا گیا تھا اور نیابت خاں نے جو کہ بڑے شہاب احمد خاں کا بھتیجہ اور ضلع الہ آباد میں اریل کا جاگیردار تھا اعلانیہ بغاوت کر دی عزیز اور ٹوڈرمل صوبہ بہار کو شہباز خاں کے ہاتھوں میں سونپ کر خود ترہت کی جانب روانہ ہو گئے۔ باغیوں میں پورا اتحاد نہ تھا۔ معصوم کابلی نے مرزا اشرف الدین کو زہر دے دیا اس میں شک نہیں کہ مشرقی علاقوں میں باغیوں کی سرکشی وسیع تر علاقے میں پھیل گئی تھی لیکن ان کا اتحاد و اتفاق بڑی حد تک کمزور پڑ چکا تھا ان کو صرف یہ امید تھی کہ مرزا حکیم حملہ کرے شہنشاہ کی توجہ اور قوت کو پوری طرح مغرب کی طرف مبذول کرے گا۔

شہباز کو جب فرنخودی اور نیابت خاں کی باغیانہ سرگرمیوں کی اطلاع ملی اس وقت وہ بہار کی بغاوت کی سرکوبی میں مصروف تھا۔ وہ فرنخودی اور ارباب بہادر سے جنگ کرنے کے لیے تیزی سے جونپور کی طرف روانہ ہو گیا۔

[illegible] جنوری [illegible] کو ایودھیا سے پچاس میل کے فاصلے پر ایک جھڑپ ہوئی باغیوں کے پاس ایک بڑی فوج تھی۔ وہ لوگ تقریباً معرکہ سر کر چکے تھے کہ یہ افواہ پھیل گئی کہ فرنخودی مارا گیا۔ یہ افواہ سن کر باغیوں کے منصوبوں پر پانی پھر گیا اور وہ شکست کھا گئے۔ شہباز کی فوج سے اتنی سختی سے نپٹا گیا تھا کہ انھیں یہ ہمت نہ ہوئی کہ بھاگتے ہوئے باغیوں کا جو ایودھیا جا رہے تھے تعاقب کرتے۔ شہباز خاں کی فوج سستا کر پھر میدان میں اتر آئی۔ [illegible] فروری کو ایودھیا سے سات میل کے فاصلے پر شہباز نے فرنخودی کو شکست دی۔ اس کے کیمپ کو لوٹا اور اس کے خاندان والوں کو قید کر لیا۔ فرنخودی ارباب بہادر اور نیابت خاں کو چھوڑ کر بھاگ گیا لیکن جلد ہی بہرائچ پر حملے کر کے

لیے ٹوٹ پڑا۔ وہاں اس کو کامیابی نہ ہوئی تو وہ محمود آباد پر پہنچا لوٹ مار کی اور جونپور پر حملہ آور ہوا۔ شاہی فوج اس کا اتنی سختی سے پیچھا کر رہی تھی کہ اس کے ساتھی اس کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

کافی بھاگ دوڑ کے بعد اس نے عزیز کوکا سے درخواست کی کہ وہ اس کی سفارش کرے۔ شہنشاہ نے عزیز کوکا کے کہنے پر اس کو معاف کر دیا لیکن چند روز بعد کسی شخص نے ذاتی رنجش کی بنا پر اس کو قتل کر دیا۔

ارباب بہادر اور نیابت خاں ایودھیا کے قریب جنگ میں شکست کھا کر سنبھل کی طرف فرار ہو گئے۔ بریلی کے قلعہ کو فتح کرنے میں ناکام ہو کر وہ کمایوں کے راجا رام شاہ اور دوسرے ہندو راجاؤں کی مدد سے لوٹ مار میں مصروف ہو گئے۔ لیکن حکیم عین الملک نے اپنی سیاست سے ہندو راجاؤں اور نیابت خاں کو بھی اپنی طرف ملا لیا۔ اب ارباب بہادر اور اس کے ساتھی رہ گئے جو ابھی تک لڑ رہے تھے۔ آخر کار ان کو شکست ہوئی اور راہِ فرار اختیار کی۔

نیابت خاں کو رنتھنبور کے قلعہ میں بھیج دیا گیا۔ اس نے وہاں سے بھاگنا چاہا لیکن پکڑا گیا اور قتل کر دیا گیا۔ حالانکہ ارباب بہادر ابھی تک آزاد تھا اور معصوم کابلی اور قتلو خاں بنگال اور اڑیسہ میں حکمران تھے لیکن بغاوت کی کمر ٹوٹ چکی تھی اور اب باغیوں کو تھوڑا تھوڑا کر کے کچل دینا زیادہ مشکل نہ تھا۔

معصوم خاں کابلی عیسیٰ خاں کے ساتھ جو جنوب مشرقی بنگال کا ایک طاقتور جاگیردار تھا جا ملا۔ وہ دونوں شاہی احکامات کی نافرمانی کرتے رہے اور جب بھی بنگال کی حکومت میں کسی قسم کی کمزوری محسوس کرتے تو حملہ کرنے سے بھی نہ چوکتے لیکن وہ لوگ مغلیہ سلطنت کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے اور نہ مشرق میں حکومت کی گرفت کو ڈھیلا کر سکے۔ جب یہ دونوں 1579ء میں انتقال کر گئے تو مغلوں کے لیے میدان صاف ہو گیا۔

اکبر کی خوش قسمتی سے حکیم کا ہندوستان پر حملہ کرنے کا منصوبہ بدخشاں میں خانہ جنگی کے سبب ملتوی ہو گیا۔ اگر اس نے ہندوستان پر اس وقت حملہ کیا ہوتا جبکہ بنگال کی بغاوت اپنے عروج پر تھی اور دوسرے علاقوں میں بھی بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی تو اکبر کو بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ جب کابلی افواج ہندوستان پر حملہ آور ہوئیں۔

تو حالت کافی سدھر چکی تھی حالانکہ مشرق کی بغاوت پوری طرح ختم نہ ہو پائی تھی۔

دسمبر 1580ء میں کابلی افواج کا ہراول دستہ دریائے سندھ عبور کر گیا۔ رہتاس کے صوبے دار یوسف نے جس کی ککھڑ بڑی وفاداری سے مدد کر رہے تھے بہادری سے مقابلہ کیا۔ نورالدین مارا گیا اور افغان فوج کو پیچھے دھکیل دیا گیا۔ اکبر نے کنور مان سنگھ کو آگے بڑھنے اور سرحدات پر قبضہ کرنے کا حکم دیا۔

مان سنگھ تیزی سے آگے بڑھا اور کچھ فوج راولپنڈی کی طرف بھیج دی چونکہ اس کو اس بات کا خدشہ تھا کہ افغان نورالدین کی شکست کا انتقام لینے کے لیے دوبارہ حملہ کریں گے مان سنگھ کا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ شادمان "شمشیر عساکر افغانی" نے 18 دسمبر کو اٹک سے پندرہ میل نیچے نیلاب کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ مان سنگھ راجپوتوں کی فوج لے کر نیلاب کی طرف تیزی سے روانہ ہوا۔

24 دسمبر کو افغانوں اور راجپوتوں کے درمیان جنگ ہوئی جس میں افغان شکست کھا گئے۔ مان سنگھ کے بھائی راجا سورج سنگھ نے جو کہ مغل فوج کے ہراول دستے کا سالار تھا شادماں کو دست بدست لڑائی میں اس قدر زخمی کر دیا کہ وہ قریب المرگ ہو گیا حالانکہ میدانِ جنگ سے شادمان کو زندہ اٹھا کر لے جایا گیا لیکن وہ جلد ہی انتقال کر گیا۔ جونہی حکیم کو شادمان کی موت کی خبر ملی وہ 15,000 سواروں کی فوج لے کر آگے بڑھا۔ اکبر نے پہلے ہی سے حکیم کی پیش بندی کر دی تھی اور سندھ کے افسروں کو یہ حکم بھیج دیا تھا کہ مرزا کے سندھ عبور کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالیں اور جب تک وہ خود نہ آ جائے لڑائی ٹالتے رہیں۔

اس حکم کے سبب مان سنگھ لاہور واپس لوٹا تاکہ وہاں پر بچاؤ کے انتظامات مکمل کر سکے۔ مرزا اب دریائے سندھ پار کر چکا تھا اور اس نے رہتاس کے گورنر یوسف کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ حکیم نے رہتاس کے قلعہ کو فتح کرنا تضیع اوقات سمجھا اور لاہور کی طرف بڑھ گیا۔

راجا بھگوان داس، مان سنگھ اور دوسرے سرداروں نے لاہور کا بہادری سے دفاع کیا اور مرزا کی ساری کوششیں بے کار ثابت ہوئیں۔ جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ لاہور کا ایک بھی افسر خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان اور نہ کوئی مُلّا اکبر کے مقابلے میں اس کی

طرف داری پر آمادہ ہے تو مرزا کو بہت مایوسی ہوئی۔

شہنشاہ کابل کی طرف سے حملے کے لیے پوری طرح آمادہ تھا۔ اس نے 50000 سواروں، 500 ہاتھیوں اور بے شمار پیادوں اور بندوقچیوں کی فوج تیار کر لی تھی 8 فروری 1581ء کو اکبر ایک زبردست فوج کی سرکردگی میں جو اس قدر بڑی تھی کہ شاید اتنی بڑی فوج کی کمان اس نے اپنی ساری عمر میں نہ کی ہوگی دارالسلطنت سے باہر نکل آیا۔ اکبر کے ساتھ اس کے دو شہزادے سلیم اور مراد بھی تھے۔

مادر مانسے رات کا کہنا ہے کہ فوج کا نظم و نسق بہت عمدہ تھا اور ہر چیز گھڑی کی طرح بروقت انجام پا رہی تھی۔ یہ بات اس وجہ سے تھی کہ اکبر انتظامات کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل پر ذاتی توجہ دیتا یہاں تک کہ فوجی کیمپ کے بازار میں جو بھی سامان فروخت ہوتا وہ اس کی بھی نگرانی کرتا۔

جب شہنشاہ شاہ آباد میں خیمہ زن تھا تو اس نے خواجہ شاہ منصور وزیر مال کو غداری کے الزام میں سزائے موت دی۔ مان سنگھ کو افغان سردار شادمان کے ذریعے سے تین خط بنام حکیم الملک، قاسم خاں میر بحر اور خواجہ شاہ منصور دستیاب ہوئے جو گویا اُن خطوط کے جواب تھے جو انھوں نے حکیم کے نام اس کی ہمت بڑھانے اور اس کو حملے کی دعوت دینے کے لیے لکھے تھے۔

پہلے تو شہنشاہ اس بات پر خاموش رہا لیکن جب شاہ منصور نے شہنشاہ کو یہ خبر دی کہ مرزا کا دیوان ملک عیسےٰ کابلی اپنے آقا سے غیر مطمئن ہو کر بھاگ آیا ہے اور شاہی کیمپ میں ملازمت کی امید میں موجود ہے تو شہنشاہ کا شبہ جڑ پکڑ گیا۔ اس نے ان خطوط کو جو مان سنگھ نے بھیجے تھے منصور کو دکھایا۔ اور اس سے اس ماجرے کی تفصیل دریافت کی۔ منصور نے بے گناہی کا اظہار کیا لیکن اس کے بیان سے شہنشاہ کو اطمینان نہ ہوا کیوں کہ اس کے دلائل یا تو کافی نہ تھے یا پھر اس وجہ سے کہ اس سال اتنے افسرانِ اعلیٰ نے بغاوتیں کی تھیں کہ اکبر ضرورت سے زیادہ حساس اور شکی ہو گیا تھا منصور کو عہدے سے برخاست کر دیا گیا اور اس کی باریابی بند کر دی۔

کچھ دنوں بعد کیمپ کا کوتوال خطوط کا ایک اور بستہ لے کر حاضر ہوا جو اس نے منصور کے شقدار شرف بیگ سے فیروز پور کے مقام پر چھینا تھا۔ ان میں سے ایک خط نے اس بات

کا علم ہوا کہ حکیم مرزا نے اپنے سارے مفتوحہ علاقوں کے پرگنوں میں شقدار مقرر کر دیے ہیں لیکن خواجہ منصور کی جاگیر کو اس سے بری رکھا ہے۔ یہ بات پوری طرح نہیں معلوم کہ آیا اس کے علاوہ بھی کوئی ایسے دلائل تھے جن کی وجہ سے منصور کی وفاداری پر شک کیا جا سکتا۔ بہرحال جو بھی ہو یہ ثبوت شہنشاہ کو منصور کے قصوروار ثابت کرنے کے لیے کافی تھے چغل خوروں کی بھی کمی نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی کے دل میں بھی اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ نہ رہا اور سب ہی اس کے دشمن ہو گئے۔

وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے شہنشاہ نے یہ فیصلہ کیا کہ ادھورا اقدام بے فائدہ ہوگا لہٰذا فتنے کی حالت میں اس نے یہ حکم صادر کیا کہ اگر کوئی اعلیٰ عہدے کا ذمے دار افسر اس کی ضمانت نہ کرے تو اس کو بر سرِ عام قتل کر دیا جائے۔

شاہ آباد کے مقام پر ابوالفضل نے امرائے خاص اور عہدیداران حکومت کی موجودگی میں منصور پر عائد کردہ الزامات کا اعلان کیا اور اس کو [illegible] فروری [illegible] ء کو ببول کے درخت پر پھانسی دی گئی۔ اس طرح مملکت کے سب سے زیادہ لائق وزیر مال (شاید بہ استثنائے ٹوڈر مل) کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا جس کا اکبر کو اپنی ساری زندگی ملال رہا۔

جب شہنشاہ کو کابل پہنچ کر اس بات کا پتہ چلا کہ خطوط کا آخری بستہ جس نے منصور پر عاید شدہ الزامات میں تابوت کی آخری کیل کا کام کیا ایک بزدلانہ جعلسازی کا نتیجہ تھا تو اس کے غم و اندوہ کی کوئی حد نہ رہی ہوگی اور اس کو ہمیشہ اس فریب اور چالبازی پر کفِ افسوس ملنا پڑا ہوگا۔

منصور کے خلاف قرائن اور دلائل ضرور موجود تھے لیکن وہ کسی طرح بھی اتنے واضح نہ تھے کہ اس کے قتل کے حکم کو جائز قرار دیا جا سکتا۔ بہرحال سیاسی ضروریات اور حالات کا تقاضا اس بات کا مقتضی تھا کہ عدل و انصاف کی باریکیوں سے درگزر کر کے فوری اور سخت کارروائی کی جائے۔ منصور کے قتل سے اگر بعض لوگوں کو درسِ عبرت ملا تو اس کے مرنے سے ہر ایک کو سکون حاصل ہوا۔

اکبر سرہند سے ایک منزل پار کر چکا تھا کہ اس کو مرزا حکیم کے لاہور سے واپس چلے جانے کی خوشخبری ملی۔ مرزا کو معلوم ہو گیا کہ اس کے سارے اندازے غلط تھے۔ اس نے یہ امیدیں لگا رکھی تھیں کہ اکبر کو خود اس کے حکام برباد کر دیں گے اور جونہی اس کی افواج

ہندوستان میں داخل ہوں گی ملک کے ہر گوشے میں بغاوت پھوٹ پڑے گی۔ لوگ جوق در جوق اس سے آملیں گے اور کم از کم لاہور تو بلا کسی مقاومت و مزاحمت کے اس کے قبضے میں آجائے گا لیکن اس کو سخت مایوسی ہوئی۔ نہ تو کسی اعلیٰ افسر نے شہنشاہ کا ساتھ چھوڑا اور نہ ہی مقامی لوگوں نے مرزا کا ساتھ دیا بلکہ راجپوت سالاروں نے اس کے سخت حملوں کو ناکام بنا دیا۔ جب اس کو اس بات کا پتہ چلا کہ شہنشاہ ایک زبردست فوج لے کر لاہور کی طرف آ رہا ہے تو وہ ہمت کھو بیٹھا اور تیزی سے بھاگ کر ہندوستان سے فرار ہو گیا۔

اکبر کے لیے لاہور جانا ضروری نہ تھا چنانچہ اس نے سرحد کی طرف جانے کا فیصلہ کیا تاکہ وہاں کے دفاعی امور کو منظم کر سکے اور اٹک میں ایک مضبوط قلعہ کی بنیاد ڈالے تاکہ یہ قلعہ کابل سے ہونے والے حملوں کے مقابلے میں کام دے اور شیر شاہ اور اسلام شاہ نے رہتاس اور مانکوٹ میں جو مضبوط قلعوں کا سلسلہ قائم کیا تھا یہ قلعہ اس سلسلے کی آخری کڑی ہو۔

مئی میں اکبر رہتاس ہوتا ہوا سندھ پہنچا۔ یہاں اس نے ایک مضبوط قلعہ کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام اپنی سلطنت کے دور دراز ترین مشرقی سرحد کے صوبہ اڑیسہ کے شہر کٹک بنارس کے وزن پر اٹک بنارس رکھا۔ حکیم کو پیغام بھیجا گیا کہ وہ خود آکر شرائط کا تصفیہ کرے یا اپنے ایک بیٹے اور بہن بخت النساء بیگم کو بھیجے یا کم از کم خواجہ حسن نقشبندی کو روانہ کرے لیکن حکیم نے اس پیام کا جواب تک دینا مناسب نہ سمجھا۔

مان سنگھ کو حکم ملا کہ دریائے سندھ عبور کر کے پشاور کی طرف جائے۔ اس کے بعد شہزادہ مراد کو بھی بھیجا گیا۔ شہنشاہ نے ایک مرتبہ پھر حکیم کو پیغام بھیجا کہ وہ آکر عہد وفاداری اٹھائے تاکہ شاہی افواج راولپنڈی سے واپس لوٹ جائیں۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو اکبر نے 12 جولائی 1581ء کو دریائے سندھ عبور کر کے اپنی اصلی فوج کو پیچھے پیچھے آنے کا حکم دیا۔

اکبر کے اس اقدام سے مرزا پر کچھ اثر ہوا اور اس نے حاجی حبیب اللہ کو پیغام وفاداری دے کر روانہ کیا۔ شہنشاہ محض الفاظ سے مطمئن ہونے والا نہ تھا اور یہ چاہتا تھا کہ مرزا کی وفاداری کا کوئی ٹھوس ثبوت ملے۔

بہرحال اکبر نے کابل پر حملہ کرنے کے ارادے کا اظہار کیا۔ اس اعلان سے افسروں اور امرا میں ناراضگی کی لہر دوڑ گئی کیوں کہ گرمی کے موسم میں اتنے طویل سفر سے پہلے ہی تھک چکے تھے اور پہاڑی سفر کے لیے قطعاً تیار نہ تھے۔

اس سلسلے میں ابوالفضل نے بھی گرمجوشی نہ دکھائی۔ ہندوستانی سپاہی برف سے خوف زدہ تھے اور ان کو افغانستان میں ایک سخت اور جانفشاں مہم کے خیال سے ہی وحشت ہونے لگی۔ مونسے رات نے شہنشاہ کو یہ مشورہ دیا کہ بات کو وہیں ختم کر دے اور اپنے بھائی سے جھگڑا نہ بڑھائے۔

اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے بیس بڑے بڑے امرا کی مجلس طلب کی گئی۔ ان سب نے بالاتفاق آگے بڑھنے کے خلاف رائے دی لیکن اکبر نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ اٹل تھا بجز اس کے کہ مشرق میں بغاوت کی شدت ہو اور کوئی امر اس کے عزم کو متزلزل نہیں کر سکتا تھا۔ معصوم فرنخودی پر شہباز خاں کی فتح نے اس کی فکروں میں کمی کر دی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے افسروں کی رائے کو کہ دریائے سندھ عبور نہ کرے کوئی اہمیت نہ دی۔ اس نے ان لوگوں سے کہہ دیا کہ اگر وہ جانا نہ چاہیں تو وہیں ٹھہر سکتے ہیں لیکن وہ اپنی افواج کو لے کر آگے بڑھنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اکبر حالات کا انتظار کیے بغیر کابل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اکبر کی جرأت نے امرا پر حسب دلخواہ اثر کیا اور وہ بھی خواہ مخواہ اس کے پیچھے روانہ ہو گئے۔

گندمک پہنچ کر اکبر کو اطلاع ملی کہ مراد کی افواج کو زک اٹھانی پڑی۔ ۳۰ جولائی کو فریدوں فوج کے پچھلے دستے کے بکھرے ہوئے حصوں پر حملہ آور ہوا اور سامان لوٹ کر غائب ہو گیا۔ فریدوں پھر اپنی پناہ گاہ سے نکلا تھوڑی سی لڑائی لڑی اور جو خزانہ میر جعد اکبر شہزادہ مراد کے لیے لایا تھا لوٹ کر فرار ہو گیا۔ یکم اگست کو مرزا حکیم شہزادہ مراد سے لڑنے کے لیے خود کابل پہنچ گیا۔

اس لڑائی میں قریب تھا کہ وہ شہزادے پر حاوی ہو جائے کہ مان سنگھ تیزی سے جنگی ہاتھیوں کو لے کر آ پہنچا اور اتنا بچا تلا حملہ کیا کہ کابلی منتشر ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ شاہی افواج مرزا کی فوج کا پیچھا نہ کر سکیں کیوں کہ ایک تو وہ ملک کے جغرافیے سے پوری طرح واقف نہ تھیں اور دوسرے ان کو مرزا کی طاقت کا بھی صحیح اندازہ نہ تھا۔

بہرحال اکبر آگے بڑھا اور 10 اگست 1581ء کو کابل پہنچ گیا۔ یہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلا واقعہ تھا کہ ایک حکمراں فاتح کی حیثیت سے کابل میں داخل ہوا۔ کابل میں ٹھہرنا متعدد وجوہ کی بنا پر درست نہ تھا۔ اول تو یہ کہ اکبر کے ملازمین کابل پر سٹلے کی تجویز نے پہلے ہی خوش نہ تھے۔ لہذا ان کو زیادہ عرصے تک کابل میں رکھنا مناسب نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ مرزا ابھی تک آزاد تھا اور افغانوں کی ہمدردیاں اسی کے ساتھ تھیں۔ اس کا بھی اندیشہ تھا کہ وہ مایوس ہوکر وسط ایشیا کے ازبکوں کی پناہ میں چلا جائے۔ اس کا بھی امکان تھا کہ ازبک اس کو خوش آمدید کہہ کر اکبر کے مقابلے میں مدد کو تیار ہوجائیں۔ ازبکوں کی مداخلت سے بہت سی سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہوجاتیں جن کا سامنا کرنے کے لیے اکبر اس وقت تیار نہ تھا۔

تیسرے یہ کہ اکبر دارالسلطنت سے چھ ماہ سے زیادہ عرصے سے غیر حاضر رہا تھا لہذا جتنی جلد ممکن ہو سکے وہ واپس لوٹنا چاہتا تھا۔ ان سب کے علاوہ یہ کہ بنگال، راجپوتانہ اور گجرات کے حالات اتنے سدھرے ہوئے نہ تھے کہ وہ آزادی کے ساتھ ایک مضبوط غیر ملکی دشمن سے جنگ مول لیتا۔

مرزا حکیم نے اعلانیہ اپنی وفاداری کا اظہار کیا اور معافی کا خواستگار ہوا لیکن خود اکبر کے سامنے حاضر ہونے سے انکار کردیا۔ چنانچہ اکبر نے کابل کی حکومت کی باگ ڈور اس کی ہمشیرہ بخت النساء بیگم زوجہ خواجہ حسن کے ہاتھوں میں دے دی۔ اس نے بخت النساء پر یہ بات بھی ظاہر کردی کہ اگر حکیم نے پھر کوئی سرتابی کی تو دوبارہ چشم پوشی نہ کی جائے گی اور جب بھی وہ مناسب سمجھے گا کابل کی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لے گا۔ اکبر چند روز وہاں رہ کر ہندوستان کی طرف واپس ہوگیا۔

کچھ عرصے کے بعد حکیم کابل لوٹ آیا اور اب اپنی بہن کے نام سے حکومت کرنے لگا۔ مان سنگھ کو صوبہ سندھ کا صوبہ دار مقرر کرکے اکبر یکم دسمبر 1581ء کو دارالسلطنت واپس پہنچ گیا۔

اکبر کی زندگی میں 81-1580ء بہت ہی بحرانی سال گذرے ہیں۔ ہندوستان میں بغاوتیں، کابل افواج کا حملہ اور خود اس کے کیمپ میں بے اطمینانی' ان سب نے مل کر اس کی قوت عمل پر اثر ڈالا اور اس کی اہلیت نو بیرآزمائش بھی۔ اکبر ان حالات میں مضبوطی سے جما رہا

طوفان کا مقابلہ کیا اور ہر مشکل کو حل کر لیا۔ اس عظیم الشان کامیابی کی خوشیاں منانے کے لیے 1582ء کا سالانہ دربار زبردست پیمانے پر ترتیب دیا گیا۔ سارے صوبجاتی صوبے داروں کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم صادر ہوا۔ اسی موقع پر اکبر نے سالِ نو کی ضیافت وجشن کا آغاز کیا جس کو دہلی کے ابتدائی ترک سلاطین ایرانی بادشاہوں کی پیروی میں منایا کرتے۔ یہ مراسم متعصب مسلمانوں کے پکے کٹے ہی کروہ اور مالیاتی نقطۂ نظر سے بھتے ہی گراں بار کیوں نہ ہوں لیکن اشرافی طبقہ والے اس کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے کیوں کہ وہ خود نمائش اور شان وشوکت کے دلدادہ تھے۔ اس کے علاوہ عام لوگ بھی اسے پسند کرتے کیوں کہ ان کو بھی خوشیاں منانے کا ایک موقع ہاتھ آتا۔

اس موقع کی یادگار منانے کے لیے کچھ اہم اعلانات کیے گئے۔ پہلا اعلان شہنشاہ کی طرف سے اس سلسلے میں یہ ہوا کہ غلامی کا خاتمہ کیا گیا ہے کیونکہ "اس مٹھی بھر کمزور (انسان) کو کیا مجال کہ خود کو آقا کہلائے اور اولادِ آدم کو اپنا غلام بنائے"۔ یہ بھی اعلان کیا گیا کہ اسیرانِ جنگ کو غلام نہ بنایا جائے۔ کوتوالوں کو یہ حکم ملا کہ غلاموں کی خرید فروخت کا خاتمہ کردیں۔ ہزاروں غلاموں کو آزاد کردیا گیا۔

لفظ غلام کے بجائے چیلا استعمال کیا جانے لگا جس کا مفہوم کہیں بہتر ہے اور جس کے معنی خدمت گزار کے ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے لوگوں میں بے معنی افواہیں پھیل گئیں اور غیر ذمے دارانہ باتیں ہونے لگیں۔

ولیعہد سلطنت اور امرائے عالی مرتبت سے کہا گیا کہ ان میں سے ہر ایک عوام کے فائدے کے لیے ایک ایک تجویز پیش کرے۔ شہزادہ سلیم نے یہ تجویز پیش کی کہ بارہ سال کی عمر سے قبل شادی نہ کی جائے۔ عزیز کوکا نے یہ رائے دی کہ صوبے داروں کو اس بات کی اجازت نہ دی جائے کہ وہ کسی کو شہنشاہ کی اجازت لیے بغیر قتل کرسکیں۔

عبدالرحیم خانخاناں نے عرض کیا کہ جہاں تک ہوسکے چھوٹے چھوٹے پرندوں کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔ راجا ٹوڈرمل نے کہا کہ ہر روز محل میں خیرات بانٹنے کا حکم دیا جائے۔ یوسف خاں نے یہ عاقلانہ تجویز پیش کی کہ ہر شہر اور قصبہ سے حالات وواقعات کی یومیہ رپورٹ حاصل کی جائے۔

بیربل نے اس تجویز میں اضافہ کیا اور یہ کہا کہ قابلِ اطمینان انسپکٹر مقرر کیے جائیں اور

وہ لوگوں کی عام حالت اور غریبوں پر جو ظلم و ستم ہو اس کی اطلاع بھیجا کریں۔ قاسم خاں چیف انجینیر نے یہ چاہا کہ ساری سلطنت کی شاہراہوں پر سرائیں تعمیر کی جائیں۔ جمال نے یہ درخواست کی کہ پریشان حال لوگوں اور حاجت مندوں کو دربار میں لانے کے لیے ایک خاص افسر مقرر کیا جائے۔ ملک الشعرا فیضی نے ایک پرانی لیکن مفید تجویز پیش کی کہ بازار میں ہر چیز کی قیمت مقرر کرنے کے لیے سرکاری محاسب مقرر کیے جائیں۔

ابوالفضل کی یہ رائے تھی کہ ہر شہر اور قصبے کے داروغہ کو حکم دیا جائے کہ وہ مکانداروں کی تفصیلی اور "نام بہ نام و پیشہ بہ پیشہ" فہرست تیار کرے۔ اُن کی آمدنی و اخراجات پر گہری نظر رکھے اور آوارہ اور بیکاروں کو شہر سے نکال دے۔ حکیم ابوالفتح نے شفاخانوں کی تعمیر کی درخواست کی۔

شہنشاہ نے یہ ساری تجاویز قبول کرلیں اور ان کے نفاذ کا وعدہ کیا۔ بہرحال یہ کہنا تو مشکل ہے کہ ان میں سے ہر ایک تجویز پر کتنا عمل ہوا لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ تجاویز محض کاغذ پر ہی نہ رہیں اور اُن کو بروئے عمل لانے کی کوششیں کی گئیں۔

اصلاح مالگذاری کا کام ازسرِنو شروع کیا گیا جو کہ نازک سیاسی حالات کے مدِّنظر عارضی طور پر روک دیا گیا تھا۔ 1582ء میں ٹوڈرمل کو وزیرِاعظم کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ اس نے متعدد اصلاحات جاری کیں اور جاگیرداروں و عمال کو اس بات پر مجبور کیا کہ دستورالعمل میں جو احکامات دیے گئے ہیں ان سے سرتابی نہ کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انصاف و یکسانیت برقرار رکھنے کے لیے جو قوانین شاہی اراضیات پر نافذ تھے ان کو جاگیروں پر بھی نافذ کر دیا گیا۔ عمال کو یہ حکم دیا کہ وہ بہت احتیاط کے ساتھ صحیح طور پر پیمائش کرکے پیداوار کا خاکہ تیار کریں۔ کاشتکاروں اور حکومت دونوں کے حقوق کی پوری ایمانداری سے حفاظت کریں اور لوگوں کی حالت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے اپنے حلقوں کا دورہ کریں۔

دو محرروں (بیتکچی) کے بجائے نسبتاً ایک زیادہ ذمّے دار اور لائق افسر اس کام پر مامور کیا گیا۔ ساری قابلِ زراعت زمین کی پیمائش کی گئی اور تدریجی ٹیکس اس لیے مقرر کیا گیا کہ لوگ اپنی خراب درجے کی زمین کو کاشت کرکے بہتر بنائیں اور پولج کے معیار تک پہنچائیں۔ زمین کی پیمائش کے لیے جو ملازمین مقرر کیے گئے ان کی تنخواہوں کا اسکیل مقرر کر دیا گیا۔ اصلاح

شدہ سکّے کے رواج کو ترقی دینے کے لیے متروک سکّوں کی قیمت بہ لحاظ وزن مقرر کردی گئی۔ عمال کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اس بات کے لیے کہ رعیت سرکاری مطالبات کو کب تک خزانے میں ادا کردے قطعی تاریخوں کا تعین کرے۔ خزانچی کو بھی ہدایت کردی گئی کہ وہ ہر اُس رقم کی جو اُس کو ادا کی جائے رسید دیا کرے۔ اس کو یہ بھی حکم ملا کہ ہر ہفتے صدر دفتر کو اپنے حساب روانہ کرے اور ہر مہینے روزانہ کی جمع کا کھاتہ روانہ کردیا کرے۔

اصلاحات مالگذاری میں سب سے زیادہ اہم یہ بات تھی کہ ایرانی خورشیدی جنتری کی بنیاد پر ایک نئے سال کا آغاز کیا گیا۔ سرکاری حساب کتاب کے لیے یہ فرض کیا گیا کہ نیا سنہ 11 مارچ 1556ء سے شروع ہوا حالانکہ حقیقت میں یہ سنہ 1584ء میں شروع ہوا تھا۔ متعدد جنتریوں کی موجودگی میں جس میں سنہ ہجری بھی شامل تھا مرکزی حکومت کو خاص طور سے کافی مشکلات کا سامنا کرنا ہوتا۔

قمری سال، شمسی سال کی نسبت دس گیارہ دن چھوٹے ہوتے ہیں لہٰذا فصلوں کے کاٹنے کا وقت صحیح طور پر میل نہ کھاتا تھا۔ اس کے علاوہ 29 شمسی سالوں کی مدت میں 30 قمری سال ہوتے۔ اگر مالگذاری سنہ ہجری کے مطابق وصول کی جاتی تو 29 سال کی مدت میں کاشت کار کو 30 سال کی مالگذاری دینا پڑتی۔ حالانکہ اس کو محض 29 سالوں کی پیداوار حاصل ہوتی۔ اس کے علاوہ پیداوار کا تعلق سورج سے ہے نہ کہ چاند سے۔ خافی خاں کے الفاظ میں "ریاضی داناں" "منجمین اور تاریخ داں اس بات کو جانتے ہیں کہ ہندوستان میں چاروں موسم، ربیع و خریف کی فصلیں، ان فصلوں کا پکنا، ہر موسم کے پھل جاگیرداروں کا علیہ و تنخواہ اور منصب داروں کی رقوم کی ادائیگی سب ہی شمسی حساب سے ہوتی ہیں نہ قمری حساب سے۔

ایشیا اور یورپ میں متعدد جنتریاں تھیں جو سب ہی شمسی حساب سے تیار کی گئی تھیں لیکن جب بغور مطالعہ کیا گیا تو پتہ چلا کہ ان سب سے ہر نقطہ نظر سے مطلق تر گرگانی جنتری تھی (جو الغ بیگ کے نام سے موسوم ہوئی) جس میں مہینوں اور دنوں کے نام بغیر کسی تبدیلی کے فارسی میں تھے۔" اکبر نے اس جنتری کو تمام سرکاری معاملات کے لیے منظور کرلیا اور اپنے مخصوص طرز فکر کی بنا پر اس کو سنہ الٰہی نام دیا۔ یہ اصلاح یقیناً کسانوں، تاجروں اور سرکاری ملازمین کو پسند آئی ہوگی اور حکومت کے لیے بھی کام میں بہت سہولت پیدا ہوگئی ہوگی۔

ناواقف لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس سنہ کا انتخاب اس بات کی دلیل ہے کہ شہنشاہ پر ایرانی اثر حاوی ہو گیا ہے۔ یا یہ کہ وہ سنہ ہجری کو جو اسلامی اہمیت کا حامل تھا ختم کرنا چاہتا ہے۔ لیکن دراصل سنہ ہجری سماجی و مذہبی احتیاجات کی بنا پر نہ تو ہٹایا جا سکتا ہے اور نہ ختم کیا جا سکتا ہے۔

اس سنہ کو سنہ الہٰی کے ساتھ ساتھ سرکاری کاغذات تک میں درج کیا جاتا۔ بہرحال اکبر اس بات سے خوش ہوا ہو گا کہ ایک ایسے سنہ کا آغاز ہوا جس کے سبب اس کا نام اور عہد حکومت تاریخ میں بطور یادگار باقی رہ سکیں گے۔

1575ء میں گلبدن بیگم اکبر کی پھوپھی اور اکبر کی بیگمات میں سے ایک سلیمہ بیگم حرمین الشریفین کی زیارت کے لیے گئیں۔ پرتگالیوں نے جو اس وقت بحیرۂ عرب پر حاوی و قابض تھے ان کو اس وقت تک سمندری راستے سے جانے کی اجازت نہ دی جب تک کہ دمن کے قریب کا گاؤں بلسر (بتسر) ان کو نہ دے دیا۔

بظاہر اکبر نے پرتگالیوں کا یہ رویہ اور اس طرح کی معاملہ بازی کو پسند نہ کیا اس نے سخت کارروائی کرنے کے بجائے یہ مناسب سمجھا کہ ان سے دوستانہ تعلقات قائم کیے جائیں اور راستہ ہموار کر لیا جائے۔ اس طریقے کا حسب دلخواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا 1580ء میں اکبر نے سخت اقدام کرنے کا فیصلہ کر لیا اور بھروچ کے جاگیردار کو اپنے فیصلے سے مطلع بھی کر دیا۔ اکبر نے دکن کی ریاستوں کو بھی دعوت دی کہ بحیرۂ عرب کو پرتگالی بحری ڈاکوؤں سے صاف کرنے میں اس کی مدد کریں۔ چونکہ اس وقت کابل سے حملے کا قوی امکان تھا اور شاہی بیگمات ابھی تک زیارت سے واپس نہیں آئی تھیں، ہٰذا بڑے پیمانے پر کوئی کارروائی نہ کی گئی۔

1581ء میں بیگمات واپس آ گئیں اور حکیم کا حملہ بھی پسپا کر دیا گیا۔ اس لیے بلسر کا معاملہ پھر اٹھ کھڑا ہوا اور موثر طریقے سے فوجی طاقت کا اظہار کر کے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا۔ 1582ء میں دمن پر حملہ کیا۔ پرتگالیوں نے اس کا خوب دفاع کیا۔ اسی عرصے میں گجرات کے حکمراں مظفر شاہ سوم نے جس کو تخت سے اتار دیا گیا تھا مغلوں کے خلاف ایک وسیع پیمانے پر بغاوت شروع کر دی۔ اس کا صوبے دار کی فوج کی وفاداری پر بھی اثر پڑا قطب الدین کی اعتراضات کے مدنظر دمن پر جو زور ڈالا گیا تھا اس میں ڈھیل پڑ گئی ہو گی

لیکن اس کا بھی پورا امکان تھا کہ یہ معاملہ پھر سے اور بڑے پیمانے پر زیادہ زور شور سے اٹھ کھڑا ہو۔ فادر اکوا ویوا کو حالات سے آگاہ کر دیا گیا اور اس نے پرتگالی حکومت کی طرف سے شہنشاہ کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی۔ چنانچہ شہنشاہ نے قطب الدین کو حکم دیا کہ فی الحال پرتگالیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دے اور اپنی طاقت گجرات کی بغاوت دبانے پر صرف کرے جہاں یہ تحریک زور پکڑتی معلوم ہو رہی تھی۔ باوجودیکہ فی الحال جنگ رک گئی تھی پھر بھی پرتگالیوں کا مسئلہ حل نہ ہو پایا تھا۔

عیسائی پادری اکبر کے دربار میں یہ امید لے کر آئے تھے کہ وہ اس کو عیسائی بنالیں گے۔ انھوں نے بڑی پُر امید اطلاعات گوا بھیجیں اور اکبر کی تمام نہاد بدعتوں میں انھیں اپنی کامیابی کا عکس دکھائی دینے لگا۔

اکبر ان غیر ملکی پادریوں اور ان کے احساسات کا احترام کرتا۔ حضرت عیسیٰ مسیح و حضرت مریم کی تصاویر کو بڑے احترام و تحسین کی نگاہ سے دیکھتا۔ اسلام اور بانی اسلام پر ان پادریوں کے سخت اور وحشیانہ حملوں کو بڑے صبر و سکون سے سنتا۔

اس نے مانسے رات کو اس لیے ملازم رکھا کہ شہزادہ مراد کو پرتگالی اور عیسائی اخلاق و آداب سکھائے۔ ان سب باتوں نے مل کر لوگوں میں یہ افواہ پھیلادی کہ شہنشاہ عیسائیت کی طرف راغب ہو گیا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر اور اس وجہ سے بھی کہ شہنشاہ عیسائی اخلاقی اصولوں کی تعریف کرتا اور ان کی تبلیغ کو رواداری کے ساتھ برداشت کرتا، عیسائی پادریوں کے دل میں یہ امید پیدا کر دی کہ وہ دن دور نہیں جب کہ اکبر عیسائی ہو جائے گا۔ لیکن یہ سب توقعات بے بنیاد تھیں اور اس بات کو ظاہر کرتی تھیں کہ پادری اکبر کے افکار و خیالات اور کام کرنے کے ڈھنگ کو سمجھنے میں کس قدر ناکام تھے۔

1580ء کے اواخر یا 1581ء کے آغاز میں ان پادریوں کو اس بات کا احساس ہونے لگا کہ شہنشاہ ان کے گھسے پٹے دعظوں اور ان کی تبدیلی مذہب کی کوششوں سے بیزار ہو چکا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح ان کی باتوں پر توجہ نہ دیتا۔ بغاوت، شورش اور حملے نے مل کر اکبر کی توجہ اس طرف مبذول کر دی کہ اب اس کو فوجی اور سیاسی معاملات کی طرف زیادہ غور کرنا چاہیے۔

1581ء کے آغاز میں گوا کے کونسل کو اس بات کا پورا احساس ہو گیا کہ نہ تو پادریوں

کی باتوں پر حرف بحرف یقین کرنا چاہیئے اور نہ اکبر کے عیسائی ہوجانے کی امید باندھنا چاہیئے۔ پادریوں کو واپسی کا حکم صادر کردیا گیا لیکن وہ واپس نہ ہوئے کیوں کہ اکبر ان کو تھوڑے عرصے اور رکھنا چاہتا تھا اور کچھ اس سبب سے کہ سادہ دل اکوا ویوا ہنوز کامیابی کی امید لگائے بیٹھا تھا اور یہ بھی توقع تھی کہ مغربی پنجاب اور مشرقی افغانستان کے نیم وحشی قبائل میں دین مسیح کی تبلیغ کے لیے تازہ میدان ہاتھ آئے گا مانسے رات اکبر کے ساتھ مغرب کی طرف روانہ ہوا لیکن اکوا ویوا سیکری میں ہی رہا۔ وہ دن رات عبادت کرتا اور اکبر کی تبدیلیٔ مذہب کے لیے سخت ریاضتوں کی مشقت برداشت کرکے دعا کرتا۔ بہرحال جب اکبر کابل سے واپس لوٹا تو اکوا ویوا کو یہ جان کر بہت مایوسی ہوئی کہ شہنشاہ اصلاح کی حدود سے متجاوز ہوچکا ہے اور اس کا ذہن برعکس سمت میں کام کررہا ہے۔ 27 ستمبر 1582ء کو اکوا ویوا نے گوا کے گورنر کو ایک خط میں تحریر کیا:

> "......میں اس کو (اکبر کو) سمجھنے سے قاصر ہوں۔ وہ اب پہلے کی طرح دین مسیح کے متعلق سوالات نہیں کرتا..... میں دیکھتا ہوں اس کے دربار میں اب اللہ کی پوری طرح اطاعت کی جاتی ہے۔"

گورنر نے اس سے فوراً واپس آنے کی درخواست کی۔ اکوا ویوا نے شہنشاہ سے واپسی کی اجازت چاہی اور اکبر نے نہایت مہربانی کے اظہار کے ساتھ اجازت دے دی۔ اکبر عیسائی مذہب و آئین کے بارے میں علماء سے براہ راست معلومات حاصل کرنے کے مقصد میں کامیاب ہوچکا تھا۔

اکبر کو امید تھی کہ مختلف مذاہب کے علماء کے درمیان بحث و مباحثہ سے وہ ایک دوسرے کے مذہب کے اصولوں سے بہتر طور پر واقف ہوسکیں گے اور اس طرح مختلف مذاہب کے پیروؤں کے درمیان افہام و تفہیم کا راستہ کھل جائے گا لیکن اس کو اس سے بڑی مایوسی ہوئی کہ اس کی کوششیں بارآور نہ ہوسکیں بلکہ اس کا الٹا اثر ہوا۔ آپس میں نفاق و رنجش پیدا ہوگئی اور سوء ظنی، بدبینی اور تعصب و شرپسندی کو خوب بڑھاوا ملا۔ اکبر کی مذہبی پارلیمنٹ کی تجویز کوئی غیر منطقی بات نہ تھی لیکن اس کے حسب دلخواہ نتائج اسی وقت حاصل ہوسکتے تھے جب مختلف مذاہب و عقائد کے مبلغ اور علماء اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے نظریات کو سمجھنے اور ان کو سراہنے کا جذبہ لے کر آتے اور بلا کسی تعصب یا طرفداری

سے ایک دوسرے کی بات سنتے۔ اس قسم کی کوششوں کی کامیابی کے لیے رواداری، وسیع القلبی، تحمل، احترام اور انصاف پسندی ضروری ہے لیکن یہاں سرے سے اس کا فقدان تھا۔ افسوس تو یہ ہے کہ عبادت خانے میں جمع ہونے والے علماء تبادلۂ خیالات کے لیے جمع نہ ہوتے بلکہ جھگڑتے۔ بحث و مباحثے کرنے کے لیے آتے اور اس خیال کو پیش نظر رکھتے کہ وہ اگر عوام پر نہیں تو کم از کم شہنشاہ پر اپنا اثر ڈال سکیں گے۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے فریق پر برتری حاصل کرنا چاہتا اور اسی لیے وہ ایک دوسرے کا منہ چڑاتے، مذاق اڑاتے اور ہر طرح نیچا دکھانے کی کوشش کرتے تاکہ ان کے سر پر کامیابی کا سہرا بندھے۔

بلا شبہ اکبر اور چند دیگر حضرات کا طرز فکر صحیح تھا لیکن وہ اپنی روح اور جذبات کو ان جھگڑالو علماء کے دلوں میں نہ ڈال سکتے تھے۔ اکبر تو یہ چاہتا تھا کہ یہ حضرات مختلف مذاہب میں ایسی باتوں کو تلاش کریں جو آپس میں اختلاط بڑھا سکتی ہوں اور یہ جستجو کریں کہ کچھ مشترک اور بنیادی اصولوں کو پیش کیا جائے جن کی سب پیروی کر سکیں۔ اس کی خواہش تو یہ تھی کہ یہ علماء اتحاد کے علم بردار بنیں۔ نفاق و اختلافات کو کم کریں لیکن افسوس تو یہ ہے کہ وہ لوگ اختلافِ نظر کو ہوا دینے، اختلاف عقائد کو اچھالنے اور دوسروں کے عقائد پر نکتہ چینی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

آخر کار شہنشاہ کو یقین ہو گیا کہ یہ مباحثات بے فائدہ ہیں اور اس کو یہ بات جان کر بہت دکھ ہوا کہ اس کی بہترین نیت اور ارادوں کو کتنا غلط جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ شہنشاہ ان علماء کی تنگ نظری، طرف دارانہ ذہنیت اور ناروا داری سے سخت مایوس ہوا اور اس کے دل میں ان لوگوں کے لیے جو احترام تھا اس کو بہت دھکا پہنچا چنانچہ اس نے 1581ء میں عملاً عبادت خانے کے مباحثات و مجالس کو بند کرنا شروع کر دیا اور یہ باب 1582ء میں ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

اکبر کے دل میں حقیقت مطلق کی تلاش کا جذبہ اب بھی موجزن تھا۔ اس نے اپنے قدیم طریقے کو از سر نو شروع کر دیا۔ وہ بعض چیدہ چیدہ اشخاص کو اپنے محل خاص میں بلا کر ان سے حقائق دین و معاشرتی خصوصیات کے بارے میں سوالات کرتا۔ عموماً شہنشاہ سوالنامہ تیار کر لیتا اور ان اشخاص سے توقع رکھتا کہ وہ سوالات کا جواب دیں۔ اس کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا اور اس کے افکار کی گہرائیوں سے ان معلومات کے اختلاط سے

بہت سا ایسا مواد حاصل کر لیا تھا جو اس کے لیے مفید تھا۔ لیکن اکبر کو کبھی اس اطمینان کا احساس نہ ہوا کہ سب گتھیاں پوری طرح سلجھ گئی ہیں اور اس کو ذہنی و روحانی سکون حاصل ہو گیا ہے۔ بلاشبہ انسان چاہے کتنی ہی کوشش کرے یہ گتھیاں آج تک پوری طرح سلجھ نہ سکیں۔ اکبر بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔

اکبر کے صوفیانہ تجربات اور مختلف مذاہب وعقائد اور فقرا و درویشوں کے رسوم و آئین کی معلومات نے اس کی نظر کو وسعت بخشی۔ اس کے لیے جہاں یہ مشکل ہو گیا کہ کسی ایک مذہب، ہندو ازم، اسلام یا عیسائیت کے رسوم و عقائد سے خود کو وابستہ کرلے اسی طرح یہ بھی مشکل ہو گیا کہ ان میں سے کسی مذہب کو کلیۃً رد کر دے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ مذہب پہلے آدمی (حضرت آدم) کے ساتھ پیدا ہوا اس کے بعد آنے والے تمام مذاہب کے پیامبروں نے اپنی سوجھ بوجھ تجربوں اور الہامات کی بنا پر گمراہ انسانوں کی رہنمائی کی۔ وہ اس نتیجے پر بھی پہنچا کہ ہر مذہب کا ایک عوام پسندانہ اور متصوفانہ پہلو بھی ہوتا ہے اور پوری طرح تجزیہ کرنے پر اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اصولِ دین اس قدر سخت اور متباین نہیں جتنے کہ نظر آتے ہیں۔ اگر مختلف مذاہب کے بنیادی اصولوں کو ان کی جزئیات، مراسم، مذہبی افسانوں اور سماجی رسوم سے علیحدہ کرکے دیکھا جائے تو ان میں چنداں بُعد و اختلاف نہ ملے گا۔ اکبر کو مذہبی معاملات میں تعصب کٹر پن، رہبانیت اور رسوم وآئین کی اندھی تقلید سے نفرت تھی۔

ضروری مواد کی عدم موجودگی میں اکبر کے مذہبی عقائد کے تمام پہلوؤں پر پوری صحت سے ساتھ تفصیلی بحث نہیں کی جاسکتی۔ البتہ بعض غیر معمولی خصوصیات کا وضاحت کے ساتھ ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اس کے عقیدے کی بنیاد توحید الٰہی کے اٹل اصول پر استوار تھی۔ اس کو ہندوؤں اور عیسائیوں کے عقیدہ حلول روح سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کا نظریۂ وحدتِ الٰہی یقیناً اسلامی اصول پر مبنی تھا اور اس زمانے کے کسی اور مذہب کے عقائد سے بالکل مختلف و متمائز تھا۔

اس کا عقیدہ تھا کہ وصال الٰہی صرف مراقبہ اور اس کی یاد میں محو ہونے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے عقیدے کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ عالم ظاہر حقائق باطنی کا عکس ہے جس کو ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا اور صرف قلب و عقل اس کا ادراک

کر سکتی ہے۔ یہ بات کوئی نئی نہ تھی اور اسلام کے صوفیوں اور علمائے علم ماوراالطبیعیات اس سے پہلے ہی سے آگاہ تھے۔

علاوہ ازیں اس کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ گو ہوا پانی اور خاک آدمی کے لیے ضروری ہیں تاہم سب سے بڑی نعمت روشنی ہے جو ایک طرف تو وجدان، منطق اور روحانیت کی شکل میں رونما ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ غزالی کے اصول سے مطابقت رکھتا ہے جسے انھوں نے مشکوٰۃ الانوار اور حکمت الاشراق میں بیان کیا ہے۔ اس کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ انسان پُراسرار طریقے پر ایک وجود سے دوسرے وجود میں منتقل ہوتا ہے اور ہر مرحلے پر اپنے ماضی کو سمیٹتا اور مستقبل کو کھولتا جاتا ہے۔ وہ اس قسم کے تناسخ ارواح کا قائل تھا۔

"اگر نظریہ صرف یہ ہو کہ روح بعض مقررہ شکلوں میں تبدیل ہوجاتی ہے تو یہ کوئی معقول بات نہ ہوگی لیکن اگر قدرت کے عجیب و غریب عوامل اس کو معدنیات نباتات وحیوانات کی شکل میں تبدیل کرتے ہوئے ارتقائی منزلیں طے کرتی رہیں تو وہ ایک اعلیٰ مقام پر پہنچ سکتی ہے۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟"

مسلمان صوفی اس نظریے سے واقف تھے۔ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ نظریہ کسی نئے اسلامی مکتب فکر کو پیش کرتا ہے ــــــ اکبر ذی روح موجودات کا احترام کرتا اور کہتا کہ زندگی عطیۂ الٰہی ہے جو انسان کسی کو عطا نہیں کر سکتا۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو انسان کو چاہیے کہ اس کی قدر کرے۔ وہ اس نظریے کا قائل تھا کہ انسان کو اپنا جسم و ذہن پاک وصاف رکھنا چاہیے اور حُسنِ اخلاق وحُسنِ سلوک کے عام اصولوں پر کاربند رہنا چاہیے۔

عصرِ حاضر کے بہت سے مورخین نے یہ اظہار کیا ہے کہ اکبر نے آفتاب پرستی زرتشتیوں سے سیکھی اور جشنِ نوروز کا منایا جانا پارسیوں کے اثر کی دلیل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نوساری کے پارسی اور ان کے بہت ہی محترم رہنما دستور مہیارجی رانا اکبر کے دربار میں موجود تھے۔ ان کے علاوہ اکبر کا ایک اور عالم وفاضل پارسی سے میل جول تھا جس کو فارسی لغت کی تالیف میں مدد دینے کے لیے ایران سے بلایا گیا تھا۔ یہ لغت بعد میں فرہنگِ جہانگیری کے نام سے موسوم ہوئی۔

اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان لوگوں نے اکبر کو اپنے عقائد و اصول

دین سے آشنا کرایا ہو۔ لیکن اس کو درست ثابت کرنے کے لیے ٹھوس ثبوت درکار ہے کہ اکبر نے ان لوگوں سے آفتاب پرستی سیکھی۔ نوروز کے موضوع پر پہلے ہی لکھا جا چکا ہے۔ ایران اور اسی طرح دہلی کے ابتدائی ترک سلاطین کی تاریخ میں ہم کو اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ بڑے بڑے بادشاہ کس طرح سالِ نو کا جشن منایا کرتے تھے۔ یہ مثالیں کافی تھیں کہ اکبر کو جشن نوروز منانے کے لیے اُبھارا جائے۔

پارسیوں کے عقیدے کے مطابق روشنی یا آفتاب کی پرستش اکبر جیسے موحد کو مشکل ہی سے پسند آسکتی تھی کیوں کہ پارسیوں کا عقیدہ بنیادی طور پر ثنویت پر مبنی ہے۔ اکبر اور اس کے سرکاری مورخ نے متعدد بار آتش پرستی کے الزام کی تردید کی ہے۔ اس کے علاوہ آتش پرستی اور آفتاب پرستی صرف پارسیوں ہی میں رائج نہیں بلکہ ہندوؤں میں بھی اس کا بہت رواج تھا۔

اگر اکبر اس عقیدے میں کسی کی پیروی کر سکتا تھا تو اس کے زیادہ امکانات تھے کہ مٹھی بھر پارسیوں کے بجائے جو مغربی ہندوستان کے دور دراز گوشے میں آباد تھے اور جن کے بعض علماء دربار میں صرف چند مرتبہ آئے۔ وہ ہندوستان کے کروڑوں ہندوؤں سے زیادہ متاثر ہوا ہو۔

بدایونی نے بھی آفتاب پرستی کی ابتدا کو زرتشتیوں کے بجائے ہندوؤں اور خاص طور پر بیربل کے اثر کا نتیجہ بیان کیا ہے۔ حالانکہ آتش پرستی کے متعلق اس کا یہ خیال ہے کہ اس مسئلے میں نوساری کے زرتشتیوں اور حرم کی ہندو بیبیات کا زیادہ دخل تھا۔

دراصل اکبر کا نظریہ کچھ اس طرح تھا کہ انسان کو اللہ کی دور از فہم ذات کے تصور کے لیے کسی خارجی علامت کی ضرورت ہے۔ خدا کے نور کی سب سے بڑی علامت جس کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے آفتاب ہے۔ جو کہ روشنی و زندگی کا منبع بھی ہے۔ اس نے کبھی حد سے بڑھ کر سورج کو خدا کا شریک نہیں بنایا۔ اس کا پختہ عقیدہ تھا اور یہ اس کو مغلوں اور اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا کہ بادشاہوں کی قسمت کو سورج کے ساتھ کچھ پُر اسرار تعلق ہے۔ ہمایوں کا عقیدہ تھا کہ یکشنبہ کا تعلق آفتاب سے ہے اور اللہ کے حکم سے اسی کے ساتھ سارے حکمرانوں اور بادشاہوں کی قسمتیں وابستہ ہیں۔

مختصر یہ کہ یہ مغلوں کا قدیمی رسم تھا اور اکبر اس سے جڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس کو

یقین دلایا گیا کہ سحر اور منتروں کے جاپ سے آفتاب کی قوت سے زیادہ مفید نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ علم نجوم کے اس عقیدے میں اکبر دوسرے ایشیائیوں کا ہم عقیدہ تھا۔ حالانکہ اسلام ان عقائد کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتا تھا پھر بھی یہ عقیدہ نہ صرف باقی رہا بلکہ بہت سے حلقوں میں پھیل کر اس نے مقبولیت بھی حاصل کی۔

اکبر خدا کی طرح سورج کی پرستش نہ کرتا بلکہ اس کا احترام کرتا اور یہ کہتا تھا کہ قرآن نے اس کی اجازت دی ہے۔ اکبر کا قول تھا کہ "لوگ اپنی نا سمجھی کے سبب سرچشمۂ نور کا احترام نہیں کرتے اور جو اس سے دعائیں مانگتے ہیں ان کو ملامت کرتے ہیں۔ اگر ان کی سمجھ کا قصور نہ ہوتا تو وہ یہ سمجھتے کہ قرآن کی ایک سورت کی ابتدا سورج (اشارہ ہے سورہ والشمس کی طرف) سے ہے۔

آفتاب پرستی کی طرح اس کا جانوروں سے مہربانی کا سلوک اور گوشت خوری سے پرہیز بھی جین مذہب کے اثر کا نتیجہ بتایا جاتا ہے۔ اکبر کے دربار میں جینی بھی موجود تھے اور اکبر کو اس بات کا فخر حاصل تھا کہ اس نے ہیرا وجے سوری، وجے سین سوری اور بھانو چندر اپادھیا جیسے زبردست علماء و فضلاء اور درویشوں کے بیانات کو سنا تھا۔

1582ء میں ہیرا وجے سوری اکبر کی درخواست پر گجرات سے اور 1591ء میں جین چندر سوری کیمبے سے آئے تھے۔ اکبر نے ان کے ساتھ بہت فیاضانہ سلوک کیا۔ ان کے تارک الدنیا ہونے کی تعریف کی اور ان کے دل و دماغ کو روشن کردینے والے بیانات کو غور سے سنا تھا اور ان کو القاب و خطابات سے نوازا تھا۔ شاید ان سے جو رابطہ قائم ہوا تھا اسی کے سبب اکبر کے دل میں حیوانی زندگی کا احترام پیدا ہوا اور اس عقیدے کو تقویت پہنچی۔

1578ء میں ایک اضطراری حالت میں اکبر نے اپنے شوقِ شکار کو ترک کردیا اور اس کے دل میں ہر ذی روح کی زندگی کے لیے احترام کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ ہندو فقراء اور مختلف مسلک کے صوفیوں نے اس مسئلے میں اور حساس بنا دیا تھا۔ اس کے دور میں کئی ایسے ہی قابلِ احترام مسلم فقیر و عالم گزرے جنھوں نے گوشت خوری قطعاً ترک کردی تھی۔ اکبر یہ ماننے لگا تھا کہ "زندگی کا نچوڑ خون میں ہے لہذا گوشت خوری ترک کرنا زندگی کے احترام کرنے کے مترادف ہے"۔

مانسے رات کا کہنا ہے کہ کھوری سنیاسیوں پر اکبر کی گوشت خوری ترک کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ مئی 1578ء میں اکبر نے واضح طور پر حیوانات کی زندگی کے احترام کا اظہار

شروع کردیا اور حکم صادر فرمایا کہ شکار قطعاً بند کر دیا جائے۔"

اس میں شک نہیں کہ جینی اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے اکبر کو سبزی خور بنالیا لیکن ان کو اس کا پورا پورا حق نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس نوعیت کے دوسرے داخلی و خارجی عوامل بھی اس کے دل و دماغ پر اثر انداز ہو رہے تھے لیکن جینیوں کے طرح اکبر نے گوشت خوری کو بالکل ہی ترک نہ کیا تھا اور نہ اس نے سب ہی جانوروں کے مارنے پر پابندی عائد کی تھی۔ اس نے گوشت کے استعمال پر پابندی عائد کردی اور بعض دنوں میں جانوروں کے ذبیحہ کو ممنوع قرار دے کر گوشت خوری کو کم کرنے کی کوشش کی۔ بقول ابوالفضل گائے کے ذبیحہ پر جو پابندی عائد کی گئی اس کی پہلی وجہ معاشیاتی اور دوسری سیاسی تھی۔ اس قسم کی پابندیاں قرآن کے منافی نہ تھیں، نہ ہی اس نے اسلام کے مقابلے میں صرف جینیوں کو خوش کرنے کے لیے یہ پابندیاں عائد کیں۔ اگر اس سلسلے میں جینیوں کا اثر کارگر ہوا بھی تو وہ ثانوی یا تائیدی عنصر کی حیثیت رکھتا تھا۔

اکبر کے خیالات وعقائد کے ارتقاء اور اس کے عام رویے نے اس کو بیرونی دنیا والوں کے لیے ایک مشکل مسئلہ بنا رکھا تھا۔ جہاں تک اس کے دین کا تعلق ہے خود اس کے زمانے کے مورخین کے درمیان بہت سے مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ ابوالفضل جو کہ اس کا مداح ہے اس کو سچا مسلمان کہتا ہے لیکن بدایونی جو کہ اس کا شدید نقاد ہے اس کو ایک ایسا بدعتی بیان کرتا ہے جس نے اپنی لاعلمی کے سبب مبارک ناگوری اور اس کے لڑکوں اور دوسرے خود غرض چاپلوس افراد کے شیطانی اثر میں آکر انجانے پن میں اسلام کو نقصان پہنچایا تھا۔

بدایونی نے اکبر کے خلاف اس بات کو ثابت کرنے کے لیے بہت ہی شدید الزامات عائد کیے ہیں کہ وہ نہ صرف اسلام کا منکر ہو گیا بلکہ مسلمانوں کو ایذا پہنچا کر اپنے نئے زہریلے دین کو استوار کرنے کے لیے ہتک آمیز طریقے پر اسلام کی بے حرمتی کرتا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ اکبر پیغمبری کا مدعی تھا اور اس کے متعلق یہ بھی شبہ ہے کہ وہ خدائی کے اعلان کا خواہشمند تھا۔ ان میں سے بعض الزامات کی جیسوٹ پادریوں نے بھی تائید کی ہے۔ ایک زمانے میں بدایونی اور پادریوں کے بیانات کو تقریباً ان کے لغوی معنوں میں قبول کر لیا گیا لیکن بغور مطالعے کے بعد ان میں سے اکثر غیر مدلل اور مبالغہ آمیز ثابت ہوئے بلکہ یہ پتہ چلا کہ

جان بوجھ کر ان کی غلط تعبیر کی گئی۔ تاریخ کے بہت سے علماء نے ان بیانات کا غور سے مطالعہ کیا ہے اور وہ تقریباً سب ہی اس مسئلے کی چھان بین کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اکبر کے مذہبی اور سیاسی نظریات کو صحیح طریقے سے سمجھنے کے لیے بدایونی اور جیسوئٹ پادریوں کے بیانات پر بھروسہ کرنا نامناسب ہے کیوں کہ ان کے پاس صحیح معلومات کی کمی تھی اور وہ حقائق کو صحیح اور غیر جانب دارانہ طریقے سے سمجھنے سے قاصر تھے۔

ابوالفضل کے بیانات گو نسبتاً زیادہ قابلِ اعتماد ہیں لیکن ان میں فارسی طرزِ بیان کی بے اعتدالی و افراط پائی جاتی ہے اور ذاتی احسان مندی اور ہیرو پرستی کے گہرے جذبات اس میں نمایاں ہیں۔ اکبر کے زمانے سے لے کر آج تک کسی نامور فارسی مورخ نے بدایونی کے نظریات کی تائید نہیں کی۔

بلوخمن اور اسمتھ کا کہنا ہے کہ اکبر اسلام سے بالکل منحرف ہو گیا تھا لیکن بیورج کا عقیدہ یہ ہے کہ "اس نے کبھی بھی اپنے ابتدائی مذہبی عقائد سے انحراف نہ کیا"۔ تاہم اس کا خیال ہے کہ اسلام کی صداقت کے بارے میں متشکک تھا۔ کاؤنٹ نوئل اکبر کے مسلک کو ایک قسم کا پارسی صوفی ہندو مذہب کہتا ہے اور یہ اظہارِ خیال کرتا ہے کہ اکبر اسلام کے غلبے کو ختم کرنا چاہتا تھا۔

محمد حسین آزاد جو کہ ایک شیعہ مصنف ہے اس کا عقیدہ تھا کہ اکبر نے جو کچھ کیا وہ محض سیاسی وجوہ کی بنا پر تھا۔ حالانکہ وہ اکبر کی بعض بدعتوں کو قانون (اسلام) کے خلاف سمجھتا ہے تاہم اس کو منکر نہیں کہتا۔

شبلی نعمانی بھی اکبر کو اسلام سے متنفر یا منکر نہیں سمجھتا بلکہ اس کے برخلاف اس کا عقیدہ یہ ہے کہ اکبر کا رویّہ خلفائے راشدین کے رویّے سے مطابقت رکھتا تھا۔ جیسوئٹ پادریوں کا نظریہ کچھ بھی کیوں نہ ہو اور عوامی حلقوں میں کچھ بھی افواہیں پھیلی ہوں اس میں شک نہیں کہ اکبر مسلمان جیا اور مسلمان ہی مرا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح ہے کہ اس نے خود کو کبھی کسی خاص مکتبِ فکر سے وابستہ نہ کیا اور خاص طور سے اس وجہ سے لوگ اس کے مذہب پر شک کرتے رہے۔ ان دنوں ایک عام مسلمان، اسلام کو شیعہ، سُنّی، حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی یا کسی اور مکتبِ فکر کے نام سے جانتا تھا اور محض چند ہی روشن خیال لوگ اسلام کی اس فرقہ وارانہ تعبیر کی سطح سے بلند ہو کر سوچ سکتے اور وسیع

نقطۂ نظر سے دیکھ سکتے تھے۔ اکبر نے ہر ایک کا نقطۂ نظر سنا لیکن جو کچھ اس کی عقل کو اچھا لگا اسی کی پیروی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ممکن ہے متعصب اور مخصوص مکاتب فکر کے پیروؤں کے نزدیک اکبر ایک اچھا مسلمان نہ ہو' لیکن اس نے اسلام کے کسی بنیادی اصول کو کبھی پامال نہ کیا۔

ممکن ہے اس کے بعض افعال قابل اعتراض ہوں لیکن اکبر کے عقائد کو کلیتہً غیر اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ کہنا کہ اس نے پارسا مسلمانوں کو اُن کے مذہبی عقائد کی وجہ سے ایذا پہنچائی اس حد تک ہی درست ہے کہ اس نے ان لوگوں میں سے بعض سے مواخذہ کیا جو مشرقی صوبجات اور پنجاب خاص طور سے لاہور میں شورش پھیلانا چاہتے تھے۔

بدایونی نے محض کینہ پروری کے سبب مبالغہ آمیزی سے کام لے کر اس فعل کو مذہبی ایذا رسانی کا رنگ دے دیا۔ چنانچہ جیسوئٹ پادریوں کے بیانات بھی طرفدارانہ رویے اور حقیقت سے ناواقفیت پر مبنی ہیں۔ اس میں ان کی یہ خواہش بھی پوشیدہ تھی کہ وہ اپنی کوششوں کی تبلیغ کرنا چاہتے تھے تاکہ اکبر اسلام سے منحرف ہو جائے۔ اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو اکبر پر یہ الزام کہ وہ اسلام سے منکر ہو گیا تھا بالکل بے بنیاد ثابت ہوگا۔

اکبر کو اس بات کا یقین تو تھا ہی کہ انسانی اعمال کی مذہبی و دنیوی تقسیم فلسفیانہ نقطۂ نظر سے نادرست ہے لہذا وہ قدرتی طور پر زندگی کو ناقابل تقسیم ہونے پر زور دیتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ انسان اپنے ہر فعل کا خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ جونہی انسان میں شعور اجاگر ہو جاتا ہے وہ خدائے حاضر و ناظر اور قادر مطلق کے روبرو رہتا ہے اور اس کی نگاہوں سے بچ نہیں سکتا۔ اسی وجہ سے وہ ہمیشہ اس بات کا کوشاں رہتا کہ اگر ممکن ہو سکے تو خدا کی مرضی معلوم کرے اور اس کی اطاعت کرے۔ وہ سچے دل سے اس کا معتقد تھا کہ وہ جو کچھ کرتا ہے فی سبیل اللہ کرتا ہے۔ اس لیے اس کا ہر فعل وسیع معنوں میں مذہبی ہے۔

اکبر نے گہرے مطالعے اور عمیق غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ حقیقت مطلق کسی خاص مذہب کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ سبھی مذہب نیکی کی دعوت دیتے ہیں اور ایک ہی مقصد کے لیے زور دیتے ہیں۔ اکبر کے اس نظریے کو ابوالفضل نے بہت ہی خوبصورت الفاظ میں کشمیر کے ایک مندر کے کتبہ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

اے خدا میں معبد میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں جو تیری جستجو میں ہیں اور ہر زبان
میں جو بولی جاتی ہیں تیری ثنا خوانی کرتے ہیں۔
شرک اور اسلام تیری ہی جستجو میں ہیں
ہر مذہب یہی سکھاتا ہے کہ تو واحد و بے مثال ہے
لوگ مسجد میں تیری تقدیس کے گن گاتے ہیں اور مندر میں تیری محبت کے جذبے سے
سرشار ہو کر ناقوس بجاتے ہیں
میں کبھی عیسائیوں کے گرجے، ہندوؤں کے مندر اور کبھی مسجد کا رخ کرتا ہوں
میں ہر جگہ تیری ہی تلاش میں سرگرداں رہتا ہوں
تیرے برگزیدہ بندوں کو کفر و عصبیت سے کیا نسبت کیونکہ
ان میں سے کوئی بھی تیرے اسلام (سچائی) کے پردے کے پیچھے نہیں ٹھہر سکتا
کفر کافر کو اور دین دین پرست کو مبارک
لیکن گلاب کی پنکھڑیوں کی خاک کی نسبت تو عطار کے دل ہی سے ہو سکتی ہے
چنانچہ اکبر کو جب اس بات کا احساس ہوتا کہ لوگ اپنی ضد کے سبب حقیقت اعلیٰ سے منہ موڑ لیتے ہیں اور اس بات کو سمجھنا نہیں چاہتے کہ آپس میں صلح و صفائی کے ساتھ رہا جا سکتا ہے راہِ خدا کی تلاش میں آگے بڑھا جا سکتا ہے اور نیکی و پاک دامنی کی زندگی گزاری جا سکتی ہے تو اس کو بہت دکھ ہوتا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "حالانکہ میں اتنی وسیع سلطنت کا مالک ہوں اور حکمرانی کی ساری لذات میری مٹھی میں ہیں لیکن کیوں کہ حقیقی بڑائی خدا کے احکام کی پابندی میں ہے لہٰذا جب میں عقائد میں اس قدر اختلاف و افتراق دیکھتا ہوں تو میرا دماغ پریشان ہو جاتا ہے۔"

اکبر نے اپنی دانائی اور ہوشمندی سے اس کا اندازہ کر لیا ہوگا کہ نہ تو سارے مذاہب کو ملا کر ایک کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی نئے مذہب کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا کیا جائے تو موجودہ متعدد مذاہب میں ایک اور کا اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن اس کو اس کا احساس تھا کہ اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کو ان لوگوں تک پہنچائے جو اس کی باتوں کو سننے کو تیار ہوں۔

اکبر نے اس مقصد کے حصول کی راہ نکالنے کے لیے اپنے مشیروں اور معتمدوں کی

مجلس میں اس مسئلے کو چھیڑا۔ ان لوگوں نے عرض کیا کہ کسی ایسے شخص کے لیے جو حکومت سے متعلق ہو موجودہ حالات میں کوئی ایسا قدم اٹھانا ممکن نہ ہوگا کیوں کہ بعض اشخاص تو واقعتاً روشن خیال ہوں گے لیکن اکثر کٹر اور متعصب لوگوں کے ڈر سے زبانیں بند رکھیں گے..... اور اگر کوئی بہت ہمت کر کے اپنے روشن خیالات کا اظہار کرے گا بھی تو سادہ لوح نیک لوگ اس کو پاگل کہنے لگیں گے اور اس کو ناکارہ سمجھ کر اس سے علیحدہ ہوجائیں گے کچھ بدبخت فوراً بدعت و الحاد کا الزام عائد کردیں گے۔ اور اس کی جان کے درپے ہوجائیں گے۔"

انھوں نے یہ بات بھی شہنشاہ کے گوش گذار کردی کہ خود وہ اپنے اعلیٰ مقام اور عقلی و روحانی اکتسابات کی بنا پر اس کام کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے اور اگر وہ چاہے تو ان افراد کو جو تیار ہوں اور جن کو وہ پسند کرے اپنے اصول زندگی میں شرکت کی دعوت دے۔ چنانچہ اکبر کے ان قدردانوں نے جو اس کو مذہبی رہنمائی کے لائق سمجھتے تھے خود کو ایک انجمن کی شکل میں مرتب کیا اور اکبر کو اپنا پیر یا گرو مان لیا۔

اکبر نے اس نئی ذمے داری کو پورے احساس مسؤلیت کے ساتھ شروع کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ "مرید بنانے کا مقصد یہ ہے کہ اس کو اطاعت خدا کی ہدایت کی جائے نہ یہ کہ اپنا ذاتی خدمت گار بنالیا جائے۔"

"ایک روحانی مرشد کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے مرید کی روحانی کیفیت کا اندازہ کرے، اس کی اصلاح کرے نہ کہ حبشیوں کی طرح زلفیں بڑھالے اور چھوٹی قبا میں پیوند لگا کر رسمی مباحثات شروع کردے۔"

ہم کو اس سے بحث نہیں کہ آیا اکبر روحانی کیفیات کے ادراک کے لائق تھا یا نہیں۔ اس نے خود بھی کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ وہ روحانیت کی آخری منزل پر پہنچ گیا ہے لیکن وہ خود کو اس کام کے لیے بہت سے دوسرے گرموں، پیروؤں اور روحانی مفسروں کی نسبت جو کہ ہندوستان میں فراوانی کے ساتھ پائے جاتے تھے زیادہ موزوں سمجھتا تھا۔

اس کی یہ انجمن پوری متانت و ضابطہ اور سادگی کے ساتھ تھوڑے آدمیوں سے شروع ہوئی۔ اس انجمن میں ہر ایک کو شرکت کی اجازت نہ تھی اور صرف لوگ ہی اس کے رکن بن سکتے تھے جو اس میں شرکت کے خواہاں ہوں اور جن کو شہنشاہ منظور کرے۔ نئے اراکین کی قبولیت کے لیے اتوار کا دن مقرر تھا۔ مبتدی اپنے ہاتھ میں پگڑی لے کر اپنا سر

شہنشاہ کے قدموں پر رکھتا۔ شہنشاہ اس کو اپنے ہاتھوں سے اٹھاتا اور اس کے سر پر پگڑی رکھتا پھر اکبر اس کو اپنا ضابطہ دیتا جس کو صوفیانہ اصطلاح میں "شست" کہتے۔ مرید اس کی تکرار کرتا اور مراقبہ کرتا۔ یہ شست ایک تختی پر کندہ ہوتا جس پر اکبر کا پسندیدہ کلمہ اللہ اکبر بھی ہوتا مرید کو اکبر کی ایک چھوٹی سی تصویر بھی دی جاتی جسے وہ اپنی پگڑی میں رکھے رہتا۔ پھر ایک مرید کو یہ بھی سکھایا جاتا کہ وہ اپنے فرائض کس طرح انجام دے۔ مرید سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے دل کا راز بے کم و کاست بیان کر دے اور پھر اکبر اس کو اپنی بہترین نصیحت سے نوازتا۔ انفرادی پند و نصائح اور ہدایات کے علاوہ اس سلسلے کے ماننے والے آپس میں جب ملتے تو سلام کے بجائے اللہ اکبر (خدا بزرگ و برتر) کہتے اور جواب میں دوسرا شخص جل جلالہ (اس کی شان بلند و بالا) کہتا۔ ان کو یہ نصیحت بھی کی جاتی کہ جہاں تک ممکن ہو وہ گوشت خوری سے پرہیز کریں اور کم از کم اپنی پیدائش کے مہینے میں گوشت کو چھوئیں تک نہیں۔ مریدوں کو یہ بھی ہدایت تھی کہ اپنی پیدائش کے دن خوب عمدہ ضیافت دیں اور خیر خیرات کریں۔ نابالغ لڑکیوں، بانجھ، حاملہ اور بوڑھی عورتوں سے مباشرت نہ کریں۔

یہ بتانا ممکن نہیں کہ آیا ان مریدوں کو ان امور کے علاوہ جو سرکاری اسناد میں درج ہیں کچھ اور بھی کام کرنا پڑتے تھے۔ آفتاب و نور کے متعلق اکبر کے جو عقائد اور ذاتی توہمات و خیالات تھے وہ دین الٰہی کا جزو نہ تھے۔ اس فرقے کی نہ تو کوئی مقدس کتاب تھی اور نہ صحیفہ، نہ مذہبی رہنماؤں کا سلسلہ تھا نہ اس فرقے کی کوئی مخصوص جائے عبادت تھی اور دین میں داخل ہونے کے علاوہ کوئی مراسم نہ تھے۔

بدایونی کا کہنا ہے کہ اس فرقے میں شامل ہونے والے کو یہ تحریری وعدہ دینا ہوتا کہ اس نے اسلام ترک کر دیا ہے اور مکمل دین داری کے چار مراحل یعنی جان و مال اور مذہب و آبرو کی قربانی قبول کر لی ہے۔

اس بیان کی مشکوک حقیقت پر اظہار تردید کیے بغیر یہ بات بلاخوف کہی جا سکتی ہے کہ یہ مراحل حقیقتاً وہ مراحل ہیں جن کو امام غزالی نے ان لوگوں کے لیے مقرر کیا تھا جو روحانی تکمیل کے خواہاں ہوں۔

امام غزالی نے یہاں تک کہا ہے کہ مرید کو اپنے مرشد سے اس طرح متوصل ہو جانا چاہیے جیسے کہ اندھا آدمی دریا کے کنارے اپنے رہنما سے چپک جائے۔" اس ضمن میں لفظ دین کا

وہی مفہوم ہے جو امام غزالی نے تقلید کے معنی میں بیان کیا ہے۔ اغلب گمان یہ ہے کہ اکبر اپنے پیروؤں کے انفرادی مذہب و عقائد میں دخل نہ دیتا۔ وہ محض ان کے روحانی ارتقاء میں معاونت کرتا اور ان کے دلوں میں مختلف مذاہب کے بہترین امتزاج اور ان کی بنیادی وحدت کا جذبہ پیدا کرتا۔

دینِ الٰہی کوئی مذہب نہ تھا اور نہ اکبر کسی نئے دین کی بنیاد ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھا کہ ممکن ہے بہت سے لوگ اس کے اعلیٰ مقام سے متاثر ہو کر اس مذہب میں داخل ہوں تاکہ وہ اپنے جذبۂ تلاش و جستجو کو تسکین پہنچا سکیں اور اس سے مادی مفاد حاصل کر سکیں۔ لہٰذا وہ اس سلسلے میں لوگوں کو داخل کرنے کے معاملے میں بہت سخت تھا۔ ان پابندیوں کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے خود کو اس سلسلے میں "اُمید اور خوف" سے بے نیاز ہو کر اعلیٰ و ارفع مقاصد کو مدنظر رکھ کر پیش کیا ہوگا۔ جب حریص لوگوں کو یہ پتہ چلا ہوگا کہ اکبر ان کی توقعات سے زیادہ ہوشیار ہے تو یقیناً ان کو مایوسی ہوئی ہوگی۔ اکبر اکثر کہا کرتا تھا "جن لوگوں کو کسی بادشاہ ذی جاہ کے دربار میں رازدارانہ مشورہ کا فخر حاصل ہے ان کی فلاح کا راز سچائی اور وفاداری میں مضمر ہے۔ اس فرض کی ادائیگی میں کسی خود غرضانہ اور حریصانہ خواہشات کو دخل نہ ہونا چاہیے۔"

خود بدایونی کا بیان ہے کہ مرید بنانے کے لیے کسی زور زبردستی یا لالچ سے کام نہ لیا جاتا تھا۔ اس قسم کی ایک بھی مثال موجود نہیں کہ کسی شخص کا دینِ الٰہی میں شرکت سے انکار کرنے پر تنزل کر دیا گیا ہو یا شریک ہونے پر کسی قسم کی ترقی ملی ہو۔ اس کے باوجود ہر طبقہ کے مریدوں کی تعداد کئی ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ ہم کو ان مرید ہونے والوں کے صرف جیس نام معلوم ہو سکے ہیں۔ بیربل کے علاوہ سب مسلمان تھے۔ ان میں سے کچھ تو بہت بلند کردار، بے حد لائق اور آزاد خیال تھے۔ بلند درجے کے ہندو افسران مثلاً بھگوان داس، مان سنگھ اور ٹوڈر مل نے اس میں شرکت کی بلکہ الٹا وہ اسے شک کی نگاہ سے دیکھتے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دینِ الٰہی کا سیاسی اثر زیادہ گہرا نہ تھا کیوں کہ ہندوستان کے کروڑوں باشندوں میں اس کے معتقدین کی تعداد چند ہزار سے متجاوز نہ ہو سکی۔ تاہم اس سلسلے نے ایسے لوگوں کا ایک گروہ پیدا کیا جس کا نصب العین "خدا اور بادشاہ" تھا اور جنھوں نے اکبر سے وفاداری اور اطاعت کی قسم کھائی تھی اور اس کے ساتھ انفرادی رابطے میں بندھے ہوئے۔

تھے۔ دینِ الہیٰ نے یہ نمونہ پیش کر کے دکھایا کہ معاشرتی، سیاسی اور دینی اختلافات کے باوجود لوگ کس طرح خدا اور بادشاہ کے نام پر متحد و متفق ہو سکتے ہیں۔ اس طریقے سے رعایا کے دل میں اکبر پر اعتماد و بھروسہ اور بڑھ گیا ہوگا اور عوام اس کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے۔

اس خیال کو کسی طرح صحیح نہیں سمجھا جا سکتا کہ اکبر اس سلسلے کو اس لیے استعمال کرتا تھا کہ وہ اپنے مکتبِ فکر کی لوگوں کو تربیت دے اور پھر اُن کو سلطنت کے دوسرے صوبوں میں اِن عقائد کی ترویج کے لیے روانہ کر دے۔

دینِ الہیٰ اکبر کی اس خواہش کی پیداوار تھا کہ ایسے لوگوں کو جو اس کی روحانی رہنمائی قبول کرنے کو تیار ہوں ایک جگہ جمع کر کے ان کے دلوں میں اپنے بلند نظریات اور اصولِ عمل کی روح پھونک سکے۔ وہ یہ سب کچھ اپنی مثال ان کے سامنے پیش کر کے انجام دینا چاہتا تھا نہ کہ کسی زور و زبردستی سے یا مکر و فریب دے کر۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کا مقصد یہ نہ تھا کہ اپنا روحانی جانشین نامزد کر کے یا دوسروں کے ذریعے اس سلسلے میں اور مُریدوں کو داخل کر کے اس دین کو ایک مستقل شکل دے۔ اکبر اگر چاہتا تو اپنی تنظیمی لیاقت سے کم از کم اس بات کی کوشش کر سکتا تھا کہ اس سلسلے کی بقا اور اشاعت کے لیے کوئی ترکیب نکالے لیکن اس نے عمداً ایسا نہیں کیا، یہ ایک بالکل نجی معاملہ تھا جس کا تعلق شہنشاہ اور رعایا کے درمیان نہیں بلکہ اکبر اور ان لوگوں کے درمیان تھا جو اس کو اپنا پیر یا گرو مانتے تھے۔

اکبر کی موت کے ساتھ وہ نجی تعلق بھی ختم ہو گیا اور وہ انجمن بھی۔ جہانگیر نے کچھ عرصہ تک اپنے باپ کی پیروی کرنا چاہی۔ اس نے مرید بھی بنائے، شست اور تصویر بھی دی۔ اس نے مریدوں کو نصیحت کی کہ "وہ اپنی زندگی فرقہ وارانہ لڑائی جھگڑوں میں ضائع نہ کریں بلکہ عالمگیر امن و آشتی کے اصولوں پر کاربند ہوں۔ اور سوائے جنگ و تعقب کی حالت میں کسی جاندار کو اپنے ہاتھوں سے نہ ماریں۔" لیکن جہانگیر میں نہ تو اپنے باپ کا سا اخلاق و کردار تھا اور نہ جاذبیت۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زیادہ کامیاب نہ ہو سکا اور اس کے کھوکھلے دعوے استقامت نہ حاصل کر سکے۔

اکبر نے جن قوتوں کو اجاگر کیا وہ بے کار نہ گئیں۔ اس کے نظریات سے اس کے

جانشینوں کی کم سے کم دو نسلیں مستفیض ہوئیں۔ شہزادہ خسرو اور دارا شکوہ اس کے مکتب فکر کے دو ممتاز نمایندے تھے اور اگر وہ تخت شاہی پر بیٹھنے میں کامیاب ہو جاتے تو یقیناً اکبر کے پیغام کو آگے بڑھاتے اور بہت ہی اعلیٰ نتائج حاصل کرتے۔ بدقسمتی سے ان میں سے کوئی بھی اکبر کی گہری سیاسی سوجھ بوجھ، ہمت اور طاقت کا مالک نہ تھا اور اسی وجہ سے دونوں ہی ناکام رہے۔

اکبر نے جب رعایا کے تحفظ کے فرائض اپنے سر لیے تو پھر اس نے عوام کی معاشرتی زندگی کی فلاح و بہبود کے کاموں میں کوئی پس و پیش نہ کیا۔ ان میں سے پہلا کام ستی کا انسداد تھا۔ 1590-91ء میں یہ حکم صادر کیا گیا کہ اگر کوئی بیوہ اپنی مرضی سے بضد ہو کر واضح الفاظ میں ستی ہونے کی خواہش کا اظہار نہ کرے تو اس کو زندہ نہ جلایا جائے۔ جو ایسی عورتیں جنھوں نے اپنے شوہر کے ساتھ ایک رات بھی نہ گزاری ہو ان کو ہرگز نہ جلایا جائے۔

اسی سلسلے میں اس نے 1578ء میں بیوہ کی دوسری شادی قانوناً جائز قرار دی اور ایک سے زیادہ بیوی یا شوہر رکھنا معیوب قرار دیا۔ اس نے یہ بھی حکم صادر کیا کہ صرف اسی شکل میں دوسری شادی کی جا سکتی ہے جب عورت بانجھ ہو۔ 1582ء میں لڑکیوں کے لیے شادی کی عمر چودہ سال اور لڑکوں کے لیے سولہ سال مقرر کی۔ ان اصلاحات کے نفاذ کے لیے اس نے شادیوں کے اندراج کا قاعدہ شروع کیا۔

گو خود اکبر ایک مذہب چھوڑ کر دوسرے مذہب کو قبول کرنے کا حامی نہ تھا۔ تاہم 1601ء میں اس نے اس بات کی کھلی اجازت دے دی کہ ہر شخص اپنے مذہب کے سلسلے میں آزاد ہے۔ کسی کو اس کی اجازت نہ تھی کہ وہ زبردستی یا غیر اخلاقی طور پر لالچ دے کر یا شہوانی محبت کے تحت کسی سے شادی کرے۔

اکبر نے 1582ء میں یہ حکم جاری کیا کہ شراب کا بنانا اور فروخت کرنا جرم ہے لیکن بعض منظور شدہ دکانوں کو شراب بنانے کی اجازت دی گئی کہ وہ صرف ان لوگوں کو شراب مہیا کریں جن کو طبی طور پر ضرورت ہو۔

1590-91ء میں ختنہ کی عمر بارہ سال مقرر کی گئی۔ طوائفوں اور بدچلن عورتوں کو شہر کے باہر ایک بستی میں رکھا گیا اور پولس کو یہ ہدایت کی گئی کہ جو لوگ اس علاقے

میں آمدورفت کریں ان پر نگاہ رکھی جائے اور ان کے ناموں کا اندراج کرلیا جائے' جو لوگ ان عورتوں کو اپنے یہاں بلائیں ان کے لیے بھی یہی حکم تھا۔ اعلیٰ افسروں پر اگر طوائف بازی کا الزام عائد ہوتا تو ان کو تنبیہہ کی جاتی اور کبھی کبھی سزائیں بھی دی جاتیں۔ اکبر ہندوستان میں فقیروں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے متفکر تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "میں چاہتا ہوں کہ میری سلطنت سے فقیری نابود ہو جائے۔"

صدیوں کی پرانی لعنت کو مٹانا واقعتاً مشکل کام تھا لیکن اس نے پولس کو حکم دیا کہ وہ فقیروں پر کڑی نگاہ رکھیں۔ ان کے چال چلن کا پتہ لگائیں اور جن لوگوں نے غربت کے سبب فقیری اختیار کی ہو ان کو ملازمت دلائیں مشتبہ چال چلن کے لوگوں کو شہر سے نکال دیا جائے اور ملنگوں اور قلندروں سے سختی کا برتاؤ کیا جائے۔

اکبر بالطبع تجسس پسند تھا۔ وہ جن لوگوں سے ملتا ان سے مذہب' ثقافت و تمدن' فلسفہ اور علوم کے بارے میں معلومات حاصل کرتا۔ اس کی ہدایات پر عربی' سنسکرت' فارسی اور حتیٰ کہ یونانی زبان کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ جن کتابوں کا شروع شروع میں ترجمہ کیا گیا ان ابتدائی کتابوں میں سنگھاسن بتیسی کا 75-1574ء میں خرد افزا نامہ کے نام سے ترجمہ ہوا۔ حیات الحیوان 76-1575ء میں وجود میں آئی۔ اتھروید کا ترجمہ 76-1575ء اور بائبل کا ترجمہ 1578ء میں ہوا۔

اسی صدی کے آٹھویں عشرے میں مہابھارت کا ترجمہ 83-1582ء میں اور بھگوت گیتا اور رامائن کا ترجمہ 84-1583ء میں ہوا۔ ہری ونش پران جامعہ رشیدی کا ترجمہ 1585ء میں اور تزک بابری کا ترجمہ 1589ء میں کیا گیا۔

سولہویں صدی کے آخری دس سالوں میں معجم البلدان کا ترجمہ ہوا جو کہ جغرافیہ کی ایک کتاب ہے۔ 92-1591ء میں قرآن اور 92-1591ء ہی میں پنچ تنتر اور 1596ء میں سرت ساگر ترجمہ کی گئیں۔ 1603ء میں روم کی تاریخ کی کسی کتاب کا ترجمہ بنام ثمرۃ الفلاسفہ کیا گیا جس میں بعض برگزیدہ ہستیوں کی سوانح حیات ہیں۔

اکبر کی کوششوں کے نتیجے میں جو کتابیں تالیف کی گئیں ان کتابوں میں تاریخ النبی (83-1582ء) اکبر نامہ اور آئین اکبری (98-1595ء) شامل ہیں۔ آئین اکبری کے کچھ حصے کا ترجمہ سنسکرت میں مہیش نامی مولف نے کیا لیکن وہ مکمل نہ ہو سکا۔

فیضی نے 1594ء میں نل ودمینتی کے عشقیہ قصے کو مثنوی کی شکل میں پیش کیا۔ بقول بدایونی ہندوستان میں تین سو سالہ مدت کے دوران نظم میں لکھی ہوئی اس سے بہتر کوئی کتاب وجود میں نہیں آئی۔ بیشتر ترجمے نہ تو مکمل تھے اور نہ لفظ بہ لفظ۔ وہ ایک طرح سے عام قسم کے ترجمے تھے کیونکہ وہ کسی خاص عملی مقصد کے لیے کیے گئے تھے۔

باب 14

سلطنت کی توسیع

1572ء میں اکبر نے گجرات کے آخری فرماں روا مظفر شاہ سوم کو گرفتار کر کے منعم خاں خان خانان کے سپرد کر دیا جو اس کو بنگال لے گیا اور اپنی لڑکی سے شادی کر دی۔ منعم خاں کی موت کے بعد مظفر شاہ کو خواجہ منصور کے سپرد کر دیا گیا جہاں سے وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔

مظفر نے کاٹھیاوار میں پناہ لی لیکن اپنی نقل و حرکت اس قدر خفیہ رکھی کہ وہاں کے صوبے دار شہاب الدین خاں کو اس کا پتہ نہ لگ سکا۔ 1582ء میں شہاب الدین کو واپس بلا لیا گیا اور اعتماد خاں اس کی جگہ صوبے دار مقرر ہوا۔ شہاب الدین کے کئی سو ملازمین نے تنخواہ کے مسئلے پر شورش برپا کر دی۔

مظفر شاہ اس افراتفری اور اعتماد خاں کی احمد آباد سے غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر یکایک ظاہر ہوگیا اور احمد آباد پر قبضہ کر لیا۔ اس بات سے شورشیوں کو اور ہوا ملی۔ مظفر الدین نے اپنی کامیابی کے جوش میں مغلوں سے جنگ کر کے ان کو شکست دی اور شاہ گجرات کا لقب اختیار کر لیا۔

اکبر نے بغاوت کی خبر سن کر 23 ستمبر کو مرزا خاں کو اجمیر کے راستے پر روانہ کیا اور سورت میں قلیچ خاں کو حکم بھیجا کہ وہ مالوہ کی طرف تیزی سے روانہ ہو جائے اور وہاں کے افسروں کو اپنے ساتھ لے کر مالوہ کے راستے سے احمد آباد کی طرف جائے۔ اس

پہلے کہ یہ افواج گجرات پہنچ سکیں بغاوت کی آگ اور زیادہ تیزی سے مشتعل ہو گئی۔ سارے غیر مطمئن عناصر مظفر کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ بڑودہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ وہاں کے حاکم قطب الدین نے ہتھیار ڈال دیے لیکن اس کو دھوکے سے قتل کر دیا گیا اور اس کی کروڑوں کی جائداد لوٹ لی گئی۔ یہ واقعہ 23 نومبر 1583ء کا ہے۔

جب یہ افسوسناک خبر اکبر کو ملی تو اس وقت وہ الہ آباد میں گنگا جمنا کے سنگم پر ایک قلعے کی تعمیر کی نگرانی کر رہا تھا۔ چنانچہ وہ گجرات میں لڑنے والے افسروں کی رہنمائی کے لیے دارالسلطنت واپس لوٹ آیا۔

جنوب میں مظفر کافی کامیابی حاصل کر چکا تھا لیکن شمال میں شاہی افواج باغیوں پر غالب ہو رہی تھیں۔ 1583ء کے آخری دن مرزا خاں بھی گجرات پہنچ گیا۔ 16 جنوری 1584ء کو مرزا خاں اور مظفر شاہ کے درمیان سرخیج کے مقام پر جنگ میں، مظفر کو مکمل شکست ہوئی وہ کھمبے کی طرف بھاگا اور دس بارہ ہزار سپاہی جمع کر کے راج پیپلا کی پہاڑیوں میں چلا گیا۔ مغل اس کا ہر جگہ تعاقب کرتے پھرے اور آخرکار مارچ کے مہینے میں چمپانیر کے مقام پر اس کو شکست فاش ہوئی۔ اس مرتبہ بھی مظفر باوجودیکہ اس کی فوج بالکل کچل دی گئی تھی نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب گجرات سے خطرہ بالکل ٹل گیا تھا۔ اکبر نے مرزا خاں کی خدمات کو سراہتے ہوئے خان خاناں کا لقب مرحمت کیا۔

مظفر کاٹھیاوار میں افغان اور ہندو سرداروں کی پرجوش مدد یا ان کی چشم پوشی سے فائدہ اٹھا کر گاہے بگاہے جنگی چھیڑ چھاڑ کرتا اور مغلوں کو پریشان کرتا رہتا لیکن مغلوں نے بھی اس کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ نظام الدین احمد ہر جگہ اس کا تعاقب کرتا رہا۔ جب باغیوں کو کامیابی کی امید نہ رہی تو وہ بھی آہستہ آہستہ اس سے جدا ہونے لگے۔

1590ء میں مظفر ایک بار پھر نوانگر، کچھ، کھیڑی اور جوناگڑھ کے حکمرانوں کے ہمراہ برآمد ہوا۔ 17 جولائی 1591ء کو عزیز کوکا نے دشمن کی اس متحدہ فوج کو ایک سخت جنگ کے بعد پاتری کے مقام پر جو کہ ویرام گام کے شمال غرب میں واقع ہے شکست دی۔ مظفر اب بھی دو سال تک مغلوں کی تعاقب کرنے والی افواج سے بچتا پھرا لیکن 25 دسمبر 1592ء کو جام کی غداری کے سبب گرفتار ہوا۔ راستے میں دھورال کے مقام پر مظفر نے استرے سے اپنا گلا کاٹ کر خودکشی کر لی۔ مظفر کی موت کے بعد گجرات پر مغلوں کا قبضہ مضبوط ہو گیا۔

اور اب وہ آسانی کے ساتھ بتدریج ان افغان اور ہندو سرداروں کو زیر کر سکتے تھے جنھوں نے اب تک کاٹھیاواڑ میں مغل سلطنت کے اقتدار کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ مظفر گجراتی کے لڑکے بہادر کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی کہ وہ گجرات پر اپنا حق جتا ...رعایوں کو اپنے گرد جمع کرے۔

اسی دوران اکبر دکن پر حملہ کے متعلق سوچ رہا تھا لیکن اس کو شمال میں افغانستان میں جو واقعات رونما ہوئے ان کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ اس علاقے میں بابری خاندان کے موروثی دشمن ازبک گذشتہ چند سالوں سے ایک اولوالعزم، جوشیلے اور جنگجو سردار عبداللہ خاں کی سرکردگی میں قوت پکڑتے جا رہے تھے۔ اس نے بخارا، بلخ، تاشقند اور عملی طور پر سارا ترکستان فتح کر لیا تھا اور ازبک قبیلوں کو ایک متحد اور مضبوط قوم کی ڈور میں پرو لیا تھا۔

1584ء میں عبداللہ خاں نے بدخشاں فتح کر لیا۔ بدخشاں سلیمان اور اس کے پوتے شاہ رُخ کے درمیان خانہ جنگی کے سبب ناقابلِ تلافی حد تک کمزور ہو گیا تھا۔ سلیمان و شاہ رخ دونوں پریشانی کی حالت میں بھاگ کر کابل پہنچے۔ مرزا حکیم کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں اس کی اپنی حکومت ازبک حملے کا شکار نہ ہو جائے۔ چنانچہ مرزا نے شہنشاہ سے مدد کی درخواست کی اور پھر اکبر کی ہدایت کے بموجب شاہ رخ اور سلیمان کو ہندوستان روانہ کر دیا۔

اکبر ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ازبکوں کو روکنے کے لیے کیا اقدام کرے کہ یہ خبر ملی کہ مرزا حکیم 30 جولائی 1585ء کو دو چھوٹے چھوٹے شہزادے کیقباد اور افراسیاب کو چھوڑ کر انتقال کر گیا اور کابل میں شورش پھیل گئی۔

اکبر نے فوراً اس خطرے کو بھانپ لیا جو افغانستان کو لاحق تھا۔ اس نے حکم دیا کہ مان سنگھ فوراً کابل کی طرف کوچ کرے اور شورش کو کچل دے اور مزید احکامات کا انتظار کرے۔ 24 اگست کو شہنشاہ خود فتح پور سے شمال مغرب کی جانب روانہ ہو گیا۔ راستے میں اکبر نے خود کالانور سے کشمیر کو ایک سفیر روانہ کیا اور یہ کہلا بھیجا کہ وہاں کا حکمراں یا تو خود حاضر ہو یا اپنے بیٹے یعقوب کو جو کہ کیمپ سے فرار ہو گیا تھا واپس کر دے۔

11 نومبر کو حب مرزا حکیم کے لڑکے جن کو مان سنگھ نے کابل سے روانہ کیا تھا کیمپ

میں پہنچے تو اکبر بہت خوش ہوا۔ بہت سے مغل سرداروں نے اکبر کو یہ مشورہ دیا کہ وہ رہتاس سے آگے نہ جائے لیکن وہ بڑھتا ہی گیا اور 7 دسمبر کو راولپنڈی پہنچ گیا۔

اکبر اس بات کا خواہاں تھا کہ ہندوستان پر ہر ممکنہ حملے کے راستوں کو مسدود کر کے اپنی سلطنت کی یکجہتی کو برقرار رکھے چنانچہ اس نے 20 دسمبر کو کشمیر سوات باجوڑ اور بلوچستان کی فتح کے لیے مہمیں روانہ کیں۔ مان سنگھ کو کابل کا صوبے دار مقرر کر کے روانہ کیا اور اٹک کو شاہی افواج کا مرکز قرار دیا۔

اکبر کے اٹک میں طویل قیام کی وجہ سے عبداللہ خاں پریشان ہو رہا تھا۔ اس کا امکان بھی تھا کہ جو گفتگو ازبکوں کے ساتھ کی جا رہی تھی اس میں پیچیدگی پیدا ہو جائے لہٰذا اکبر نے واپسی کا فیصلہ کر لیا لیکن دوسری طرف اس وقت تک چھوڑ جانا بھی مناسب نہ تھا جب تک کہ سرحدی قبائل مخالفانہ رویہ اختیار نہ کریں، کشمیر فتح نہ ہو جائے اور عام حالات سدھر نہ جائیں اس کے علاوہ آگرہ اور دہلی میں قحط پھیل جانے کے سبب اکبر نے وہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور مئی [illegible]ء میں لاہور پہنچ کر اس کو سلطنت کا پایۂ تخت قرار دیا اور وہاں سے فوجی اور سیاسی اقدامات کی نگرانی کرنے لگا۔

ازبکوں کی منظم اور ہمہ گیر مخالفت کے لیے ضروری تھا کہ درۂ خیبر پر پورے طور پر بہ حاصل کیا جائے اور دریائے کابل کے کنارے کنارے جتنے افغان قبائل آباد ہیں ان کو مطیع کر لیا جائے۔ جب تک افغانستان پر پوری طرح قبضہ نہ ہو جائے اور پشاور کے میدانی علاقے اور سوات و باجوڑ کے پہاڑی علاقوں میں رہنے والے قبیلے مخالفانہ روش پر برقرار رہیں، اس وقت تک کابل یا بدخشاں میں کسی مہم کا بے روک ٹوک سر ہونا ناممکن تھا۔ بدقسمتی سے سوات اور باجوڑ کے یوسف زئی قبیلے ہمیشہ کی طرح پریشانی کا باعث بنے رہے۔ وہ راستوں کو گھیر کر ہندوستان اور توران کے درمیان آنے جانے والے قافلوں کو لوٹتے اور سرکشانہ سرگرمیوں میں مصروف رہتے۔

اکبر نے باجوڑ کے یوسف زئیوں کی سرگرمیوں کے لیے زین خاں کو روانہ کیا۔ ادھر سعید خاں گکھڑ کو حکم ملا کہ پشاور کے میدانی علاقے کو صاف کر کے زین خاں سے جا ملے۔ کچھ دنوں بعد زین خاں کی مدد کے لیے راجا بیربل کو بھی روانہ کر دیا گیا۔ میدانی علاقے میں تو مہم کافی کامیاب رہی اور زین خاں بھی باجوڑ کے کوہستانی علاقے میں کامیاب

رہا لیکن اس نے یہ اطلاع بھیجی کہ جب تک تیراہ اور سوات کے افغانوں کو پوری طرح قابو میں نہ کر لیا جائے۔ اس وقت تک باجوڑ کی مہم پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے گی۔ چنانچہ اسی کام کے لیے اس نے مزید کمک مانگی۔

شہنشاہ نے حکیم ابوالفتح کو ملکنڈ کی گھاٹی کی راہ سے جو کہ قریب ترین راستہ تھا زین خاں کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ ملکنڈ کی گھاٹی کے پاس زین خاں حکیم ابوالفتح سے آملا اور اب یہ مشترکہ فوج چک درہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس وقت فوج کے سرداروں خاص کر بیربل اور زین خاں کے درمیان اس بات پر اختلاف پیدا ہو گیا کہ ایک فوج تو چک درہ کی نگرانی کے لیے رہے اور دوسری فوج پہاڑیوں کے اندر جاکر فوجی کارروائی شروع کرے۔

متذکرہ بالا نظریہ زین خاں کا تھا لیکن بیربل جس کو حقیقتاً وہاں کے حالات سے بہت ہی کم واقفیت ہوگی اس بات پر اڑا رہا کہ شہنشاہ کی خواہش یہ تھی کہ وہ لوگ پہاڑیوں میں گھس جائیں تیزی سے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس علاقے کو روندتے ہوئے گزر جائیں نہ کہ اس پر ہمیشہ کے لیے قبضہ کر لیں۔

جوں ہی فوج کا ہراول پہاڑیوں کی چوٹی پر پہنچا پچھلا دستہ جس کی کمان زین خاں کے ہاتھ میں تھی اور جو ابھی وادی میں ہی تھا دشمنوں کے حملے کا نشانہ بن گیا اور وہ رسد کا سامان لے بھاگے۔ زین خاں نے بڑی مشکل سے اور بہت نقصان اٹھا کر خطرے کا مقابلہ کیا۔ اس نے اپنے ساتھی کو یہ مشورہ دیا کہ وہ جہاں ہیں وہیں ٹھہر کر دشمن سے لڑیں یا پھر جنگی قیدیوں کا تبادلہ کر کے صلح کر لیں اور شہنشاہ کے اگلے احکامات کے منتظر رہیں۔ کچھ لوگوں نے بیربل کو یہ اطلاع دی کہ افغان شبخون مارنے کا ارادہ رکھتے ہیں لہٰذا حفاظت کے لیے مناسب یہی ہے کہ نالنداراے گھاٹی کو جو صرف چند میل لمبی ہے طے کر لیا جائے۔ چنانچہ بیربل آگے روانہ ہوا اور زین خاں اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ جوں ہی یہ لوگ گھاٹی کے قریب پہنچے جہاں افغانوں نے مضبوطی سے ناکہ بندی کر رکھی تھی سورج ڈوب گیا۔ رات کی تاریکی میں جنگ ہوئی جس میں مغلوں نے بری طرح شکست کھائی اور بہت سے لوگ ہلاک ہوئے۔

اس لڑائی میں جو ۱۴ فروری 1586ء کو عمل میں آئی بیربل اور کئی دوسرے بہادر

سردار اس موت کی گھاٹی میں تہ تیغ ہو گئے۔ زین خاں اور ابوالفتح خاں بے انتہا پریشانی اٹھا کر بچے کھچے لوگوں کے ہمراہ اٹک پہنچے۔ اکبر کو راجا بیربل کی موت پر سخت افسوس ہوا اور زین خاں اور ابوالفتح دونوں کو برخاست کر دیا۔

اکبر اس شکست سے یقیناً بہت ہی بددل ہوا ہوگا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ یوسف زئیوں پر اپنی فوجی برتری کا مظاہرہ کرے تاکہ ان پر اور دوسرے طاقتور رقیب عبداللہ ازبک پر اس کی قوت کا رعب پڑ سکے لیکن نتائج اس کی توقعات کے بالکل برعکس برآمد ہوئے۔ بہرحال اکبر ایسی ناکامیوں سے گھبرانے والا نہ تھا۔

اکبر نے راجا ٹوڈرمل کو یہ ہدایات دے کر روانہ کیا کہ یوسف زئیوں کو سزا دے اور کم سے کم خون بہا کر اور کم سے کم سختی برت کر ان کو مکمل وفاداری اور اطاعت پر مجبور کر دے۔ مان سنگھ کو بھی اس کی مدد کے لیے روانہ کیا گیا۔

راجا ٹوڈرمل جیسے ہوشیار اور تجربہ کار جرنل اور مان سنگھ جیسے بہادر کمانڈر کی منظم فوج زین خاں اور بیربل کی مشترکہ فوج کی نسبت کہیں زیادہ بہتر تھی۔ بعد میں زین خاں اور ابوالفتح کو بھی ان کی مدد کے لیے روانہ کیا گیا۔

اس مرتبہ مغل سرداروں نے عاقلانہ احتیاط، بہتر قوت فیصلہ اور زیادہ بہادری کا مظاہرہ کیا۔ راجا نے کئی فوجی چوکیاں قائم کیں اور فوجی اہمیت کے مقامات پر متعدد قلعے تعمیر کرا کے ان میں فوجیں متعین کر دیں۔ مغل ان قلعوں میں سے افغانوں پر حملہ کر کے ان کو پریشان کرتے۔ یہاں تک کہ جلد ہی وہ لوگ بڑی بیچارگی کی حالت میں مبتلا ہو گئے۔

اکتوبر 1[illegible]ء میں زین خاں نے عید قرباں کے موقع پر جب کہ وہ سب عید منانے جمع ہوئے ناگہاں حملہ کر کے ان کو شکست دی۔ زین خان کی اس فتح سے یہ فائدہ ہوا کہ مزید چوکیاں قائم ہو گئیں اور میدانی علاقے سے رابطہ قائم ہو گیا۔ باوجودیکہ افغان اب بھی کبھی کبھی چوری چھپے حملے کرتے رہے لیکن مغلوں کو اپنی مضبوطی کا اتنا یقین ہو گیا تھا کہ آصف خاں اور زین خاں دونوں دربار واپس آ گئے۔

1[illegible]ء میں یوسف زئیوں کا شر انگیز سردار کالو افغان گرفتار کر لیا گیا۔ 1[illegible]ء میں اکبر خود کابل گیا تاکہ اس علاقے میں امن و امان قائم کیا جا سکے۔ شہنشاہ نے افغانی فقراء اور درویشوں کو انعام و اکرام دیا۔ لوگوں نے اس کا گرمجوشی سے استقبال کیا اور راستے بھر

دونوں طرف ترک وتاجک تحفے لے کر شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شہنشاہ بذاتِ خود ایک قبیلے کے گھر پر گیا اور اس نے ہزارا قوم کے افغان سرداروں سے بڑی عزت و احترام کے ساتھ ملاقات کی۔ ممکن ہے اکبر وہاں زیادہ عرصے تک قیام کرتا لیکن اس کی موجودگی سے عبداللہ خاں ازبک کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا لہٰذا اکبر قاسم خاں کو کابل کا صوبےدار اور شہباز خاں کو سوات کا سالار بنا کر واپس چلا گیا۔

ابھی تک افغانوں نے صلح کا سبق نہ سیکھا تھا۔ 1590ء میں انھوں نے پھر شورش برپا کی اور زین خاں کو ان کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا گیا۔ 1592ء میں ایک مرتبہ پھر زین خاں کو سوات اور باجوڑ بھیجا گیا تاکہ وہاں پر روشنیہ فرقے کی ہمدردی میں جو شورش اٹھ کھڑی ہوئی تھی اس کو کچل دے۔

دسمبر 1595ء میں اسمٰعیل قلی خاں جو کہ بلوچستان بھیجا گیا تھا اپنی مہم میں کامیاب ہوا اس علاقے کے لوگوں نے جلد ہی اطاعت قبول کر لی۔ ان کے سردار غازی خاں وجاہ اور ابراہیم خاں اپنی وفاداری کے ثبوت میں بذاتِ خود دربار میں حاضر ہوئے اور شہنشاہ نے ان کو اپنے علاقوں پر قابض رہنے کی اجازت دے دی۔

شادی خاں معروف بہ زین العابدین کی موت کے بعد سے کشمیر کی زمین جنت نظیر تشدد، تعصب، سیاسی سازشوں اور مخالفین کی خانہ جنگیوں اور ناروا داری کا شکار ہو گئی تھی۔ بہت عرصہ قبل سکندر لودی کے زمانے میں کشمیر کا حکمراں محمد وہاں سے بھاگ کر سکندر کے دربار میں پناہ لینے آیا تھا اور اپنے چچا فتح خاں کے مقابلے کے لیے مدد کا طالب ہوا تھا۔ سکندر نے فتح خاں کو شکست دے کر محمد کو دوبارہ تخت پر بٹھا دیا۔ فتح خاں کے بیٹے سکندر نے بابر کی مدد حاصل کی لیکن وہ کشمیر میں کوئی اثر و رسوخ حاصل نہ کر سکا۔

1528ء میں محمد کو تخت سے اتار دیا گیا اور ملک کاجی نے اس کے لڑکے ابراہیم کو تاج پہنا دیا۔ کاجی کے مخالفین نے بابر کی مدد حاصل کی، ابراہیم کو نکال باہر کیا اور محمد کو دوبارہ تخت پر بٹھا دیا۔

ابراہیم کے ساتھیوں نے کامران کو فتح کشمیر پر ابھارا تھا لیکن کامران کے سپاہیوں کے سفاکانہ سلوک سے کشمیر کی مخالف جماعتوں نے ایک عارضی دفاعی سمجھوتہ کر لیا جو کہ مغلوں کو پسپا کرنے کے لیے کافی مضبوط ثابت ہوا۔ 1533ء میں کاشغر سے کشمیر پر حملہ ہوا جس کے

نتیجے میں کشمیر کے حاکم کو مجبور ہو کر اپنی لڑکی کاشغر کے شہزادے کو بیاہنی پڑی۔ جونہی یہ خطرہ ٹلا وہاں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ ایک فریق نے ہمایوں کو کشمیر کو فتح کرنے کی دعوت دی لیکن چند وجوہ کی بنا پر جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے ہمایوں نے یہ تجویز منظور نہ کی لیکن بابر کے ایک رشتے کے بھائی حیدر دوغلات نے یہ تجویز منظور کر لی اور 41-1540ء میں کشمیر فتح کر لیا اور ہمایوں کے نام کا خطبہ اور سکے جاری کر دیے۔

اب دوسرے فریق نے شیر شاہ کی مدد طلب کی لیکن افغان مہم جس کی سرکردگی حسین خاں شیروانی کر رہا تھا ناکام ثابت ہوئی۔ اسی طرح اسلام شاہ کے زمانے میں نیازیوں کی کوششیں بھی شرمناک حد تک ناکام رہیں۔ حیدر مرزا نے اسلام شاہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کر لیے اور جب تک کہ وہ 1551ء میں ایک جھگڑے میں مارا گیا حکومت کرتا رہا۔

حیدر کی موت کے سبب فرقہ وارانہ جنگ کی آگ اور بھی شدت سے بھڑک اٹھی۔ اس وقت چار گروہ تھے۔ زینا، مکری، بکوری اور کاجی۔ ملک چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا تھا اور ہر روز ایک نیا حکمراں بنتا اور اتارا جاتا۔ آٹھ سال کی مدت میں پانچ بادشاہوں نے حکومت کی۔ قدیم خاندان کی حکومت ختم ہو گئی۔ اس پر غازی خاں چک نے 1560ء میں قبضہ کر لیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد حکومت غازی خاں کے بھائی حسین خاں کو منتقل ہو گئی۔ ان واقعات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بابر، ہمایوں اور کامران کی نگاہیں کشمیر پر کیوں لگی ہوئی تھیں۔

اکبر کے تعلقات حسین شاہ اور اس کے برادر و جانشین علی شاہ کے ساتھ غیر اطمینان بخش نہ تھے۔ اگرچہ اکبر نے خود حسین شاہ کی لڑکی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر اس نے 1572ء میں علی شاہ چک کی بھتیجی سے شہزادہ سلیم کی شادی کرنا بخوشی قبول کر لیا۔ علی شاہ نے یہاں تک کیا کہ اجتماعی نمازوں میں اس بات کا اعلان کر دیا کہ اکبر کشمیر کا مقتدر اعلیٰ ہے۔ علی شاہ کا 79-1578ء میں انتقال ہو گیا۔ اور اس کا بیٹا یوسف اس کا جانشین ہوا۔ فوراً ہی خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ یوسف مجبوراً بھاگ کر اکبر کی پناہ میں آ گیا۔ 1580ء میں شہنشاہ نے مان سنگھ کو یوسف کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ شاہی فوج بھمبر تک پہنچ گئی۔ کشمیریوں نے صلح کی درخواست کی اور یہ چاہا کہ یوسف تنہا واپس آ جائے۔ یوسف مغل افسروں کو اطلاع کیے بغیر خاموشی سے نکل گیا اور تخت پر جا بیٹھا۔

1584ء میں یوسف سے کہا گیا کہ وہ خود دربار میں حاضر ہو کر اظہار اطاعت کرے۔ یوسف خاں نے خود حاضر ہونے سے انکار کر دیا اور اپنے بجائے پہلے اپنے چھوٹے لڑکے حیدر اور پھر بڑے بیٹے یعقوب کو روانہ کر دیا لیکن اکبر اس بات سے مطمئن نہ ہوا اور ہمیں کو ان وزیروں کی جماعت سے تشویش پیدا ہو گئی جنھوں نے یوسف کو اپنے ہاتھوں کھلونا بنا رکھا تھا۔

1585ء میں جب اکبر سرحد کی طرف جا رہا تھا تو یعقوب اپنی جان کے خوف سے شاہی کیمپ سے نکل بھاگا۔ اکبر نے یوسف کو حکم بھیجا کہ وہ یا تو خود حاضر ہو یا پھر یعقوب کو دربار میں حاضر ہونے کی ہدایت کرے۔ شاید یوسف خود آنے کو تیار تھا لیکن اس کے اُمرا نے اسے جانے نہ دیا اور اکبر کی سفارت ناکام رہی۔ اکبر ان حالات میں کشمیر کو مشکوک وفاداری کی صورت میں چھوڑ نہ سکتا تھا جب کہ ازبک خطرہ سر پر سوار تھا اور شمال مغربی سرحد نازک صورت اختیار کر چکی تھی۔

دسمبر 1585ء میں اکبر نے شاہ رُخ اور بھگوان داس کو پکھلی گھاٹی کے راستے کشمیر پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ جب مغل فوج بولیاس کی گھاٹی میں پہنچی تو انھوں نے دیکھا کہ یوسف خاں نے اس کا راستہ بند کر رکھا ہے۔ اس جگہ ایک گھمسان کی لڑائی ہوئی لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اب مغل فوج مخمصے میں پھنس گئی۔ وہ نہ تو آگے بڑھ سکتی تھی اور نہ پیچھے ہٹ سکتی تھی کیونکہ سیلاب کی وجہ سے پل ٹوٹ گئے تھے اور دروں میں پانی بھر گیا تھا۔ کیمپ میں قحط اور شدید سردی کے سبب بہت سے لوگ ہلاک ہو گئے۔ اسی وقت اُن لوگوں کو خبر ملی کہ یوسف زیوں کے خلاف جو مہم بھیجی گئی تھی اس نے بھی زبردست زک اُٹھائی ہے۔ چنانچہ فوج میں مزید خوف و ہراس پھیل گیا۔ بھگوان داس نے یوسف کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ یہ نہ بھولے کہ راجپوت جان کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے اور اگر شہنشاہ کی یہ فوج کشمیر میں فنا ہو بھی جائے تو بھی مغل شہنشاہ کی قوت کو کوئی ضرر نہ پہنچے گا۔

اس حقیقت نے یوسف کے دل پر اثر کیا لیکن اس کے امرا پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخرکار وہ خاموشی سے اپنے خیمے سے فرار ہو کر بھگوان داس کے پاس آ پہنچا۔ کشمیریوں نے یعقوب کو فوراً بادشاہ بنا دیا اور جنگ کے لیے نکل آئے۔ کئی ہزار قحط زدہ مغل

سپاہی جنگ میں کام آئے اور باقی کو جان بچانے کے لیے خندقوں میں پناہ لینی پڑی۔ مغل اب اور زیادہ وہاں نہ ٹھہر سکتے تھے کیوں کہ قحط اور سردی اس قدر شدت اختیار کر چکی تھی کہ ایک اشرفی کے بدلے میں ایک وقت کا کھانا میسر نہ آتا تھا اور جسم کو چھپانے کے لیے ہاتھیوں اور گھوڑوں کے پیٹ چاک کر کے اس میں پناہ لیتے تھے۔ مغلوں کے لیے کوئی اور چارۂ کار نہ رہا تو انھوں نے یعقوب کے ساتھ ایک قسم کا معاہدہ کر لیا جس کی شرائط یہ تھیں کہ خطبہ اور سکوں میں اکبر کا نام موجود ہوگا' زعفران کی کھیتی کی آمدنی' شالوں کے ٹیکس اور ٹکسال کی آمدنی شہنشاہ کے لیے مخصوص ہوگی۔ اس طرح 1586ء میں یہ تھکی ہاری پریشان حال فوج شہنشاہ کو اپنی مصیبت کی داستان سنانے واپس پہنچی۔

اکبر کے نزدیک کشمیر کی مہم بھی ناکام ہی رہی اور اس کا بھی وہی حشر ہوا جو بیربل اور زین خاں کی یوسف زئیوں کے خلاف پہلی مہم کا ہوا تھا۔ اس مہم میں جو نام نہاد کامیابی حاصل ہوئی وہ شکست سے بھی بدتر تھی۔

اکبر کو ان خبروں سے زیادہ جھنجلاہٹ اس وجہ سے بھی ہوئی ہوگی کہ اس وقت توران کے حکمراں عبداللہ خاں کا ایلچی اس بربادی کا واقعہ درج کرنے کے لیے شاہی دربار میں موجود تھا۔ چنانچہ اکبر نے اس معاہدے کو جو اس کے افسروں پر بے انتہا مصائب کی حالت میں تھوپا گیا تھا ماننے سے انکار کر دیا۔

1586ء ہی میں یعقوب نے کشمیر پر اکبر کے اقتدار اعلیٰ کی دھجیاں اُڑا دیں اور اپنے نام کا خطبہ اور سکے رائج کرے۔ مختصر یہ کہ کشمیر میں اس وقت ایک ایسے بادشاہ کی حکومت تھی جس کے تعلقات شہنشاہ سے غیر دوستانہ تھے۔

اکبر یعقوب کو چھوڑنے والا نہ تھا۔ پہلے تو اس نے یہ چاہا کہ یوسف کو دوبارہ کشمیر کے تخت پر بٹھا دیا جائے لیکن پھر اس نے اپنا خیال بدل دیا کیوں کہ یوسف میں اتنی بھی استعداد نہ تھی کہ وہ اپنے لڑکوں یا امرا کو جو کہ کافی طاقت ور ہو گئے تھے اپنے قابو میں رکھ سکے۔ آخر کار اکبر نے کشمیر فتح کرنے کا ارادہ کر لیا اور قاسم خاں میر بحر کو یعقوب سے نپٹنے کے لیے روانہ کیا۔

یعقوب نے شاہ اسمٰعیل کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ قاسم خاں ایسے وقت کشمیر پہنچا

جب کہ یعقوب کی تنگ نظرانہ سیاست نے شیعہ سنیوں کے درمیان فساد برپا کر رکھا تھا۔ کچھ امیروں نے اس سے الگ ہوکر شمس الدین چک کی سرکردگی میں علم بغاوت بلند کیا۔ قاسم خاں احتیاط سے آگے بڑھا۔ جن گھاٹیوں پر قبضہ کر لیا تھا ان کو محفوظ کیا، بہت سے امراء کی ہمدردیاں حاصل کیں اور جو غیر مطمئن کشمیری امراء اس کی خدمت میں آئے ان کی پذیرائی کی۔ 2 اکتوبر 1586ء کو جنگ ہوئی۔ اس میں شمس الدین چک کو شکست ہوئی اور اس طرح سری نگر کا راستہ صاف ہوگیا۔ 7 اکتوبر کو مغل افواج سری نگر پہنچ گئیں اور اکبر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ یعقوب سری نگر سے فرار ہوگیا اور مخالفانہ سرگرمیاں جاری رکھیں۔ مغل فوج جگہ جگہ اس کا تعاقب کرتی رہی۔ باغیوں کی بے چینی اور نقض امن کی کاروائیوں کے سبب قاسم خاں کو سختی کا برتاؤ کرنا پڑا لیکن جلد ہی اس تشدد آمیز اقدام کے لیے پچھتانا پڑا۔ تشدد سے کوئی مسئلہ حل نہ ہو سکا بلکہ مشکلات میں اور اضافہ ہوگیا۔

قاسم خاں ان حالات کے سبب اکتا گیا اور اس نے وہاں سے تبادلے کی درخواست کی۔ اکبر نے مرزا یوسف کو جو کہ مشہدی سید تھا دو ہزار سپاہیوں کے دستے کے ہمراہ قاسم خاں کی جگہ روانہ کیا۔ مرزا نے استحکام و مصالحت کی پالیسی اختیار کی۔ اس نے آہستہ آہستہ امراء اور عوام کو اپنی طرف ملایا۔ شمس الدین چک کو زبردست شکست ہوئی اور آخرکار 1589ء میں یعقوب کو بھی اطاعت کرنے پر مجبور کردیا۔ شہنشاہ نے یعقوب کو معاف کردیا اور اس کو پنج صدی منصب عطا کیا اور بہار میں ایک چھوٹی سی جاگیر عنایت کی۔

فتح کشمیر نے شمالی پنجاب کی پہاڑیوں کے نیم محکوم اور سرکش راجاؤں پر گہرا اثر ڈالا۔ چنانچہ 1590ء میں راجگان نگرکوٹ، جمّوں مانی، جسوال اور کوئی ایک درجن دوسرے سردار شہنشاہ کی خدمت میں اطاعت گزاری کے لیے حاضر ہوئے۔ 1591ء میں خورد تبت کے حکمران علی رائے نے بھی تحفے بھیجے اور اپنی لڑکی سلیم کو بیاہ دی۔ ان سب راجاؤں کی مشترکہ طاقت ایک لاکھ پیادہ اور دس ہزار سوار بتائی جاتی ہے۔ ان لوگوں کے شہنشاہ اکبر کی حاکمیت قبول کرنے کی وجہ سے پنجاب اور سرحدات کی مضبوطی و استحکام کو کافی مدد ملی۔

روشنیہ فرقہ (جس کو مغل مورخین تاریکی کہتے ہیں) کا بانی ایک افغان بایزید نامی تھا جو 1525ء میں جالندھر میں پیدا ہوا اور افغانستان کی پہاڑیوں میں پرورش پائی۔ بچپن ہی

سے اس کا رجحان روحانیت کی طرف تھا لیکن جب تک وہ ملا سلیمان کے زیر اثر نہ آیا اس کے مذہبی عقائد نے کوئی شکل اختیار نہ کی۔ ملا سلیمان غالباً اسمٰعیلی تھا اور شہر کالنجر (اتر پردیش) میں رہتا تھا۔ کالنجر سے واپسی پر بایزید کانیگورم کے قریب پہاڑ کے غار میں روحانی عبادات میں منہمک ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس طرح اس نے وہ سب مراحل طے کر لیے جو انسانی روح کی طہارت کے لیے ضروری ہیں۔ اس کے بعد بایزید کو یہ احساس ہوا کہ اس کو خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے، وہ جو کچھ کہتا ہے یا کرتا ہے بے چوں و چرا حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس نے پیر روشن کا لقب اختیار کیا اور اس کے پیرو روشنیہ کہلائے۔

بایزید کے عقائد کا سب سے اہم اصول پیروں کی برگزیدگی و حرمت پر اعتقاد تھا وہ ہر معاملے میں پیر کی بات کو قطعی سمجھتے۔ ان کا نظریہ تھا کہ جو لوگ پیر کے فرماں بردار اور مطیع نہیں وہ ایسے جانور ہیں جن کو بغیر کسی احساس پشیمانی کے نیست و نابود کر دیا جائے اور ان کی جائیداد ضبط کر لی جائے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ قرآن و حدیث کی صوفیانہ طریقے پر تفسیر کی جائے اور اس کام کو محض پیر ہی انجام دے سکتا ہے۔

پیر کے درجے کو پہنچنے کے لیے ریاضت اور مذہبی اعمال کی ضرورت ہوتی ہے یا پھر پیرو ہی ہوتا ہے جو کسی پیر کی ہدایات پر عمل پیرا ہو۔ پیر ظاہری قانون اور شرع کے قواعد اور پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے۔ قیامت، جنت اور دوزخ کو تعبیری ڈھنگ سے سمجھنا چاہیے۔ اور وہ سب اسی دنیا میں موجود ہیں۔ انسانی ارواح دوسرے جسموں میں منتقل ہو سکتی ہیں۔ راسخ العقیدہ مسلمان روشنیوں کو ملحد سمجھتے اور حکومت نے ان پر سلطنت سے غداری اور لوٹ مار کے الزامات عائد کیے۔ اگر اس فرقے کی تشدد آمیز فوجی کارروائیوں کو شمار نہ کیا جائے تو یہ فرقہ بھی کم و بیش ان ہی دوسرے فرقوں کی طرح تھا جو اس زمانے کے رائج عقائد کی بنیاد پر وجود میں آئے۔

بایزید کے عقائد کے سبب سنی اس کے مخالف ہو گئے لیکن اس کے جوش و خروش کے باعث بہت سے افغان قبیلے مخصوص طور پر مہمند، غازی خیل، خلیل اور محمود زئی اس کے پیرو ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وادئ پشاور اور دریائے کابل کے آس پاس رہنے والے سارے پشتو زبان بولنے والے وحشی افغان قبیلے بڑی شدومد کے ساتھ اس سے مل گئے۔ سنیوں

سے اس کو جو اذیت پہنچی اسس کی وجہ سے وہ اُن کا سخت دشمن ہوگیا اور اُس نے آخرکار اپنے مخالفین کو نیست و نابود کرنے کی تبلیغ شروع کردی۔ بایزید کا گروہ جس میں مُریدوں کو مختلف روحانی مراتب میں تقسیم کیا گیا تھا، حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ مصروف کار تھا۔ اسس عقیدے کے سبب سرکش افغان قبائل جو کہ ہمیشہ لوٹ مار اور غارت گری میں مصروف رہتے اب ان کو اپنے عمل کے لیے مذہبی جواز بھی ہاتھ آگیا اور وہ ہندوؤں و سنی مسلمانوں میں سے کسی کو نہ چھوڑتے۔ بایزید کی حرکات نے بالآخر مرزا حکیم کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ مرزا حکیم نے بایزید کو بلا بھیجا۔ اور اس نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ مباحثہ کرکے اس شک کو رد کردیا کہ وہ مسلمانوں کا دشمن ہے۔ اس کو چھوڑ دیا گیا۔ اب بایزید کی ہمت اور بھی بڑھ گئی۔ اس نے اپنی کوششیں تیراہ اور سفید کوہ علاقے میں بھی شروع کردیں۔

بایزید نے آہستہ آہستہ مغلوں کی حاکمیت و برتری کے خلاف مہم شروع کردی اور مذہبی و سیاسی آزادی کے لیے جنگ کی تبلیغ کرنے لگا۔ بایزید نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے ایک غیر منظم سوار فوج تیار کی۔ آخرکار وہ کابل کی حکومت سے مقابل ہوا لیکن اسس کو شکست ہوئی اور ایسی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا کہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

بایزید کے بعد روشنیہ فرقے کی قیادت عمر کے ہاتھ میں آئی لیکن یوسف زئی قبیلے کے لوگ جو کسی وقت روشنیہ تحریک کے زبردست حامی تھے عمر کے مخالف ہوگئے اور اس کو قتل کردیا۔ عمر کا سب سے چھوٹا بھائی جلالا جو کہ 14 سال کا تھا گرفتار کرلیا گیا اور 1581ء میں جب کہ اکبر اپنی کابل کی پہلی مہم سے واپس لوٹ رہا تھا اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اکبر نے اس کے ساتھ تو مہربانی کا سلوک کیا لیکن جلالا مطمئن نہ ہوا اور فرار ہوگیا۔ اب وہ بھی اپنے باپ کی طرح تشدد کی تبلیغ کرنے لگا۔ اس نے جلد ہی بنگش، آفریدی اور اورکزئی قبیلوں کو متحد کیا جو کہ خیبر کے راستے میں آباد تھے اور مشترکہ طور پر مغلوں سے کھلم کھلا دشمنی کرنے لگا۔ جلالا نے پشتونوں کے بادشاہ ہونے کا اعلان کردیا۔ اسس کے مرید ملک بھر میں لوٹ مار اور غارت گری کرتے۔ یہاں تک کہ انھوں نے ہندوستانی و افغان علاقوں میں ربط و ضبط کا سلسلہ سخت دشوار بنادیا۔ انھوں نے پشاور کے مغل جاگیردار سید حامد بخاری اور اس کے چالیس رشتے داروں کو قتل کردیا اور 1585ء میں قلعہ کو گھیر لیا۔

20 دسمبر کو جب کہ زین خاں یوسف زئی کے خلاف لڑ رہا تھا اور شاہ رُخ کشمیر کی سرکوبی میں مصروف تھا۔ اکبر نے مان سنگھ کو حکم دیا کہ تاریکیوں (روشینہ فرقے والوں) کی سرکوبی کرکے کابل کا راستہ صاف کردے۔ راجا نے ان پر سخت قاتلانہ حملے کیے اور اتنی سختی سے حکومت کی کہ افغان اس راجپوت کے ظلم و تشدد سے لرز اٹھے لیکن تباہ کن اپنے طرزِ عمل سے باز نہ آئے۔ تقریباً اسی وقت تورانی سفیر میر قریش آیا لیکن وہ اُس وقت تک درۂ خیبر سے نہ گزر سکا جب تک کہ مان سنگھ نے آکر روشینہ فرقے والوں کو جو کہ میر کو لوٹنے کی دھمکی دے رہے تھے مار کر بھگا نہ دیا۔

اکتوبر 1586ء کے اواخر میں مان سنگھ بخار میں مبتلا ہو گیا جس کی وجہ سے وہ ڈیڑھ مہینے تک نقل و حرکت نہ کر سکا۔ افغانوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر تیراہ میں اپنی طاقت بڑھالی اور درۂ خیبر کو پتھروں سے مضبوط کر لیا۔ جونہی مان سنگھ صحت یاب ہوا وہ پھر نکل پڑا اور درہ کو کوہستانی برف اور ناپاک وحشیوں کے باوجود سخت کوشش کے بعد 15 دسمبر 1586ء کو صاف کر دیا۔

مان سنگھ کے ساتھی زین خاں نے اپنی عادت کے بموجب کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کابل سے دریائے سندھ تک فوجی چوکیاں مقرر کر دیں۔ مان سنگھ نے مخالفین کو سختی سے کچلنے کی سیاست پر عمل کیا جس کی وجہ سے اکبر نے اس کو واپس بلا لیا جلالا نے ایک مرتبہ پھر مغل فوج پر حملہ کر دیا جس کی سرکردگی ابوالمطلب خاں کے ہاتھوں میں تھی لیکن اس کو شکست ہوئی اور وہ پہاڑیوں میں فرار ہو گیا۔

نئے فوجی افسر صادق خاں نے وقتی طور پر آفریدی اور اورکزئی قبیلوں کو جو جلالا کے خاص حامی تھے اپنی طرف ملا لیا۔ جلالا فوراً توران کی طرف بھاگ گیا اور 1588ء میں افغانوں نے اس کے خاندان کو مغلوں کے سپرد کر دیا۔ تین چار سال بعد جلالا توران سے واپس آگیا اور قبائلیوں کو بھڑکا کر ایک مرتبہ پھر مغلوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے۔ 1592ء میں شہنشاہ نے کابل اور سرحد کی افواج کو قاسم خاں و آصف خاں کی سرکردگی میں ان پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ بعد میں زین خاں کوکا کو سوات اور باجوڑ کی طرف روانہ کیا جہاں باغیوں کی حمایت میں شورش پھوٹ پڑی تھی۔ جلد ہی کامیابی اور محمود زئی افغان باغیوں کی فوج سے جا ملے۔ زین خاں کوکا نے ان کا تعاقب کیا اور ان کے نئے مرکز پر جو کہ کافرستان میں تھا حملہ

کردیا۔ یہاں انھوں نے ایک قلعہ اس لیے بنا دیا تھا کہ اگر فرار ہونا پڑے تو یہاں آکر پناہ لے سکیں۔ زین نے اپنے پچھلے دستوں کو مضبوط کر رکھا تھا اور اس کام کے لیے اس نے اپنے راستے کی ہر منزل پر ایک چوکی قائم کردی تھی۔ اس طرح زین دشمن پر کافی دباؤ ڈال سکتا تھا۔ بہرحال سخت گھمسان کی لڑائی کے بعد ہی زین روشینہ فرقے کا خاص قلعہ چوکہ چنکاری میں تھا فتح کر سکا۔

زین خاں اور قاسم خاں کی کارروائیاں خاصی کامیاب رہیں۔ تیراہ کے افغان زیر ہو گئے اور کافرستان میں کتشالی کا قلعہ بھی فتح ہو گیا۔ کافروں کو اتنا تنگ کیا گیا کہ ان میں سے کچھ تو شاہی فوج کی مدد کرنے پر تیار ہو گئے۔

باغیوں کا سردار محبت علی گرفتار ہوا اور 1593ء تک سارا پہاڑی علاقہ نیز علاقہ کاشغر اور بدخشاں کی سرحد تک مغلوں کے قبضے میں آگیا۔ 1596ء میں عبداللہ خاں ازبک نے توران اور مغل سلطنت کے درمیان ہندوکش کو سرحد مان لیا۔ جلالا جو کہ ابھی تک آزاد تھا تیراہ کے علاقے میں بھاگ گیا۔ لیکن وہاں کے افغانوں نے اس کو پناہ دینے سے انکار کردیا۔ اب قاسم خاں کو حکم ملا کہ وہ کابل واپس چلا جائے۔

اس وقت جب کہ قندھار پر حملہ کی تیاریاں کی جا رہی تھیں کابل کے صوبے دار قاسم خاں کو اس کی خواب گاہ میں قتل کردیا گیا۔ اس قاتل گروہ کا سردار محمد زمان تھا اور بدخشاں کے کچھ پناہ گزین اس کے شریک کار تھے۔ قاسم کے بھائی ہاشم بیگ نے پھرتی سے سازشیوں کی سرکوبی کی اور جو بدخشانی بھی اس کے ہاتھ لگا قتل کردیا۔ اس طرح امن و امان قائم ہو گیا۔

قاسم خاں کی موت روشینہ فرقے کی سرکشی کی ایک علامت سمجھی گئی۔ کابل کے نئے گورنر قلی خاں نے اس بغاوت کو کچل دیا۔ شہنشاہ نے 1597ء میں زین خاں کو ایک بار پھر کابل کے حالات درست کرنے کے لیے روانہ کیا۔

زین خاں کو کابل آمد اور عبداللہ خاں ازبک کی وفات کی خبروں نے باغیوں کی سرگرمیوں کو سرد کردیا۔ وہ لوگ سفید کوہ کی طرف بھاگ گئے اور 1597ء میں تیراہ ایک دفعہ پھر قبضے میں آگیا۔ زین خاں نے کابل پر کچھ داری سے حکومت کی اور مال گزاری پر آٹھ سال کے لیے 12½ فی صدی معافی حاصل کرکے وہاں کے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرلیں۔ اگست 1600ء تک

ایک سوداگر کے بھیس میں غزنی بھی پایا گیا۔ وہ نوہانیوں کی درخواست پر ہزاراؤں کے خلاف ان کی مدد کے لیے گیا تھا لیکن جب 28 اگست 1600ء کو جلالا شہر سے باہر نکل رہا تھا تو ہزاراؤں نے اس کو روک لیا۔ جلالا جھگڑے میں سخت زخمی ہوا اور بھاگ کر رباط کی پہاڑیوں میں پناہ لی۔ مراد بیگ نے اس کا پیچھا کیا اور پکڑ کر سر قلم کر لیا۔

1601ء میں اکبر کی صورت حال شمال مغربی سرحدی علاقے میں کافی مضبوط ہو گئی۔ اس میں شک نہیں کہ 1602ء میں جلالا کے بیٹے احداد نے ایک مرتبہ پھر تیراہ علاقے میں شورش برپا کی اور مشہور سرکش قبیلوں کو جن میں آفریدی، بانی اور کرزئی اور سدی شامل تھے اپنے ساتھ ملا لیا۔ لیکن یہ شورش محض ایک مقامی معاملہ تھا اور زیادہ وسیع پیمانے پر نہ پھیلی۔ تختہ بیگ نے ان لوگوں کی سرکوبی کی مہم شروع کی اور جلد ہی زیر کر لیا۔ احداد اپنی جان بچا کر بھاگا اور پھر اکبر کے عہد حکومت میں اس کے بارے میں کچھ سننے میں نہ آیا۔

اکبر قندھار فتح کرنے کی پوری تیاریاں کر لینا چاہتا تھا تاکہ جب بھی موقع ملے فوراً کارروائی عمل میں لائی جا سکے۔ قندھار اور بلوچستان کی مہمات اس بات کی محتاج تھیں کہ سندھ پر پورا پورا تسلط قائم رہے۔ بھکر مغلوں کے اختیار میں تھا۔ اکبر یہ چاہتا تھا کہ ٹھٹھہ فتح کر کے اپنی سلطنت کو سندھ میں مضبوط بنا دے۔

چنانچہ عبدالرحیم خان خاناں کو ٹھٹھہ کی فتح کے لیے روانہ کیا گیا۔ اس وقت ٹھٹھہ کی حکومت جنگی بیگ کے ہاتھوں میں تھی اور وہ اکبر کی خدمت میں اظہار اطاعت کے لیے خود حاضر نہ ہوا تھا، خان خاناں نے سہوان کا محاصرہ کیا جنگی بیگ سہوان کی حفاظت کے لیے ایک بحری بیڑہ لے کر آیا جس میں کچھ یوروپین بھی شامل تھے۔

دو لڑائیوں میں مغلوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا لیکن مصیبتوں اور پریشانیوں کو جھیل کر انھوں نے سندھیوں کو شکست دی اور ٹھٹھہ و سہوان 1591-92ء میں مغلوں کے قبضے میں آ گئے، جنگی بیگ دربار مغلیہ کے امرا میں شامل ہو گیا اور اس کو دکن میں جنگ کے لیے بھیج دیا گیا۔ اس طرح سندھ کا پورا علاقہ مغل سلطنت کا حصہ بن گیا۔ جنگی بیگ کو ملتان کا صوبہ اور تین ہزاری منصب عطا ہوا۔

قندھار اکبر کی حکومت کے آغاز ہی میں ایرانیوں کو منتقل ہو چکا تھا اور اس وقت سے شاہ طہماسپ کا بھتیجا سلطان حسین مرزا اس پر حکومت کر رہا تھا۔ باوجودیکہ ایران میں

انتشار تھا شہنشاہ نے قندھار واپس لینے کی کوشش نہ کی اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سلطان حسین نے اکبر کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کیے ہوئے تھے لیکن حقیقی وجہ یہ تھے کہ اکبر اپنے اندرونی ملکی معاملات میں بہت منہمک تھا اور چاہتا تھا کہ ہندوستان کی سرحد کے اندر ہی اپنی سلطنت کو مزید وسیع کرے۔ جب تک کہ اکبر اپنی سرحدوں اور سندھ کو مضبوط نہ بنالے اس کے لیے قندھار فتح کرنا اور پھر اس پر قبضہ جمائے رکھنا ممکن نہ تھا۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ اکبر قندھار پر قبضہ کرنے کا بے حد خواہش مند تھا کیونکہ قندھار ہندوستان کا پھاٹک یا دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ شمار کیا جاتا تھا۔

1576ء میں سلطان حسین مرزا چار لڑکوں کو چھوڑ کر فوت ہو گیا اور قندھار کا علاقہ ان چاروں لڑکوں کے قبضے میں رہا۔ بڑا لڑکا مظفر حسین خاص قندھار میں رہتا اور رستم مرزا اور اس کے بھائی زمین داور کے علاقے پر قابض تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایران سے الگ اور خود مختار ہونے کا اعلان کر دیا لیکن مظفر اور رستم کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی جس میں رستم کو شکست ہوئی۔ رستم نے اکبر کے ساتھ بات چیت شروع کی۔ اکبر اس وقت شمال مغربی سرحد میں موجود تھا۔ 1594ء میں اکبر نے رستم کو پنج ہزاری منصب اور ملتان و بلوچستان کی حکومت عطا کی۔

چونکہ اکبر اپنی سرحدوں کو مضبوط کر رہا تھا اور قندھار حاصل کرنے کا خواہاں تھا اور اسی وجہ سے رستم مرزا کو پناہ دی گئی تھی اس بات کا امکان تھا کہ مرزا مظفر شاہ عباس اول بادشاہ ایران یا عبداللہ خان ازبک کے ساتھ جس نے کہ خراسان فتح کر لیا تھا متحد ہو جائے لیکن مظفر حسین نے بھی اکبر کی پناہ حاصل کی۔ ایرانی اور ہندوستانی حکومتوں کے درمیان فوراً خط و کتابت شروع ہو گئی۔ اکبر نے یہ وعدہ کیا کہ ضرورت پڑنے پر وہ توران کے حکمران عبداللہ خان کے مقابلے میں شاہ ایران کی مدد کرے گا لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے قندھار حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ شاہ ایران جنگ کے لیے تیار نہ تھا اس نے ازبکوں کے خوف سے بادل ناخواستہ ترکوں کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا تھا اور مغل شہنشاہ کی حمایت بھی طلب کی تھی۔

اکبر نے زیادہ انتظار نہ کیا۔ سندھ پہلے ہی فتح ہو چکا تھا اور مغل افواج سیبی (بلوچستان) تک جو کہ قندھار کے قریب ہے پہنچ چکی تھیں۔ قندھار پر قبضہ کرنے کے لیے مغل

فوجی دستہ روانہ کر دیا گیا۔ مظفر حسین مرزا نے بغیر کسی مخالفت کے قلعہ مغل فوج کے حوالے کر دیا اور خود اکبر کے دربار میں آگیا۔ اکبر نے 1595ء میں مظفر حسین کو پنج ہزاری منصب اور سنبھل کی سرکار عطا کی۔ عوام نے مغلوں کا استقبال کیا اور ازبکوں کو جنھوں نے زمین داور اور گرمسیر پر قبضہ کر لیا تھا مار بھگایا۔ یہ دونوں علاقے آسانی سے مغلوں کے قبضے میں آگئے۔

جب راجا مان سنگھ بہار آیا تو اس نے گیدھور کے راجا پورنمل اور کھڑگ پور کے راجا سنگرام سنگھ کو زیر کر لیا۔ اس نے گیا کے آنند چیرو کے خلاف اور ان افغانوں کے خلاف جو پورنیا، تاجپور اور دربھنگہ کے اضلاع میں شورش برپا کیے ہوئے تھے ایک مہم روانہ کی اور 89-1588ء میں انھیں زیر کر لیا۔

راجا نے جھارکھنڈ کے راستے اڑیسہ پر حملہ کیا۔ اس زمانے میں اڑیسہ قتلو خاں نوہانی کی سرکردگی میں باغی افغانوں کا مرکز تھا۔ افغان جنگ کے لیے باہر نکل آئے اور رائے پور کے قریب راجا مان سنگھ کے بیٹے جگت سنگھ کو شکست دی۔ اب مان سنگھ آگے بڑھا لیکن قبل اس کے کہ کوئی قطعی فیصلہ ہو قتلو خاں مر گیا۔ خواجہ عیسیٰ نے قتلو کے لڑکے نصیر کو جانشین بنایا لیکن 1590ء میں افغانوں کو جب یہ احساس ہوا کہ ان کی طاقت کمزور ہے تو انھوں نے یہی فیصلہ کیا کہ اطاعت قبول کر لیں اور اکبر کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کر دیں۔

شہنشاہ نے راجا مان سنگھ کے اس معاہدے کو جو اس نے افغانوں کے ساتھ کیا تھا بڑی بے دلی سے منظور کیا کیوں کہ اکبر اپنا اثر و رسوخ اور طاقت دکن میں بڑھانا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے اڑیسہ کلیدی اہمیت کا حامل تھا۔ جب تک قتلو کا وکیل خواجہ عیسیٰ زندہ رہا اس معاہدے کا احترام کیا گیا۔ اس کی موت کے بعد افغان سرکشی پر آمادہ ہو گئے۔ انھوں نے جگن ناتھ کے مندر کی بے حرمتی کی اور اسے لوٹ لیا۔ باغیوں نے بشن گڑھ (وشنو پور) کے راجا ہمیر کے علاقے کو بھی جو کہ مغلوں کا دوست تھا غارتگری کا نشانہ بنایا۔

چنانچہ مان سنگھ نے 1591ء میں بہار اور بنگال دونوں سمتوں سے افغانوں پر حملہ کر دیا۔ بنگال کے حکمراں سعید خاں نے پرجوش مدد نہ کی اور نہ پوری طرح مغلوں کا

ساتھ دیا۔ چنانچہ جنگ کا سارا بوجھ بہار کی فوج پر آپڑا۔ مان سنگھ نے بینا پور یا مالنا پور کے مقام پر جو کہ دریائے سوبرن ریکھا کے شمالی ساحل پر جو جلیسر سے کوئی دس بارہ میل کے فاصلے پر ہے افغانوں سے جنگ چھیڑ دی۔ یہ جنگ بڑی خون آشام ثابت ہوئی اور فتح مغلوں کو ہی نصیب ہوئی۔ 1592ء میں مغلوں نے کٹک اور سارن گڑھ پر قبضہ کر لیا اور وسیع علاقے ان کے قبضے میں آ گئے۔

بنگالی سرکشوں کا حلقۂ عمل صرف سنارگاؤں اور ست گاؤں تک ہی محدود نہ تھا ماگھ کے حکمراں اور بعض زمیندار بھی ان کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ ان کی طاقت کا راز بحری بیڑے اور دریائی لڑائیوں میں پوشیدہ تھا۔ مغل بھی ہارتے جیتتے ان پر زور ڈالتے رہے۔ آخرکار بکرم پور کی جنگ میں مان سنگھ نے باغیوں پر کاری ضرب لگائی۔ کیدار رائے بے حد زخمی ہوا اور مر گیا۔

ماگھ کے سردار نے جب اس کا اندازہ لگا لیا کہ مغلوں کا مقابلہ کرنا بے سود ہے تو وہ ستمبر۔ اکتوبر 1603ء میں اپنے علاقے میں واپس چلا گیا اور عثمان اپنے افغان ساتھیوں کے ہمراہ اکیلا رہ گیا۔ اب افغانوں کی مخالفت کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ مان سنگھ ڈھاکہ چلا گیا اور شہنشاہ کو اطلاع بھیج دی کہ بنگال کا معاملہ عملی طور پر فیصل ہو چکا ہے۔ اکبر اس خبر سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے فوراً مان سنگھ کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور اس کو ہفت ہزار ذات اور شش ہزار سوار کا منصب عطا کیا جو کہ ایک بے نظیر اعزاز تھا۔

شہنشاہ اس بات سے خوش نہ تھا کہ مان سنگھ نے کھاروا کے راجا کے ساتھ جس نے مغلوں کا اقتدار تسلیم کر لیا تھا بہت ہی سختی کا برتاؤ کیا۔ چنانچہ اس نے مان سنگھ سے کہا کہ وہ اس معاملے میں ڈھیل دے۔ مان سنگھ نے راجا کے علاقے سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں۔ راجا نے مان سنگھ کو خوش کرنے کے لیے اپنی لڑکی اس سے بیاہ دی۔

بعض سرکردہ افغان سردار مثلاً قتلو کے بھتیجے سلیمان و عثمان اڑیسہ سے ہٹا دیے گئے، اور ان کو مشرقی بنگال میں جاگیریں دے دی گئیں۔ انھوں نے اس بات کو قطعاً پسند نہ کیا لیکن جب ان کو کیمپ میں بلایا گیا تو حالات اور بھی نازک ہو گئے۔ انھوں نے جانے سے

انکار کردیا اور کھلم کھلا بغاوت پر کمربستہ ہو گئے۔
شورش پسندوں نے مغل افسروں کو مار بھگایا۔ مغل افواج اتنی تعداد میں نہ تھی کہ افغانوں کے اُبلتے ہوئے باغیانہ جوش کو دبا سکے۔ چنانچہ شورش ست گاوُں تک پھیل گئی۔

ضلع ڈھاکہ کے طاقت ور زمیندار عیسیٰ نے بھی باغیوں کی مدد کی اور بنگال سے مان سنگھ کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر انھوں نے اپنی طاقت کو اور بھی مضبوط کرلیا اکبر نے مان سنگھ کو افغان بغاوت کی سرکوبی کے لیے پھر روانہ کیا۔ مان سنگھ گھوڑا گھاٹ تک آیا لیکن وہاں پہنچ کر بیمار ہوگیا۔ چنانچہ افغانوں نے عیسیٰ خاں اور معصوم خاں کابلی کی سرکردگی میں بہت زور پکڑلیا۔ 1596ء میں مان سنگھ میدان میں پہنچا اور باغیوں کو مار بھگایا۔

1596ء میں مان سنگھ اپنی اس کوشش میں کہ کوچ بہار کا راجا لچھمی نارائن شہنشاہ کے اقتدار کو تسلیم کرے کامیاب ہوگیا۔ لیکن عیسیٰ خاں نے فوراً ہی لچھمی نارائن کے ایک رشتے کے بھائی اور اس کے رقیب رگھو دیو کی پُشت پناہی شروع کردی اور اس کی مدد کے لیے روانہ ہوگیا۔
مان سنگھ نے اپنے بیٹے دُرجن سنگھ کو روانہ کیا تاکہ وہ دشمنوں کو آپس میں ملنے سے روک دے لیکن عیسیٰ خاں اور معصوم خاں نے مل کر 1597ء میں دُرجن سنگھ کو شکست دی اور وہ مارا گیا۔ آخر میں عیسیٰ خاں نے مغلوں سے صلح کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

مئی 1598ء میں معصوم کابلی مرگیا اور اگلے سال عیسیٰ خاں بھی راہیِ مُلکِ عدم ہوا۔ ان دونوں کی موت سے جنوبی بنگال میں افغانوں کی طاقت کمزور ہوگئی۔ مان سنگھ کو دربار میں واپس بلا لیا گیا اور بنگال میں اس کا نوجوان لڑکا مہا سنگھ اپنے باپ کے نام سے حکومت کرنے لگا۔ مہا سنگھ کے کمزور انتظام حکومت کے سبب عثمان خاں اور سجاول خاں کی ہمت بڑھی اور انھوں نے شورش پھیلانا شروع کردی۔
مئی 1600ء میں جو فوج افغانوں کی سرکوبی کے لیے بھیجی گئی وہ بھدرک کے مقام پر خونریز جنگ کے بعد شکست کھا گئی اور مغل فوج کا بخشی بھی قید کرلیا گیا۔ مان سنگھ

اس وقت شہزادہ سلیم کے ہمراہ میواڑ میں تھا۔ وہ یہ خبر سن کر تیزی سے بنگال کی طرف روانہ ہوا۔ افغانوں نے شیرپور عطائی کے قریب اس کا مقابلہ کیا لیکن وہ اس جنگ میں 1601ء میں ہار گئے۔ تورانی سرکش مظفر خاں اور معصوم خان کابلی کے لڑکے نے اطاعت قبول کر لی۔

اب مان سنگھ نے ڈھاکہ کو اپنا مرکز بنایا اور زمینداروں کو اپنی طرف ملانے کا کام شروع کر دیا۔ مان سنگھ نے مفتوحہ علاقے کو پوری طرح سلطنت میں شامل کر لیا اور 1602ء میں داؤد و سلیمان کو سنار گاؤں کی طرف بھگا دیا۔

باب 15

دکن

جس زمانے میں اکبر اپنی سلطنت مضبوط کر رہا تھا اور شمال مغربی سرحد کے دفاعی انتظامات کو ایک مستقل شکل دے رہا تھا اُس وقت بھی وہ دکن میں واقع ہونے والے سیاسی اور مذہبی واقعات سے بے خبر نہ تھا۔ بظاہر وندھیا کی پہاڑیاں شمال کو جنوب سے جدا کرتی ہیں لیکن تمدن، تجارت اور سیاست ان موانعات کو بآسانی عبور کر چکی تھیں۔ مدون تاریخ کے قدیم ترین دور سے ملک کے یہ دونوں حصے اپنی سیاسی تنظیموں میں اختلافات کے باوجود آپس میں روابط اور تعلقات بڑھاتے رہے۔ شہنشاہی حکومتوں کا اثر تو ایک طرف رہا صوبجاتی حکومتیں بھی تاریخ ہند کے ترکی دور کے ماقبل و مابعد علٰحدگی پسندانہ سیاست کو بروئے کار نہ لاسکیں۔

گجرات، مالوہ اور اڑیسہ کی ریاستیں ہمیشہ جنوبی ہند کی سیاست کے بھنور میں پھنسی رہیں۔ اگر مغل سلطنت جو ان ریاستوں کی جانشین تھی خود کو اس سیاست سے علٰحدہ رکھ سکتی تو یہ بات کسی معجزے سے کم نہ ہوتی۔ مختلف قسم کے مسائل اُٹھ کھڑے ہوتے جن کا تعلق ریاستوں کی حد بندی، اثر و رسوخ، تجارت، لوگوں کی مہاجرت، مذہبی سیاست اور دوسرے امور سے ہوتا اور ان کو از سر نو حل کرنا پڑتا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمال کی قسمت جنوب سے وابستہ رہی ہے اور ممکن ہے کہ یہی وجہ ہو کہ قدرت نے ہندوستان کو ایک مضبوط اکائی کی شکل میں بنایا ہے۔ ان دو

منطقوں کے تعلقات کا مسئلہ محض ان ہی خطوط کی رہنمائی میں حل ہو سکتا ہے جو قدرت نے مقرر کر دی ہیں اور اس میں کسی زمانے کے سیاسی حالات کی خصوصیات کو کوئی دخل نہیں۔

پندرھویں صدی کے اختتام کے ساتھ بہمنی خاندان کے زوال کا آغاز ہوا اور ہندوستان کے جنوبی ساحل پر پرتگالیوں کی آمد شروع ہو گئی۔ بابر کو بہمنی خاندان کے تجدید استحکام کی دعوت دی گئی لیکن بابر اس کو انجام نہ دے سکا۔ ہمایوں اور شیر شاہ بلا شبہ اپنے اپنے ڈھنگ سے دکن میں ہونے والے واقعات کی طرف متوجہ رہے لیکن ان کو حالات نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ دکن کے معاملات میں کوئی عملی حصہ لیتے یہاں تک کہ اکبر بھی اس وقت تک بیٹھا ہی رہا جب تک کہ گجرات فتح نہ ہو گیا۔ مالوہ اور گجرات کی فتح کے بعد ہی اکبر نے دکن کی سیاست میں عملی دلچسپی لینا شروع کی۔

1560ء میں وجے نگر اور بیجاپور کی حکومتوں نے مل کر حکومت احمد نگر کو شکست دی جو اُس وقت ایک طاقت ور ریاست تھی اور اس پر بہت ہی شرمناک شرائط عائد کی گئیں۔ اکبر نے 1561ء میں مالوہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا اسے وجے نگر کی بڑھتی ہوئی طاقت پر جو کہ اس کی سلطنت کی سرحدوں سے بہت قریب آ چکی تھی تشویش پیدا ہوئی۔ اکبر کی خوش قسمتی سے ایک طرف تو وجے نگر کی قسمت پر جنوری 1565ء میں تالی کوٹا کے مقام پر مہر ثبت ہو گئی تھی اور دوسری طرف اس کی طاقت راجپوتانہ میں بہت بڑھ گئی۔ اکبر نے جس کے قبضے میں راجپوتانہ اور مالوہ دونوں آ چکے تھے۔ 1572ء میں آسانی کے ساتھ گجرات پر فتح حاصل کر لی۔

گجرات سے تعلقات خاندیش کے ساتھ اتنے قریبی تھے کہ خاندیش کے حاکم محمد شاہ دوم نے گجرات پر اپنا حق جتا دیا۔ 1562ء میں جب پیر محمد خاندیش کے علاقے میں داخل ہوا جہاں پر مالوہ کا سابق حکمران باز بہادر پناہ گزیں تھا تو محمد شاہ کی مغلوں سے جھپٹ ہو گئی لیکن یہ مہم ناکام رہی۔

1574ء میں جب احمد نگر کی ریاست میں برار کا علاقہ شامل کر لیا گیا تو خاندیش کے حکمراں کو تشویش ہوئی۔ ممکن ہے بیجاپور اور گولکنڈہ والوں نے بھی اکبر کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہو۔ خاندیش کا حاکم محمد شاہ دوم برار کی حکومت کے ایک مدعی کی مدد کے لیے

روانہ ہوا لیکن شکست کھائی۔ برہان پور کو لوٹ لیا گیا اور اسیر گڑھ کا محاصرہ کر لیا مرتضیٰ نظام شاہ کی فوج مغلوں کی سرحد کے قریب پہنچ گئی۔ اس کی نقل و حرکت سے اکبر قطعی بے خبر نہ تھا 1577ء میں اکبر دریائے نربدا کے کنارے خیمہ زن ہوا جب کہ نظام شاہ کی افواج برار کی سرحد پر تعینات تھیں۔ احمد نگر کی فوج کے افسروں میں سے ایک افسر مظفر حسین مرزا بھی تھا جو کہ مغل سلطنت کا مفرور باغی تھا۔ نظام کے امرا نے اس کو یہ عاقلانہ مشورہ دیا کہ مرزا کو وہاں سے ہٹا دیا جائے اور اس طرح سے شہنشاہ کی تشویش کو ختم کر دیا جائے لیکن حالات میں اتنا تناؤ پیدا ہو گیا کہ خاندیش کے حاکم محمد شاہ نے بھی ایک مضبوط فوج نظام کے ہاتھ مستحکم کرنے کے لیے دولت آباد روانہ کی۔ چونکہ ابھی اکبر کے دماغ میں دوسری تجاویز زیر غور تھیں اس لیے اس نے دکن کی ریاستوں کے فوجی مظاہرات سے چشم پوشی اختیار کی اور اپنا پڑاؤ اٹھا کر شمال کو واپس چلا گیا۔ بحران وقتی طور پر ٹل گیا لیکن جلد ہی دکن کے مسئلے نے اپنی ساری پیچیدگیوں کے ساتھ اکبر کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔

1577ء میں محمد شاہ دوم فوت ہو گیا۔ کچھ وقفے کے بعد راجا علی خاں (عادل شاہ چہارم) اس کا جانشین ہوا۔ اکبر نے ایک فوج عادل شاہ سے خراج وصول کرنے بھیجی۔ مرتضیٰ نظام نے پوری فوجی مدد دینے کا وعدہ کرتے ہوئے اس پر زور ڈالا کہ وہ خراج ادا کرنے سے انکار کر دے۔ لیکن راجا علی خاں مرتضیٰ نظام کی روش سے جو اس نے برار اور بیدر جیسی چھوٹی ریاستوں کے ساتھ روا رکھی تھی پوری طرح آگاہ تھا لہٰذا اس کو اپنے مستقبل کی طرف سے تشویش ہوئی اور اس نے خراج ادا کر کے مظفر حسین خاں کو بھی مغلوں کے سپرد کر دیا اور اس طرح وہ مغلوں کا طرف دار ہو گیا۔ یہ کامیابی مغلوں کی سیاست دکن کا پہلا سنگ میل تھی۔

ریاست خاندیش گجرات اور دکن کی ریاستوں کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتی تھی۔ اسی وجہ سے مغل حکومت اس کے ساتھ دوستی کو بڑی اہمیت دیتی تھی کیوں کہ اس سے گجرات اور مالوہ کا مضبوط دفاع ممکن تھا۔ نیز اس دوستی کا فائدہ یہ بھی تھا کہ اگر ضرورت ہوئی تو خاندیش کو دکن میں آگے بڑھنے کے لیے پہلی سیڑھی کے بطور استعمال کیا جا سکتا تھا۔ راجا علی خاں قدرتی طور پر دکن کا ہمدرد تھا لیکن احمد نگر و بیجاپور کی ریاستوں نے اپنی سلطنتوں کی توسیع کے لیے جو تشدد آمیز طریقہ اختیار کر رکھا تھا اس کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی ریاستوں

میں خوف و ہراس پیدا ہو گیا تھا۔ خاندیش جو کہ دو مضبوط طاقتوں کے درمیان گھرا ہوا تھا اس نے یہی فیصلہ کیا کہ نسبتاً مضبوط تر طاقت کا ساتھ دے۔

زیادہ وقت نہ گزرنے پایا تھا کہ دکن کی سیاست میں ایسی تبدیلی آئی جو مغلوں کی مرضی کے مطابق تھی۔ مرتضیٰ کی ایک خوب صورت نوجوان سے دل بستگی کی وجہ سے اس کی ریاست میں شورش و بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی۔ چنگیز خاں نے مرتضیٰ کے بھائی برہان الدین کو اپنی قید سے آزاد کر دیا اور تخت نشینی کے لیے اس کے حق کی تائید کرنی شروع کر دی۔

1670ء میں برہان الدین کو شکست ہوئی اور اِدھر اُدھر گھومتے پھرنے کے بعد آخرکار وہ 1588ء میں اکبر کے دربار میں پناہ گزین ہوا جہاں اس کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کیا گیا۔ ادھر 1580ء میں بیجاپور کا حکمران علی عادل قتل ہو گیا اور اس کے بجائے ابراہیم کو جو کہ نو سالہ لڑکا تھا تخت پر بٹھا دیا گیا۔

مرتضیٰ نظام شاہ کے دل میں غرض غالب آئی۔ اس نے گولکنڈہ کے قطب شاہ کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ بیجاپور پر حملہ کرنے میں اس کی مدد کرے۔ حملہ آور فوج کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ بیجاپور کی فوج بہت مضبوط تھی بلکہ اصل وجہ خود حملہ آوروں کے درمیان حسد اور غداری تھی۔ بیجاپور کے حالات روز بروز ابتر ہوتے گئے۔ مذہبی تعصب اور شیعوں کی ایذا رسانی نے حالات کو مزید پیچیدہ کر دیا۔

اسی وقت جب کہ بیجاپور کے حالات ابتر ہو رہے تھے۔ احمد نگر کے واقعات میں بھی خرابی ہونے لگی۔ مرتضیٰ نظام شاہ بتدریج پاگل ہو رہا تھا۔ اتنا پاگل کہ اس نے اپنے بیٹے حسین کو زندہ جلا دینا چاہا لیکن معاملہ اُلٹ گیا اور 1588ء میں بیٹے نے باپ کو اُبال کر مار ڈالا۔ حسین ناقابل برداشت حد تک خونخوار اور بد اخلاق تھا اپریل 1589ء میں اس کو تخت سے اتار کر قتل کر دیا گیا اور اس کا چچیرا بھائی اسمٰعیل پسر برہان الدین تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اسمٰعیل کے حامیوں کا سردار جمال خاں کٹر مہدوی تھا۔ اس نے مہدویت کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دیا، شیعہ و سنی دونوں کو بے دریغ اذیت پہنچائی اور غیر ملکیوں کو ریاست سے باہر نکال دیا۔

اس وقت مغل سلطنت کے صوبوں کی سرحدوں کے قریب جو سیاسی انتشار اور بدنما مذہبی و نسلی فسادات و شدید اذیت رسانی کی وارداتیں عمل میں آ رہی تھیں

وہ اکبر کی سیاست اور اس کے منصوبوں کے لیے ایک کھلے چیلنج کی حیثیت رکھتی تھیں اور اس کا امکان تھا کہ مغل صوبے بھی اُن کی زد میں آ جائیں۔

اکبر کا خیال تھا کہ برہان الملک جس کو اکبر نے ہمیشہ نوازا تھا اور جو مغل دربار میں رہ کر اکبر کے طرزِ عمل و طرزِ فکر سے کافی واقفیت حاصل کر چکا تھا۔ وہ نہ صرف مغلوں کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھے گا بلکہ احمد نگر کا انتظام، مغل سلطنت کی سیاست کے نقطۂ نظر کے مطابق چلائے گا۔

چنانچہ اکبر نے برہان کی اس درخواست کو قبول کر لیا کہ احمد نگر کا تخت اس کے لڑکے سے واپس دلوانے میں اس کی مدد کی جائے اور مالوہ کے صوبے دار عزیز کوکا کو حکم ملا کہ برہان کی مدد کے لیے مناسب اقدامات کیے جائیں۔

مالوہ پہنچ کر برہان نے عزیز کوکا سے درخواست کی کہ وہ اس کو ایک مختصر دستے کے ہمراہ آگے بڑھنے کی اجازت دے تاکہ احمد نگر کے لوگوں کے دلوں میں یہ شک پیدا نہ ہو کہ وہ غیر ملکی فوج کے بل بوتے پر ان کو مغلوب کرنے آیا ہے۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ ایک بڑی غیر ملکی فوج کی موجودگی ایک منظم مخالفت اور پیچیدگیوں میں اضافے کا سبب بن جائے گی۔ عزیز نے یہ تجویز مان لی اور آگے نہ بڑھا۔

برہان الملک برار میں داخل ہوا لیکن بجائے اس کے کہ لوگ اس کا استقبال کرتے اس کو سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ناکام ہو کر راجا علی خاں کی طرف مدد کے لیے بھاگا۔ راجا علی خاں نے پہلے ہی بیجاپور کے حکمران کو احمد نگر پر چڑھائی کرنے کے لیے راضی کر لیا تھا۔ احمد نگر کی فوج کا سپہ سالار جمال خاں بیجاپور کی فوج پر ٹوٹ پڑا اور اس کو شکست دی۔ اب وہ خاندیش کی طرف بڑھا لیکن مئی ۱۵۹۱ء میں روشن گمیدا کے مقام پر شکست کھائی اور قتل ہو گیا۔ برہان احمد نگر کے تخت پر برہان نظام شاہ کا لقب اختیار کر کے بیٹھ گیا۔ اب احمد نگر میں شیعوں نے ظلم و تشدد کا بازار از سرِ نو گرم کر دیا اور اس مرتبہ مہدویوں کو سخت ایذائیں پہنچائی گئیں۔

چونکہ برہان کو خاندیش کے حکمراں کی مدد سے تخت ملا تھا اور اس میں مغلوں کا کوئی براہِ راست دخل نہ تھا لہٰذا وہ خود کو کسی طرح اکبر کا ممنونِ احسان نہ سمجھتا تھا چنانچہ اس نے اکبر اور اس کی سیاست کو نظر انداز کرتے ہوئے آزادی کے ساتھ حکومت

شروع کردی۔ برہان کی تخت نشینی سے دکن کے حالات یا خود اس کی حکومت کے
انتظام میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کے برخلاف برہان عیش و عشرت میں اس حد تک
غرق ہو گیا کہ امرا کی بیویوں اور لڑکیوں کی عزت بھی محفوظ نہ تھی۔ پرتگالیوں سے شکست
کھانے کے بعد بھی ابراہیم عادل شاہ کے چھوٹے بھائی اسمٰعیل کی حمایت میں حکومت بیجاپور
سے نبرد آزما ہو گیا۔

اس دفعہ بھی اس کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کی شکست نے مہدویوں کو
ترغیب دی کہ اس کو تخت سے اتارنے اور غیر ملکیوں کو قتل کرنے کا منصوبہ بنائیں۔ اگرچہ
باغیوں کو شکست ہوئی مگر ریاست میں ہیجان باقی رہا۔ برہان الدین اپریل 1595ء میں
فوت ہو گیا۔

راجا علی خاں کا رویہ پوری طرح واضح نہ تھا۔ اس نے 1585ء میں جو روش
اختیار کی اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ وہ بحران کے وقت غداری بھی کر سکتا تھا۔ برہان نظام
کی مدد کے سلسلے میں اس نے جو طرز اختیار کیا اس کی وجہ سے اس کے دل میں آسانی
سے یہ مغرورانہ احساس پیدا ہو سکتا تھا کہ وہ بادشاہ گر ہے۔ اگر اکبر احمد نگر یا کسی
اور دکنی ریاست پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنا چاہتا تو وہ برہان کی مدد اور حمایت پر پوری
طرح اطمینان نہ کر سکتا تھا

اکبر کے خیال میں ایک اور اہم بات تھی۔ پرتگالیوں کے معاملے میں وہ اس نتیجے
پر پہنچا تھا کہ ان لوگوں نے ہندوستان میں جو قدم اٹھائے ہیں ان کو اکھاڑنا بہت مشکل
ہے۔ اکبر پرتگالیوں کے اس رویّے سے بہت آزردہ تھا جو انھوں نے بحرِ عرب میں روا رکھا
تھا اور ان کی کارروائیوں سے فکر مند تھا کہ وہ ہندوستانی جہاز رانی میں مداخلت کرتے،
مذہبی معاملات میں تعصب برتتے، لوگوں کو تکلیفیں پہنچاتے اور تبدیلیِ مذہب پر مجبور
کرتے۔ وہ اس بات کا خواہاں تھا کہ ان لوگوں کو کم از کم بحرِ عرب سے نکال باہر کرے
دکن کی ریاستوں نے پرتگالیوں کو زیر کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی ساری کوششیں
ناکام ہوئیں۔ 1569-70ء میں احمد نگر، بیجاپور اور زمورین نے متحدہ کوشش کی جو بے کار ثابت
ہوئی۔ 1580ء میں بیجاپور کے سلطان کو گوا پرتگالیوں کو دینا پڑا اور وہاں کے سارے
مسلمان مرد، عورت اور بچے قتل کر دیے گئے۔ احمد نگر پرتگالیوں کے ساتھ جارحانہ اور

دفاعی جنگی معاہدہ کر چکا تھا۔ جب 1592ء میں برہان نظام کا چول پر حملہ بہت شرمناک طریقے پر ناکام ہوا تو اکبر کے شبہات اور پختہ ہو گئے۔

گجرات کے حکمرانوں کے تجربے بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ پرتگالیوں نے 1509ء میں مصریوں اور گجراتیوں کے متحدہ بحری بیڑے کو اس وقت قطعی شکست دی جب کہ گجرات محمود بیگڑھ کے زمانے میں اپنی طاقت کے عروج پر پہنچ چکا تھا۔

1530ء میں ان لوگوں نے بغیر کسی چھیڑ چھاڑ کے رندیر اور سورت کے آباد اور مرفہ الحال شہروں کو لوٹا اور جلا دیا۔ اگلے سال انھوں نے دیو پر چھاپہ مارا اور اس جزیرے پر رہنے والے ہر شخص کو قتل کر دیا۔ گجرات کے حکمران اور یمن کے امیر مصطفیٰ کی مشترکہ کوششوں کے بعد بندرگاہ بڑی مشکل سے بچ سکا اور انھوں نے اس کی پاداش میں بہت سی بندرگاہوں کو آگ لگا دی۔ پرتگالیوں نے بہادر کی بدقسمتی سے پورا فائدہ اٹھا کر اس بات پر مجبور کر دیا کہ 35-1534ء میں بسین ان کے سپرد کر دے اور دیو کے مقام پر قلعہ بنانے کی اجازت دے دے۔

عثمانی سلطان سلیمان (1551-54ء) کے بحری بیڑے کو زبردست شکست دے کر پرتگالیوں کے حوصلے اور بڑھ گئے۔ 1558ء میں انھوں نے جھوٹے وعدے کر کے دمن کی بندرگاہ حاصل کر لی اور اس پر قابض رہے۔ جب اکبر نے گجرات پر قبضہ کر لیا تو اس نے دیکھا کہ پرتگالی ہندوستان کے مغربی ساحل پر بہت ہی مضبوطی سے حاکم و قابض ہیں۔ بعض واقعات نے یہ بات قطعی طور پر واضح کر دی کہ پرتگالیوں کا فتنہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان لوگوں نے 1575ء میں جب شہنشاہ کی چچی اور دوسری شاہی بیگمات زیارت مکہ کے لیے جا رہی تھیں بہت سی الجھنیں پیدا کیں۔ 1582ء میں دمن کو واپس لینے کی مہم کو ناکام بنا دیا اور سورت پر بھی دست درازی کی جو محض مغل فوج کی بروقت مداخلت کے سبب ناکام ہو سکی۔

اگر اکبر پرتگالیوں سے نبٹنے کے لیے ایک مضبوط بحری فوج تیار کر سکتا تو وہ ضرور کوشش کرتا لیکن متعدد وجوہ کی بنا پر یہ کام انجام نہ پا سکا۔ اس کے سامنے دوسرا راستہ یہ تھا کہ اپنی اور دکن کی ریاستوں کے وسائل کو جمع کر کے بہت ہی منظم اور متحدہ طریقے پر پورے مغربی ساحل پر کارروائی شروع کی جائے۔ اس قسم کی کوشش کے لیے ضروری تھا کہ

دکن کی ریاستیں پوری طرح مدد دیں بلکہ بہتر یہ ہوتا کہ وہ اکبر کی قیادت عظمیٰ کو مان لیں۔

یہ بات بالکل واضح تھی کہ دکن کے سلسلے میں سلطنت مغلیہ ایک بہت سوچا اور سمجھا ہوا طریقہ اختیار کرے۔ اکبر یہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کی آپس میں جھگڑنے والی ریاستوں کے درمیان امن و صلح برقرار ہو، سارے ملک میں ایک سوچا سمجھا اور یکساں طرز حکومت قائم ہو، مختلف العقیدہ فرقوں کے درمیان مذہبی رواداری اور تہذیبی مفاہمت پیدا ہو اور ملک کی خارجہ پالیسی مضبوط ہو۔ اس کے ان ہی خیالات نے اس کو دکن کا راستہ دکھایا دکن کے معاملے میں اکبر کی پالیسی محض ذاتی خواہشات یا ملک گیری کی علامت نہیں کہی جاسکتی اس کے برخلاف اس کو ایک عظیم بادشاہ کی روشن خیالی سمجھنا چاہیے۔

اکبر نے فتح گجرات کے کچھ ہی عرصے بعد دکن کی ریاستوں کے ساتھ گہرے تعلقات قائم کرنا شروع کر دیا۔ 1573ء میں اس نے میر حسن کو احمد نگر کے حکمراں کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ وہ محمد حسین مرزا کو اس کے سپرد کر دے۔ اس درخواست کو نامنظور کر دیا گیا 1577ء میں نظام کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کیے گئے۔ دو سال بعد بیجاپور اور گولکنڈہ کو سفیر بھیجے گئے۔ 1586ء میں نظام شاہ اور راجا علی خاں کے پاس ایلچی روانہ کیے گئے اور برار میں فوجی طاقت کا مظاہرہ کیا گیا۔ اگر مغل افسر آپس میں متفق الخیال ہوتے تو یہ مہم ایک پوری جنگ کی شکل اختیار کر لیتی۔

دکن کے حکمرانوں کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ مغلوں کے وسائل کافی وسیع ہیں اور گجرات کی شورش میں ہاتھ ڈالنا کوئی عاقلانہ بات نہ ہوگی۔ 1589ء میں اکبر نے برہان الملک کو احمد نگر کا تخت حاصل کرنے میں مدد دی۔ نظام شاہی خاندان کے حالات روز بروز ابتر ہوتے گئے جس سے شہنشاہ کو مایوسی ہوئی۔

چنانچہ 1591ء میں اکبر نے فیضی کو راجا علی خاں کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ وہ اپنی غیر قابل اعتماد پالیسی کے نتائج سے خبردار رہے۔ اکبر نے گولکنڈہ اور بیجاپور کو بھی سفیر روانہ کیے تاکہ وہاں کے حکمرانوں کو ترغیب دیں کہ وہ اکبر کا اقتدار اور برتری قبول کر لیں لیکن گولکنڈہ اور بیجاپور کے حکمرانوں نے یہ بات قبول نہ کی اور اکبر کے سفیروں کو شیریں کلمات سے بہلا کر اور تحفے تحائف دے کر واپس کر دیا۔ برہان نظام کا برتاؤ البتہ ناپسندیدہ تھا۔ اس نے شہنشاہ کے ایلچی امین الدین کے ساتھ بہت ہی نازیبا سلوک

گیا۔ ایلچی پر تاجروں کو لوٹنے کا الزام عائد کر کے سرسری طور پر برخاست کر دیا۔ دکن کے ان سب حکمرانوں میں سے محض راجا علی خاں ہی ایسا تھا جس کو دوست سمجھا جا سکتا تھا۔ دکن کے حکمرانوں کو 1592ء میں اڑیسہ کی فتح، شہزادہ مراد کو گجرات کا پہلا صوبیدار مقرر کیا جانا اور شہنشاہ کے داماد شاہ رخ مرزا کو مالوہ کا صوبے دار مقرر کیے جانے سے اکبر کے ارادے کی پختگی کا اندازہ ہونا چاہیے تھا۔

انھوں نے شائد یہ سمجھا کہ اکبر شمالی مغربی سرحد کے معاملات میں بری طرح اُلجھا ہوا ہے لہٰذا دکن میں کسی طولانی مہم کو انجام نہ دے سکے گا۔ وہ اس بات کے لیے تیار نہ تھے کہ کسی کی برتری تسلیم کریں۔ اس کے برخلاف وہ آپس کی بے جا اور بے فائدہ جنگوں، فرقہ وارانہ کش مکش، مذہبی ایذا رسانی، بدنظمی اور عام اخلاقی پستی سے بالکل مطمئن نظر آتے تھے۔ بہمنی سلطنت کی خاکستر پر جو پانچ ریاستیں وجود میں آئیں۔ ان کو غیر ملکی قسمت آزما اور موقع پرست افراد چلا رہے تھے اور یہ لوگ کسی طرح ان ریاستوں کے باشندوں کے قدرتی رہبر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے اسی طرح ان ریاستوں کے حاکموں کا دکن کے لوگوں پر حکومت کرنے کا حق کسی طرح بھی مغلوں کے حق حکومت سے زیادہ نہ تھا اور نہ یہ حکمراں دکن کے لوگوں کی قدرتی حب الوطنی سے کسی قسم کی اخلاقی یا روحانی طاقت، برتری یا قوت حاصل کرنے کا دعویٰ کر سکتے تھے۔

یہ حکمراں اپنی رعایا کے دلوں میں دکن کو پرتگالیوں کے بڑھتے ہوئے خطرے سے محفوظ کرنے کے لیے کسی قسم کا اطمینان یا جذبہ نہ پیدا کر سکتے تھے اور نہ اپنی ریاستوں میں امن وامان برقرار رکھ سکتے تھے۔

برہان نظام شاہ کی موت کے بعد احمد نگر میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ وہاں کا نیا سلطان ابراہیم نظام شاہ جس کو برہان نے نامزد کیا تھا بیکار محض ثابت ہوا۔ وہاں کے امرا دو حصوں میں منقسم ہو گئے۔ ان میں سے ایک گروہ کا سردار میاں منجھو تھا اور دوسرا گروہ اخلاص خاں کے ماتحت ایک افریقی سردار تھا۔

میاں منجھو کی مخالفت کے باوجود امرا نے بیجاپور کے سفیر کی توہین کر کے جنگ مول لے لی۔ میاں منجھو نے آخر تک بیجاپور سے جنگ کرنے سے منع کیا لیکن حبشی سردار کے جنگی گروہ اور ابراہیم نظام نے جنگ کو دعوت دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ احمد نگر کی فوج کو شکست

ہوئی اور ابراہیم جنگ میں کام آیا۔

ابراہیم کی موت سے احمدنگر کی حالت اور بھی ابتر ہوگئی۔ میاں منجھو نے احمد نام کے ایک مجہول النسل آدمی کو تخت پر بٹھادیا۔ ادھر اخلاص خاں نے ایک لڑکے کو بازار میں سے پکڑکر موتی شاہ کا لقب دیا اور اس کی حمایت پر کربستہ ہوگیا۔ ابہنگ خاں نے برہان شاہ اول کے سب سے بڑے لڑکے علی کی حمایت کی۔ دوسری طرف حسین نظام شاہ اول کی بیٹی اور علی عادل شاہ کی بیوہ چاند بی بی نے ابراہیم نظام شاہ کے نابالغ بچے کا ساتھ دیا۔ اس طرح تخت کے چار دعوے دار ہوگئے اور احمدنگر کی سلطنت ایک تباہ کن جنگ میں مبتلا ہوگئی۔

میاں منجھو نے حالات سے مایوس ہوکر شہزادہ مراد، عبدالرحیم خاں خاناں اور صوبے دار مالوہ کو دکن آنے اور امن وامان برقرار کرنے کی دعوت دی۔ چونکہ اکبر نے پہلے ہی سے ان کو تیار رہنے کا حکم دے رکھا تھا لہٰذا فوجوں کی روانگی میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ ادھر راجا علی خاں کو بھی ہدایت دے دی گئی کہ وہ اپنی فوجوں کے ساتھ مغلوں سے آملے۔

جس وقت مغل فوج احمدنگر پہنچی منجھو اپنے حبشی رقیب پر قابو پاچکا تھا اور سیاسی حالات آہستہ آہستہ اس کی مرضی کے مطابق ڈھلتے جارہے تھے۔ اب منجھو اپنی اس حماقت پر بہت پشیمان ہوا کہ اس نے مراد کو کیوں دعوت دی اور احمدنگر کے دفاع کی تیاریاں کرنے لگا۔ اس نے سب فریقوں کو متحد کرنے کے لیے چاند بی بی پر جو پابندیاں عائد کردی گئی تھیں ان کو ہٹادیا اور اس کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے یہ بھی کوشش کی کہ حبشیوں اور دوسرے مخالفوں کو راضی کرکے اپنے ساتھ ملالے۔

میاں منجھو نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے حاکموں سے بات چیت شروع کی اور ان کو یہ ترغیب دی کہ مغلوں کے حملے کا مقابلہ کریں۔ مغلوں سے لڑنے کی خاطر میاں منجھو نے چاند بی بی کو اتالیق مقرر کیا اور خود قلعہ سے باہر نکل گیا۔ بیشتر سرداروں نے اس کا صحیح اندازہ لگایا کہ اگر گولکنڈہ اور بیجاپور کی افواج بروقت نہ پہنچیں تو کامیابی کی امید نہیں کی جاسکتی لہٰذا انھوں نے میاں منجھو پر یہ زور دیا کہ جب تک امدادی فوجیں نہ پہنچ جائیں وہ جنگ کو ٹالتا رہے۔

میاں منجھو نے تو یہ مشورہ قبول کر لیا لیکن چاند بی بی کا خیال تھا کہ بیکار رہنا اور مغلوں کو اس بات کا موقع دینا کہ وہ قلعہ پر دباؤ ڈالتے رہیں عاقلانہ اقدام نہ ہوگا۔ چنانچہ چاند بی بی نے مجاہدالدین شمشیر خاں کو جو ایک ریٹائر شدہ باتجربہ اور لائق افریقی فوجی سردار تھا واپس بلالیا اور اس کو اس بات کے لیے راضی کیا کہ مغلوں کے خلاف موثر دفاعی اور جنگی کارروائیاں کرے۔ بہرحال منجھو اپنے منصوبوں پر قائم رہا اور شمشیر خاں کو احمد نگر کی حفاظت کی ذمے داری سونپ کر خود بیجاپور اور گولکنڈہ کی طرف روانہ ہوگیا تاکہ وہاں سے فوجی امداد جلد سے جلد بھجوا سکے۔ لیکن منجھو نے اس بات کا خیال رکھا کہ احمد نظام شاہ کو اپنے ہمراہ رکھے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میاں منجھو اپنی ضد پر احمد نگر کی مدد کرنے کے لیے قائم نہ تھا بلکہ اس کا یہ عمل باغیانہ اور غدارانہ تھا۔ چاند بی بی اور شمشیر خاں کے اس فیصلے سے کہ جنگ کی جائے بعض افسروں حتیٰ کہ غیر ملکیوں کی ہمت بڑھی اور انھوں نے میاں منجھو کا ساتھ چھوڑ کر شیر دل خاتون کا ساتھ دیا۔

میاں منجھو کا فیصلہ غلط تھا۔ اس نے یا تو انتہائی بزدلی اور یا پھر غداری کے باعث احمقانہ قدم اٹھایا۔ اس بات پر مشکل سے یقین کیا جا سکتا ہے کہ میاں منجھو کو اس کا علم نہ تھا کہ مغل سرداروں کے درمیان اختلافات موجود ہیں۔ اگر وہ ان اختلافات کا فائدہ اٹھاتا اور پورے جوش وخروش سے چاند بی بی کا ساتھ دیتا تو مغلوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

چاند بی بی پر احمد نگر کے دفاع کا پورا بوجھ پڑا اور لوگوں کو متحد کرنے کا مشکل کام تن تنہا انجام دینا پڑا لیکن وہ اس سے گھبرائی نہیں۔ اس نے سب سے پہلے یہ کیا کہ دکن کے سرداروں میں سب سے زیادہ با اثر سردار محمد خاں کی حمایت حاصل کی۔ اس کے بعد اس نے برہان پور کے کوتوال انصار خاں کو علیحدہ کر دیا جو میاں منجھو کا ساتھی تھا اور میاں منجھو نے اس کو قلعہ کی حفاظت کے لیے چھوڑا تھا۔

اب چاند بی بی نے اپنے نابالغ بھتیجے بہادر کے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا اور محمد خاں کی مدد سے خود حکومت کرنا شروع کر دی۔ چاند بی بی نے حبشی جنرل ابھنگ خاں کو مغلوں کی مخالفت پر اکسایا جو ابھی تک برہان نظام شاہ اول کے بیٹے شاہ علی کے

جی حکومت کا طرفدار تھا اور جس کی عمر ستر سال کو پہنچ چکی تھی۔

دسمبر 1595ء کے وسط میں شہزادہ مراد احمد نگر کے قریب آ پہنچا۔ اس نے عوام کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے یہ اعلان کیا کہ کسی قسم کی لوٹ مار نہ ہو۔ رعایا کو کسی قسم کی تکلیف نہ دی جائے اور اس بات کا پورا پورا انتظام کیا جائے کہ شہریوں کی عزت و آبرو اور اُن کے جان و مال کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ لیکن شہباز خاں کے آدمیوں نے یا تو اس کی چشم پوشی سے یا غفلت کے سبب تھوڑی بہت لوٹ مار کی۔

جب شہزادے نے یہ خبر سنی تو وہ غضب ناک ہو گیا اور ان میں سے کئی آدمیوں کو عوام کے سامنے موت کی سزا دی۔ اس لوٹ مار کے نتیجے میں لوگ ہوشیار ہو گئے اور شہزادے کی یقین دہانی کے باوجود بڑی تعداد میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ بہرحال شہزادے نے 16 دسمبر 1595ء کو احمد نگر کے قلعہ کا محاصرہ شروع کر دیا۔ ابتدا میں تو محاصرہ بہت ڈھیلا رہا جس کے سبب ابھنگ خاں نے قلعہ کی مشرقی جانب مغلوں پر یکایک حملہ کیا اور قلعے میں گھستا چلا گیا۔

اس واقعے سے شہزادہ اور بھی ہوشیار ہو گیا۔ قلعہ کو اب ہر طرف سے گھیر لیا گیا اور اس بات کی زبردست کوشش کی گئی کہ خندقوں کو مسمار کر کے قلعہ کی دیوار کے نزدیک پہنچا جائے۔

شہزادہ بہت ہی محنت سے کام کر رہا تھا اور وہ خود اپنا بیشتر وقت خندقوں میں گڑھوں کو پُر کرنے کے کام اور قلعہ کی دیوار کے سامنے ایک برج کی تعمیر کی نگرانی کرنے میں صرف کرتا۔

شہزادے کی اتنی جدوجہد کے باوجود مغلوں کو اطمینان بخش طریقے پر کامیابی حاصل ہوتی ہوئی نظر نہ آتی تھی۔ صادق خاں اور شہباز خاں کے درمیان جو حسد اور رقابت موجود تھی اس کی وجہ سے مغلوں میں نفاق پیدا ہو گیا اور مغل افسروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ قلعہ کی فتح میں جتنی دیر ہوتی جا رہی تھی اتنی ہی احمد نگر کے حامیوں کو متحد ہونے اور ضروری کارروائی کرنے کا موقع ملتا جا رہا تھا۔

ادھر کولی سردار دینکوجی نے دھمکی دی کہ وہ مغلوں کے رسل و رسائل کو گجرات کے ساتھ منقطع کر دے گا۔ سید راجا جس کو دینکوجی سے جنگ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا دشمن سے

جو تعداد میں بہت زیادہ تھے کامیابی سے مقابلہ نہ کرسکا اور مارا گیا۔ چند روز کے بعد سعادت خاں نامی شخص نے ناگہانی حملہ کیا اور گجرات سے آنے والے ایک بڑے خزانے کو لوٹ لیا جو سید عالم کی نگرانی میں مغلوں کے لیے سامانِ رسد اور گولہ بارود لے کر جارہا تھا۔

مغل افسر دولت خاں نے موتی شاہ کے حامی سردار اخلاق خاں کے مقابلے میں جو فتح حاصل کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخلاص خاں اپنے رقیب میاں منجھو سے جاملا جو کہ مغلوں کے خلاف بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر کے امرا کا ایک مضبوط اور متحد محاذ قائم کر رہا تھا۔

شہزادہ مراد کو روز افزوں مخالفت کے علاوہ سامان رسد کی کمی کا بھی سامنا کرنا پڑا جو خوف زدہ رعایا کے فرار ہونے کے باعث اور بھی شدید ہوگئی۔ ادھر شہزادے کے کیمپ میں غداری شروع ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ شہباز خاں و خان خاناں شہزادہ سلیم کے حامی تھے اور وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ احمد نگر کا قلعہ فتح کرکے شہزادہ مراد کے نام میں چار چاند لگ جائیں۔

خواجہ محمد شیرازی نامی ایک ایرانی نے محصور شدگان کو صادق خاں کے توپ خانے کی سرنگ کا پتہ دے دیا۔ خاندیش کا حکمراں راجا علی خاں جس کی ہمدردیاں خفیہ طور پر احمد نگر کے ساتھ تھیں قلعہ میں بوقت ضرورت سامانِ رسد جانے دیتا اور اس سے چشم پوشی کرتا۔

ان تمام پریشانیوں اور کام کی زیادتیوں سے مایوس ہوئے بغیر شہزادہ "صبح سے شام تک کام کی نگرانی کرتا ہوا سارا وقت خندقوں میں گزار دیتا" وہ ابھی تک محاصرہ کو تنگ تر کرنے میں ہمہ تن مصروف تھا کہ یہ خبر ملی کہ میاں منجھو اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا ہے۔ منجھو نے نہ صرف اخلاص خاں کو اپنی طرف ملا لیا بلکہ عادل شاہ دوم کو بھی س بات کے لیے تیار کرلیا کہ وہ پچیس تیس ہزار سواروں کی فوج اپنے لائق سپہ سالار سہیل خاں کی سرکردگی میں روانہ کردے۔

قطب شاہ نے مہدی قلی سلطان کو دس ہزار سوار اور بیس ہزار پیادے دے کر روانہ کیا۔ اب متحدین کی مشترکہ فوج جس کی تعداد ستر ہزار تھی شاہ درگ کے

مقام پر جمع ہوگئی تاکہ قلعہ کو آزاد کرایا جاسکے۔ ان حالات میں یہ قرار پایا کہ متحدہ فوج کی آمد سے قبل ہی قلعہ پر زبردست حملہ کردیا جائے اور سُرنگوں میں آگ لگادی جائے۔

خواجہ محمد نے جو خفیہ اطلاع دی تھی اس کے سبب محصورین نے دو سُرنگوں کو خالی کردیا تھا۔ محض ایک ہی سُرنگ پھٹی جس کے سبب قلعہ کی تقریباً پچاس گز دیوار اُڑ گئی۔ مغل جن کو چتوڑ میں کافی تلخ تجربہ ہوچکا تھا۔ دوسری سرنگ کے پھٹنے کا انتظار کرنے لگے۔ محصورین نے اس مہلت سے فائدہ اٹھاکر خود کو حملے پر آمادہ کرلیا۔ جس وقت مغلوں کو یہ پتہ چلا کہ دوسری سرنگ بھی خالی کی جاچکی ہے تو کافی دیر ہوچکی تھی تاہم مغلوں نے اس بات کی جان توڑ کوشش کی کہ قلعہ میں داخل ہوجائیں یہاں تک کہ خندقیں ان کی نعشوں سے پٹ گئیں۔

دوسری طرف سے مدافعین نے بھی ہمت اور بہادری کا مظاہرہ کیا کیونکہ صادق خاں کی طرف سے کوئی حملہ نہ ہوا اس لیے انھوں نے اپنی ساری قوت قلعہ کی ٹوٹی ہوئی دیوار کی حفاظت کے لیے وقف کردی۔ سارے ہی افسر اور سردار جن میں شمشیر خاں، آہنگ خاں اور محمد خاں بھی شامل تھے مغلوں کو اس رخنے سے آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے پہنچ گئے۔ لوگوں میں اتنا جوش و خروش تھا کہ جو لوگ لڑنے کے عادی نہ تھے وہ بھی اس وقت وہاں جا پہنچے۔

اسی لیے بعض غیر ملکی افسروں اور دکن کی ریاستوں کے سفرا کو جو کہ اس وقت قلعہ میں موجود تھے یہ بات سوجھی کہ اگر چاند بی بی کو محاذِ جنگ پر لے آیا جائے تو لوگوں میں اور بھی جوش و خروش پیدا ہوجائے گا۔

جب چاند بی بی کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی تو وہ فوراً راضی ہوگئی۔ چاند بی بی چمکدار زرہ بکتر زیب تن کیے منہ پر نقاب ڈالے ہاتھ میں ننگی تلوار اٹھائے ہاتھی پر سوار میدانِ جنگ میں پہنچ گئی۔ جب سپاہیوں نے ملکہ کو شاہی چتر کے نیچے دیکھا تو ان کی ہمتیں بلند ہوگئیں۔ ملکہ کی موجودگی کی خبر نے بوڑھوں اور لڑکوں میں بھی اس قدر جوش پیدا کردیا کہ وہ بھی قلعہ کی حفاظت کے لیے آپہنچے۔

اب مغل فوج پر توپ کے گولے، بندوقوں کی گولیاں، دستی بم اور تیر اولوں کی طرح برس رہے تھے۔ اگر دوسرے مغل افسر حملہ آور دستے کی مدد کو پہنچ جاتے تو ممکن تھا

مغل کامیاب ہوجاتے لیکن سرنگوں کے نہ پھٹنے اور قلعہ کی فصیلوں سے برسنے والی آگ نے ان کو اپنی پوری کوشش صرف کرنے سے باز رکھا۔ چار گھنٹے تک گھمسان کی لڑائی جاری رہی۔ حملہ آور فوج کو زبردست نقصان اٹھاکر واپس لوٹنا پڑا۔ چاند سلطانہ ٹوٹی دیوار کی مرمّت ہونے تک وہیں موجود رہی۔

شہزادہ مراد کو بہت مایوسی ہوئی لیکن اس نے ہمّت نہ ہاری۔ اگلے روز اُس نے اپنی فوج کو پھر صف آرا کرکے خود قیادت کا فیصلہ کیا۔ اس نے خان خاناں سے مدد کی درخواست کی لیکن اس نے بہانہ بازی سے کام لیا۔ شہزادے نے ہمّت ہارے بغیر گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ جونہی اس نے کھائی میں اترنا چاہا اس کے بہی خواہوں نے اس کے گھوڑے کی لگام پکڑلی۔ وہ گھوڑے پرسے کود پڑا اور احدی دستے کو جوکہ فوج کے بہترین جنگجو اور شاہی محافظتی دستہ سمجھے جاتے تھے حملہ کرنے کا حکم دیا۔ کئی مرتبہ پوری طاقت کے ساتھ حملہ کیا گیا لیکن مدافعین نے جن کے حوصلے پچھلے روز کی کامیابی کے سبب بڑھ گئے تھے آتش باری شروع کردی۔ مغلوں نے جہاں تک ممکن تھا شجاعت و بہادری کا مظاہرہ کیا۔ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک لڑتے رہے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ان کے وار آہنی دیوار پر لگ رہے ہوں۔ آخرکار مغل فوج بہت زیادہ نقصان اٹھا کر واپس لوٹ گئی۔

مغل بہت مایوس ہوئے۔ وہ جنگ کے طول پکڑنے کے سبب بہت پریشان تھے۔ رسل ورسائل کی کمیابی روز بروز شدّت اختیار کرتی جارہی تھی اور یہ خبریں زور پکڑ رہی تھیں کہ مخالفین کی متحدہ فوج جلد ہی آنے والی ہے۔ مدافعین بھی اس بات کے مشتاق تھے کہ معاملہ فیصل ہوجائے کیوں کہ انھوں نے مغل فوج کو اچھی طرح پرکھ لیا تھا اور یہ سمجھ گئے تھے کہ قلعہ کو فتح نہ کرسکنے کے باوجود ان کے وسائل بہت وسیع ہیں۔ اس کے علاوہ قلعہ کے اندر بھی سامان رسد ختم ہورہا تھا اور قحط وفاقہ کشی کا خطرہ تھا۔

چاند سلطانہ کو میاں منجھو کی نیت پر شک ہونے لگا جو گولکنڈہ اور بیجاپور سے فوجیں لے کر آرہا تھا۔ چاند سلطانہ یہ نہ چاہتی تھی کہ ابراہیم شاہ کے بیٹے بہادر کا حق احمد نگر کے تخت پر کسی طرح خطرے میں پڑجائے۔ آخرکار بات چیت شروع ہوگئی۔ برار اور دولت آباد کے علاقہ جات کی سپردگی کے سوال پر حجت ہونے لگی۔ صادق خاں اس کے لیے اَڑا ہوا تھا۔

چاند بی بی پریشان تھی اور اس نے اپنے سفیر افضل خاں کو لکھ بھیجا کہ حتی الامکان جلد از جلد صلح کی کوشش کرے۔" چونکہ اس کے سپاہی مزید تحمل نہ کر سکتے تھے۔ رسد کے نہ پہنچنے کے سبب فوج کے بیشتر حصے نے یہ فیصلہ کیا کہ قلعہ کی دیوار سے کود کر وہ مغلوں کے کیمپ میں چلے جائیں۔

آخر کار اعلیٰ مغل افسروں کو بیش قیمت تحائف، سیم و زر کی فراخدلانہ تقسیم اور برار کے علاقے کی سپردگی کے وعدے پر فیصلہ ہوگیا۔ مغلوں نے دولت آباد کا مطالبہ ترک کردیا اور 20 مارچ 1596ء کو بہادر کو مغل شہنشاہ کے زیر اقتدار احمد نگر کا حکمران تسلیم کرلیا گیا۔

مغلوں کی واپسی کے بعد محمد خاں نے ساری طاقت اپنے ہاتھوں میں سمیٹ لی اور بہادر نظام شاہ احمد نگر کا نام نہاد بادشاہ تسلیم کرلیا گیا۔ میاں منجھو اپنے امیدوار احمد کے حق کی برابر حمایت کرتا رہا لیکن چاند بی بی کی درخواست پر بیجاپور کے حکمراں کی مداخلت کی وجہ سے اس کی کوششیں ناکام ہوگئیں۔ آخر کار منجھو نے احمد نگر کی سیاست سے دست کشی اختیار کرلی اور بیجاپور میں ملازم ہوگیا۔

ابتدا میں چاند بی بی کو محمد خاں پر پورا اعتماد تھا لیکن جب اس نے آہنگ خاں اور شمشیر خاں کو قید کرلیا اور اعلیٰ عہدوں پر اپنے آدمیوں کو مقرر کرنا شروع کیا تو چاند بی بی کو خطرہ لاحق ہوا اور اس نے پھر بیجاپور سے مدد کی درخواست کی۔ بیجاپور نے سہیل خاں کی سرکردگی میں ایک فوج روانہ کی جس نے احمد نگر کا محاصرہ کرلیا۔

محمد خاں نے انتقاماً مغلوں سے مدد مانگی لیکن اس کے اس اقدام سے مخالفت نے اور شدت اختیار کی اور آخر کار محمد خاں گرفتار کرلیا گیا۔ اس کی جگہ [illegible]ء میں آہنگ خاں کو پیشوا مقرر کیا گیا۔ چاند بی بی اس انتظام سے مطمئن ہوگئی لہٰذا بیجاپور کی فوج کو واپسی کا حکم دے دیا گیا۔

بیجاپوری جنرل سہیل خاں یہ چاہتا تھا کہ کسی قسم کی ہنگامہ آرائی ہو تو مغلوں سے شمشیر آزمائی کرسکے۔ احمد نگر کا نیا وزیر آہنگ خاں بھی اس بات کا خواہاں تھا کہ مغلوں سے برار واپس مل جائے۔

چاند سلطانہ نے مغلوں کو بھڑکانے کی مخالفت کی لیکن وہ اپنی کوششوں میں

کامیاب نہ ہوئی۔ سہیل خاں نے مغلوں کے خلاف یہ الزام تراش کر جھگڑے کا جواز پیدا کر لیا کہ انھوں نے ان علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی ہے جو صلحنامہ میں شامل نہیں ہیں۔ سہیل خاں اُس وقت تک احمد نگر میں رہا جب تک کہ اس کو بیجا پور سے مغلوں کو باہر نکالنے کا حکم نہ مل گیا۔ گولکنڈہ نے بھی مغلوں کے خلاف متحدہ محاذ میں شرکت کر لی اور ایک مشترکہ فوج جس میں تقریباً 60,000 سوار تھے مغلوں سے مقابلہ کرنے کے لیے چل دی۔

مغلوں کو بھی کچھ شکایات تھیں۔ نظام شاہی سرداروں نے برار کا علاقہ امن و آشتی کے ساتھ خالی نہ کیا تھا بلکہ ان میں سے کچھ افسروں نے تو تقریباً دس ہزار آدمیوں کی فوج مغلوں کو پریشان کرنے کے لیے تیار کر لی تھی۔ اس نازک موقع پر شہباز خاں شہزادے کی اجازت کے بغیر مالوہ چلا گیا۔ جس کے سبب مغل فوج کمزور ہو گئی۔ اس کے علاوہ افسروں کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔

جب شہزادے نے مخالفت کو زور پکڑتے دیکھا تو اس نے جنگی مجلس مشاورت طلب کی اور ان سے دریافت کیا کہ کیا روش اختیار کی جائے۔ آخرکار فیصلہ یہی ہوا کہ چاہے جو کچھ بھی ہو میدان سے قدم نہ ہٹائیں۔

بیس ہزار پر مشتمل مغل فوج شاہ رخ مرزا اور خان خاناں کی سرکردگی اور راجا علی خاں کی مدد کے ساتھ دکن کی افواج سے مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھی اور دریائے گوداوری کے جنوبی ساحل پر سون پت میں ڈیرا ڈال دیا۔ 5 فروری 1597ء کو اشٹی کے مقام پر جنگ ہوئی۔ بیجاپور کی افواج نے مغلوں کے ہراول اور میسرہ دستوں کو تتر بتر کر دیا۔ مغلوں کو جو زبردست نقصان ہوا اس میں خاندیش کے حکمراں راجا علی خاں کی موت سب سے اہم تھی لیکن مغل فوج کا قلب اور میمنہ اپنی جگہ جمے رہے اور آخرکار نظام شاہی و قطب شاہی فوجوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ شام کے وقت فوجیں علیحدہ ہو گئیں اور دونوں طرف کے سپہ سالار یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ صحیح حالت کیا ہے۔

دوسرے دن پو پھٹی تو خان خاناں یہ دیکھ کر سخت حیرت زدہ ہوا کہ سہیل خاں اس کی فوج سے تین چار گنا فوج کی سرکردگی میں اس کے سامنے موجود ہے اور فتح کی امید سے اس کا چہرہ دمک رہا ہے۔ مغل مایوسی کی حالت میں جانبازی سے لڑتے رہے اور ان کے مقابلے میں سہیل خاں نے شاندار دلیری دکھائی۔ سہیل بری طرح زخمی ہوا اور گھوڑے

سے گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی بیجاپور کی فوج میں ابتری پھیل گئی اور سپاہی ہیل کو اٹھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مغل چونکہ تھک چکے تھے اس لیے انھوں نے بھاگتے ہوئے دشمن کا پیچھا کیا۔

شہزادہ مراد احمد نگر کی طرف بڑھنے کا خواہش مند تھا لیکن خان خاناں نے موافقت نہ کی اور یہ تجویز پیش کی کہ مہم کو اگلے سال تک کے لیے ملتوی کر دیا جائے۔ کچھ عرصے بعد جنرل صادق خاں جو مراد کا دست راست اور بہترین فوجی افسر تھا فوت ہو گیا۔

صادق خاں کی موت اور خان خاناں کی واپسی کی وجہ سے نظام شاہ نے مغلوں کی بیرونی چوکیوں پر دباؤ قائم رکھا لیکن اس کے باوجود مغلوں نے گاوِل گڑھ، نرنالہ گڑھ کے قلعے 16[illegible]ء میں اور ناسک [illegible]ء میں حاصل کر لیے۔

ب

[illegible] فروری 15[illegible]ء کو عبد اللہ خاں ازبک جس کے نام سے سارا وسط ایشیا کانپتا تھا فوت ہو گیا اور توران میں افراتفری پھیل گئی۔ اس واقعے سے سرحد کے حالات بہتر ہو گئے۔ اس کے علاوہ اکبر نے کشمیر اور کابل سے قندھار، بلوچستان، مکران اور سندھ تک اپنی حالت کو استوار کر کے سرحدوں کو مستحکم بنا لیا تھا اور اب وہ اپنی توجہ دکن کی سیاست کی طرف مبذول کر سکتا تھا جہاں کے حالات بڑے پراگندہ تھے۔

اکبر نے خان خاناں کو واپس بلا لیا۔ اور شہزادہ مراد کی واپسی سے پہلے ہی شاہزادہ دانیال کو بھیج دیا۔

اکبر نے اپنے سب سے زیادہ معتمد و وفادار ابو الفضل کو دکن روانہ کیا تاکہ وہ مراد کو وہاں سے واپس بھیج دے، دکن کے معاملات کو از سر نو منظم کرے اور خود تحقیقات کرنے کے بعد حالات کی تفصیل سے اطلاع دے۔ اسی دوران اس نے خود دکن کا دورہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

ابو الفضل کو دکن پہنچنے پر پہلی بات جو نظر آئی وہ یہ تھی کہ خاندیش کا نیا حکمران بہادر خاں اس بات کے لیے تیار نہ تھا کہ دکن میں مغلوں کی فوجی مہم میں ان کا ساتھ دے دوسری مایوسی شہزادہ مراد کی بیماری اور اس کی وفات سے ہوئی۔ مراد کا لڑکا رستم

نومبر ۱۵۹۸ء میں مر چکا تھا جس کے سبب وہ ہمیشہ غمگین رہتا اور اس غم کو بھلانے کے لیے اس نے اندھا دھند شراب پینا شروع کر دیا۔ کثرتِ شراب نوشی کے سبب اس کو ضعفِ معدہ اور مرگی کے دورے پڑنے لگے لیکن مراد نے اپنی بیماری کی طرف کافی توجہ نہ دی اور شراب نوشی و سیر سیاحت کو جاری رکھا۔

جب اس کو اس بات کا علم ہوا کہ اس کو دکن سے واپس بلایا جا رہا ہے اور ابوالفضل اس کو لے جانے کے لیے آرہا ہے تو وہ اپنی گرتی ہوئی صحت کے باوجود احمد نگر فتح کرنے میں دوبارہ منہمک ہو گیا۔ یکایک اس کی حالت خراب ہو گئی، مرگی کے دوروں نے شدت اختیار کر لی اور ۲ مئی ۱۵۹۹ء کو جب کہ وہ دولت آباد سے ابھی چالیس میل دور ہی تھا بے ہوشی اور ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ اسی حالت میں ختم ہو گیا۔

ان تمام باتوں کے باوجود کہ خاندیش کے نئے حکمراں نے مدد دینے سے انکار کر دیا تھا، شہزادہ مراد کی موت واقع ہو گئی تھی، دکن میں مقیم پرانے افسروں نے خود غرضانہ کاہلی کا مظاہرہ کیا اور روپیہ کم تھا۔

ابوالفضل نے اپنا تن من دکن کی مہم میں لگا دیا۔ اس کی تن دہی اور لگن نے دوسرے افسروں کی ہمت بھی بڑھائی اور وہ بھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ابوالفضل نے ناسک کے سوا اور دوسرے مقامات کے دفاع کا مناسب انتظام کیا جن پر مغل قابض تھے۔ اس نے بیٹر کی حفاظت کے لیے فوجی مدد بھیجی اور اس کو احمد نگر کی افواج سے بچا لیا جو اس پر روز بروز زیادہ دباؤ ڈال رہی تھیں۔ وہاں کے حاکم شیر خواجہ نے بھی بہادری سے احمد نگر کی فوج کا مقابلہ کیا۔

اسی دوران ابوالفضل نے چاند بی بی سے خط و کتابت شروع کر دی اور قابلِ اطمینان جواب پایا۔ ابوالفضل خود بھی احمد نگر جانا چاہتا تھا لیکن اس کو خبر ملی کہ شمشیر خاں برار میں داخل ہو گیا ہے اور شہزادہ دانیال جلد ہی آنے والا ہے لہٰذا اس نے اپنی پیش قدمی روک دی۔

اس وقت مغل دو محاذوں پر سرگرم عمل تھے۔ ایک طرف تو اسیر علی گڑھ کا معاملہ طول کھینچ رہا تھا اور دوسری طرف شہزادہ دانیال نے احمد نگر کے علاقے میں فوجی کارروائی جاری رکھی۔ ان دنوں احمد نگر میں دو حکومتیں تھیں۔ قلعہ میں چاند سلطانہ اپنے بھتیجے

بہادر نظام شاہ کے نام پر حکومت کر رہی تھی۔ قلعہ سے باہر آہنگ خاں کی حکومت تھی۔ آہنگ خاں نے قلعہ پر قبضہ کرنا چاہا لیکن اس کی کوشش بیکار ثابت ہوئی۔

چاند سلطانہ نے ابوالفضل سے خط و کتابت کے دوران یہ تجویز پیش کی کہ اگر اس کو بیٹر پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی جائے تو وہ احمد نگر مغلوں کو سونپ دے گی لیکن یہ معاہدہ اسی وقت نافذ ہوسکتا تھا جب کہ مغل آہنگ خاں کی قوت توڑ کر اس کو درمیان سے ہٹادیں۔

دانیال احمد نگر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ آہنگ خاں نے اس کی پیش قدمی کو جے پور کوٹلے کے درّے میں روکنے کی کوشش کی۔ شہزادے نے اس درّے کو چھوڑ دیا اور دوسرے راستے سے آگے بڑھا۔ آہنگ خاں احمد نگر لوٹ آیا اور اس نے چاند سلطانہ سے مصالحت کرنا چاہی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ آہنگ جنّار کی طرف فرار ہوگیا۔ دانیال احمد نگر پہنچ گیا اور محاصرہ کر لیا۔

چاند سلطانہ کو قدرتاً اس بات میں شک تھا کہ احمد نگر کی فوج مغلوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکے گی۔ خصوصاً اس حالت میں جب کہ اکبر بھی نزدیک آچکا تھا۔ قلعہ کئی مہینے تک محصور رہا۔ چاند سلطانہ اس کے لیے تیار تھی کہ جو تجاویز اس نے ابوالفضل کے سامنے پیش کی تھیں ان کو مان لے لیکن اس کے امرا صلح کے خلاف اور جنگ کے خواہاں تھے۔

چاند سلطانہ نے اس پریشانی کے عالم میں ایک خواجہ سرا حمید خاں عرف چیتا سے ان تجاویز کے بارے میں مشورہ طلب کیا۔ چیتا خاں نے زور زور سے سڑکوں پر اعلان کرنا شروع کر دیا کہ ملکہ مغلوں سے سازش کر رہی ہے۔ دکنی غضب ناک ہوگئے اور بعض لوگوں نے چیتا خاں کی سرکردگی میں ملکہ کے محل میں گھس کر اس کو قتل کر دیا۔

مغل حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ سرنگیں پہلے ہی کھودی جا چکی تھیں اور خندقوں کو پاٹ دیا گیا تھا۔ 8 اگست 1600ء کو سرنگوں میں آگ لگا دی گئی جس کی وجہ سے نیلی نامی برج اور ستر فٹ لمبی دیوار پھٹ گئی۔ فوراً ہی زبردست حملہ کر دیا گیا اور قلعہ پر یکایک قبضہ ہوگیا۔ بہادر شاہ نظام گرفتار ہوا اور فوج کے پندرہ سو سپاہی تہہ تیغ کر دیے گئے۔ مغلوں نے دارالسلطنت اور قلعہ پر قبضہ کر لیا اور گولہ بارود کے علاوہ ایک عمدہ کتب خانہ بھی ان کے ہاتھ لگا۔

احمد نگر کی فتح کے ساتھ ریاست کی طاقت بکھر گئی تاہم مغلوں کی مخالفت جاری رہی۔ دولت آباد میں برہان شاہ اول کا ایک پوتا مرتضیٰ نظام شاہ کے لقب سے تخت نشین کر دیا گیا اس کا سب سے بڑا حامی ایک حبشی ملک عنبر تھا جس نے آگے چل کر دکن میں مغلوں کی پیش قدمی روکنے کے سلسلے میں کارہائے نمایاں انجام دیے ملک عنبر کا حلقۂ اثر مرتضیٰ دوم کی وفاداری کا دم بھرتا تھا اور ایک بااثر امیر شمار کیا جاتا تھا۔

ملک عنبر کا حلقۂ اثر تلنگ کی سرحد سے چند میل دور بیڑ اور احمد نگر تک پھیلا ہوا تھا اور راجو کا اقتدار دولت آباد سے لے کر احمد نگر کے علاقے اور گجرات کی سرحد تک مانا جاتا تھا۔

عبدالرحیم خان خاناں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ دونوں سردار آپس میں ایک دوسرے کی مدد نہ کریں گے لہٰذا اس نے عنبر کے علاقے سے تلنگ کے بعض ضلعوں پر قبضہ کرنے کے لیے فوج روانہ کی۔ ملک عنبر نے جوابی کارروائی کی اور مغلوں سے بعض تھانے چھین لیے۔

مندیر کے قریب گھمسان کی لڑائی میں ملک عنبر زخمی ہو گیا لیکن اس کے ساتھی اس کو اپنے ہمراہ اٹھا کر لے گئے۔ عنبر نے تندرست ہونے کے بعد خان خاناں سے ملاقات کی اور مغلوں سے علاقوں کے ردوبدل کے بارے میں فیصلہ کر لیا۔

اسیر گڑھ کا مشہور قلعہ ایک مضبوط اور ٹھوس چٹان پر سطح زمین سے تقریباً نو سو فٹ کی بلندی پر واقع تھا اور مالی گڑھ دکر گڑھ کے قلعے اس کی حفاظت کرتے تھے۔ یہ قلعہ دکن کو جانے والی شاہراہ پر مسلط تھا۔ فیضی سرہندی کے بقول "اس سے زیادہ مضبوط قلعے کا تصور محال تھا۔ یا یوں کہیے کہ اس سے زیادہ کسی قلعہ میں توپ خانہ، جنگی ذخائر، اور رسد کا فراہم کرنا ممکن نہ تھا۔"

یہ قلعہ اگر کسی دوست حکومت کے پاس ہوتا تو اس سے دکن کی ریاستوں کو فتح کرنے کا کام لیا جا سکتا تھا اور یہی قلعہ دشمن کے ہاتھوں میں زبردست رکاوٹ بن سکتا تھا۔ راجا علی خاں سابق حکمراں خاندیش شہنشاہ کا دوست تھا لیکن اس کے لڑکے و جانشین قدر خاں بہادر شاہ کے نظریات بالکل مختلف تھے۔

دکن کی ریاستیں آپس کی لڑائیوں کے باوجود مغل سلطنت کی بڑھتی ہوئی طاقت کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ راجا علی خاں کا برتاؤ جو کہ شہنشاہ کا بہترین دوست سمجھا جاتا تھا مشکوک تھا اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ دو طرفہ سیاست کا کھیل کھیل رہا ہے۔ لیکن راجا علی نے مغلوں کی طرف داری میں جنگ کی اور سون پت کے مقام پر اس نے اپنی جان کی قربانی بھی دے دی۔ مغلوں نے اس کو موجود نہ پاکر اور اس کی فداکاری سے لاعلمی پر اس پر غداری کا الزام عائد کرکے خاندیش کے کیمپ کو لوٹ لیا۔ جب ان کو حقیقت کا پتہ چلا تو سخت ندامت ہوئی اور معافی مانگی لیکن جو نقصان ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا۔

خاندیش کے امرا اور بہادر خاں پسر راجا علی خاں کو سخت غصہ آیا اور تعلقات خراب ہوگئے۔ بہادر کمزور اور عیاش تھا لہذا اس بات کا بڑا امکان تھا کہ وہ اپنے امراد اور حامیوں کے بہکانے میں آجائے۔ اس کے علاوہ غیر مفتوحہ ریاستوں کے امرا کسی دوسری ریاست کے تسلط و برتری کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے لہذا وہ مغلوں کے اقتدار کو کیوں کر تسلیم کرتے۔

اکبر جب اجین پہنچا تو اس کو خبر ملی کہ بہادر شاہ شہزادہ دانیال کی خدمت میں عرض احترام کے لیے حاضر نہ ہوا اور شاہزادہ یہ چاہتا تھا کہ بہادر شاہ کے خلاف مہم بھیجی جائے۔ اکبر نے شہزادے کو حکم بھیجا کہ وہ فوراً احمدنگر روانہ ہوجائے اور بہادر کا معاملہ اس پر چھوڑ دے۔ بہادر کے پاس یکے بعد دیگرے تین مرتبہ پیغام بھیجا گیا لیکن اس نے ٹال مٹول کی اور حاضری کے ارادے کا کوئی اظہار نہ کیا۔ اس کی اس ضد نے اکبر کو ناراض کردیا اور وہ اسیرگڑھ کے قلعے کا محاصرہ کرنے کے لیے برہان پور کی طرف بڑھ گیا۔

بہادر نے اپنی ماں اور بیٹے کو شہنشاہ سے عذر خواہی کے لیے روانہ کیا لیکن اکبر اس بات پر اڑا رہا کہ وہ خود حاضر ہوکر اطاعت کا اظہار کرے۔ رسد کی فراہمی میں مشکلات اور بھاری توپوں کی کمی کے باوجود قلعہ کا محاصرہ جاری رکھا۔ اسی دوران بنگال میں شورش اور شہزادہ سلیم کے باغیانہ رویے کی خبر ملی لیکن اکبر نے اس محاصرے کو چھوڑ کر آگرہ جانا منظور نہ کیا۔

احمدنگر کی فتح اور اکبر کے اس ارادے نے کہ محاصرے کے کام کو تیز تر کردیا جائے بہادر

کو پریشان تو کر دیا لیکن وہ اس عقیدے و اطمینان پر جا رہا کہ اسیر گڑھ کا قلعہ ناقابلِ تسخیر ہے۔ جب سپّن کی پہاڑی اور مالی گڑھ کا قلعہ فتح ہو گیا اور کوڑھی پہاڑی پر مغلوں نے قبضہ کر لیا تو اسیر گڑھ کے قلعہ کا بیرونی استحکام ختم ہو گیا اور اب قلعہ بلا روک ٹوک ایک موثر حملے کا نشانہ بن سکتا تھا۔

ایک طرف تو مغلوں کی حالت مضبوط ہوتی گئی جس کے سبب محاصرہ خطرناک حد تک تنگ تر ہوتا گیا اور دوسری طرف قلعہ کے اندرونی حالات بدسے بدتر ہوتے گئے۔ بہادر خاں کے امرا کے نظریات میں اختلاف تھا اور "پست ترین قسم کے کمینے ساتھی" اس پر پورا اثر جمائے ہوئے تھے۔ سپاہیوں کی تنخواہیں ادا نہ کی گئی تھیں اور سامانِ رسد سڑنے لگا تھا۔ ادھر پناہ گزینوں اور جانوروں کی ایک بڑی تعداد قلعہ میں گھس آئی اور صفائی کا انتظام درہم برہم ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک خاص قسم کی بیماری قلعہ میں پھیل گئی۔ یہ بیماری اگرچہ مہلک نہ تھی تاہم جو بھی اس مرض کا شکار ہوتا اس کا نچلا دھڑ مفلوج ہو جاتا اور بینائی خراب ہو جاتی۔ لوگ اس طویل محاصرے اور روز بروز بگڑتے ہوئے حالات کے سبب گھبرا اٹھے اور بہادر شاہ کی مقاومت ایک احمقانہ عمل معلوم ہونے لگا۔

مغلوں نے مدافعین کے حوصلوں کو پامال کرنے کے لیے اپنی سیاست اور مال و دولت کی بازی لگا دی۔ دکن کی ریاستوں نے بھی ان ہی ہتھیاروں کو مفید طور پر مغلوں کے خلاف استعمال کیا تھا اور اب مغل اسی ڈھنگ سے ان سے انتقام لے رہے تھے۔ ان تمام عناصر نے مل کر مقاومت کو کمزور بنا دیا۔ آخرکار ایک سازش وجود میں آئی کہ بہادر کو مغلوں کے حوالے کر کے صلح کر لی جائے۔

بہادر کو اس کا پتہ چل گیا۔ اس نے افسروں کی مجلسِ مشاورت طلب کی اور دریافت کیا کہ موجودہ حالت کے مقابلے کے لیے کیا کارروائی کی جائے۔ آخرکار یہ فیصلہ قرار پایا کہ اگر اکبر قلعہ اور ریاست اس کے قبضے میں رہنے دے اور فوجیوں کی زندگی اور رعایا کی جان و مال اور آبرو کی ضمانت دے تو وہ اطاعت کرے گا۔

یہ تجاویز سعادت خاں کے ذریعے شہنشاہ کی خدمت میں بھیجی گئیں لیکن وہ جا کر مغلوں سے مل گیا۔ بہرحال اکبر نے رام داس کو صحیح حالات کا پتہ لگانے کے لیے روانہ کیا۔ رام داس مقرب خاں کے ہمراہ لوٹ آیا۔ مقرب خاں یاقوت کا لڑکا اور بہادر کا معتمد امیر تھا۔ اس نے

ساری شرائط اکبر کے سامنے رسمی طور پر پیش کردیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے
اور تو سب شرائط منظور کرلیں لیکن قلعہ سپرد کرنے پر بضد ہوا۔

اب بہادر کے امرا نے یہ مشورہ دیا کہ قلعہ سپرد کردے اور خود بھی شہنشاہ کی
خدمت میں حاضر ہو جائے لیکن قلعہ کا حاکم یاقوت اس تجویز کے سخت خلاف تھا۔ مقرب
خاں نے کسی نہ کسی طرح بہادر خاں کو قلعہ سے باہر آنے پر تیار کرلیا اور بہادر کی مرضی
کے مطابق خان اعظم نے دربار تک اس کی شنوائی کی۔ جب بہادر نے اکبر کے سامنے
احترامات پیش کردیئے تو اس کو فرید بخاری کی نگرانی میں دے دیا گیا۔

یہ بات پوری طرح واضح نہیں کہ آیا مقرب خاں نے سارے حالات بہادر سے
صحیح طور پر بیان کردیئے تھے یا نہیں۔ بہادر نے قلعہ کو سپرد کرنے کے بارے میں کوئی
دستاویز تحریر نہ کی اور اس بات کو اس کی دو رُوئی اور اکبر کو فریب دینے کے
ارادے پر محمول کیا جاتا ہے۔ زیادہ امکان اس امر کا ہے کہ اس کو شہنشاہ کے اس
ارادے کے بارے میں کہ وہ قلعہ کو حاصل کرنا چاہتا ہے بتایا ہی نہ گیا ہو۔

بہادر کو مجبور کیا گیا کہ وہ یاقوت کو لکھ بھیجے کہ قلعہ مغلوں کے سپرد کردیا جائے
جب مقرب خاں نے بہادر کا یہ فرمان یاقوت کو دیا تو اس نے مقرب کو سخت سُست
کہا اور اپنے آقا کو قید کرا کے قلعہ دشمنوں کے سپرد کردینے پر بڑی لعن طعن کی۔ جب
مقرب خاں کو احساس ہوا کہ اس کے ہاتھوں سے بادشاہ، شہنشاہ اور اپنے باپ
مقرب خاں تینوں کا اعتماد جاتا رہا ہے تو اس کو سخت صدمہ ہوا اور اس کے ضمیر نے
اسے اتنی ملامت کی کہ خنجر مار کر خود کو ہلاک کرلیا۔

ملک یاقوت نے قلعہ میں مقیم بعض شہزادوں کو اس پر آمادہ کرنا چاہا کہ وہ تاج پہن
لیں اور مغلوں سے جنگ جاری رکھیں لیکن اس بھاری ذمہ داری کو اٹھانے کے لیے
کوئی تیار نہ ہوا اور نہ امرا میں سے کسی نے اس کی حمایت کی کیوں کہ وہ مصیبت آزمائی
کی مدت کو مزید طول دینا نہ چاہتے تھے۔ ملک یاقوت نے بے انتہا مایوسی کی حالت میں حُبُ الوطنی
کے جذبے سے سرشار ہو کر خودکشی کرلی۔ اس کی موت کے ساتھ ہی قلعہ کو سپرد کرنے میں
جو رکاوٹ باقی تھی وہ ختم ہوگئی۔ اور 16-15 جنوری 1601ء کو ابوالفضل کے لڑکے عبدالرحمٰن
کو قلعہ کی چابیاں سونپ دی گئیں۔ بہادر اور اس کے خاندان کو گوالیار بھیج دیا گیا اور

اس طرح فاروقی خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ اکبر نے خاندیش کو دان دیش نام دے کر اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

بعض مورخین نے اکبر پر اس معاملے میں جس کے نتیجے میں اسیر گڑھ کے قلعہ پر قبضہ ہوا اور بہادر گرفتار کر لیا گیا فریب دہی کا الزام عائد کیا ہے۔ یہ بات ناقابلِ یقین ہے کہ بہادر خاں نے خود کو جان بوجھ کر محض قید کیے جانے کے لیے سپرد کیا ہو۔ اسی طرح یہ بات بھی ناقابلِ یقین ہے کہ وہ اکبر کے پاس صرف اس لیے گیا تھا کہ اکبر نے اسے ملاقات کے لیے بلایا تھا اور "اپنے سر کی قسم کھا کر یہ کہا تھا کہ بہادر کو ملاقات کے بعد صحیح و سالم واپس جانے دیا جائے گا"۔

اگر بہادر کی صورتِ حال اتنی ہی مضبوط ہوتی جتنی کہ جیسوئٹ پادریوں نے تحریر کی ہے تو پھر اس کو کیا ضرورت تھی کہ وہ اپنی جان خطرے میں ڈالتا؟ اس کے علاوہ اکبر اور بہادر کے درمیان اصل جھگڑا تو بہادر کے ذاتی طور پر اکبر کے سامنے حاضر ہونے اور اسیر گڑھ کو سپرد کرنے کا تھا لہٰذا یہ بات سمجھنا مشکل ہے کہ بہادر نے کامیاب مقاومت کے بعد یکایک یہ فیصلہ کیوں کر لیا کہ وہ خود کو سپرد کر دے؟ تو پھر کیا وہ محض ذاتی اطاعت کے لیے ہی گیا تھا؟ اگر اس نے اپنی مرضی سے اطاعت قبول کی تھی تو پھر اسیر گڑھ کا قلعہ سونپنے سے انکار کیوں کیا؟ کیا اکبر نے اس کو یہ بتایا تھا کہ اگر وہ اپنی اطاعت کا اظہار کر دے تو اسیر گڑھ کے قلعہ کا مطالبہ معاف کر دیا جائے گا؟ اکبر اس فوجی مفاد سے کیوں ہاتھ دھو بیٹھتا جسے اس نے مہینوں کی زحمت کے بعد حاصل کیا تھا۔

یہ درست ہے کہ سلیم نے بغاوت کر دی تھی لیکن دکن کی افواج کی قیادت دانیال کو سونپی جا [illegible] تھی، جس نے حال ہی میں احمد نگر کا قلعہ فتح کیا تھا اور اس بات کا خواہش مند تھا کہ بہادر [illegible] کی گستاخی پر جو اس نے خود حاضر نہ ہو کر کی تھی قرار واقعی سزا دے۔ اس سے قبل کہ اکبر کے خلاف کوئی فیصلہ کیا جا سکے مندرجہ بالا سوالات کا حل لازمی ہے۔ بہرحال اس بات کا امکان موجود ہے کہ مقرب خاں نے یا تو جنگ ختم کرانے کے لیے یا پھر شہنشاہ کو خوش کرنے کے لیے بعض حقائق کو بہادر سے مخفی رکھا اور ان میں خاص طور سے اسیر گڑھ کے قلعہ کا مسئلہ تھا جس کو حاصل کرنے کے لیے اکبر بضد تھا۔

چنانچہ یہ بات فرض کر لینا حق بجانب معلوم ہوتا ہے اور اس بات کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ بہادر کو کس بات پر تعجب ہوا اور اس نے قلعہ کو سپرد کرنے کے لیے کسی تحریر کے دینے سے کیوں انکار کر دیا۔

اس بات سے اس امر کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ مقرب کے باپ نے اس پر غداری کا الزام کیوں لگایا، اکبر کیوں ناراض ہوا اور مقرب کی موت کی کیا وجوہات تھیں؟ اگر بہادر نے قلعہ اپنی مرضی سے حوالے کر دیا ہوتا تو اکبر اس کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کرتا لیکن اس کے انکار نے حالات کو بدل دیا اور بجائے اس کے کہ بہادر کے ساتھ مہمانوں کا سا سلوک کیا جائے اس کے ساتھ دشمنوں کا رویہ برتا گیا اور اس کو گوالیار بھیج دیا گیا۔

احمد نگر اور اسیر گڑھ کے قلعوں کو فتح کرنے کے بعد دکن کا راستہ صاف ہو گیا اور مغلوں کی جڑیں مضبوط ہو گئیں۔ وہ دکن کی باقی ماندہ ریاستوں کے مقابلے میں اپنی سیاسی اور فوجی طاقت کو زیادہ مؤثر طریقے پر استعمال کر سکتے تھے۔

اکبر کا سب سے بڑا لڑکا سلیم بڑے ارمانوں اور دعاؤں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اکبر نے اسے فراخ دلی اور ذوقِ نفاست کی تعلیم دلائی تھی اور اس سے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں لیکن اکبر کو سلیم کی راحت پسند عادتوں، شراب نوشی اور اپنے گرد جمع کیے ہوئے دوستوں سے دلبستگی کے سبب بہت مایوسی ہوئی۔

آہستہ آہستہ باپ بیٹے کے درمیان تعلقات کشیدہ ہوتے گئے۔ 1591ء میں بلکہ اس سے کچھ قبل اکبر کھلے طور پر اپنے بیٹے سے ناخوش ہو گیا اور اگر تھوڑا بہت بھروسہ اکبر کو باقی رہ گیا تھا تو وہ بھی جاتا رہا۔ اس نے سلیم کو شاہی احکامات نظر انداز کرنے پر سخت وسست کہا۔ 1591ء میں اکبر پر قولنج کا شدید حملہ ہوا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ مرض اس وجہ سے لاحق ہوا کہ سلیم نے خفیہ طور پر اکبر کو زہر دلوایا تھا۔

شہزادہ روز بروز اپنے فرائض سے لاپرواہ ہوتا گیا۔ اس نے 1598ء میں ماوراء النہر کی طرف ایک فوجی مہم کی قیادت سے انکار کر دیا اور اگلے سال 1599ء میں دکن جانے کو بھی تیار نہ ہوا۔ اس سے اتنی دور دراز جگہوں پر جانا اس لیے مناسب نہ تھا مبادا اس کی عدم موجودگی اس کے مفاد کے لیے نقصان دہ ثابت ہو۔ لیکن شہزادے کی ان

نافرمانیوں کے باوجود اکبر کے دل میں اس کے لیے ایک نرم گوشہ موجود تھا۔ چنانچہ اس نے بیٹے کے خلاف کوئی شدید اقدام نہ کیا۔ اکبر نے سلیم کو میواڑ کو دوبارہ فتح کرنے کے لیے مامور کیا اور خود دکن کی طرف روانہ ہوگیا۔

سلیم اجمیر نہ گیا اور بے کار وقت ضائع کرتا رہا۔ وہ بجائے اس کے کہ فوجی مہمات میں دلچسپی لے کثرتِ مے نوشی میں مصروف ہوگیا جو کہ اکبر کے سارے لڑکوں کی ہلاکت کا باعث بنی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو اپنے ہوش وحواس پر قابو نہ رہا وہ اپنے نالائق ساتھیوں کے کہنے سے بہک جاتا۔ ان لوگوں نے اس کو بھڑکایا کہ شہنشاہ کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھائے۔ میواڑ کی بے فائدہ اور بے کار مہم کو ختم کردے اور اپنی طاقت کسی بہتر اور مفید تر مہم میں لگادے۔

ان لوگوں میں اس بات پر اختلاف پیدا ہوگیا کہ وہ پنجاب جائے یا مشرقی صوبوں کی طرف قدم بڑھائے۔ اس کو ہر صورت میں آگرہ جانا ضروری تھا تاکہ وہاں سے مال و دولت اور دوسرے مادی وسائل جو کچھ مل سکیں ان پر قبضہ کرلے۔ اس کی خوش قسمتی سے ایک بہت ہی کامیاب اور مال دار امیر شہباز خاں تقریباً ایک کروڑ روپے کی جائداد چھوڑ کر انتقال کرگیا۔

سلیم نے جہاں تک ہوسکا اس کے مال و دولت پر قبضہ کرلیا اور آگرے کی طرف جو کہ قلی خاں کے اختیار میں تھا روانہ ہوگیا۔ شہزادے کا بڑے احترام کے ساتھ استقبال کیا گیا لیکن قلی خاں نے کسی قسم کی مدد دینے سے انکار کردیا۔ اس وقت شہزادہ طاقت کے استعمال کے لیے تیار نہ تھا۔ چنانچہ اس نے مان سنگھ کے کہنے پر جولائی 1599ء میں دریائے جمنا کو عبور کیا اور بنگال کی حدود تک اپنا تسلط قائم کرلیا اس نے الٰہ آباد کو اپنا مرکز بنایا اور کالپی، جون پور اور بہار میں اپنے صوبے دار مقرر کردیے اور بہار کے خزانے کو جس میں تیس لاکھ روپیہ تھا اپنے قبضے میں کرلیا۔

اکبر سلیم کی حرکات کی اطلاع پاکر قدرتاً پریشان ہوا۔ اس نے شریف کو شہزادے کے پاس روانہ کیا تاکہ اس کو تنبیہہ کرکے دوبارہ اطاعت پر راضی کرے لیکن شریف خود شہزادے سے جاملا۔ اب اکبر نے یہ فیصلہ کیا کہ خود ہی جلد از جلد آگرہ پہنچے۔ چنانچہ وہ 21 اپریل 1601ء کو برہان پور سے روانہ ہوگیا۔ دارالسلطنت پہنچنے کے کچھ دنوں بعد

اس کو اطلاع ملی کہ سلیم تیس ہزار سواروں کی سرکردگی میں باپ کی خدمت میں احترام بجا لینے کے بہانے راستے میں ملک کو لوٹتا' غارت کرتا آگرے کی طرف چلا آرہا ہے۔ شہنشاہ نے سلیم کو ایک سخت خط روانہ کیا اور یہ لکھا کہ اگر وہ حقیقتاً باپ سے ملنا چاہتا ہے تو تنہا آئے ورنہ الہ آباد واپس جائے۔

سلیم الہ آباد واپس ہوگیا۔ بنگال اور اڑیسہ کے صوبے اس کو دے دیئے گئے اور اس سے یہ کہہ دیا گیا کہ وہ اُن پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے اپنے آدمیوں کو بھیج دے۔ شہزادے نے اس تجویز کی طرف توجہ نہ دی وہ الہ آباد ہی میں رہا اور اُس نے اپنے نام کے سکے جاری کر دیئے۔

اکبر ان باتوں سے برہم نہ ہوا اور نہ ہی فوری طور پر کوئی آویزش شروع کی۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اکبر کو اپنے بیٹے سے محبت تھی۔ دوسرے یہ کہ بنگال میں افغانوں اور شمالی پنجاب میں راجا باسو کی بغاوتیں ابھی پوری طرح دبائی نہ جا سکی تھیں اور ان کے علاوہ اکبر کو اپنی قوت پر پورا بھروسہ تھا اور وہ سلیم کو خوب پہچانتا تھا چنانچہ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ معاملہ کو وقت کے ہاتھوں سونپ دے جو سلیم کو خود ہی راہِ راست پر لے آئے گا۔

شہنشاہ نے ابوالفضل کو دکن سے واپس بلانا ہی بہتر سمجھا۔ چونکہ شہزادہ کھلم کھلاّ بغاوت پر کمربستہ تھا لہٰذا اکبر نے یہی مناسب سمجھا کہ ابوالفضل کو جس نے اپنی لیاقت و اطاعت سے وفاداری کا حق ادا کر دیا تھا دربار میں واپس بلا لیا جائے تاکہ اس کی عقل و فہم سے بیشتر فائدہ اٹھایا جائے۔

ابوالفضل حکم ملتے ہی آگرے کی طرف روانہ ہوگیا اور تیزی سے منزلیں طے کرنے لگا۔ شہزادہ سلیم کو جب ابوالفضل کی واپسی کا علم ہوا تو اس کو بہت تشویش ہوئی اور اس کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کام کے لیے سلیم نے اورچھہ خاندان کے ایک بُندیلا سردار بیر سنگھ دیو کو حاصل کیا۔

جب ابوالفضل سرونج پہنچا تو اس کے ساتھی تیزی سے سفر کرنے کی وجہ سے تھک چکے تھے۔ مقامی افسر گوپال داس نے یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے آدمیوں کو وہیں چھوڑ کر تازہ دم سپاہیوں کو جن کو گوپال نے بھرتی کیا تھا اپنے ساتھ لے جائے۔ ابوالفضل

کو بھی اس کا علم ہوگیا کہ بیر سنگھ دیو کی نیت خراب ہے تاہم اس نے گوپال داس کا مشورہ قبول کر لیا اور اپنے بہترین ساتھیوں کو چھوڑ کر آگے بڑھا۔ ابوالفضل ہر قسم کے خطرے کے باوجود بغیر پرواہ کیے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ 9 اگست 1602ء کو سرائے بار اور انتری کے درمیان اس کو گھیر لیا گیا۔ بیر سنگھ دیو اس بات پر رضامند ہوگیا کہ اس کو جان بچا کر جانے دے لیکن ابوالفضل نے سخت کلامی کی اور جبار خاں نے غصے میں بھر کر بیر سنگھ پر حملہ کر دیا۔ جبار مارا گیا اور ابوالفضل کا سر قلم کر کے سلیم کے پاس بھیج دیا گیا۔

ابوالفضل کے قتل کی خبر شہنشاہ کو ملی تو صدمے سے اس کا برا حال ہوگیا اور کچھ عرصے کے لیے تو وہ اپنے حواس کھو بیٹھا۔ وہ رونے اور سینہ کوبی کرنے لگا۔ کئی دن بعد اس کی حالت درست ہوئی۔ اس نے بیر سنگھ دیو کا پیچھا کرنے اور اس کو سزا دینے کا حکم صادر کیا۔ بیر سنگھ کا ایک جگہ سے دوسری جگہ تعاقب کیا گیا۔ لیکن وہ اپنی جنگلی پناہ گاہوں میں چھپتا پھرا اور ہاتھ نہ آیا۔ اکبر قدرتاً سلیم سے بھی ناراض ہوا۔

اپنی ماں اور گلبدن بیگم کے کہنے سننے سے آخرکار شہنشاہ کا غصہ کم ہوا اور اس نے اس بات کی اجازت دی کہ سلطان سلیمہ بیگم کو بھیجا جائے تاکہ وہ سلیم کو اس بات پر راضی کرے کہ وہ اپنے طور طریق درست کرے۔ سلطان سلیمہ بیگم کی مہم کامیاب رہی۔ سلیم نے شہنشاہ سے رسمی طور پر معافی کی درخواست کی۔ سلیم کے ساتھ فتح پور آیا اور باپ کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

شہنشاہ اس کے ساتھ مہربانی سے پیش آیا اور اس کا خوف دور کرنے کے لیے اور اسے مطمئن کرنے کے لیے اپنی پگڑی اس کے سر پر رکھی اور اس طرح اس کے جانشین ہونے کا اعلان کر دیا۔

1603ء میں ایک مرتبہ پھر سلیم کو میواڑ کے زیر کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ وہ فتح پور گیا اور وہاں پہنچ کر یہ عذر پیش کیا کہ سپاہیوں اور ساز و سامان کی کمی کے سبب وہ اس مہم پر نہیں جا سکتا۔ اور یہ درخواست کی کہ اس کو اپنی جاگیر پر واپس جانے کی اجازت دی جائے۔

اکبر جانتا تھا کہ سلیم کیا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس نے سلیم کو الہ آباد جانے اور پُر لطف

دخوش وخرم زندگی بسر کرنے کی اجازت دے دی۔ الہ آباد پہنچ کر سلیم اپنے پرانے ڈھنگ پر اتر آیا اور ایک آزاد حکمراں کی طرح رہنے لگا۔ (نومبر 1603ء)

چند ماہ بعد اکبر کو پتہ چلا کہ سلیم ذلیل و پست کاموں میں بیش از حد مبتلا ہو کر نہ محض خود کو برباد کر رہا ہے بلکہ سخت ظلم و تشدد پر بھی اتر آیا ہے۔ اس زمانہ میں بنگال سے مان سنگھ کی رپورٹ نے اس کے دل و دماغ کو بنگال کے معاملات کی طرف سے مطمئن کر دیا۔ اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ سلیم کو راہ راست پر لانے کے لیے الہ آباد کی طرف کوچ کرے۔

21 اگست 1604ء کو وہ شہزادہ دانیال اور اپنی محترم ماں کی تیزی سے گرتی ہوئی صحت کے باوجود آگرے سے روانہ ہو گیا لیکن جس کشتی میں وہ روانہ ہوا وہ رات میں خشکی میں پھنس گئی اور تین دن تک سخت بارش ہوتی رہی۔ ابھی بارش ختم نہ ہو پائی تھی کہ خبر ملی کہ مریم مکانی کی حالت نازک ہو گئی ہے۔ چنانچہ شہنشاہ واپس لوٹ آیا اور اس نے اپنی ماں کو زندگی کے آخری لمحات گزارتے پایا۔ ماں کی موت سے شہنشاہ کو زبردست صدمہ پہنچا اور لامحالہ الہ آباد کی مہم معرض التوا میں پڑ گئی۔

شہزادہ جانتا تھا کہ اکبر جس مہم کے لیے ایک مرتبہ سوچ لے تو وہ کبھی اس کو ادھورا نہیں چھوڑتا۔ چنانچہ اس نے دادی کی موت کے واقعے سے فائدہ اٹھایا اور خود تعزیت کے لیے آگرے پہنچا۔ حالانکہ ظاہری طور پر اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا لیکن تنہائی میں اکبر نے اس کو سخت لعن طعن کی۔ اس کو نظر بند کر دیا گیا۔ پورے دس دن بعد اس کی رہائی اور دربار میں حاضری کا حکم دیا۔

19 مارچ 1605ء کو شہزادہ دانیال دائم الخمری کی وجہ سے 33 سال چھ مہینے کی عمر پاکر چالیس دن کی بیماری کے بعد فوت ہو گیا۔ کثرت مایوسی کے سبب اس کی صحت بہت گر گئی تھی اور کافی عرصے تک بیمار رہنے کے سبب وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس کی موت کا فوری سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ مرشد قلی نے ایک پرانی بندوق کی زنگ آلود نال کی دو آتشہ شراب پلا دی تھی۔

اکبر کئی سال سے اپنے پرانے درد شکم میں مبتلا تھا۔ ستمبر کے آخری ہفتے میں اس پر پیچش کا حملہ ہوا۔ کچھ دنوں تک یہ خیال کرکے کہ اس کی مضبوط جسمانی بناوٹ

خود بخود مرض پر غالب آجائے گی کوئی دوا نہ دی گئی لیکن اس کی حالت خراب تر ہوتی گئی اور خون آنے لگا۔ حکیم علی نے سخت قابض دوا دی جس کی وجہ سے پچپش اک دم رُک گئی لیکن اس کو بخار اور عسرالبول کی شکایت ہوگئی۔ اس کی صحت تیزی سے گرنے لگی۔ اب حکیم نے اس کو زبردست مسہل دے دیا۔ جس کے سبب بہت زیادہ دست آگئے۔ دستوں کو روکنے کی ساری کوششیں ناکام ہوگئیں اور 23 دن کی سخت بیماری کے بعد 16 اکتوبر 1605ء کو شہنشاہ نے آخری سانس لی۔

اس کی موت کے بارے میں چاروں طرف افواہیں پھیلتی گئیں۔ کچھ لوگوں نے یہ خبر اڑادی کہ اس نے غلطی سے ایک زہریلی گولی خود کھالی جس گولی سے وہ مان سنگھ کو مارنا چاہتا تھا۔ دوسروں کا کہنا تھا کہ شہنشاہ مان سنگھ کو نہیں بلکہ ٹھٹھ کے صوبے دار غازی بیگ پسر جانی بیگ کو مارنا چاہتا تھا۔ تیسری افواہ یہ گرم تھی کہ سلیم نے باپ کو زہر دے دیا۔

اس قسم کے شبہات کی کئی وجوہ تھیں۔ اکبر و سلیم کے درمیان کشیدہ تعلقات کسی سے پوشیدہ نہ تھے۔ اس کے علاوہ حکیم علی" جو کہ عام طور پر دل کا برا اور بدکردار تھا جہانگیر کا چہیتا تھا۔ جہانگیر نے خود ہی اعتراف کیا ہے کہ" اس کی پوری وفاداری میری طرف ہے" اور" میں ہمیشہ اس کو خوش رکھنا چاہتا تھا" اور ایک افواہ یہ بھی گشت کر رہی تھی کہ حکیم علی کے کچھ دوستوں نے اس کو زہر دے کر ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ سلیم کو اس مفروضہ سازش سے جو کہ اکبر کی علالت کے دوران ظہور میں آئی خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ یہ بات مشہور ہے کہ عزیز کوکا اور شہزادہ خسرو کے خسر خان اعظم اور ماموں مان سنگھ کی یہ خواہش تھی کہ شراب خوار و پست اخلاق سلیم کو ہٹا کر اس کے بجائے خوش اخلاق و خوش مشرب جوان شہزادے خسرو کو تخت پر بٹھایا جائے جس کے اخلاق پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اکبر بھی خسرو کو ترجیح دیتا تھا اور اس سازش کی حمایت کرتا تھا۔ سازشیوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ جب سلیم باپ کے پاس ادائے احترام کو آئے تو اس کو گرفتار کر لیا جائے لیکن سلیم کو بروقت ضیاء الملک قزوینی کے ذریعے اس سازش کی اطلاع مل گئی اور

وہ شہنشاہ کے پاس نہ گیا۔ اب راجا اور خان اعظم نے امرا کی مجلس مشاورت طلب کی اور ان سے جانشینی کے بارے میں مشورہ لیا۔ ملک خیر اور سعید خاں چغتائی نے یہ کہہ کر اس موضوع کی شدید مخالفت کی کہ باپ کی حیات میں اس کے بیٹے کا جانشین مقرر کیا جانا چغتائی تاتاروں کے رسم و آئین کے خلاف ہے اور ایسا ہرگز نہ ہو سکے گا۔"

چنانچہ یہ مجلس درہم برہم ہو گئی۔ اس کے بعد مرتضیٰ خاں المعروف بہ شیخ فرید بخاری نے سادات بارہہ اور سلیم کے دوسرے ساتھیوں مثلاً رکن الدین روہیلہ، معتمد خاں و مرزا شریف کو جمع کیا۔ ان لوگوں نے شہزادے سے رجوع کیا اور اس سے وعدہ لیا کہ وہ اسلام کی حفاظت کرے گا اور خسرو کے حامیوں سے انتقام نہ لے گا۔ تب سلیم کے شہنشاہ ہونے کا اعلان کر کے "نقارے بجا کر خوشی کا اظہار کرنے لگے۔" ان لوگوں کی حفاظت میں سلیم آخری مرتبہ اپنے باپ کو جو کہ موت سے ہم آغوش ہو رہا تھا دیکھنے گیا۔ شہنشاہ کی زبان بند ہو چکی تھی لیکن حواس بجا تھے۔ شہنشاہ نے پیش خدمتوں کو اشارہ کیا کہ اس کی پگڑی سلیم کے سر پر رکھیں اور اس کا خنجر اس کی کمر پر باندھ دیا جائے۔ اس کے بعد شہنشاہ نے آنکھیں موند لیں اور سکون کے ساتھ 16 اکتوبر 1605ء کو ملک الموت کو لبیک کہا۔ اگلے روز صبح اسلامی آئین کے مطابق نعش کو غسل دیا گیا اور سکندرہ لے جایا گیا۔

اکبر تاریخ ہند کا سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ وہ بیک وقت اپنے زمانے کی پیداوار اور اس کا جنم داتا بھی تھا۔ اکبر کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑا وہ ان مسائل کے مقابلے میں جو چندر گپت، اشوک یا گپتا بادشاہوں کو لاحق ہوئے، بہت پیچیدہ اور مشکل تھے۔ وہ ایک غیر ملکی ترک اور مسلمان تھا۔ اس کو مختلف النوع فرقے کے لوگوں مثلاً ہندوستانیوں کو، جن میں ہندو اور نو مسلم شامل تھے، ترکوں، مغلوں اور ایرانیوں سے سابقہ پڑا اور آگے چل کر اس کو عیسائیوں سے بھی نبٹنا پڑا۔

اکبر نے اپنی خداداد بصیرت، تجربات اور میل جول کے سبب ایسے بنیادی اصول مرتب کیے جو اس کے اعمال کے محرک ہوئے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اس کو اس بات کا پورا یقین ہو گیا تھا کہ کم از کم ہندوستان کے دو بڑے فرقوں کے درمیان اتحاد قائم کرنا اشد ضروری ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے سخت گیرانہ اقدامات ختم کیے اور مذہبی بندشوں کو دور کر دیا۔ یاتری ٹیکس، جزیہ اور دوسرے فالتو ٹیکس اڑا دیئے۔ سرکاری ملازمتیں سب کے

بے کھول دی گئیں اور مختلف طریقوں سے سب فرقوں کے درمیان قریبی معاشرتی تعلقات اور ہمدردانہ افہام وتفہیم کو بڑھاوا دیا۔ ہندوؤں کو جلد ہی اس بات کا احساس دلایا گیا کہ شہنشاہ خود کو ان کا بھی اتنا ہی محافظ سمجھتا ہے جتنا کہ دوسروں کا۔

شہنشاہ نے اپنی روش صلح کل کے سبب ہندوؤں کے دلوں میں بھی سلطنت مغلیہ کے لیے جوش کا جذبہ پیدا کر دیا اور انھوں نے اس کے لیے اپنا خون بہایا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندو عوام و امرا جنھوں نے اکبر کی رہبری میں اس وسیع سلطنت کے بنانے میں قربانیاں دیں وہ بجا طور پر فخر و مباہات کر سکتے تھے۔

اکبر کا عقیدہ تھا کہ جب سب مذاہب دین الہٰی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ پیغمبروں نے ان کی اشاعت کی ہے تو ان میں کچھ مشترکہ بنیادی باتیں ضرور ہونا چاہییں۔ ان مذاہب کے مقاصد کم و بیش ایک ہی جیسے ہیں لیکن وہ کسی نہ کسی طرح تفصیلات بدعات، توہمات اور اسی قسم کے دوسرے پردوں میں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ اگر ان مقاصد کو غیر جانب دارانہ اور عمیق تحقیقات کے ذریعے تدوین کر لیا جائے تو یہ انسانوں کو مذہبی نقطۂ نگاہ سے متحد کرنے میں بڑے اہم اور قیمتی ثابت ہوں گے۔

اکبر نے اپنی تحقیقات بلا روک ٹوک جاری رکھیں اور کبھی کبھی تو اسے یہ محسوس ہوتا کہ اس نے تقریباً ان حقائق کو پا لیا ہے۔ اس کو خدا پر بے حد بھروسہ و اعتقاد تھا اور وہ ہمیشہ ہر معاملے میں اس کی رہنمائی کی دعا کرتا۔ اکبر مذاہب کے درمیان بنیادی وحدت کی تلاش کے جوش میں کبھی کبھی ان عناصر سے جو نفاق کا باعث ہوتے چشم پوشی کرجاتا۔ اس کو متعصب اور کٹر لوگوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی اور کبھی کبھی تو اس کو ان پر غصہ آجاتا۔ اکبر خود بہت ہی مذہبی اور صوفیانہ مزاج کا مالک تھا اور اسی قسم کے لوگوں کی صحبت سے اس کا دل خوش ہوتا جو راتوں کا بیشتر حصہ جاگ کر عبادت میں گزارتے۔

اکبر کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ اس دنیا کو جس میں اس قدر نفاق و کش مکش ہے ایک مقتدر طاقت کے تحت متحد کر دے۔ اس نے یہ بات اسلام کی تعلیمات اور چنگیز خاں کے تجربات سے سیکھی تھی۔ اس نے اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے سب سے پہلے ہندوستان کو متحد کرنے کا نہ صرف خواب دیکھا بلکہ اس کو بروئے کار لانے کے لیے بیشمار زحمتیں برداشت کیں۔ اس نے سارے ملک کو ایک حکومت کے تحت لانے کے لیے اپنی

پوری کوششیں صرف کردیں تاکہ یکساں انتظامیہ، عدلیہ اور مالیہ وجود میں آسکے اور یکساں قسم کے زرعی اور تجارتی قوانین نافذ ہوسکیں۔ اگر دکن کی ریاستیں اس کے منصوبے کو اچھی طرح سمجھ لیتیں اور اس کا ساتھ دے سکتیں تو شاید ہندوستان ایشیا اور یورپ دونوں براعظموں کا سب سے زیادہ مضبوط اور مالدار ملک بن جاتا اور اس کی تاریخ بھی بالکل مختلف ہوتی۔

ہندوستان کو متحد کرنے کے بعد اکبر مشرق وسطیٰ اور مغربی ایشیا کو اس کے ساتھ ملانا چاہتا تھا کیوں کہ عالمی سلطنت کی تشکیل کے لیے یہ بہت ضروری اور اہم اقدام تھا۔

اکبر بحیثیت حکمراں کے بہت ہی روشن خیال اور وسیع القلب بادشاہ تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ بادشاہت اللہ تعالیٰ کی تفویض فرمائی ہوئی ایک زبردست ذمہ داری ہے اور بادشاہ کا ہر فعل ایک قسم کی عبادت اور خدا کے حضور میں نیاز و پیش کش کی حیثیت رکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ امور مملکت کے انجام دینے میں بہت احتیاط اور غور و فکر سے کام لیتا۔ وہ کسی نہ کسی طرح حکومت کے سارے کاموں کا تفصیل سے مطالعہ کرتا اور اس طرح امور انتظامیہ پر اس کا پورا پورا قابو تھا۔

اگر حالات کا تقاضا ہوتا تو وہ کام کرنے کی غیر معمولی صلاحیت، تحمل، فوری فیصلہ اور سرعت عمل کا مظاہرہ کرتا۔ وہ کسی کام میں خوب غور و خوض اور باقاعدہ تیاریوں کے بغیر ہاتھ نہ ڈالتا۔ وہ ایک مرتبہ جو بھی فیصلہ کرلیتا تو اس کو عزم بالجزم کے ساتھ انجام دیتا اور اس کی پرواہ نہ کرتا کہ اس میں کتنا وقت صرف ہوگا اور کتنی زحمت ہوگی۔ اکبر کم سخن تھا لیکن جو کچھ کہتا وہ مختصر، خیال انگیز اور واضح ہوتا۔ وہ اپنے اخلاق و عادات اور دوسروں کے ساتھ سلوک میں ممتاز اور باوقار تھا۔ اس کی شخصیت بارعب اور بااثر تھی۔ اس کو کینوں، بدکرداروں اور محض خوشامدیوں کی صحبت پسند نہ تھی۔ اکبر نے اپنے ساتھی بڑی عقلمندی کے ساتھ لائق ممتاز اور صاحب استعداد لوگوں میں سے منتخب کیے۔

اکبر چاہے بزم میں ہو یا رزم میں ہمیشہ حالات کو اپنے قابو میں رکھتا۔ وہ بحیثیت ایک سالار و سپاہی کے، بحیثیت ایک مدبر، منتظم اور لیڈر کے اپنے سارے

ہم عصروں سے ممتاز تھا۔ اکبر اس وقت تک جنگ پر آمادہ نہ ہوتا جب تک کہ وہ اپنے اعلیٰ مقاصد و نظریات کے مطابق صلح کی ساری کوششیں نہ کر لیتا۔ جب ہر قسم کی ترغیب اور عقلی دلائل ناکام ہو جاتے تو پھر وہ اپنی تلوار کو نیام سے باہر نکال لیتا اور عام طور سے اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا۔

بظاہر وہ مطلق العنان تھا لیکن عملی طور سے وہ حلیم الطبع ہمدرد، خردمند اور مہربان تھا اور جہاں تک ہو سکتا دوسروں کی خواہشات کا خیال رکھتا اور ان کو پورا کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کی دلچسپی صرف اتنی ہی نہ تھی کہ مالگذاری جمع ہو جائے، صلح برقرار رہے اور اس کے اثر و رسوخ کا حلقہ وسیع تر ہوتا جائے۔ وہ غریبی اور گداگری کو ہٹانے اور اصلاحات کو بروئے کار لانے میں بھی اتنی ہی دلچسپی رکھتا تھا۔ بدقسمتی سے اس کے وسائل اور اس کے زمانے کی معلومات بہت محدود تھیں لہٰذا اس کو جو کامیابیاں ہوئیں وہ نمایاں نہ ہو سکیں۔

اکبر فنون لطیفہ اور ادب کا قدرداں اور مربی تھا۔ اگرچہ اکبر نے لکھنا نہ سیکھا تھا اور وہ اگر پڑھ سکتا تھا تو بھی پڑھنا پسند نہ کرتا تھا تاہم وہ عالم تھا اور شعر، اخلاقیات، مذہب اور فلسفے کی باریکیوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ خدا نے اس کو غیر معمولی، عجیب اور قوی یادداشت بخشی تھی جس کی مدد سے اس نے علم کا ایک خزانہ حاصل کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے نقاد و عیب جو بھی اس کی تعریف سے باز نہ رہ سکے۔

اکبر اعلیٰ قسم کی نظم اور اچھے اشعار کا شوقین و مربی تھا۔ لیکن اسے کھوکھلے پن، ظاہر داری اور خیالات کی پستی سے نفرت تھی۔ فن نقاشی اور معماری کی ترقی میں اکبر کی عملی دلچسپی اور عادلانہ تشویق و ترغیب کو کافی دخل تھا۔ وہ صوتی و آلاتی دونوں قسم کی کلاسیکی موسیقی کا دلدادہ تھا اور لائق موسیقاروں و ہنرمندوں کی سرپرستی کرتا۔ وہ شاید اسلامی عقائد اور خیالات کی وجہ سے فن مجسمہ سازی کی حوصلہ افزائی نہ کر سکا لیکن اس کے عہد میں پتھروں اور آرائشی نقش و نگار نے قابل توجہ ترقی کی۔

اکبر اگرچہ اپنی جوانی میں ورزش، کھیلوں، شراب اور ایسے کارناموں کا دلدادہ تھا جن میں بہادری اور جرأت کا مظاہرہ ہو لیکن جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا اس میں وقار اور سنجیدگی آتی گئی۔ اکبر کی عادات سادہ اور معتدل تھیں۔ وہ اپنے آخری ایام میں بتدریج

تارک الدنیا ہوگیا۔ وہ کم کھاتا۔ گاہ گاہ تھوڑی سی شراب پیتا اور بہت کم مقدار میں افیون کھاتا۔ اس میں ایرانیوں یا ترکوں کی طرح جنسی معائب نہ تھے اور نہ عورت اس کی کمزوری تھی۔ اس کی زندگی و خیالات صاف ستھرے تھے۔ وہ سب کی سنتا لیکن اپنے فیصلے کے مطابق عمل کرتا۔ باوجودیکہ اکبر کا نشانہ بہت ہی عمدہ تھا لیکن اس نے عملاً وسیع پیمانے پر شکار کرنا بند کر دیا تھا۔

اس کے دل میں اپنے اقربا کے لیے بہت جگہ تھی اور جہاں تک ہو سکتا وہ ان کی کوتاہیوں سے چشم پوشی کرتا۔ وہ اپنے بڑوں کا خاص طور پر عورتوں کا بڑا احترام کرتا۔ اکبر ان لوگوں کی درخواستوں کو رد کرنا سخت ناپسند کرتا۔ اس کا رویہ ایسا تھا کہ لوگ اس کے جذبات سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ امور مملکت میں عورتوں کے زیر اثر نہ رہا۔ اس کو اپنے بچوں اور ان کی اولاد سے بہت محبت تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے ان کو عمدہ تعلیم دلائی لیکن بظاہر اس نے ان کو اس بات کی آزادی دے رکھی تھی کہ اپنی مرضی کے مطابق رہیں جس کے سبب اس کو آخر میں سخت مایوسی، خجالت اور دل شکنی کا سامنا کرنا پڑا۔

ان سب باتوں سے بلاخوف تردید یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اکبر دنیا کے بزرگ ترین بادشاہوں میں سے تھا۔

اکبر کی زندگی کے تاریخ وار واقعات

1	اکبر کی پیدائش	15 اکتوبر 1542
2	تخت نشینی بمقام کالانور	فروری 1556
3	دہلی میں اکبر کے نام کا خطبہ پڑھا جانا	4 فروری 1556
4	دہلی سے تردی بیگ کا فرار	7 اکتوبر 1556
5	پانی پت کی دوسری جنگ	5 نومبر 1556
6	عادل شاہ کی موت	اپریل 1557
7	سکندر کا قلعہ مانکوٹ کو سپرد کرنا	24 مئی 1557
8	بیرم کی اتالیقی کا دور	1556-1560
9	بیرم کی برطرفی	مارچ 1560
10	فتح مالوہ	1561
11	خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ کی زیارت	14 جنوری 1562
12	ادہم خاں کی موت	16 مئی 1562
13	خاندان امبر سے ازدواجی تعلقات	1562
14	فتح میرتا	1562
15	اسیران جنگ کو غلام بنانے کا خاتمہ	1562
16	یاتری ٹیکس کا خاتمہ	1563
17	جزیہ کا خاتمہ	1564
18	فتح گونڈوانا	1564
19	ازبکوں کی بغاوت	1564-67
20	مرزا حکیم کی پسپائی	نومبر/دسمبر 1566
21	چتوڑ کا محاصرہ	1567-68

22	رنتھنبور کی فتح	1568
23	فتح کالنجر	1569
24	مارواڑ کی تذلیل	1570
25	مرزاؤں کی بغاوت	1572-73
26	فتح گجرات	1573
27	بہار و بنگال کی فتح	1574-76
28	منصب داری سسٹم کی تنظیم	1575
29	عبادت خانے کی تعمیر کا حکم	1575
30	ہلدی گھاٹ کی لڑائی	1576
31	اکبر کا خطبہ پڑھنا	26 جنوری 1579
32	منشور جس میں اکبر کو امام عادل قرار دیا	21 ستمبر 1579
33	بنگال کی بغاوتیں	1579-80
34	عبداللہ و عبدالنبی کی برطرفی	1580
35	جشن نوروز کی تجدید	1580
36	صوبوں کی تشکیل نو	1580
37	کابل پر حملہ	1580-81
38	فتنۂ ازبک	1580-98
39	اکبر کا کابل پہنچنا	10 اگست 1581
40	آگرے میں اصلاحات کی دوسری قسط	1582
41	عبادت خانے کا بند کیا جانا	1582
42	سنہ الٰہی کا آغاز	1584
43	کشمیر کا الحاق	1585
44	یعقوب کی اطاعت	1589
45	فتح سندھ	1590-92
46	فتح اڑیسہ	1592

47	فتح بلوچستان	1595
48	حصول قندھار	1595
49	آشٹی کی لڑائی	5 فروری 1597
50	مراد کی وفات	2 مئی 1599
51	فتح احمد نگر	اگست 1600
52	قلعہ اسیر گڑھ کی فتح	جنوری 1601
53	ابوالفضل کا قتل	اگست 1602
54	سلیم کی بغاوت	1603
55	دانیال کی وفات	1604
56	اکبر کی وفات	16 اکتوبر 1605

مزید مطالعے کے لیے پڑھیے

فارسی

ابوالفضل : اکبرنامہ جلد سوم۔ ترجمہ انگریزی ایچ بیورج۔ ببلوتھیکا انڈیکا سیریز
آئین اکبری جلد سوم۔ ترجمہ انگریزی ایچ بلوخمن وایچ ایس جیریٹ
عبدالقادر بدایونی : منتخب التواریخ جلد دوم۔ ترجمہ انگریزی ڈبلیو ایچ لو
خافی خاں : منتخب اللباب
محمد قاسم : گلشن ابراہیمی المعروف بہ تاریخ فرشتہ۔ ترجمہ انگریزی لفٹیننٹ کرنل برگز
نظام الدین احمد : طبقات اکبری جلد سوم۔ ترجمہ انگریزی بی۔ ڈے
سجان رائے : خلاصتہ التواریخ

یوروپین

Du Jarrie: Akbar and the Jesuits, Trans.by Payne
Monserrate: Account of India, Trans. by Hoyland
Maclagan: The Jesuits and the Great Mughals

انگریزی (جدید)

Von Noer: Emperor Akbar

Wilson, H.H.: Religious Innovations of Akbar

Smith V. : Akbar the Great Mughal

Malleson: Akbar

Roy Chowdhri: Din-e-Ilahi

Abdul Aziz: Mansabdari System

G.N.Sharma: Mewar and Mughals

ہندی

اوجھا، او۔ ایچ : راجپوتانہ کا اتہاس

اردو

ذکاء اللہ۔ تاریخ ہندوستان

آزاد ایم۔ ایچ : دربار اکبری

باب 16

جہانگیر

خسرو کی بغاوت ۔ سکھ مذہب ۔ نورجہاں کی شادی

سلیم 24 اکتوبر 1605ء کو قانونی طور پر تخت نشین ہو گیا۔ اس نے جہانگیر کا لقب اختیار کیا۔ اتفاق سے بحساب جمل کلمہ جہانگیر کے حروف کے اعداد اتنے ہی نکلتے ہیں جتنا کہ اللہ اکبر کے۔ جشن تاجپوشی بڑے تزک و احتشام سے منایا گیا۔ اس موقع پر بڑی تعداد میں قیدیوں کو رہا کیا گیا، نئے سکے نئے ناموں کے ساتھ چلائے گئے اور ایک فرمان کے ذریعے ان لوگوں کو جنھوں نے جہانگیر کی تخت نشینی کی مخالفت کرنے کی جرأت کی تھی عام معافی دے دی گئی۔ بیشتر ملازمین اپنی جگہوں پر مستقل کر دیے گئے اور نئے قوانین نافذ ہوئے۔

شہنشاہ نے تمغا اور میر بحری ٹیکس معاف کر دیے، شراب کشی و شراب نوشی ممنوع قرار دی گئی اور مجرمین کے ناک کان کاٹنے کی سزائیں موقوف کر دی گئیں۔ یہ احکام جاری کر دیے گئے کہ سرکاری زمینوں کے عہدے دار اور جاگیر دار اپنے علاقے میں بغیر اجازت کے اپنی رعایا کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم نہ کریں نہ اپنے مفاد کے لیے ان کی زمینیں جوتیں نہ کسی کے مکان پر قبضہ کریں۔ سوداگروں کی اجازت و علم کے بغیر سامان کی گانٹھوں کو نہ کھولا جائے۔ وارثوں کو یہ حق دے دیا

گیا کہ بغیر کسی مداخلت کے موروثی جائداد پر قبضہ کرلیں۔ ان لوگوں کی جائداد کا حساب وکتاب جو کہ لاوارث ہو گئے ہوں علیحدہ رکھا جائے تاکہ "جائز اخراجات" مثلاً مساجد، سرایوں، پلوں، تالابوں اور کنوؤں کی تعمیر کرائی جائے۔ جاگیرداروں اور ملازمین کو حکم دیا گیا کہ سرائیں تعمیر کریں اور سنسان سڑکوں کے آس پاس آبادی بسائیں تاکہ چور ڈاکو رہزنی نہ کرسکیں۔

سرکاری عہدے داروں سے کہا گیا کہ بڑے بڑے شہروں میں شفا خانے تعمیر کرائیں اور حکومت ان کے پورے اخراجات برداشت کرے۔ کھانے کے لیے جانوروں کا ذبیحہ ۱۸ ربیع الاول سے جو شہنشاہ کا یوم ولادت تھا بند کردیا گیا۔ یہ پابندی اس طرح عائد کی گئی کہ ہر سال بادشاہ کی عمر کا جو سال ہوتا اتنے ہی دنوں کے لیے اس سال کے دوران ذبیحہ بند رہتا۔ اس کے علاوہ ہر ہفتے جمعرات و اتوار کو بھی ذبیحہ نہ ہوتا۔ یہ قوانین اکبر کی رائج کردہ اصلاحات پر مبنی تھے اور اس خیال سے نافذ کیے گئے کہ یہ اصلاحات جاری رہیں۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ ان قوانین پر کس حد تک عمل کیا گیا لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ رعایا کے مفاد کے لیے قائم کیے گئے تھے اور یہ بیکار ثابت نہ ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوانین عام قسم کے تھے اور ان سے اسلام یا مسلمانوں کی طرفداری یا حمایت مقصود نہ تھی۔ یہ قوانین کسی حد تک اس لیے بھی نافذ کیے گئے کہ رعایا کے دلوں میں یہ اعتماد پیدا ہوجائے کہ نیا بادشاہ اپنے باپ کی عام سیاست میں نمایاں تبدیلی لانا نہیں چاہتا۔

شاہزادہ خسرو جہانگیر کا سب سے بڑا بیٹا تھا اس کی ماں راجا مان سنگھ کی بہن تھی۔ اس کی شادی عزیز کوکا کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ باوجودیکہ جہانگیر نے مان سنگھ سے قسم کھاکر یہ کہا تھا کہ وہ شہزادے کو کوئی نقصان نہ پہنچائے گا پھر بھی جہانگیر نے اس کو نیم قید کی حالت میں رکھ چھوڑا تھا۔ اس کو اس وقت تک اطمینان حاصل نہ ہوا جب تک کہ اس بات کا یقین نہ ہوگیا کہ جوان شہزادہ نے آگرے کا تخت حاصل کرنے کا ارادہ دل سے بالکل نکال دیا ہے اور اس کے طاقتور حامیوں نے بھی اس کی حمایت ترک کردی ہے۔

عبدالرحیم خان خاناں کا رویہ بھی پوری طرح واضح نہ تھا۔ چنانچہ جہانگیر نے یہی فیصلہ کیا کہ اکبر کے زمانے کے ان امرا کا اثر بالکل ختم کر دیا جائے جن کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ خسرو کی یا اس کے بھائیوں میں سے کسی کی اولاد کی حمایت کریں گے۔ چنانچہ اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ اختیارات ایسے لوگوں کو منتقل کیے جائیں جن پر اس کو پورا پورا اعتماد حاصل ہو۔

اس پالیسی کے مطابق جہانگیر نے محمد شریف خاں کو جو کہ مشہور و معروف خوشنویس اور مصور خواجہ عبدالصمد کا لڑکا تھا ملک کے سب سے بڑے عہدے پر ترقی دے کر امیرالامرا مقرر کر دیا۔ شریف نے سلیم اور اکبر کے درمیان اختلافات کی خلیج کو وسیع تر کرنے میں خاص کردار ادا کیا تھا۔ وہ اکبر کے خوف سے پہاڑیوں اور جنگلوں میں چھپتا پھرتا اور اس نے سخت مصیبتوں کا سامنا کیا۔

جب جہانگیر تخت نشین ہوا تو وہ بھی اپنی پناہ گاہ سے نکلا۔ باوجودیکہ وہ کسی خاص خوبی کا مالک نہ تھا اور سلطنت کے امرا اسے ذلیل نگاہوں سے دیکھتے پھر بھی اس کی بڑی عزت کی گئی۔ اسی طرح مرزا غیاث بیگ کو اعتماد الدولہ کا خطاب دیا گیا اور اس کو نائب وزیر مقرر کیا۔ حالانکہ وہ ایک ہزاری منصب دار تھا۔ بعض استثنیات کو چھوڑ کر جہانگیر کا انتخاب بطور عموم اچھا نہ تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے مداحوں اور حامیوں کا حلقہ اس کی خود کی طرح بہت معمولی لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور وہ سلطنت کے قدیمی اراکین کے دلوں میں نہ تو اعتماد پیدا کر سکا اور نہ ان پر بھروسہ کر سکتا تھا۔

جہانگیر نے فوجیوں کو خوش کرنے کے لیے ان کی تنخواہوں میں بیس سے چار سو فی صدی تک اضافہ کر دیا اور اس کا بار سلطنت کے بھرپور خزانے پر پڑا جو اس کو اپنے باپ سے وراثت، میں ملا تھا۔

6 اپریل 1606ء کو شہزادہ خسرو تقریباً تین سو پچاس سواروں کے ہمراہ آگرے سے فرار ہو گیا۔ متھرا پہنچ کر اس نے حسین بیگ بدخشی کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ تین سو ایماق سواروں کے ہمراہ اس سے مل جائے۔ پھر وہ دہلی ہو کر لاہور کی طرف روانہ ہوا اور راستے میں ایک لاکھ روپے کا خزانہ جسے عبدالرحیم دیوان لاہور

سے آگرے پہ جارا تھا چھین لیا۔ لاہور پہنچنے تک شہزادے کے پاس بارہ ہزار سواروں کی فوج جمع ہو گئی تھی۔ لاہور کے صوبے دار دلاور خاں نے شہزادے کو شہر میں داخلے کی اجازت نہ دی۔ مشکل سے نو دن گزرنے پائے تھے کہ جہانگیر ایک بڑی فوج اور توپ خانہ لے کر آ پہنچا۔ شہزادے نے اطاعت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بھیروال کے مقام پر جنگ ہوئی جس میں شہزادے کو شکست ہوئی اور جان بچا کر بھاگا۔

خسرو نے اپنے ہندی اور افغان ساتھیوں کے مشورے کو کہ آگرے پر حملہ کر کے اس کو لوٹتا ہوا اپنے ماموں مان سنگھ کے پاس بنگال چلا جائے نہ مان کر حسین بیگ بدخشی کا مشورہ قبول کیا کہ رہتاس ہوتا ہوا کابل چلا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بیشتر ساتھیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور اس نے مٹھی بھر ہمراہیوں کے ساتھ فرار ہونے کی کوشش کی۔ دریائے چناب کو پار کرتے ہوئے اس کی کشتی کیچڑ میں پھنس گئی اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔

شہزادے کو ہتھکڑی اور بیڑی پہنا کر لاہور لے جایا گیا اور قید خانے میں مقید کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ اس کو یہ تکلیف بھی برداشت کرنی پڑی کہ راستے کے دونوں طرف پھانسی کے تختوں پر اپنے ساتھیوں کو لٹکے ہوئے سخت عذاب کے ساتھ جان دیتے ہوئے دیکھا۔ یہ دہشت ناک منظر کئی دنوں تک اس کی آنکھوں میں گھومتا رہا۔ وہ دن رات روتا رہتا۔

اس منظر کا اثر اتنا دردناک تھا کہ شہزادہ جب تک زندہ رہا کسی نے اس کو خوش نہ دیکھا۔ کہا جاتا ہے کہ جہانگیر نے اپنے دوسرے بیٹے پرویز کو ولیعہد مقرر کیا۔ ان لوگوں میں جن پر یہ الزام تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح باغی شہزادے سے رابطہ رکھتے ہیں سب سے زیادہ اہم اعتماد الدولہ اور اس کا سب سے بڑا لڑکا محمد شریف تھا۔ اعتماد الدولہ کو قید میں ڈال دیا گیا لیکن بعد میں دو لاکھ روپیہ جرمانہ لے کر رہا کر دیا گیا۔ البتہ محمد شریف کو قتل کر دیا گیا۔

تھانیسر کے شیخ نظام کو ملک بدر کر کے مکہ بھیج دیا گیا۔ عبدالرحیم کو بے دردی کے ساتھ اذیت پہنچائی گئی لیکن بعد میں معاف کر دیا گیا۔ سکھ گرو ارجن دیو کے بارے میں جہانگیر نے حکم دیا کہ اگر وہ جرمانہ ادا نہ کرے تو قتل کر دیا جائے۔ گرو کے لڑکوں اور جائداد

کو مرتضیٰ خاں کے سپرد کر دیا گیا۔

سکندر لودی کے زمانے میں گرو نانک نے سکھ تحریک کی بنیاد ڈالی جس نے آگے چل کر ہندوستان کی تاریخ میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ نانک تلونڈی میں (جو کہ اب ننکانہ کہلاتا ہے) مہتہ کالو پٹواری کے یہاں 15 اپریل 1469ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد نانک نے فارسی اور مروجہ اسلامی علوم کی تعلیم سید حسن سے حاصل کی۔ ان کے بہنوئی نے ان کے لیے سرکاری غلّے کے گودام دار کی ملازمت حاصل کرلی۔ ستائیس سال کی عمر میں جب کہ وہ دو لڑکوں اور دو لڑکیوں کے باپ بن چکے تھے ان کے دل میں روحانی اور مذہبی تلاش و جستجو کا اتنا غلبہ ہوا کہ وہ ملازمت کو چھوڑ بیٹھے اور دور دراز کے سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔

انھوں نے آسام اور ڈھاکہ سے بغداد تک اور تبت و اڑیسہ سے سیلون تک کا سفر کیا اور بہت سے سنت فقیروں سے ذاتی تعلقات پیدا کرلیے۔ وہ ان کے عقائد، اخلاق، مذہب اور عادات کا بغور مطالعہ کرتے۔

کہا جاتا ہے کہ وہ مراد شیخ شرف نامی درویش، شیخ بہاء الدین اور کبیر کی تعلیمات سے بہت متاثر ہوئے۔ اس بات کے متعلق کہ وہ کسی کے باقاعدہ مرید ہوئے شک ہے کیوں کہ ان کے بقول خدا ان کا گرو تھا۔ 1521ء میں جب بابر کے حکم سے ایک خون آشام شمشیر کی طرح جوگایوں کے گلے پر جھپٹ پڑا ہو، سید پور کو غارت اور وہاں کے شہریوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا تو نانک کے دل پر اس سانحے کا گہرا اثر ہوا۔ کہا جاتا ہے اس موقع پر وہ گرفتار ہوئے لیکن بعد میں رہا کر دیے گئے۔ بڑھاپے میں وہ کرتار پور میں بس گئے۔ کاشت کاری شروع کردی اور 22 ستمبر 1539ء کو فوت ہو گئے۔

نانک کبیر ہی کی طرح ایک مصلح تھے البتہ ان کے اظہارات میں نسبتاً زیادہ ٹھہراؤ اور وقار پایا جاتا ہے۔ وہ ملک کے سیاسی و سماجی حالات سے بہت غیر مطمئن تھے۔ ان کا کہنا تھا "کال (زمانہ) قینچی ہے۔ فرماں روا قصائی ہیں، انصاف پر لگا کر اڑ گیا ہے .... میں دکھ سے روتا ہوں کہ نجات کس طرح حاصل ہوگی؟" وہ اندھی تقلید، منافقت، پستی اور بزدلی کی مذمت کرتے اور ہم وطنوں میں جو اخلاقی کمزوریاں پیدا ہوگئی تھیں ان سے نالاں تھے۔ ان کے مذہبی افکار کا سماجی پہلو ان کی تعلیمات سے واضح طور پر آشکار ہوجاتا

ہے۔ ان کا مقولہ تھا "جو شخص سب آدمیوں کو (شاید عورتوں کو بھی) برابر سمجھتا ہے وہ ہی نیک ہے" اور "اس دنیا کی ناپاکیوں میں سے صرف پاکی کی اطاعت و فرماں برداری کرو۔" انھوں نے عورتوں کو مردوں کے ہم رتبہ قرار دیا۔ چھوت چھات اور ذات پات کی تمیز ختم کرنے کے لیے انھوں نے مل جل کر کھانے کا سلسلہ شروع کیا۔ شراب اور سور کا گوشت ممنوع قرار دیا۔ انھوں نے بت پرستی، حلول خداوندی اور شرک کو ممنوع قرار دیا۔ اور ذات پات، اساطیر، مذہبی رسومات کو ماننے سے انکار کیا۔

اس کے علاوہ انھوں نے اخلاقی قدروں پر زور دیا۔ ان کے نزدیک ہندو و مسلمانوں کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں اور یہ سب خدا کے بندے ہیں۔

نانک چاہتے تھے کہ ان کی تحریک ان کے بعد بھی باقی رہے۔ انھوں نے مختلف مقامات پر سنگتیں قائم کیں۔ اور سنگتوں کی دیکھ بھال کے لیے آدمیوں کو مامور کیا۔ اپنے جانشین کے انتخاب میں انھوں نے بہت احتیاط برتی اور لیہنا نامی مرید کو اپنے بیٹوں پر ترجیح دی۔ اس انتخاب کے دو وجوہ تھے۔ اوّل تو یہ کہ لیہنا بلند کردار اور دین دار تھا۔ دوسرے یہ کہ نانک کا سب سے بڑا بیٹا دنیوی امور سے بے نیاز اور تارک الدنیا ہو چکا تھا۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ نانک یہ نہ چاہتے تھے کہ ان کی تحریک ترک دنیا اور دنیوی امور و مسائل سے روگردانی کی تبلیغ کرے۔ ان کا مقصد اور نظریہ تو یہ تھا کہ عوام الناس کے دلوں میں مذہب کی روح پھونک دیں۔ وہ مذہب کو اسلام کی طرح "خانہ داروں کا مذہب" بنانا چاہتے تھے۔

گرو انگد (لیہنا) نے نانک کے اقوال کو مرتب کیا جو "بھٹا گوہری" کی شدھ شکل میں لکھے گئے۔ کیونکہ اس وقت یہی زبان پنجاب کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ یہ زبان لنڈا سے ملتی ہے اور ایک طرح سے مہاجنی سے بہت نزدیک ہے۔ سکھوں کی مقدس کتاب عوام کی زبان میں مرتب ہوئی اور پنجاب کے باشندوں کے رسم الخط میں تحریر کی گئی۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں کیوں کہ بہت سے فقیروں اور درویشوں نے اس سے قبل بھی مقامی زبانوں اور مروجہ رسم الخطوں کو مذہبی ضروریات کے لیے استعمال کیا تھا گرو انگد نے گرو نانک کی تعلیمات کی پُر امن اور باوقار طریقے سے ترویج و تبلیغ کی۔ انھوں نے لنگر خانوں کو سماجی مذہبی ادارے کی شکل دی۔ گرو انگد مارچ 1552ء میں فوت ہوئے۔

گرو انگد نے اپنے بیٹوں کی مخالفت کے باوجود امرداس کو اپنا خلیفہ مقرر کیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سکھ دو طبقوں میں بٹ گئے۔ بڑے طبقے نے گرو انگد اور اُن کے جانشین کو اپنا رہنما مانا اور چھوٹے طبقے نے گرونانک کے سب سے بڑے بیٹے بابا سری چند کو اپنا گرو بنایا اور یہ لوگ اُداسی (تارک الدنیا) کہلائے۔ اُداسی جیسا کہ اُن کے نام سے واضح ہے عقیدۂ رہبانیت کی اور ساری دنیوی چیزوں سے علیحدگی کی تبلیغ و پیروی کرتے۔

گرو امرداس نے ترک دنیا کے خیال کو قبول نہ کیا۔ وہ خود تجارت اور کاشت کاری کرتے اور اپنے مریدوں کو "دنیا دار سنت" اور "ایک گرو ایک شبد اور ایک تفسیر" کی تعلیم دیتے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ شبد ہی قطعی سند ہے اور سارے صحیفوں سے برتر ہے۔

انھوں نے سکھ فرقے کو منظم کیا اور بائیس گدیاں مقرر کیں جن پر گرو کی طرف سے آدمی مقرر کیے جاتے۔ ان کا فرض تھا کہ مذہب کو پھیلائیں اور سکھوں کی بھلائی کا خیال رکھیں۔ گرو کا لنگر ہندو مسلمان، امیر غریب سب کے لیے کھلا ہوا تھا۔ حالانکہ خود گرو سادہ اور موٹا جھوٹا کھاتے۔ لنگر سے مہمانوں کو عمدہ کھانا دیا جاتا جو گھی اور شکر سے تیار کیا جاتا۔ مہدویوں کی طرح یہاں بھی "ہر روز جو کچھ ملتا اسی دن صرف کر دیا جاتا اور کل کے لیے کچھ بھی نہ بچتا۔"

کہا جاتا ہے کہ گرو امرداس کے زمانے میں بہت سے مسلمانوں نے سکھ مت قبول کیا۔ گرو انگد کے ورثا کی مخالفت کے سبب امرداس نے اپنا مرکز گوئندوال میں منتقل کر دیا۔ یہاں پر گرو نے اپنی نگرانی میں ایک باؤلی کھدوائی تاکہ زائرین اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

اکبر نے دورۂ پنجاب کے دوران گرو سے ملاقات کی اور عطیہ دینے کی پیش کش کی لیکن گرو نے نرمی کے ساتھ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ شہنشاہ نے گرو کی شخصیت اور ترک نفس سے متاثر ہو کر گرو کی لڑکی بی بی بھانی کو کئی گاؤں کا عطیہ دیا اور گرو اور اُن کے مریدوں کو یاتری ٹیکس کی ادائیگی سے معاف کر دیا۔ گرو نے شادی و موت کی رسومات کو سادہ بنایا اور ستی، پردہ، شراب کے استعمال کو ممنوع قرار دیا۔ گرو

نے اپنی بیٹی بی بی بھانی کے شوہر رام داسں کو اپنا خلیفہ مقرر کر کے غیر ارادی طور پر ایک ایسی روایت کا آغاز کیا جو آگے چل کر پریشانی کا باعث بنی۔ گرو نے سکھوں کے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"رام داسں ذات کامل ہے جس نے شریر دھار لیا ہے۔ دنیا میں جو اُس کی پیروی کرے گا وہ نجات پائے گا۔"

اس طرح انھوں نے گرو کو اگر خدائی نہیں تو نیم خدائی کی حیثیت دے دی۔ انھوں نے سکھوں کو یہ سبق دیا کہ "اگر وہ کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو اپنی جان اور مال و دولت سب کچھ گرو کی سیوا میں تج دیں اور اس کا حکم بجالائیں۔" امرداس ستمبر 1574ء میں فوت ہوئے۔

اکبر نے گرو رام داس کا بھی احترام کیا۔ 1577ء میں اکبر نے 700 روپے کے عوض پانچ سو بیگھہ زمین جس میں ایک قدرتی چشمہ بھی تھا گرو کو عطا کیا۔ یہ چشمہ ایک تالاب کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا اور اس کے آس پاس امرت سر کا شہر آباد ہوا جو کہ سکھوں کے لیے تجارتی اور مذہبی دونوں لحاظ سے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس موقع محل کا انتخاب بہت ہی عاقلانہ تھا کیوں کہ اُس کے پاس کے علاقے میں محنتی ہندو آباد تھے جو کہ اُس نئے فرقے کے لیے تندرست اور زحمت کش پیرو مہیا کر سکتے تھے۔ یہ شہر جو تجارتی لحاظ سے اہم تھا عبادت خانے کی آمدنی میں بھی بتدریج اضافہ کر سکتا تھا اور نئے عقائد کی تبلیغ و اشاعت میں مفید ثابت ہوتا۔

گرو نے تجارت اور سوداگری کو جو اہمیت دی اس سے محنت و مزدوری کا وقار قائم ہوا، دست کاری، ہنر اور صنعت کو بڑھاوا ملا۔ اور لوگوں کے سینوں میں اولوالعزمی کی روح جوش مارنے لگی۔ یہ سب چیزیں نہ صرف سکھوں کے لیے نعمت ثابت ہوئیں بلکہ آگے چل کر پنجاب کے ہندوؤں نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا۔

رام داسں نے اپنے تیسرے بیٹے ارجن کو جو کہ اٹھارہ سالہ جوان تھا اپنا جانشین مقرر کیا کیونکہ وہ ہی سب سے زیادہ لائق تھا۔ اور اُس کی پیشانی پر روشن مستقبل کی چمک پائی جاتی تھی۔ اس تقرر کے ساتھ موروثی جانشینی کا اصول پوری طرح قائم ہو گیا۔ ہندوستان کے مذہبی فرقوں اور سلسلوں میں یہ طریقہ عام تھا۔ حالانکہ یہ ایک

غیر جمہوری قاعدہ ہے۔ رام داس ستمبر 1581ء میں فوت ہوئے۔

رام داس نے اس کلیہ کو بڑی اچھی طرح پیش کیا کہ گرو کی آتما ایک ہی ہے اور وہی سلف سے خلف میں پہنچتی ہے اور اس کو روشنی دکھاتی ہے۔ انھوں نے ارجن کی نمایاں خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

"جس طرح ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلایا جاتا ہے اسی طرح گرو کی آتما ارجن کے جسم میں داخل ہو چکی ہے۔"

بالفاظ دیگر گرو کی روح ایک گرو سے دوسرے گرو کی روح میں منتقل ہوتی رہتی ہے چنانچہ اس کلیہ سے یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ ہر گرو کا ایک جیسا احترام کرنا چاہیے اور ان سب میں وہی تغیر ناپذیر انا موجود ہے جو مسلسل اور ناقابل تقسیم ہے گرو کے منصب کا سرچشمہ خدا ہے۔

ارجن کی نامزدگی کے سبب ان کے بھائیوں کے دلوں میں بہت مایوسی اور شکایات پیدا ہوئیں لیکن گرو نے اپنے صبر و حوصلے، خوش تدبیر اور جذبۂ مصلحت اندیشی سے وقتی طور سے اس مخالفت پر قابو پالیا اور سکھوں کے اتحاد و تنظیم کا کام شروع کیا۔ وہ دورہ کرتے اور ا... عبادات کی تبلیغ کرتے وہ خود بھی ایسے سنگتوں کو منعقد کرتے اور یہ بتاتے کہ اجتماعی عبادت انفرادی عبادت کی نسبت بہتر ہے۔ انھوں نے مسندوں یعنی تعلیمی اداروں کی جنھیں آن کے اسلاف نے قائم کیا تھا از سرنو تنظیم کی جن کا مقصد سکھ مذہب کی تبلیغ اور ہم عقیدہ لوگوں سے عطیات جمع کرنا تھا۔

سکھوں سے کہا گیا کہ وہ "اپنی آمدنی کا دسواں حصہ خدا کی راہ میں نذر کریں" یہ نذر ایک طرح سے لازمی قرار دے دی گئی۔ مسند یا ان کے معاون میورا کہلاتے جو جگہ جگہ سے نذریں جمع کرتے۔ انھیں اس کی اجازت نہ تھی کہ نذر و نیاز کی آمدنی کو اپنے ذاتی مصرف میں لائیں۔ اس طرح امرت سر کے مرکزی خزانے کے لیے مستقل آمدنی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اب گرو کے لیے ممکن ہوگیا کہ دوسرے شہر مثلاً ترن تارن اور کرتار پور بسائے چنانچہ وسیع پیمانے پر تعمیر و کھدائی کا کام شروع ہوگیا۔

امرت سر کے تالاب کے بیچ انھوں نے دربار صاحب (گولڈن ٹیمپل) کی تعمیر شروع کی جو سکھوں کا مرکزی عبادت خانہ تھا۔ یہ گویا سکھوں کا کعبہ تھا۔ ان کے اہم ترین کاموں

میں سے ایک یہ ہے کہ انھوں نے خود اپنے اور پچھلے گروؤں نیز کم از کم پانچ مسلمانوں اور دس ہندو درویشوں کے بھجن مرتب کیے جو "آدی گرنتھ" کہلاتے ہیں۔ یہ کتاب گویا سکھوں کی بائبل بن گئی اور سکھ مذہب کے معتقدین اس کو "ویدوں اور قرآن سے بھی بالاتر سمجھتے۔" یہ آدی گرنتھ 1604ء میں دربار صاحب میں رکھ دیا گیا۔

گرو کا دربار اتنا عالی شان ہوتا کہ مغل سلطنت کے بہت سے امرا کے دربار کی شان و شوکت اس کے سامنے ماند پڑجاتی۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ گرو راجا جنک کی طرح معاشی زندگی بسر کرے جو دینی اور دنیوی کمالات کے اتحاد کا ایک مکمل نمونہ تھی۔ انھوں نے یہی مثال اپنے مریدوں کے سامنے پیش کی اور ان کو اس بات کی ترغیب دی کہ روحانی و اخلاقی فضائل کے ساتھ ساتھ سپاہیانہ خوبیاں اور تجارت میں ترقی کا جذبہ بھی ابھاریں۔

سکھوں نے گھوڑوں کی تجارت کی طرف توجہ دی جو کہ اس زمانے میں بہت ہی سود مند تھی۔ اس سے فن شہسواری سیکھنے میں بھی مدد ملتی: "وہ جو سپاہیانہ مشقیں کرتے ہیں۔ وہ میدان جنگ میں نڈر ہو کر لڑتے ہیں، وہ جو میدان جنگ میں فتح کرنے یا مرنے کا فیصلہ کر کے جاتے ہیں۔ اور وہ جو مرتے دم ست نام کو اپنے سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔ وہ موت و زیست کی اذیت سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔" ان تمام باتوں نے مل کر سکھوں میں اپنی ذات اور اپنے فرقے کے متعلق گہرا احساس پیدا کر دیا۔ اس فرقے میں دولت، جوش اور قوت کا اضافہ ہوا اور اس طرح وہ دوسرے فرقوں اور مذہبی و سیاسی طبقوں کے لیے جاذب توجہ بن گئے۔

اکبر کی وسیع المشربانہ سیاست سے فائدہ اٹھا کر سکھ گروؤں کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ اپنے سماجی و مذہبی کاموں کو حسب دلخواہ انجام دیں۔ شہنشاہ کو اس تحریک یا اس کی تنظیم میں کوئی خاص قابل اعتراض بات معلوم نہ ہوئی لیکن یہ تحریک پنجاب کے جاگیرداروں اور مذہبی ٹھیکیداروں کی آنکھوں میں کھٹکتی ہوگی۔ اس وقت سرہند احیائے دین اسلام کی ایک زبردست تحریک کا مرکز بنا ہوا تھا جس کی رہنمائی شیخ احمد الفاروقی سرہندی (متولد 64-1563) کر رہے تھے جو کہ ایک راسخ العقیدہ صوفی سلسلے کے خلیفہ بھی تھے۔

سولھویں صدی کے اختتام پر دہلی میں وہ نقشبندیہ سلسلہ میں شامل ہوئے، اور ان کا دعویٰ تھا کہ دین مبین اسلام کے مختلف سلسلے، عقائد کی روحانی طاقت ان کے اندر متمرکز ہے۔ جہانگیر نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس کی پیدائش کے وقت ہی سے خدا نے اس کو ہندوستان کا بادشاہ منتخب کرلیا تھا۔ اسی طرح شیخ احمد کا بھی یہی دعویٰ تھا کہ منشائے الٰہی یہی تھا کہ وہ دنیائے اسلام کی مذہبی اور روحانی رہنمائی کریں۔ وہ بڑے عالم باعمل تھے اور لوگ ان کا بہت احترام کرتے۔ ان کو اسلام کے دوسرے ہزار سالہ دور کا مجدد کہتے ہیں۔ اسی لیے ان کا خطاب مجدد الف ثانی ہے۔ ان کا مقصد اسلام کو ہر قسم کی بدعات اور حشو و زوائد سے پاک کرنا تھا۔

انھوں نے اور باتوں کے علاوہ شیعیت اور دین الٰہی کی تبلیغ کے خلاف کوششیں جاری رکھیں، سپاہیوں اور امرا کے درمیان زبردست تبلیغ کی اور بہت سے امرا کو اپنے خیالات کا طرفدار بنالیا۔

شیخ کے مداحوں میں خان خاناں، سید صدر جہاں، خان جہاں اور مہابت خاں کے نام لیے جاتے ہیں۔ اس وقت اکبر اپنی عمر کے آخری سال گزار رہا تھا اور اس کی پوری توجہ دکن کے امور اور سلیم کی بغاوت کی طرف مبذول تھی۔ اس کے علاوہ اکبر کو اتنا استحکام حاصل ہو چکا تھا کہ ہندوستان کے میدانی علاقوں میں کسی متعصب تحریک کا چلانا آسان نہ تھا۔

اکبر کے آخری ایام میں البتہ بعض امرا نے آگرے کی محافظ فوج کے سالار فرید بخاری کی سرکردگی اور بارہ کے سیدوں کی حمایت میں سلیم کی تخت نشینی کی پُرزور حمایت کی۔ ان لوگوں نے سلیم کو اس شرط پر اپنی پرجوش حمایت کا یقین دلایا تھا کہ وہ اسلام کی حفاظت کرے گا۔

غالباً اس وعدے کا مطلب یہ تھا کہ جہانگیر اکبر کی روش کے مقابلے میں روایتی اسلام کی حمایت کرے گا۔ جہانگیر کی تخت نشینی کے فوراً بعد شیخ فرید کو پنجہزاری منصب عطا ہوا اور سلطنت کا میر بخشی بنا دیا گیا۔ فرید اور شیخ احمد کے تعلقات بہت گہرے تھے۔
چنانچہ پنجاب میں دو مستحکم مذہبی تحریکیں وجود میں آچکی تھیں جو مفید بھی ہو سکتی تھیں اور مضر بھی۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے ڈھنگ سے عوام اور خاص طور سے پنجاب

کے رہنے والوں کی سیاسی و مذہبی زندگی پر اثر انداز ہوئیں ان دونوں تحریکوں کے پیرو اپنے عقائد و جذبات اور پُرجوش رہبروں کے سبب سماجی و سیاسی پہلو اختیار کر رہے تھے لہٰذا جہانگیر کو دونوں ہی سے نبٹنا پڑا۔ جہانگیر نے سکھ مذہب اور اس کے گرو کے متعلق سُن رکھا تھا "جس کو مذہبی اور دنیوی رہنما کہہ کر پکارتے تھے" اور جو اپنے دین میں مسلمانوں کو بھی شامل کر لیتا۔ جہانگیر اس سلسلے میں مزید یہ لکھتا ہے کہ "مجھے کئی مرتبہ یہ خیال آیا کہ اس بے بنیاد موضوع (سکھ مذہب) کو ختم کردوں یا پھر اس (گرو) حقیر انسان کو اسلام کا حلقہ بگوش بنالوں"۔

باغی شہزادہ خسرو جب پنجاب سے فرار ہوتا ہوا گزرا تو اس نے گرو سے ملاقات کی۔ کہا جاتا ہے کہ گرو نے شہزادے کو مبارک باد دی۔ اس کی پیشانی پر زعفران کا قشقہ کھینچا اور اپنی دعاؤں کے علاوہ کچھ مالی مدد بھی دی۔

خسرو کی بغاوت نے جہانگیر کے مزاج میں تندی پیدا کر دی تھی اور وہ سخت گیر بھی ہو گیا تھا۔ گرو ارجن نے اپنے سلوک کی وضاحت میں بیان کیا کہ انھوں نے خسرو کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا اس کے سوا کوئی اور مقصد نہ تھا کہ شہنشاہ اکبر کے پوتے سے جو پریشان حالی میں مبتلا تھا مہربانی اور ہمدردی کا اظہار کرے لیکن جہانگیر اس بیان سے مطمئن نہ ہوا اور اس نے گرو پر دو یا ڈھائی لاکھ کا جرمانہ عائد کر دیا۔ گرو نے یہ کہہ کر کہ ان کے پاس اپنی کوئی دولت نہیں اور جو کچھ ہے وہ غریبوں، لاچاروں اور مسافروں کے لیے ہے" جرمانہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

اس بات پر شہنشاہ نے حکم صادر کیا کہ گرو کو گرفتار کر لیا جائے۔ ان کے بچے اور مکان فرید بخاری کو دے دیے جائیں جس کو اب مرتضیٰ خاں کا خطاب مل چکا تھا۔ ان کی جائداد ضبط کر لی جائے اور گرو کو قتل کر دیا جائے۔ البتہ جہانگیر نے سکھوں کے خلاف نہ تو کچھ کیا اور نہ کہا۔ سکھوں کے خلاف کوئی الزام عائد نہ کیا گیا۔ اور محض مذہبی بنیادوں پر ایذا رسانی جہانگیر کا شیوہ نہ تھا۔ اس کے باوجود گرو کو جو سزا دی گئی وہ اس الزام کے مقابلے میں جو ان پر عائد کیا گیا بہت ہی زیادہ سخت اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی تھی۔

عبدالرحیم اور شیخ نظام کو جو سزائیں دی گئیں ان کا اس سزا سے کوئی مقابلہ نہیں

کیا جا سکتا۔ گرو نے نہ تو جرمانہ ادا کیا اور نہ ہی اپنے مریدوں کو جرمانے کی ادائیگی کے لیے چندہ جمع کرنے کی اجازت دی۔ سکھ روایات کے مطابق چندو شاہ نے ذاتی رنجش کی بنا پر گرو کو اتنی اذیت پہنچائی کہ وہ مر گئے اور 30 مئی 1606ء کو ان کی نعش دریائے راوی میں پھینک دی گئی۔

گرو کی موت سے شیخ احمد خوش ہوئے اور ان کو یہ امید ہوئی کہ اس واقعے سے سکھ تحریک کو زبردست دھکا پہنچے گا لیکن اس بات کا سکھوں پر بالکل مختلف طریقے سے اُلٹا اثر ہوا اور ان لوگوں میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی۔ اس سانحے کو انھوں نے بڑی تلخی کے ساتھ برداشت کیا اور اس واقعے نے ان کو یہ احساس دلایا کہ وہ "خود کو مسلح کریں اور اگر زندگی چاہتے ہیں تو جنگ کے لیے آمادہ ہو جائیں"۔

گرو ارجن دیو کی موت کی دردناک خبر ان کے گیارہ سالہ لڑکے و جانشین ہرگوبند کو ایک الہام بخش پیغام کے ساتھ ملی جس میں کہا گیا "اس سے (گرو ارجن کے جانشین) کہہ دو کہ ماتم نہ کرے اور نہ بزدلانہ طریقے سے سوگ منائے بلکہ خدا کے گن گائے۔ اس کو پوری طرح مسلح ہو کر تخت نشین ہونا چاہیے۔ جہاں تک ہو سکے اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ فوج تیار کرے"۔ گرو کی شہادت نے سکھوں کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ یہاں تک کہ جو باتیں سکھ تحریک میں ابھی تک پوشیدہ تھیں وہ واضح ہو گئیں۔ یہ پیغام اس بات کا منشور تھا کہ عادلانہ جذبات جنگجوئی کو ارادتاً اور بتدریج منظم کیا جائے۔ سکھ مذہب کو سپاہیانہ مذہب بنایا جائے اور گرو ایک مقدس مجاہد کی حیثیت اختیار کرے۔ اسلام کی طرح جہاد کو مذہبی فرائض میں شامل کر کے معتقدین کو اس کی انجام دہی کی تعلیم دی گئی۔

گرو ہرگوبند نے اپنے والد کی وصیت کو گرہ میں باندھ لیا۔ دس دن تک گرنتھ صاحب کا پاٹھ ہوتا رہا۔ اس کے بعد گرو گدی نشین ہوئے اور پرانی رسم کے مطابق ان کو سیلی اور پگڑی پیش کی گئی۔ گرو نے حکم دیا کہ یہ دونوں چیزیں بھی فوراً ہی خزانے میں جمع کرا دی جائیں اور یہ کہا "تلوار کی پیٹی میری سیلی ہوگی اور پگڑی کے بجائے میں شاہی کلغی استعمال کروں گا"۔ پھر انھوں نے دو تلواریں باندھیں "جو کہ مذہبی و دنیوی اقتدار کی علامت تھیں"۔ گرو کی ماں نے تنہائی میں ان کو سمجھایا لیکن انھوں نے یہی جواب دیا "میرے

متعلق آپ بالکل پریشان نہ ہوں ہر بات مرضیٔ مولیٰ کے مطابق ہوگی۔"

ہرگوبند نے اب مسندوں کو حکم دیا کہ آئندہ متعقدین سے جو نذر و نیاز وصول کی جائے وہ ہتھیار اور گھوڑوں کی شکل میں ہو نہ کہ روپے پیسے کی صورت میں۔ انھوں نے پیروں کو گوشت کھانے کی اجازت دے دی اور "تخت اکال بنگا" کی بنیاد رکھی جو کہ پتھروں کا بنا ہوا ایک پختہ دالان تھا۔ اسی کو انھوں نے اپنا تخت قرار دیا۔ شہر امرت سر کو ایک چھوٹی سی فصیل کے ذریعے محفوظ کر دیا گیا اور اس کا نام لوہ گڑھ رکھا۔ جب مشہور ہوا کہ گرو ہرگوبند فوجی لیاقت کے لوگوں کی قدر کرتے ہیں تو بہترین قسم کے جنگجو اور پہلوان ان کے پاس آئے اور ان میں سے انھوں نے اپنے ذاتی محافظین کا دستہ منتخب کیا۔

ان کے سپاہی تنخواہ دار نہ تھے وہ یا تو قطعاً رضاکارانہ طور پر شامل ہوئے تھے یا پھر ان کو صرف دو وقت کا کھانا، لباس، ایک گھوڑا اور ہتھیار دیے جاتے۔ کشتی، جنگ اور شکار روز کا مشغلہ تھا۔

"گرو ہانکا لگانے والوں کے گروہ کے ساتھ شکاری کتوں اور پالتو چیتوں اور مختلف النوع بازوں کو لے کر (ہر روز) لمبی مسافت طے کرتے لیکن مذہبی تعلیمات سے غفلت نہ برتتے۔" گرو ساون کے بادلوں کی طرح ہدایات کی بارش کرتے اور سکھ ان کے فیض سے دھان کے کھیتوں کی طرح سرسبز و شاداب ہو رہے تھے"۔ سکھوں کو حکم دیا گیا کہ سارے تنازعات کو آپس ہی میں طے کر لیا کریں۔

لیکن گرو کا ارادہ یہ نہ تھا کہ آئندہ جلد ہی کسی سے جھگڑا مول لیں چہ جائیکہ مغل شہنشاہ سے۔ انھوں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ شہنشاہ جہانگیر سے ملیں کیونکہ شہنشاہ نے ان کے دوہرے اقتدار اور اکال تخت سے گھبرا کر 1612ء میں بلا بھیجا تھا۔ جہانگیر نے حکم دیا کہ ان کے باپ پر جو جرمانہ عائد کیا گیا تھا وہ ادا کریں لیکن انھوں نے انکار کر دیا لہٰذا ان کو بارہ سال کے لیے گوالیار کے قید خانے میں بھیج دیا۔

کچھ عرصے تک ان کو قید میں ضرور رکھا گیا لیکن ان کے ساتھ قلعدار کا سلوک بہت اچھا تھا۔ پھر جب گرو کی ماں نے بھائی جیٹھا کو ان کی رہائی حاصل کرنے کے لیے دہلی روانہ کیا تو ان کا مقصد وزیر خاں کی مدد سے پورا ہوگیا اور شہنشاہ کی ناراضگی ختم ہوگئی۔ گرو کو رہا کر دیا

گیا اور چندو کو اُن کے سپرد کر دیا گیا تاکہ وہ جس طرح چاہیں اُس کو سزا دیں۔ اس کے بعد جہانگیر کے زمانے میں حکومت کا سکھوں سے کسی قسم کا جھگڑا نہ ہوا۔ سکھوں کے ایک گروہ نے گرو کی سیاست اور منصوبوں پر پُر زور اعتراض کیا اور یہ اعتراضات بھائی گورداس کے فصیح و بلیغ الفاظ اور کلمات سے ظاہر ہوئے لیکن گرو نے اس کی پرواہ کیے بغیر اپنا کام جاری رکھا۔

لاہور میں جہانگیر کو اس بات کا علم ہوا کہ فراہ کے صوبے دار اور سیستان کے ملک نے حسین خاں شاملو صوبے دار ہرات کی مدد سے قندھار کا محاصرہ کر لیا ہے۔ شہنشاہ کے لیے اکبر کی موت اور خسرو کی بغاوت کے بعد یہ واقعہ چنداں تعجب خیز نہ تھا۔ وہ اس سے بھی بے خبر نہ تھا کہ برخاست شدہ مرزاؤں کے کچھ پیرو سرحد کے ایرانی افسروں کے ساتھ خط و کتابت کر رہے تھے تاکہ ان کو قندھار پر حملہ کرنے کی دعوت دیں۔ ادھر ایرانی جو قندھار کو دوبارہ حاصل کرنے کے خواہاں تھے اکبر کی موت کی اطلاع پانے کے بعد ایسی کوشش کرنے سے باز نہ رہ سکتے تھے۔

چنانچہ شہنشاہ نے فیصلہ کیا کہ وہ ابھی لاہور ہی میں مقیم رہے تاکہ بوقت ضرورت کابل بھی جا سکے۔ جہانگیر نے یہ فیصلہ اپنے بعض مشیروں کے مشورے کے برخلاف کیا کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ شہنشاہ دارالسلطنت لوٹ جائے تاکہ وہاں سے گجرات، بنگال اور دکن کے حالات پر جو ابتر ہوتے جا رہے تھے نگاہ رکھ سکے۔ ٹھٹھ کے مشہور حکمراں جانی بیگ کے بیٹے مرزا غازی بیگ کو 1607ء میں قندھار کی نجات کے لیے ایک مضبوط فوج دے کر روانہ کیا گیا۔

1607ء میں جب قندھار پر حملہ ہوا تو شاہ عباس شاہ ایران نے اس کی طرف سے چشم پوشی کی لیکن اس میں کوئی عملی حصہ شاید اس لیے نہیں لیا کہ اس وقت ترکوں کے ساتھ اس کی لڑائی تھی۔ چنانچہ حملہ آور فوج اتنی آراستہ اور مستعد نہ تھی کہ قندھار کو جلد فتح کر سکتی۔

جہانگیر کی خوش قسمتی سے قندھار اس وقت شاہ بیگ خاں جیسے لائق وفادار بہادر اور تجربے کار شخص کے زیر حکومت تھا۔ وہ دشمنوں کے مقابلے کے لیے بالکل آمادہ تھا۔ اس نے قلعہ کو مستحکم کر لیا تھا اور اس کے سپاہی بھی خوش تھے۔ محاصرے نے

طول کھینچا یہاں تک کہ غازی بیگ قندھار کے نواح میں پہنچ گیا۔ ایرانی اس کا اندازہ نہیں لگا سکے کہ شہنشاہ ہند اس قدر تیز اقدام کر سکتا ہے لہٰذا غازی خاں کی آمد نے ان کے چھکے چھڑا دیے۔ وہ لوگ لڑنے کے لیے آمادہ نہ تھے چنانچہ انھوں نے تیزی سے سرحد پار کر کے راہ فرار اختیار کی

شاہ عباس نے اپنے صوبے داروں کے کوتاہ نظرانہ عمل سے تجاہل کا اظہار کیا۔ اس نے کہا کہ حملہ اس کی اجازت کے بغیر کیا گیا اور جوں ہی اس کو حملے کا علم ہوا اس نے "حملہ آوروں کو بذریعہ فرمان فوراً واپسی کا حکم صادر کیا۔ اس نے فروری۔ مارچ 1607ء میں حسین بیگ کو اپنا ایلچی بنا کر روانہ کیا تاکہ خاندان تیموریہ سے اپنی دوستی و محبت کا اظہار کرے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ایران یہ توقع رکھتا تھا کہ جہانگیر کو اس کے لیے راضی کر لیا جائے گا کہ وہ قندھار اس کو دے دے۔

شاہ نے اپنے سفیر یادگار علی سلطان تالش اور دوسروں کے ذریعے ایک سے زائد مرتبہ قندھار کی واپسی کے سوال کو چھیڑا لیکن جہانگیر نے ہر دفعہ اس بات کو ٹال دیا۔ جب شاہ اپنی سیاسی کوششوں میں ناکام ہو گیا تو اس نے طاقت کے استعمال کا فیصلہ کر لیا۔

"جب مجھ کو خسرو کی بغاوت کی طرف سے اطمینان حاصل ہوا اور قزلباشوں کو آسانی سے ہرا دیا گیا تو میرا دل چاہا کہ کابل جا کر شکار کروں۔" لہٰذا 27 مارچ 1607ء کو وہ آہستہ آہستہ کابل کی طرف روانہ ہوا اور جون میں وہاں پہنچ گیا۔ وہاں وہ کابل کے قدرتی مناظر، شکار، تفریح اور شراب سے لطف اندوز ہوا۔ اس نے بعض عمارتوں کی مرمت اور سڑکوں و باغوں کی اصلاح کا حکم دیا۔

اس نے بدخشاں کے معاملات میں دلچسپی دکھائی اور مرزا حسین کو جو شاہ رُخ مرزا کا لڑکا کہلایا جاتا تھا حکم دیا کہ دربار میں حاضر ہو کر اپنی فوجی مدد کی درخواست کے بارے میں گفتگو کرے۔ بنگش افغانوں کو سزا دینے کے لیے ایک مہم بھیجی گئی۔ دوسری مہم "غزنی کے راستے کو اس طرح محفوظ کرنے کے لیے روانہ کی گئی کہ مسافر قندھار سے بہ سہولت تمام کابل پہنچ سکیں"۔ جہانگیر نے کابل میں اپنی شاہانہ آمد اور کابلیوں کو خوش کرنے کے لیے کابل میں سرکاری و دیگر مالیات کو قطعاً معاف کر دیا اور تقریباً گیارہ ہفتے رہ کر اگست 1607ء

میں واپسی کا سفر اختیار کیا۔

ابھی کابل سے روانہ ہوئے مشکل سے ہفتہ بھر گزرا ہوگا کہ سرخاب کے مقام پر جہانگیر کو قتل کرنے کی ہیبنہ سازش کا پتہ لگا۔ شہزادہ خرم جہانگیر کا تیسرا بیٹا خسرو کا رقیب تھا اُس نے شہنشاہ کو دیوان خواجہ ویس کی اطلاعات کی بنیاد پر یہ خبر دی کہ خسرو کے بھڑکانے پر کچھ جوان لوگوں نے جن میں دیوان اعتماد الدولہ کا بیٹا محمد شریف، وکیل سلطنت جعفر بیگ آصف خاں کا بھتیجا نورالدین اور متوفی حکیم ابوالفتح کا بیٹا فتح اللہ بھی شامل تھے چار پانچ سو آدمیوں کے ساتھ مل کر شہنشاہ کے قتل کا منصوبہ تیار کیا ہے۔ خرم نے ایک کاغذ بھی پیش کیا جس میں سازشیوں کے نام درج تھے۔ جہانگیر کا دل خسرو کی طرف سے کچھ نرم ہوتا جا رہا تھا۔ مگر اس خبر نے اس کو اتنا غضب ناک کر دیا کہ اس نے خان جہاں کا مشورہ فوراً مان لیا اور کاغذ کو بغیر پڑھے آگ میں جھونک دیا۔

شہنشاہ جہانگیر نے جو اپنی مشہور و معروف زنجیر عدل پر اس قدر نازاں تھا بغیر کسی مزید تحقیق و تفتیش کے نورالدین شریف اور دوسرے تین اشخاص کو جو سازش کے رہنما سمجھے جاتے تھے قتل کرا دیا۔ اعتماد الدولہ کو قید کر دیا جو دو لاکھ روپئے جرمانہ ادا کرنے کے بعد رہا کیا گیا لیکن اس کو عہدہ پر دوبارہ مقرر نہ کیا گیا۔ بدقسمت شہزادے کو اندھا کرنے کا حکم دے دیا۔ "جب اس کی آنکھ میں سلائی پھیری گئی تو اس کو اتنی تکلیف ہوئی کہ اس کا ذکر بیان سے باہر ہے" اس ناپاک کام کو مہابت خاں نے اپنے ہاتھوں سے انجام دیا۔ بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہزادے کی بینائی پوری طرح ضائع نہ ہوئی کیوں کہ محبت پدری نے جب پھر جوش مارا تو جہانگیر نے سخت کوشش کی کہ اس کی بینائی لوٹ آئے۔ حکیم صدرا ایک آنکھ کی روشنی پوری طرح اور دوسری آنکھ کی جزوی طور پر ٹھیک کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اگر جہانگیر کے بعد خسرو تخت نشین ہوتا تو ہندوستان کی تاریخ کیا ہوتی؟ اس سوال کا جواب کوئی مورخ نہیں دے سکتا۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ خسرو اگرچہ جہانگیر کا بیٹا تھا لیکن بہت سی باتوں میں باپ سے بہتر تھا۔ اس نے ابوالفضل اور ابوالخیر کے زیر سایہ اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ ہندی فلسفے کا سبق شیووت سے حاصل کیا تھا جو ایک مشہور عالم تھا۔

شہزادے نے قلم و شمشیر دونوں کے استعمال میں مہارت پیدا کی۔ خسرو سنجیدہ، خوش اخلاق اور متین تھا اور اس میں ان عیبوں میں سے کوئی بھی نہ تھا جو جہانگیر کے دامن کو داغ دار بنا چکے تھے۔ اس کو شراب اور عورت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی دلآویز صورت، حسن اخلاق، نیک کردار، باوقار اطوار، آزادانہ خیالات، نرم و نازک دل نے دادا کا سب سے چہیتا اور عوام و امراء کی اکثریت کا محبوب بنا دیا تھا۔

بعض وجوہ کی بنا پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس شہزادے نے اکبر کے دوسرے وارثوں کی بہ نسبت دادا سے زیادہ فیوض حاصل کیے تھے اور اس بات کی توقع کی جاتی تھی کہ وہ دوسروں کی بہ نسبت اکبر کی سیاست کو بہتر اور کامیاب طریقے سے انجام دے سکے گا۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ اپنے باپ کی طرح سازشیں کرنے کے مشکل فن میں ناتجربہ کار تھا اور اس کے سب سے بڑے حامی عزیز کوکا اور مان سنگھ یا تو اکبر کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے یا تخت کی آبرو کی خاطر یا پھر ذاتی وجوہ یا خانہ جنگی کے ڈر سے اپنی طاقت کو پوری طرح کام میں نہ لائے۔

ان سب سے زیادہ ان لوگوں میں قوت فیصلہ کی کمی کے سبب خسرو تخت نشینی سے محروم رہا۔ ان سب کے علاوہ مذہبی امور میں خسرو کے آزاد خیالات اور درجہ دوم و سوم کے امراء کے اس خوف نے کہ خسرو کی تخت نشینی کے نتیجے میں طاقت اور اختیارات عزیز کوکا اور مان سنگھ کے ہاتھوں میں ہمیشہ کے لیے آجائیں گے، شہزادے کے مفاد کو کافی نقصان پہنچایا۔

امراء کا راسخ العقیدہ طبقہ جہانگیر کو بعض واضح وجوہ کی بنا پر ترجیح دیتا تھا۔ خسرو کی ناکامی اور بدبختی کے باوجود لوگوں کے دلوں سے اس کی ہمدردی کا جذبہ جلد ہی ختم نہ ہوا۔ چار سال بعد جب اُچ خاندان کے قطب نامی شخص نے بھاگل پور (بہار) میں یہ اعلان کیا کہ وہ شہزادہ خسرو ہے اور جیل سے بھاگ آیا ہے تو حامیوں کی ایک بڑی تعداد اس کے گرد جمع ہو گئی۔ اس فرضی شہزادے نے اپریل 1610ء میں جب کہ بہار کا صوبے دار افضل خاں ایک مہم پر گیا ہوا تھا شہر پٹنہ پر قبضہ کر لیا۔ پٹنہ کے ہاتھ سے نکل جانے کی خبر سن کر صوبے دار واپس آیا اور دریائے پن پن کے

کنارے قطب کو شکست دی۔ قطب پٹنہ کے قلعہ میں واپس بھاگ آیا لیکن اس کو قلعہ سپرد کرنے پر مجبور کر دیا گیا اور پھر وہ اپنے کئی ساتھیوں کے ہمراہ قتل کر دیا گیا۔

اکبر نے کئی بار میواڑ فتح کرنے کا کام شہزادہ سلیم کو سونپا لیکن اس کا دل اس طرف مائل نہ ہوا۔ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے اپنے باپ کی خواہش کو پورا کرنا چاہا اور ضمناً یہ بھی چاہا کہ اپنے عہد حکومت کو جہاد مقدس سے شروع کرے جس سے اس کا امکان تھا کہ اس کے حامی خوش ہوں گے۔ تخت نشینی کے تھوڑے ہی عرصے بعد اس نے اپنے دوسرے بیٹے پرویز کو بیس ہزار سوار دے کر" رانا کے خلاف . . . جو کہ ایک مکروہ کافر تھا جہاد کرنے کے لیے" روانہ کیا۔

شہزادے کے ہمراہ جعفر بیگ، آصف خاں اور راجا جگن ناتھ جیسے لائق افسر بھیجے گئے۔ ان ہی لوگوں میں مہارانا پرتاپ کا سرکش بھائی رانا ساگر بھی تھا۔ اس کو میواڑ میں مغل علاقوں کے علاوہ چتوڑ بھی دے دیا گیا تھا۔ شاید شہنشاہ کو یہ توقع تھی کہ رانا ساگر کو چتوڑ کا قانونی رانا تسلیم کرنے سے میواڑ کے باشندوں کے دلوں میں اعتماد و امید کی کرنیں پھوٹ پڑیں گی اور وہ مغل شہنشاہ سے مخالفت اور نافرمانی کی سیاست کو ترک کر کے اس کے گرد جمع ہو جائیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو بہت خوب ورنہ اس ترکیب سے میواڑ کا متحدہ محاذ ٹوٹ جائے گا اور اس کو فتح کرنا آسان ہوگا۔

پرویز کو یہ ہدایت دی گئی کہ رانا امر سنگھ سے ملاقات کر کے اس کو مطیع ہونے کی تجویز پیش کرے اور کہے کہ وہ اپنے بیٹے کرن سنگھ کے ہمراہ دربار میں حاضر ہو اگر رانا اطاعت سے انکار کر دے تو فوجی اقدامات کے ذریعے اس کا سر جھکا دیا جائے۔

رانا امر سنگھ جس نے اپنے عظیم باپ کی پریشان حالی دیکھی تھی اور جس کو مغل سلطنت کے وسائل اور طاقت کا اچھی طرح اندازہ تھا لڑائی سے کتراتا رہا۔ اس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ تین نسلوں سے جو جنگ جاری تھی میواڑ اس کے نقصان دہ اثرات سے ہنوز نجات نہ پا سکا تھا یا پھر اس پر خود مغلوں کے ساتھ ایک طولانی جنگ کے خیال سے ہی لرزہ طاری ہو جاتا

اس کے امرا نے اس کے نظریات سے اتفاق نہ کیا کیوں کہ ایسا کرنے سے اُن کے نظریات اور اُن کی آبرو کو سخت صدمہ پہنچتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے یہی فیصلہ کیا کہ

بغیر جنگ کیے اطاعت قبول نہ کریں گے۔

انھوں نے رانا پرتاپ کی زندگی سے جو سبق حاصل کیا تھا وہ ہنوز ان کے دلوں میں تازہ تھا۔ وہ اس بات کے خواہاں تھے کہ سرخ جھنڈا اڑتا رہے اور اگر ضرورت ہو تو وہ لوگ عظیم رانا کے خاردار راستے پر بھی گامزن ہونے کو تیار رہیں۔ امر سنگھ کو ان کے جوش و جذبے کے سامنے جھکنا پڑا۔ اکا دکا جھڑپیں ہوئیں۔ بھیلوں نے مغلوں کی رسد بند کرنا شروع کر دی اور دیور کا درہ پار کرنے کی مغل کوششیں ناکام ہو گئیں لہذا جہاں تک ہو سکا انھوں نے ملک میں لوٹ مار مچا دی اور جنگ کی آگ آہستہ آہستہ بھڑک اٹھی۔

ابھی تک کوئی فیصلہ کن جنگ نہ ہو پائی تھی کہ شہزادہ خسرو کی بغاوت کے سبب شہزادہ پرویز کی واپسی کے احکامات پہنچ گئے۔ جنگ کے ساتھ ساتھ مغلوں کی سیاسی کارروائیاں بھی جاری تھیں۔

آصف خاں نے شہزادے کو بتایا کہ رانا اپنے ایک بیٹے باگھا کو دربار میں بھیجنے کے لیے تیار ہے۔ شہزادے نے یہ تجویز ماننے سے انکار کر دیا۔ البتہ یہ کہا کہ اگر رانا خود حاضر ہو یا کرنی سنگھ کو بھیجے تو وہ صلح کی شرائط پر بات چیت کرنے کو آمادہ ہے۔ معاملہ اس سے آگے نہ بڑھا۔

شہزادہ اور آصف خاں دونوں ہی دربار میں واپس چلے گئے اور راجا جگن ناتھ اور دیگر افسران کو رانا کی نقل و حرکت کی دیکھ بھال اور مغل علاقوں کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ رانا بذات خود کسی بھی فوجی اقدام سے گریز کرتا رہا۔

یہ خاموشی و سکوت کی حالت اس وقت ٹوٹی جب کہ 1608ء میں جہانگیر نے جو کہ رانا پر فتح حاصل کرنے کا مصمم عزم کر چکا تھا' مہابت خاں کو بھیجا تا کہ مہم کو از سر نو شروع کرے۔ مہابت خاں ایک سخت اور راست باز کابلی تھا جس میں تنظیمی استعداد' جرات سرعت عمل' حالات سے مطابقت' اثر و رسوخ اور استحکام و استواری بدرجہ اتم موجود تھے" اور وہ ان بہترین سپہ سالاروں میں سے تھا جس کو میواڑ کی فتح جیسا اہم کام سونپا جا سکتا تھا۔

اب مہابت خاں نے سارے علاقے میں لوٹ مار مچا دی اور رانا کو پہاڑیوں میں پناہ

لینے پر مجبور کر دیا۔ شہزادہ خرم کے ماموں راجا کشن سنگھ راٹھور نے بہادری کا مظاہرہ کیا اور ایک جنگ کے دوران میواڑ کی فوج کو شکست دی۔ بیس ہزار امرا قتل ہوئے اور تین ہزار سپاہی گرفتار کر لیے گئے۔ میواڑ کی جنگ میں مہابت خاں کی یہی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ اس سے زیادہ اس کو کامیابی نہ ہو سکی۔ اور اس بات کا شک پیدا ہو گیا کہ راجپوت سپاہ اس مہم میں دل و جان سے دلچسپی نہیں لے رہی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ 1609ء میں "مرکز میں بعض امور کی دیکھ بھال" کے بہانے اس کو واپس بلا لیا گیا اور میواڑ کی مہم پر خواجہ عبداللہ خاں کو روانہ کیا گیا۔ خواجہ عبداللہ خاں نے بندیلے راجا رام چندر سے جنگ میں فتح پا کر اور مرزا شاہ رُخ کے لڑکے بدیع الزماں کو جو کہ رانا کے ساتھ شریک ہونا چاہتا تھا 1607ء میں گرفتار و قتل کر کے نام پیدا کر لیا تھا۔ جہانگیر اس کو "جو شیلا و جوانمرد...... اور بے عیب ہیرو" سمجھتا تھا۔ عبداللہ نے یہ مہم بہت ہی جوش و خروش کے ساتھ شروع کی اور ہمیشہ کی طرح رانا امر سنگھ کو پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔

رن پور کے درّے کے قریب 1611ء میں اس کو سخت ہزیمت اٹھانا پڑی لیکن جلد ہی اس نے اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے شہزادہ کرن کو زبردست شکست دی اور اپنی کھوئی ہوئی آبرو کو دوبارہ حاصل کر لیا۔ اس جرات مندانہ اقدام کو سراہتے ہوئے اس کا رتبہ پنج ہزاری کر دیا گیا اور فیروز جنگ کا خطاب عطا ہوا۔

شاید عبداللہ اس سے زیادہ پیش رفت نہ کر سکا۔ چونکہ دکن میں اس کی ضرورت تھی اس لیے اس کو واپس بلا لیا گیا۔ اس کی فرمائش پر میواڑ کی مہم کی کمان مؤ (پنجاب کے پہاڑی علاقے) کے راجا باسو کو دے دی گئی لیکن راجا باسو اس کام میں قطعاً ناکام رہا وہ کسی قسم کی کامیابی کا دعویٰ نہ کر سکا سوائے اس کے کہ اس نے ایک مورتی اور اس کے اخراجات کے لیے ایک گاؤں ضرور حاصل کر لیا۔

اس مورتی کے بارے میں مشہور ہے کہ میواڑ کی فیضانِ خداوندی سے بہرہ یاب شاعرہ میرا بائی اس کی پوجا کیا کرتی تھی۔ یہ مورتی رانا نے اپنی دوستی اور حسن نیت کی علامت کے بطور پیش کی تھی۔

مئی 1611ء میں جہانگیر نے نور جہاں سے جو کہ اپنے عہد کی تاریخ میں اہم کردار ادا

کرنے والی تھی شادی کرلی۔ نورجہاں تہران کے مرزا غیاث الدین محمد وعصمت بیگم کی لڑکی تھی۔ 1576ء میں غیاث کے والد خواجہ شریف کی وفات ہوگئی اور اس کا خاندان مصیبت وغریبی کی زندگی گزارنے لگا۔

غیاث نے اس پریشان حالی میں یہ فیصلہ کیا کہ بیوی بچوں کو لے کر ہندوستان کی راہ اختیار کرے۔ اس وقت اس کی بیوی حمل کے آخری مراحل طے کر رہی تھی۔ راستے میں چوروں نے اس کا مال واسباب لوٹ لیا لیکن اس کو اور اس کے خاندان کو ہندوستان جانے دیا۔

77-1576ء میں قندھار پہنچ کر اس کے یہاں دوسری لڑکی پیدا ہوئی جس کے سبب غیاث کو اور بھی کوفت ہوئی۔ کارواں کے سردار ملک مسعود نے اس کو ہر قسم کی مدد دی اور وہ صحیح سلامت مع اپنے خاندان والوں کے فتح پور سیکری پہنچ گیا۔ ملک مسعود نے غیاث کو اکبر کے حضور میں بھی پیش کیا اور شہنشاہ نے اس کی خوبیوں کو سراہتے ہوئے فوراً اپنی ملازمت میں رکھ لیا۔

غیاث نے لیاقت اور محنت سے کام کرکے آہستہ آہستہ ترقی کرنا شروع کی۔ 1595ء میں اس کو کابل کا دیوان مقرر کیا گیا۔ اور آخرکار شاہی کارخانہ جات کا دیوان بیوتات مقرر ہوا۔ جہانگیر نے تخت نشین ہونے کے بعد اس کو نائب دیوان مقرر کیا اور اعتمادالدولہ کے خطاب سے نوازا۔

غیاث نے مہرالنسا کی تعلیم وتربیت کی طرف بڑی توجہ دی۔ خداداد حسن پر اس کے جاذب توجہ اطوار اور اعلیٰ ادبی ذوق نے چار چاند لگا دیے۔ حاضر جوابی، دل چسپ اور مہذب انداز گفتگو، شائستہ اخلاق، باوقار ووضعدارانہ چال چلن، ذکاوت اور ہوش مندی ان سب نے مل کر اس کو بلند درجے کی بیگمات کے حلقے اور شاہی خاندان میں ہر دلعزیز بنا دیا۔ جب وہ سولہ سال کی ہوئی تو 1594ء میں علی خاں سے شادی کردی گئی جو کہ ایک ایرانی اولوالعزم سردار تھا اور خان خاناں کے حملہ ٹھٹھہ کے موقع پر کارہائے نمایاں انجام دے چکا تھا۔

اکبر نے علی قلی کو میواڑ کی مہم کے دوران سلیم کے ماتحت مقرر کیا۔ شہزادہ علی قلی کی بہادری اور حوصلہ مندی سے اتنا خوش ہوا کہ اس کو شیر افگن کا لقب عنایت کیا۔

جب سلیم نے شہنشاہ سے بغاوت کی تو علی قلی شہنشاہ کا وفادار رہا لیکن جہانگیر نے تخت نشینی کے بعد اس کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا کیوں کہ اس نے سب ہی کو بخش دیا تھا اور عام معافی کا حکم صادر کیا تھا۔

بہرحال جب علی قلی کو بنگال کے مشرقی گوشے میں بردوان کا حاکم مقرر کیا گیا تو اس بات سے شہنشاہ کی ناخوشی یا بے اعتمادی کا اظہار ہوتا تھا۔ علی قلی ایسی بیوی کے ساتھ اس غیر صحت مندانہ اور باغی علاقے میں چلا گیا۔ بظاہر علی قلی اس تقرر سے خوش نہ تھا۔ اس نے بھی راجا مان سنگھ کی طرح باغی افغانوں سے نبٹنے میں جوش و خروش کا اظہار نہ کیا حتی کہ اس پر یہ الزام بھی عائد کیا گیا کہ اس کی کوتاہیاں غداری کی حد تک پہنچ گئی تھیں۔ بہرحال اس کا کوئی قرار واقعی ثبوت نہ تھا تاہم یہ مناسب سمجھا گیا کہ اس کو واپس بلا لیا جائے۔ اس کی واپسی کو مہر النسا کے قضیے سے کوئی تعلق نہیں۔

بنگال میں مغل دشمن عناصر کی تعداد اور طاقت دونوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا ان میں شمالی بنگال کے مسند اعلیٰ موسیٰ خاں اور اس کی مشہور و معروف برادری جو بارہ بھائیوں کے نام سے مشہور تھی اور جس میں جو کائی بگر کا عثمان خاں نوہانی و برادران باہنا چنگ کا انور خاں اور سلہٹ کا بایزید کرانی شامل تھے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ افغانوں کے بڑے طاقت ور زعما میں شمار ہوتے اور مغلوں کے سخت دشمن سمجھے جاتے تھے۔ ان لوگوں کو دوسرے طاقت ور راجاؤں کی بالواسطہ یا بلاواسطہ حمایت حاصل تھی جن میں جیسور کے پرتاپ دیتہ، آسام کے پرتاپ سنگھ، کچار کے شترودمن، تہیرا کے یاسو مانکیہ اور اراکان کے سلیم شاہ شامل ہیں۔

فرنگی (بیشتر پرتگالی) دریائی ڈاکوؤں نے بھی مغل دشمن عناصر کی حمایت کی۔ اس وقت جب کہ مغلوں کے خلاف دشمنی زور پکڑ رہی تھی اور ہر طرف سے حملے کی تیاریاں ہو رہی تھیں بنگال کے صوبے دار راجا مان سنگھ اور اس کے ماتحت افسروں پر کسی قسم کا ردعمل نہ ہوا۔ ان کا یہ رویہ ناقابل توجیہہ حد تک پریشان کن تھا۔ بنگال میں ملازمت کرنا اور وہ بھی ایسے حالات میں جب کہ شہنشاہ ان کو مشتبہ نظروں سے دیکھتا ہو کوئی خوش گوار بات نہ تھی۔

چنانچہ جہانگیر نے یہ فیصلہ کیا کہ ایسے افسروں کا جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں

بنگال سے تبادلہ کردیا جائے. اس نے مان سنگھ کو صوبہ بہار بھیج دیا اور اپنے رضاعی بھائی قطب الدین خاں کو بنگال کا حکمراں مقرر کیا. شیر افگن کو بھی واپس بلایا گیا اور اس کی اطلاع نئے صوبے دار کو بھیج دی گئی۔

قطب الدین نے بنگال پہنچ کر شیر افگن کو صوبے کے مرکز راج محل میں بلا لیا۔ شیر افگن نے بہانہ بازی اور حکم عدولی کی۔ صوبے دار نے یہ فیصلہ کیا کہ خود بردوان جائے اور اس سرکش سردار سے نبٹے۔ وہاں پہنچ کر اس نے شیر افگن کو حاضری کا حکم دیا۔ وہ صرف دو ساتھیوں کے ہمراہ حاضر ہوگیا۔

شیر افگن کا خیال تھا کہ بغیر کسی محافظ دستے کے جانے سے گورنر کے دل میں اس کی طرف سے غداری یا نافرمانی کا اگر کوئی شائبہ ہوگا تو وہ بھی نکل جائے گا اور خفگی رفع ہو جائے گی۔ یہ اقدام تقریباً اسی قسم کا تھا جو بیرم خاں نے قندھار میں ہمایوں کے ساتھ کیا تھا کیوں کہ بیرم کے خلاف غداری یا نافرمانی کے الزامات عائد کیے گئے۔ شیر افگن کی بدقسمتی سے قطب الدین نے شیر افگن کے اس اقدام کو اس نگاہ سے نہ دیکھا بلکہ الٹا وہ شیر افگن کے اس غیر رسمی اور بے تکلفانہ برتاؤ سے ناخوش ہوگیا اور اس کو اپنی بے عزتی پر محمول کیا۔

چنانچہ قطب الدین نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اس کو گھیر لیں۔ صوبے دار کی اس غیر عادلانہ و بزدلانہ حرکت نے جوان ترک کی رگوں میں خون کو گرما دیا اور اس نے گالی دے کر صوبے دار پر تلوار کا بھرپور مہلک وار کیا۔ صوبے دار کے خدام نے شیر افگن کو گھیر لیا۔ شیر افگن نے ایک ہی وار میں حملہ آوروں کے سردار کا تو خاتمہ کردیا لیکن اس پر قابو پا لیا گیا اور اس کی تکا بوٹی کر دی گئی۔ یہ واقعہ 30 مارچ 1607ء کا ہے۔ صوبیدار کی حماقت اور عدم تدبّر اور شیر افگن کی تند مزاجی ایک افسوسناک حادثے میں بدل گئی جس کے نتائج بہت دور رس تھے۔

جہانگیر کو لاہور سے کابل کے لیے روانہ ہوئے تین ہی دن گزرے تھے کہ یہ سانحہ پیش آیا۔ یہ تو معلوم نہیں کہ یہ خبر آگرے سے اس کو کس مقام پر ملی لیکن یہ واضح ہے کہ اس نے اپنے پروگرام میں کوئی تبدیلی نہ کی اور 3 جون 1607ء کو کابل پہنچ گیا۔ شیر افگن کی موت سے مہرالنسا کے باپ اور بھائیوں کو جو کہ اعلیٰ سرکاری مراتب پر مقرر تھے بہت سی

غلط فہمیوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔
کہا جاتا ہے کہ بعض افسر تو مہرالنساء کے قتل کے حق میں تھے لیکن ایک کشمیری نے اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کی۔ یہاں تک کہ شہنشاہ کے حکم سے مہرالنساء کو واپس بلا لیا گیا۔ شہنشاہ نے فوراً اپنے افسروں کو حکم بھیجا کہ شیر افگن کے خاندان کو بحفاظت تمام آگرہ پہنچا دیا جائے۔
بدقسمتی سے اس وقت نور جہاں کے باپ اعتمادالدولہ کا بڑا لڑکا معہ بہت سے دوسرے ساتھیوں کے خسرو کو رہائی دلانے کی سازش میں ملوث تھا۔ چنانچہ اس کو قتل کی سزا دی گئی اور اعتمادالدولہ کو نائب وزیر کے عہدے سے برطرف کر کے قید میں ڈال دیا گیا جو کم ازکم دو سال تک معزول رہنے کے بعد بحال ہوگیا۔
جہانگیر و اعتمادالدولہ کی افغانستان کے دور افتادہ علاقے میں موجودگی اور پھر اعتمادالدولہ کے خاندان پر یہ غیر متوقع افتاد اس بات کی پوری طرح وضاحت کرتی ہے کہ مہرالنساء کو پایۂ تخت میں کیوں رکھا گیا اور اس کو محل کی سب سے زیادہ معمر خاتون رقیہ سلطان بیگم دختر حکیم مرزا اور اکبر کی پہلی بیوی کو اس کی دیکھ بھال کے لیے کیوں مقرر کیا گیا۔ یہاں مہرالنساء ایک محفوظ و باعزت زندگی گزارتی رہی تھی اور تقریباً چار سال تک اپنے اعزاز و امتیازات سے مستفید ہوتی رہی۔
جہانگیر نے اپنے جلوس کے چھٹے سال کے آغاز میں جشن نوروز کے موقع پر جو میلہ لگتا تھا اس میں نور جہاں کو دیکھا اور اسی وقت سے وہ نہ صرف اس کو پسند کرنے لگا بلکہ اس پر عاشق ہوگیا۔ مارچ 1611ء میں دونوں کی شادی ہوگئی۔ یہ شادی بہت ہی کامیاب و خوش گوار رہی اور اس کو شہنشاہ کا پورا اعتماد و احترام اور محبت حاصل رہی۔ وہ خود بھی بہت ہی لائق وفادار اور محبت کرنے والی بیوی اور ملکہ ثابت ہوئی۔ مہرالنساء ایک قابلِ احترام اور ممتاز خاندان کی فرد تھی۔ اس نے اپنی شخصیت، کردار اور سلیقہ و قابلیت سے اپنے خاندان کا نام دوبالا کر دیا۔
اس حقیقت کے گرد داستان طرازی اور عشق بازی کا جو تانا بانا بنا گیا وہ شاہجہاں کے حامیوں کے درمیان اس وقت تیزی سے پھیلنے لگا جب کہ نور جہاں کا اثر و رسوخ باپ کی موت کے بعد بڑھنا شروع ہوا۔ یہ سب کچھ ذاتی رنجش اور دل کا غبار نکالنے کے لیے کیا

گیا حالانکہ اس کا کوئی جواز موجود نہیں۔

اس وقت کے قاعدے کے بموجب ملکہ کے نزدیک ترین رشتے دار اعلیٰ منصبوں پر مقرر کیے گئے کیوں کہ وہ لائق، ہوشیار اور مہذب تھے لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کو حکومت میں جو عہدے اور عزت نصیب ہوئے وہ اس کے مستحق نہ تھے البتہ اس شادی سے ان کی راہِ ترقی نسبتاً جلد ترطے ہوگئی۔

یہ کہنا غلط ہے کہ اعتماد الدولہ کو حکومت میں جو اعزاز و مقام حاصل ہوا وہ محض اس وجہ سے ہوا کہ بادشاہ پر اس کی لڑکی کا بہت اثر تھا۔ یہ تو اس کی ذاتی استعداد، ہوشیاری اور ادبی ذوق کی وجہ سے تھی کہ بادشاہ نے اس کو اپنی تخت نشینی کے پہلے ہی سال میں سلطنت کا نائب دیوان مقرر کیا تھا۔ شہنشاہ نے لکھا ہے کہ "اعتماد الدولہ کو وزارت کا عہدہ مدت ملازمت میں متقدم ہونے، راست بازی اور سرکاری امور میں تجربہ کاری کی بنا پر عطا کیا گیا ہے۔"

اعتقاد خاں (جس کو بعد میں آصف خاں کے خطاب سے نوازا گیا) کا معاملہ بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ اس کی طبیعت کی جولانی متعدد علوم میں دسترس کی وجہ سے اور بھی نکھر گئی تھی۔ اس کو ہر علم میں کم و بیش دخل تھا۔ ادبیات کے مطالعے سے فارسی طرزِ بیان میں اس نے مہارت حاصل کر لی تھی اس کا دماغ عملی کاموں کی طرف زیادہ راغب ہوتا۔ مالی امور کے بندوبست میں ساری مغلیہ سلطنت میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ امور مملکت داری میں اس نے ہمیشہ حقائق پر قابو پانے اور اس کے ذرائع پیدا کرنے میں اعلیٰ استعداد کا مظاہرہ کیا۔ وہ بڑا ہی محنتی اور جفاکش تھا۔

میواڑ کے ساتھ صلح و احمد نگر سے جنگ

جہانگیر نے دکن کی ریاستوں کے بارے میں اپنے باپ کی سیاست کی پیروی کی۔ وہ سارے دکن کو فتح کرنا چاہتا تھا لیکن اس کو بہت کم کامیابی ہوئی۔ مغلوں کی پیش رفت میں سب سے بڑی روک خود ملک عنبر تھا جس کی تنظیمی لیاقت، استحکام اور اثر و رسوخ ناقابلِ انکار تھے عنبر کو بغداد کے بازار سے قاسم خواجہ نامی شخص نے خریدا اور احمد نگر لا کر مرتضیٰ نظام شاہ اوّل کے لائق و ممتاز وزیر میرک دبیر چنگیز خاں کے ہاتھ

فروخت کیا۔ جب برار اور خاندیش مغلوں کے قبضے میں آ گئے تو عنبر نے بیجاپور میں ملازمت کر لی لیکن اس کی قسمت میں احمد نگر ہی لکھا تھا لہٰذا وہ احمد نگر واپس آیا اور ابھنگ خاں (آہنگ خاں) نے اس کو 150 گھوڑوں کا منصب دار بنا دیا۔ جب دانیال نے احمد نگر پر حملہ کیا تو عنبر اور ملک راجو کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ مغل علاقے میں لوٹ مار اور غارت گری پھیلائیں۔ اس دوران اس کے ہمراہیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ عنبر کی کارروائیوں کا حلقہ تلنگانہ کی سرحدات سے لے کر بیڑ اور چیول تک پھیل گیا۔ اس حلقے میں احمد نگر و احمد آباد کے بھی کچھ علاقے شامل تھے۔ احمد نگر کے زوال کے بعد بھی انھوں نے غارت گری کا کام جاری رکھا اور اس طرح مغلوں کو زبردست پریشانی لاحق ہو گئی۔

مغلوں اور ملک عنبر کے درمیان پہلی زوردار جھڑپ 2-1601ء میں ہوئی۔ مغل فوج کی کمان عبدالرحیم خان خاناں کا بیٹا مرزا ایرج کر رہا تھا۔ مندیر کے مقام پر گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں ملک عنبر سخت زخمی ہوا لیکن اس کے وفادار ساتھی اس کو نکال لے گئے۔

ملک عنبر کی کارروائیوں میں ملک راجو کی رقابت اور مخاصانہ سرگرمیاں رکاوٹ بن گئیں۔ چونکہ ان دونوں میں صلح کا کوئی راستہ نہ نکل سکا لہٰذا ملک عنبر نے مغلوں سے صلح کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے سرحد کا مسئلہ مغلوں کے ساتھ طے کر لیا اور خود خان خاناں کا منظور نظر بن گیا۔

اس کے بعض حامیوں نے اس تبدیلی سیاست کو پسند نہ کیا اور اس کی حمایت سے دست کشی اختیار کر کے مرتضیٰ نظام شاہ سے جا ملے۔ نظام شاہ نے ملک عنبر سے لڑنے کے لیے ایک فوج روانہ کی لیکن 1603ء میں اس کو شکست ہوئی۔ اس فتح سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عنبر نے پرندا کے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور یہ قلعہ اس کے خاندان کے لیے پناہ گاہ بن گیا۔ جس کی اس کو سخت ضرورت تھی۔

جب دانیال نے دکن پر حملہ کیا تو اس وقت نظام شاہ نے عنبر کو اپنی طرف ملا لیا اور وہ مغلوں کو پریشان کرنے لگا۔ عنبر نے مغلوں سے کھلے میدان میں جنگ کرنے سے ہمیشہ گریز کیا۔ نظام شاہ عنبر کی ادھوری حمایت سے اکتا گیا اور اس نے راجو سے عنبر کو زیر کرنے کے لیے مدد طلب کی۔

جب عنبر نے یہ دیکھا کہ وہ راجو کا مقابلہ نہ کر سکے گا تو وہ پھر مغلوں سے مدد کا طالب ہوا۔ خان خاناں کی زیرکانہ سیاست یہ تھی کہ وہ ان دونوں رقیبوں کے درمیان طاقت کا توازن برقرار رکھے تاکہ وہ اپنے معاملات میں منہمک رہیں۔

نظام شاہ نے 1607ء میں عادل شاہ کی مدد سے راجو کو گرفتار کر لیا اور اس طرح عنبر کا راستہ صاف ہو گیا۔

عنبر بڑا سرگرم عمل، لائق منتظم اور فن جنگ کا ماہر تھا۔ "فن حرب، سپہ سالاری، معقول فیصلے اور انتظامی امور میں کوئی اس کا ثانی و رقیب نہ تھا۔" احمد نگر کے زوال اور خسرو کی شکست کے دوران چھ سال کی جو مہلت دکن کے رہنے والوں کو میسر آئی اس مدت کو ملک عنبر نے بڑے عاقلانہ طور پر اصلاحات عمل میں لانے کے لیے استعمال کیا جس کے سبب کاشت کار خوش حال اور حکومت مال دار ہو گئی۔ شائد وہ ٹوڈرمل کے طریق کار سے متاثر ہوا ہوگا۔ یہ طرز نظم مغل فوج کے ہمراہ وندھیاچل کی پہاڑیاں پار کر کے دکن پہنچ گیا ہوگا۔

اس نے زراعت برائے مالیات کے منحوس طریقے کو ختم کر دیا اور گاؤں کے انتظامی سلسلے کو از سر نو شروع کیا۔ پہلے تو اس نے مال گزاری کی جنس میں ادائیگی کے طریقے کا تجربہ کیا لیکن آخر کار مال گذاری کی رقم کی نقد ادائگی کا سلسلہ جاری کر دیا اور اس کا حساب اس زمین کی پیمائش کے مطابق ہوتا جو واقعتاً زیر کاشت ہو۔ سرکاری مطالبہ $\frac{2}{5}$ یا تقریباً $\frac{1}{3}$ ہوتا۔ مال گزاری کا کام اکثر ہندوؤں کے سپرد ہوتا لیکن انتظامی امور کی نگرانی مسلمان حکام کرتے۔ عنبر کے اصلاحی اقدامات کے سبب کاشتکاری کو خوب فروغ حاصل ہوا اور رعایا خوش حال ہو گئی اور ساتھ ہی ساتھ سرکاری خزانے میں بھی اتنا روپیہ جمع ہو گیا کہ وہ حکومت کے روز افزوں اخراجات، فوجی مہموں اور بڑھتی ہوئی سیاسی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔

ملک عنبر نے اپنی عقل خداداد سے یہ سمجھ لیا کہ احمد نگر اپنے محدود وسائل اور مقابل کے ترقی یافتہ فن جنگ کے سبب مغلوں سے کامیابی کے ساتھ نبرد آزما نہیں ہو سکتا اور یہ بات پچھلے تجربوں سے خوب واضح ہو چکی تھی۔ اس نے گوریلا جنگ کے فوائد کا اندازہ لگایا جو میواڑ کے ہندو راجا اور بندیل کھنڈ اور افغانستان کے سرحدی قبائل نے مغلوں

کے برخلاف جاری کر رکھی تھی اور اس میں خاصی کامیابی حاصل کی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ کوہستانی علاقے میں گوریلا فن جنگ سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں ہو سکتا تھا اور ایسی ریاستوں کے لیے جن کے وسائل بھی کم ہوں یہی ایک طرز جنگ باقی رہ جاتا ہے۔ مرہٹے گوریلا طرز جنگ کی تربیت پائے ہوئے تھے اور اس کے بموجب جہاں تک ہو سکتا وہ کھلی جنگ سے پرہیز کرتے۔

اس طرز کا بنیادی راز یہ تھا کہ دشمن کی رسد کو قطع کر کے اس کو پریشان اور خستہ کر دیا جائے۔ اس پر ناگہانی حملے کیے جائیں، کمین گاہیں لگائی جائیں۔ چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہیں، دشمن کو خوف زدہ کیا جائے اور جہاں تک ہو سکے اس کو سخت مشکل حالات سے دوچار ہونا پڑے۔

ملک عنبر نے مرہٹوں کی پھرتیلی سوار فوج کی تعداد بڑھائی اور ان لوگوں کو گوریلا فن جنگ کی سخت تربیت دی۔ عنبر نے بحری فوج کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہ کیا جو اس کی ریاست اور ایران کے درمیان تجارتی تعلقات کی حفاظت کے لیے ضروری تھی۔ اس نے راج گڑھ سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر ایک جزیرہ جنجیرہ (جزیرہ) کو بحری چوکی بنانے کے لیے تجویز کیا اور فوجی کشتیوں پر عربی النسل حبشیوں کو ملازم رکھا۔ یہ لوگ سیدی (سید) کہلائے۔ ان سیدیوں کی قوت مغل سلطنت کے زوال کے بعد بھی قائم رہی اور وہ مرہٹوں و یوروپین طاقتوں کو کافی عرصے تک پریشان کرتے رہے۔

ان تیاریوں کی تکمیل کے بعد اس نے احمد نگر کے ان علاقوں کی واپسی کی کوشش کی جن کو مغل فتح کر چکے تھے۔ اس کی خوش قسمتی سے اس وقت دکن میں مغل حکومت آپس کی رنجشوں اور نا اتفاقی کے سبب کمزور ہو گئی تھی۔ یہ رنجش اور نا اتفاقی کچھ تو جنوبی ریاستوں کے زر و جواہر کے سبب پیدا ہوئی جو فساد کی جڑ ہے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ مغل افسر دکن کی طول طویل پہاڑی جنگوں سے اکتا چکے تھے۔

حالانکہ جہانگیر دکن کی سیاست کی طرف پوری توجہ نہ دے سکا پھر بھی اس نے اپنے بہترین افسروں کو جن پر اسے پورا اعتماد تھا دکن روانہ کیا۔ 1608ء میں اس نے عبدالرحیم خان خاناں کو خود اس کی مرضی کے مطابق بھیجا۔ عبدالرحیم خان خاناں نے یہ تحریری وعدہ کیا کہ اگر اس کو بارہ ہزار مزید فوج اور دس لاکھ روپیہ دے دیا جائے

تو وہ "اس خدمت کو سرانجام دے گا" جہانگیر نے اس کی شرائط قبول کرلیں اور شاہی اصطبل سے بہترین گھوڑے، پانچ ہاتھی، مرصع تلوار اور خلعت عطا کیا۔

جب عبدالرحیم خان خاناں نے جنگ میں کافی جوش وخروش نہ دکھایا تو پھر شہزادہ پرویز اور شریف خان وزیر اعظم کو 1610ء میں مزید فوج دے کر روانہ کیا گیا لیکن شہنشاہ کے ان سب اقدامات کے باوجود کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا۔ عنبر کے مقابلے میں مغلوں کی کچھ نہ چلی کیونکہ اس کے پرچم کے نیچے ایک بڑی فوج جمع ہوگئی تھی۔

ایک دفعہ جہانگیر نے یہ ارادہ بھی کیا کہ وہ خود دکن جاکر وہاں کے معاملات کو سلجھائے لیکن امرا نے اس کو باز رکھا اور خان جہاں نے وعدہ کیا کہ دکن کی جنگ کو کامیابی کے ساتھ ختم کردیا جائے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ بہت کم مغل افسروں کو جنوب کے سیاسی و فوجی حالات اور دشمن کے اثر و رسوخ اور وسائل کا صحیح علم تھا۔

تازہ فوجی کمک پہنچنے سے قبل خان خاناں کو دکن میں زبردست زک اٹھانی پڑی اس نے یہ کوشش کی کہ احمد نگر پر یکایک حملہ کرکے اس کو فتح کرلے لیکن اس کی یہ کوشش بھی ناکام رہی دشمن باہر نکل کر لڑنے کو تیار نہ ہوا۔ اس کے برخلاف انھوں نے گوریلا ترکیبیں اس کامیابی کے ساتھ انجام دیں کہ مغل فوج کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ان کی رسد جوکہ پہلے ہی سے قحط کے سبب کم تھی بالکل ہی منقطع ہوگئی۔ خان خاناں کو زبردست نقصان ہوا اور اس نے صلح کرلی۔ وہ برہان پور واپس لوٹ گیا۔ اس ناکامی کا یہ نتیجہ ہوا کہ 1610ء میں احمد نگر مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

جہانگیر کو اس بات کا یقین دلایا گیا کہ مغلوں کی شکست کی بنیادی وجہ خان خاناں کی دو رویہ پالیسی ہے۔ یہ کہا جاتا تھا کہ خان خاناں ملک عنبر کے ساتھ ساز باز رکھتا تھا اور عنبر نظام شاہ کی ریاست کی مال گزاری کا $\frac{1}{3}$ حصہ خان خاناں کو ادا کرتا تھا۔ چنانچہ خان خاناں کو واپس بلاکر دکن کی مہم کی کمان خان جہاں لودی کے سپرد کردی گئی۔ خان خاناں کی طرح خان جہاں نے بھی شہنشاہ کو یہ لکھا کہ اگر وہ اس مہم کو کامیابی سے سرانجام نہ دے سکے تو "اس کو شہنشاہ کی خدمت میں حضوری کے شرف سے محروم کردیا جائے اور پھر وہ غلامانِ دربار کو بھی اپنی صورت نہ دکھائے گا۔"

شہنشاہ کا خیال خان جہاں کے بارے میں بہت بلند تھا اور وہ اس پر بہت بھروسہ

کرتا تھا۔ چنانچہ شہنشاہ نے خان جہاں کا مشورہ بخوشی مان لیا اور دو ہزار احدی، دس ہزار سوار اور 35,000,00 روپیہ دے کر روانہ کیا۔ شہنشاہ نے اپنی پگڑی بھی خان جہاں کے سر پر رکھی اس کے علاوہ عبداللہ خاں کو میواڑ سے گجرات روانہ کیا اور یہ ہدایت دی کہ وہ خاں جہاں سے میل جول قائم رکھے اور ناسک کے محاذ پر سرگرم عمل رہے۔

1611ء میں خان جہاں اور مان سنگھ کی اصل فوج برار اور خاندیش کے راستے روانہ ہوئی اور عبداللہ خاں براستہ ناسک روانہ ہوا۔ قرار یہ پایا کہ دونوں فوجیں دولت آباد کی طرف رُخ کریں اور وہاں مل کر مل جائیں۔ عبداللہ نے اپنی لیاقت و استعداد پر بھروسہ کرتے ہوئے کامیابی کا سہرا اپنے سر لینا چاہا۔ وہ اصل فوج کو نظرانداز کرکے دشمنوں کی سرزمین میں گھستا ہوا دولت آباد تک پہنچ گیا۔

عبداللہ کو اس بے باکی و بے احتیاطی کا خمیازہ اٹھانا پڑا کیوں کہ احمدنگر کے ایک سوار دستے نے گوریلا طرز جنگ سے کام لے کر اس کو سخت پریشان کیا، اس کی رسد منقطع کردی اور اس کا سازوسامان لوٹ لیا۔ آخرکار اس نے واپسی کا ارادہ کیا اور لڑتا ہوا گجرات کی سرحد تک لوٹ آیا۔ اس لڑائی میں اسے اپنے چند قابل اور بہادر سپاہیوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔

سپہ سالار خان جہاں نے اس پسپائی کی وجہ یہ بیان کی کہ امرا کے درمیان اختلافات موجود تھے۔ اس کے علاوہ اس نے خان خاناں پر یہ بھی الزام لگایا کہ اس نے جان بوجھ کر اپنی فوج کو ظفرنگر میں روکے رکھا اور اس طرح اس پر غداری کا الزام لگایا۔ شہنشاہ نے اس شکست کو بیشتر عبداللہ خاں کی جلد بازی پر محمول کیا۔ 1612ء میں خاں جہاں سے کمان واپس لے کر ایک مرتبہ پھر عبدالرحیم خان خاناں کو سونپ دی گئی۔ اس وقت عارضی طور پر شہنشاہ کی توجہ میواڑ کی طرف مبذول ہوگئی۔

راجا باسو جب کوئی کامیابی حاصل نہ کرسکا تو یہ افواہ گرم ہوئی کہ چونکہ وہ راناکا بہی خواہ ہے اس لیے اس مہم کو دل وجان سے انجام نہیں دے رہا ہے لہٰذا خان اعظم عزیز کوکا کو اس کی جگہ مقرر کیا گیا۔ عزیز کوکا دکن کی گندی سیاست سے علیحدہ رہنا چاہتا تھا اس لیے اس نے شہنشاہ سے درخواست کی کہ اس کو میواڑ بھیج دیا جائے۔ جب عزیز نے میواڑ کی فوج کی کمان سنبھالی تو اس نے شہنشاہ کو لکھا کہ "جب تک شاہی پرچم ان علاقوں میں نہ لہرائے معاملات

کا حل ہونا دشوار ہوگا۔

لہٰذا 1613ء میں جہانگیر "باغی رانا کے معاملات کو ختم کر دینے کے لیے" آگرہ سے روانہ ہوا اور اجمیر میں اپنا مرکز قائم کیا۔ خان اعظم کی درخواست پر اس نے شہزادہ خرم کو بھی جنگ کے لیے روانہ کر دیا۔ اس اولوالعزم اور تندمزاج شہزادہ کا خان اعظم جیسے عمر رسیدہ ایمان دار، صاف گو اور خوددار امیر کے ساتھ مل جل کر کام کرنا ممکن نہ تھا۔

شہزادہ نے خان اعظم کے خلاف شہنشاہ سے شکایت کی۔ شہنشاہ نے فوراً ہی ایک مکتوب کے ذریعے خان اعظم سے سدھار کی درخواست کی اور اس کو تنبیہہ بھی کر دی لیکن حالات میں سدھار نہ ہوا بلکہ وہ بگڑتے ہی چلے گئے یہاں تک کہ شہزادے نے اس کی گرفتاری کا حکم صادر کیا۔ شہنشاہ نے خان اعظم کو قلعہ گوالیار بھیج دیا پھر کچھ عرصے بعد اس کو رہا کر دیا گیا۔

شہزادہ خرم نے زبردست وسائل کے ساتھ بڑی سنجیدگی سے مہم کا آغاز کیا۔ "کھیتوں اور باغوں کو آگ لگا دی گئی، گاؤں اور شہر لوٹ لیے گئے اور معبد گرا دیے گئے۔" مغلوں نے میدانی علاقوں کو پہلے ہی اُجاڑ دیا تھا اور کھیتی باڑی کے آثار تک باقی نہ رہے تھے۔ بہت سے ایسے علاقوں میں جہاں لوگ یہ سمجھتے تھے کہ فوجی چوکیاں قائم نہیں کی جاسکتیں قائم کر دی گئیں۔ اور باد رفتار فوجی دستے تیز دھوپ یا زبردست بارش کا خیال کیے بغیر راجپوتوں کا مسلسل تعاقب کرتے رہے۔ زبردست ناکہ بندی، مستقل جنگ، رسد کی کمی اور قحط و وبا نے مل کر راجپوتوں کی ہمت مقاومت کو توڑ دیا۔ لوگ رانا کا ساتھ چھوڑ کر بھاگنے لگے یہاں تک کہ اس کے پاس مٹھی بھر ساتھی رہ گئے۔

اِن حالات میں رانا امر سنگھ کا سلطنت مغلیہ کی قوت و طاقت سے ٹکر لینا ممکن نہ تھا۔ امراء اور شہزادہ کرن نے رانا کو یہی مشورہ دیا کہ مصالحت کر لے۔ امر سنگھ نے وعدہ کر لیا کہ وہ شہزادہ خرم کے پاس خود حاضر ہوگا اور اپنے بیٹے کرن کو دربار میں بھیج دے گا۔ اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ ایک ہزار سپاہیوں کا دستہ مغل فوج میں خدمت کے لیے روانہ کر دے گا لیکن اس نے یہ درخواست ضرور کی کہ اس کو دربار میں حاضری سے معاف کیا جائے۔

شہزادہ خرم نے یہ تجاویز شہنشاہ کو بھیج دیں اور اس نے بخوشی ان کو قبول کر لیا۔

ہمارے ذہن عالی میں ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو قدیم خاندانوں کو برباد نہ کیا جائے۔" شہنشاہ محض یہ چاہتا تھا کہ وہ اطاعت تسلیم کرلیں۔ اس کے علاوہ دکن کے حالات بہت ہی غیر اطمینان بخش اور اس کے محتاج تھے کہ شہنشاہ ان پر پوری توجہ دے لیکن جب تک میواڑ کا مسئلہ حل نہ ہوجائے وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ شہنشاہ نے رانا پر صرف ایک پابندی لگائی اور وہ یہ کہ رانا چتوڑ کے قلعے کو مضبوط نہ کرے۔

رانا امر سنگھ شہزادہ خرم سے ملنے گیا۔ شہزادے نے بہت ہی عزت و احترام کا برتاؤ کیا۔ تحفے تحائف بہت ہی بڑے پیمانے پر ردّ و بدل کیے گئے۔ رانا نے شہزادہ کرن کو بھیجنے کا وعدہ کیا اور اس کو واپسی کی اجازت مل گئی۔ جوں ہی کرن شہزادے کے کیمپ میں پہنچا خرم اجمیر کی طرف چل دیا۔

شہنشاہ نے خرم کو بے حد عنایات سے نوازا اور اس کو بیس ہزار ذات اور دس ہزار سوار کا منصب عطا کیا اور صفِ اوّل میں دائرے کے دائیں طرف جگہ دی" جو کہ مغل دربار میں کسی کو کم ہی حاصل ہوتی ہے۔ "کرن وحشی مزاج تھا لہٰذا میں اس کا دل جیتنے کے لیے ہر روز کوئی نہ کوئی تازہ مہربانی کا سلوک کرتا"

جب شہزادہ کرن کو دربار میں شہنشاہ کے حضور میں پیش کیا گیا تو شہنشاہ نے بڑی مہربانی کا سلوک کیا۔ جہانگیر نے اس کو حلقے کے اندر بلایا اور گلے لگایا۔ مغل دربار میں اتنی عزت کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی۔

سچ تو یہ ہے کہ شہنشاہ اور نور جہاں بیگم نے کرن کو تحفوں سے لاد دیا۔ چند ماہ بعد اس کو پانچ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب عنایت ہوا۔ جب صلح ہوگئی تو میواڑ کے وہ سارے علاقے مع قلعہ چتوڑ کے جو اکبر و جہانگیر کے زمانے میں چھین لیے گئے تھے رانا کو واپس کر دیے گئے۔ اس کے علاوہ خود شہزادے کو کافی جاگیر عنایت کی گئی۔ دو سال بعد رانا امر سنگھ اور شہزادہ کرن کے دو سنگ مرمر کے اسپ سوار مجسمے آگرے میں جھروکے کے نیچے والے باغ میں نصب کرائے گئے لیکن رانا پرتاپ کے لڑکے کی زخم خوردہ خودداری کو شاہی نوازشات سے کوئی سکون حاصل نہ ہوا اور اس کی ذہنی بے چینی میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا گیا یہاں تک کہ اس نے راجکمار کرن کے حق میں تخت سے دست برداری حاصل کرلی اور اپنی زندگی کے آخری ایام نوچوکی

جاکر خلوت و تنہائی میں بسر کرنے لگا۔ لیکن جہانگیر نے ازروئے عنایت رانا کی کنارہ کشی کو اس کی موت سے پہلے قانونی طور پر تسلیم نہ کیا۔

اس طرح تیمور اور چتوڑ کے خاندانوں کی قدیم رقابت کا خاتمہ ہوا جو 1526ء میں شروع ہوئی لیکن 1567ء کے بعد سنجیدہ تر و طولانی تر ہوتی گئی۔ اس پچاس سالہ جنگ مقاومت کی تاریخ بہت سے ایسے جوشیلے واقعات سے پُر ہے جن میں پُرجوش دلاوری، تعجب خیز وفاداری، حیرت انگیز قربانی، غیر معمولی تحمل، کردار کی اعلیٰ ظرفی اور حُب الوطنی کے مظاہرے ہوئے۔ اس سے قبل راجپوتوں کی دلیری اور نصب العین کو اس قدر زبردست آزمائش سے کبھی بھی نہ گزرنا پڑا تھا اور نہ انھوں نے اتنی شان و شوکت اور شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا۔

نصف صدی تک جاری ہوئی جنگ کو ناگفتہ بہ مشکلات کی موجودگی میں جاری رکھنا، بے شمار تکالیف کا برداشت کرنا، اپنے ہر آرام و سکون کو ایک جذبے اور مقصد کی خاطر قربان کر دینے کے لیے بڑی ہی عالی ظرفی اور بلند کردار کی ضرورت ہوتی ہے اگر ساری راجپوت ریاستوں نے اس کے آدھے جوش و ولولے آزادی کا بھی مظاہرہ کیا ہوتا تو سلطنت مغلیہ کی تاریخ بہتر یا بدتر شکل میں بالکل بدل چکی ہوتی۔ لیکن میواڑ کے حلقۂ اثر کے باہر کم ہی لوگوں نے اس جنگ کو قومی رنگ دیا اور سوائے چند لوگوں کے کوئی بھی اس کو ہندو مسلم جنگ یا ہندوؤں کی جنگ آزادی کہنے کے لیے تیار نہ تھا۔

اگر اس سارے معاملے کو محض تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو اس بات پر افسوس ہوتا ہے کہ مہارانا پرتاپ سنگھ کے اس انکار نے کہ وہ شہنشاہ دہلی کی برتر فوجی طاقت اور لامحدود وسائل کی حقیقت کو تسلیم کر لے اس قدر خون ریزی اور تکالیف کو جنم دیا اور اسی جذبے نے رانا کی موت کے بیس سال بعد تک اس جنگ کو جاری رکھا۔ یہ بات بھی اسی قدر قابل افسوس ہے کہ مغل شہنشاہوں کی سیاست، جن میں اکبر بھی شامل ہے، راناؤں کے دلوں میں کسی قسم کا اعتماد پیدا کرنے سے محروم رہی۔ اگر رانا پرتاپ نے اکبر کو وہی شرائط پیش کی ہوتیں جو اس کے لڑکے نے خرم کو پیش کیں تو اس کا بہت امکان تھا کہ وہ ان کو بخوشی منظور کر لیتا۔

جہانگیر اپنی کامیابی پر چاہے کتنا ہی فخر کیوں نہ کرے وہ یہ نہ بھولا ہوگا کہ امر سنگھ

کا میواڑ رانا پرتاپ سنگھ کے میواڑ کے مقابلے میں کہیں زیادہ کمزور تھا - پھر بھی جب تک کہ امرا اور
ولیعہد نے مصالحت کی کوشش نہ کی اس وقت تک امرسنگھ نے بھی ہتھیار نہ ڈالے۔ میواڑ کے
بہترین سپوتوں کی خونریزی کے بعد وہاں کے حکراں اور امرا کو اس بات کا احساس ہوا کہ "میواڑ
کے رنگوں کا آرام و سکون اس کا طالب تھا کہ آزادی کو قربان کر کے صلح حاصل کی جائے اور
اس قربانی کے اس سے زیادہ کوئی اور معنی نہ تھے کہ شہنشاہ کے اقتدار کو تسلیم کر لیا جائے۔"
میواڑ کے حکرانوں نے کوئی ایسی کوشش جو انسانی طور پر ممکن العمل ہو اٹھا نہ رکھی کہ ریاست
کی آزادی کا ارغوانی پھریرا ہوا میں اُڑتا رہے۔ ان کی شان کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔
لیکن واقعات کے بہاؤ کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ حُب الوطنی کا ایک تاریخی
افسانہ وجود میں آگیا جس کو آزادی اور دلیری کے دلدادہ ہمیشہ اپنے دلوں کی گہرائیوں
میں زندہ رکھیں گے۔ اس جنگ نے رانا کمبھا، رانا سانگا اور مہارانا پرتاپ کے کاموں کی اہمیت
کو ثابت کر دیا۔ جہانگیر کی تعریف کیے بغیر بھی نہیں رہا جا سکتا جس نے میواڑ کے بہادر وارثوں
سے شرافت کا سلوک کیا اور ان سے مہربانی و سخاوت سے پیش آیا۔ اس کے برخلاف راجپوتوں
کے ہم مذہب مرہٹوں نے جو سلوک ان کے ساتھ روا رکھا وہ اس کے بالکل ہی برعکس تھا۔

باب 17

مصالحت: سرحدی مسائل

بعد کے حالات

جہانگیر کو جب میواڑ کے واقعات سے فراغت حاصل ہوئی تو اس نے اپنی عسکری قوت کا رُخ ملک عنبر کی طرف موڑ دیا۔ دکن میں مغلوں کی پیش قدمی بہت ہی سست تھی۔ خان خاناں کی سیاست نے ملک عنبر کے بعض لائق افسروں مثلاً یاقوت خاں، آدم خاں، جادھو راؤ وغیرہ کو ملک سے جدا کر دیا اور یہ لوگ خان خاناں کے سب سے بڑے لڑکے شاہ نواز خاں سے جا ملے۔

شاہ نواز اب بالاپور سے آگے چلا اور راستے میں دکنی فوج کو پسپا کرتا ہوا روشن گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے 1616ء میں اپنے دس ہزار سواروں کے ساتھ ایک گہری خندق کو پار کر کے دشمن کی چوکی پر قبضہ کر لیا۔ دوسری طرف احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کی مشترکہ فوج کو جس کی تعداد چالیس ہزار تھی ترغیب دلائی گئی کہ وہ مغلوں پر حملہ کر دیں۔

جب دکنی فوج خندق کے پاس پہنچ گئی تو اس کو ایک دم روک دیا گیا۔ سارے سپاہی بے ترتیبی سے اکھٹے ہو کر ایک ہجوم کی شکل میں بدل گئے اور مغل توپ خانے نے ان کو نشانہ بنا کر اڑانا شروع کر دیا۔ عنبر کو زبردست شکست ہوئی وہ جان بچا کر بھاگا اور قلعہ دولت آباد میں پناہ لی۔

دکنی فوج کا سارے کا سارا توپ خانہ، بڑی مقدار میں گولا بارود اور اونٹ، ہاتھی گھوڑے مغلوں کے ہاتھ لگے۔ جب اندھیرا ہوگیا اور مغل سپاہی اور گھوڑے تھک چکے تو فاتح فوج دشمنوں کا چار پانچ میل تعاقب کرنے کے بعد لوٹ آئی۔ مغل اب کھڈ کی طرف چلے۔ دشمنوں نے اس جگہ کو خالی کر دیا مغلوں نے اس کو آگ لگادی (فروری 1616ء) اور اپنے کیمپ واپس آگئے۔

اس کے بعد دکن میں شہزادہ پرویز اور خان خاناں میں ناچاقی پیدا ہوگئی جس کے سبب پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں۔ کہا جاتا ہے کہ خان خاناں شہزادہ پرویز کی جگہ شہزادہ خرم کو بلانے کا اتنا مشتاق تھا کہ اس نے ملک عنبر کو اس بات کے لیے اکسایا کہ جہاں تک ہو سکے مغل علاقے میں لوٹ مار کرے۔ یہ ترکیب کارآمد ثابت ہوئی۔ پرویز کو صوبہ الہ آباد منتقل کر دیا گیا اور دکن کی کمان خرم کو سونپ دی گئی جس نے میواڑ کی مہم کے سبب شہرت حاصل کرلی تھی۔

نومبر 1616ء میں خرم تحفے تحائف سے لدا پھندا اور شاہ کے نادر و غیر معمولی لقب سے سرفراز دکن کی طرف روانہ ہوا۔ جہانگیر نے دکن کی مہم کے استحکام کے لیے اپنے لشکر کو بھی آگے بڑھایا اور 6 مارچ 1617ء کو مانڈو پہنچ گیا۔

شاہ خرم کی دکن میں آمد اور جہانگیر کے مانڈو میں پڑاؤ نے دکن کے حکمرانوں پر غیر معمولی اثر کیا اور ان کو کچھ چوکنا بھی کر دیا۔ وہ لوگ خان خاناں کی سیاست اور زر و جواہر کی رشوت ستانی میں ملوث ہو چکے تھے لہٰذا انھوں نے اس کے مشورے کو فوراً مان لیا۔ بیجاپور کے حکمراں نے یہ جتایا کہ وہ ثالث کے فرائض انجام دے کر دکن کے معاملات کو اطمینان بخش طریقے پر حل کر دے گا۔ عنبر کو آسانی سے اس کے لیے راضی کرلیا گیا کہ وہ بالاگھاٹ احمد نگر اور کچھ دوسرے قلعے مغلوں کو سونپ دے۔

یہ نام نہاد فتح محض خیالی تھی اور مغلوں کی طاقت اتنی ہی رہی جتنی کہ اکبر کی دکن سے واپسی کے وقت تھی۔" اس ظاہری صلح کا بہت پروپگینڈہ کیا گیا۔ جہانگیر کو اطمینان دلایا گیا کہ "سارے ہی سردار اپنے سروں کو فرماں برداری کے پھندے میں ڈال کر بہت عاجزی کے ساتھ خدمت پر کمربستہ ہیں"۔

جس ایلچی نے یہ خبر شہنشاہ کو پہنچائی اس کو ایک بڑی جاگیر بخش دی گئی اور اس

نام نہاد فتح کی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ خوشیاں منائی گئیں۔ شہزادہ خرم کی سفارش پر عادل شاہ کو حضوری میں پیش کیے بغیر قیمتی تحفوں کے بدلے میں اور ثالثی کے فرائض انجام دینے کے صلے میں "فرزند" کے غیر معمولی لقب سے نوازا گیا۔

خرم ہی کی درخواست پر عبدالرحیم خان خاناں کو جس کی ایک پوتی سے شہزادے نے اگست 1617ء میں شادی کی تھی دکن کا صوبے دار مقرر کر دیا گیا۔ خود شہزادہ پایۂ تخت واپس ہو گیا۔ شہنشاہ نے اس کو شاہجہاں کے لقب سے نوازا۔ اس کے منصب میں اضافہ کر کے اس کو تیس ہزار ذات اور بیس ہزار سوار کا منصب عطا کیا اور یہ غیر معمولی عزت بخشی کہ وہ دربار میں تخت کے قریب ایک کرسی پر بیٹھا کرے۔

شہنشاہ، شہزادے اور نور جہاں کے درمیان بے حد قیمتی تحفوں کا تبادلہ ہوا۔ زرو جواہر کی چمک دمک اور ضیافتوں کی شان و شوکت نے شاہجہاں کی کامیابیوں پر ایک مصنوعی بھڑکیلا پردہ ڈال دیا۔ شاہجہاں کو اس کی خدمات کے صلے میں گجرات کا صوبے دار مقرر کر دیا گیا۔ مختصر یہ کہ یہ سب تماشا اس لیے انجام دیا گیا کہ متعلقہ فریقوں کو اس کی سیاسی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔

لیکن ملک عنبر ان لوگوں میں سے نہ تھا جو خاموش رہ کر مغلوں کو اپنی مرضی کے مطابق سب کچھ کرنے دے۔ جہانگیر کے پندرھویں سالِ جلوس میں جب کہ شہنشاہ کشمیر میں تھا عنبر پھر میدان میں نکل آیا اور احمد نگر اور برار کے بہت سے علاقے مغلوں سے چھین لیے۔

کہا جاتا ہے کہ خان خاناں نے جان بوجھ کر عنبر کو اس بات کی ہمت بندھائی کہ وہ مغل علاقوں کو لوٹ مار کر کے غارت کرے تاکہ شہنشاہ مجبور ہو کر شاہجہاں کو دوبارہ دکن روانہ کر دے۔ احمد نگر کا محاصرہ کر لیا گیا اور مغلوں کو شہر خالی کرنا پڑا۔ مغلوں کو کئی تھانوں سے باہر نکال کر ان کا تعاقب کیا گیا یہاں تک کہ انھوں نے بالاپور پہنچ کر جو ان کا مرکز تھا دم لیا۔

خان خاناں نے شہنشاہ کو یہ گذارش بھیجی کہ مغل فوج کو روپے اور رسد کی سخت ضرورت ہے۔ شہنشاہ نے حکم دیا کہ بیس لاکھ روپیہ فوراً ارسال کیا جائے۔ اس کے فوراً ہی بعد شاہجہاں کو دوبارہ دکن کی کمان سنبھالنے کے لیے نامزد کیا تاکہ وہ وہاں

جاکر مغلوں کے کھوئے ہوئے علاقوں کو واپس حاصل کرے۔ اس کام کے لیے شہزادہ کو ایک کروڑ روپے کی منظوری دے دی گئی۔ شہزادے نے حالات کی سنجیدگی کا احساس کرتے ہوئے اور اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے شراب نوشی ترک کردی اور یہ قسم کھائی کہ آیندہ سے شراب نہ پیے گا۔ شراب خانے میں جتنی بھی شراب تھی سب دریائے چنبل میں بہادی گئی اور سونے چاندی کے برتن توڑ ڈالے گئے۔

جب شہزادہ اجین پہنچا تو اس کو اطلاع ملی کہ دکنی افواج اور بھی طاقت ور ہوگئی ہیں اور وہ دریائے نربدا کو عبور کرکے لوٹ مار کرتی آگے بڑھتی چلی آرہی ہیں شہزادہ تیزی سے برہان پور کی طرف چلا۔ دکنی فوجیں پیچھے ہٹ گئیں۔ شاہجہاں نے نو دن کی مدت اپنی تیاریوں اور رسد کی فراہمی میں صرف کی اور اس کے بعد ایک زبردست مہم کا آغاز ہوا۔

مغل فوج تین حصوں میں منقسم ہوگئی۔ ہر حصے میں چھ ہزار سوار تھے۔ ان دستوں کے سالار داراب خاں، عبداللہ اور خواجہ ابوالحسن مقرر کیے گئے۔ اس مہم کی ہدایت کا سارا کام اگرچہ بظاہر خان خاناں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا گیا تھا لیکن حقیقت میں راجا وکرماجیت اس کو انجام دے رہا تھا۔

مغلوں نے بڑی محنت کے بعد احمد نگر کے نئے دارالسلطنت کھڑکی پر قبضہ کیا اور اس کو بالکل ویران کردیا۔ پھر انھوں نے دولت آباد پر دباؤ ڈالا اور احمد نگر کی واگزاری کے لیے جو کہ خنجر بیگ کی دلاورانہ سرگرمی میں مقاومت کر رہا تھا قدم اٹھائے۔ ان حالات کو دیکھ کر ملک عنبر کو خدشہ پیدا ہوا اور اس نے صلح کی درخواست کی۔ 1621ء میں اس نے سارے مفتوحہ مغل علاقے واپس کردیے اور احمد نگر سے اپنی افواج کو ہٹا لیا۔ شہزادے نے جو صلح کی شرائط پیش کیں وہ شاید اس وجہ سے نرم و آسان تھیں کہ اس کی فوج کی رسد ختم ہوتی جارہی تھی یا دربار کے حالات نے اس کو زیادہ متفکر بنا دیا تھا۔

عنبر نے مغلوں کے جو علاقے فتح کرلیے تھے ان کو واپس کرنے کے علاوہ چھبیس ستائیس میل کا ایک قطعہ اور اٹھارہ لاکھ روپیہ خراج ادا کرنا قبول کرلیا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ عنبر کے ساتھ ساز باز میں شریک تھے لہٰذا ان دونوں پر بھی بارہ اور بیس لاکھ روپیہ علی الترتیب جرمانہ کیا گیا۔ مغل فوجوں کی اس کامیابی سے دکن کی ریاستوں کے اس منصوبے کو کہ مغلوں کو

جنوب ہند سے نکال باہر کیا جائے زبردست دھکا پہنچا لیکن وہ اس سے حواس باختہ نہ ہوئیں۔ مغلوں نے اپنے قدم شمالی دکن میں اچھی طرح جما لیے تھے۔ مغل شہنشاہ کی سیاستِ دکن کا دارو مدار اس پر تھا کہ وہاں کی ریاستیں مغل سلطنت کی مخالفت میں کیا قدم اٹھاتی ہیں اور اس طرح دکنی سیاست کا کبھی ختم نہ ہونے والا دور شروع ہو گیا۔

اکبر کی زندگی کے آخری ایام میں مان سنگھ کی بنگال سے غیر حاضری کے سبب عثمان اور دوسرے باغیوں کو اپنا سر ابھارنے کی فرصت مل گئی۔ جہانگیر نے تخت نشینی کے بعد راجا کو بنگال واپس بھیجا لیکن کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس کو وہاں سے واپس بلا لیا گیا کیونکہ وہ کافی عرصہ وہاں رہ چکا تھا اور شہنشاہ کو اس پر اعتماد بھی نہ تھا۔

1606ء میں راجا مان سنگھ کے بجائے قطب الدین خاں کوکا کو بھیجا گیا جو شیر افگن کے ہاتھوں مارا گیا۔ دوسرا گورنر جہانگیر قلی جس سال مقرر ہوا اسی سال بیمار ہو کر مر گیا۔ اس کے بعد شیخ علاء الدین کو جو شیخ سلیم چشتی کے پوتے تھے صوبے دار بنایا گیا۔ شیخ علاء الدین کو اسلام خاں کا خطاب ملا۔ جہانگیر نے اس "بہادر اور خوش اخلاق جوان" کی وفاداری سے خوش ہو کر 1608ء میں "فرزند کے لقب سے سرفراز کیا تھا"

کہا جاتا ہے کہ جب اسلام خاں کا تقرر ہوا تو افسرانِ اعلیٰ نے یہ اعتراض کیا کہ وہ ابھی جوان ہے اور بہار کی صوبے داری کے مختصر عرصے میں اس نے جو تجربہ حاصل کیا ہے وہ بہت کم ہے لیکن اسلام خاں نے تھوڑے ہی عرصے میں یہ ثابت کر دیا کہ اس کا انتخاب صحیح تھا۔

اسلام خاں نے اپنی دور اندیشی و مستعدی کا اس طرح ثبوت دیا کہ اس نے باغیوں کے خلاف منظم طریقے پر تنبیہی مہمیں اور چھوٹے چھوٹے معرکے شروع کیے۔ زمینداروں کے ساتھ تدبر اور ہوشیاری سے معاملات کو نپٹایا۔ اس نے آہستہ آہستہ راج محل سے ڈھاکے کے راستے میں جو رکاوٹیں تھیں ان کو صاف کیا اور اپنا فوجی مرکز ڈھاکے میں مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ ڈھاکے کا محل وقوع فوجی و دفاعی امور کے لیے بہت مناسب تھا۔ وہاں سے رسل و رسائل کی اچھی طرح دیکھ بھال اور باغی سرداروں پر آسانی سے نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔ راجا جیسور (پرتاپ ادیتہ) اور کچھ دوسرے سردار بھی مطیع ہو گئے۔ پرکچھ حاجو (آسام) کے راجا کے خلاف جو مہم بھیجی گئی وہ ناکام رہی لیکن اس سے اسلام خاں کے فوجی عزائم میں کوئی فرق

نہ آیا کیونکہ یہ مہم خاص طور سے سنارگاؤں کے طاقت ور حاکم اور بارہ بھائیوں کے لیڈر موسیٰ خاں کے خلاف تھی۔

1608ء میں اسلام خاں نے ڈھاکے کو مستحکم کر کے اپنا مرکز بنایا اور افواج کو موسیٰ خاں سے جنگ کے لیے آمادہ کیا۔ مغلوں نے کئی جنگیں کیں اور جتر پور و دکھرا پر جو کہ دفاعی اڈے تھے قبضہ کر لیا۔ اس طرح سنارگاؤں کی فتح کا راستہ صاف ہو گیا۔

اسلام خاں نے 1610ء میں اپنے نقصانات کی تلافی اور اپنی افواج کو از سر نو منظم کر کے مہم کو پھر سے شروع کیا۔ موسیٰ خاں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن مغل فوج کی مستقل پیش قدمی کے سبب اس نے یہی مناسب جانا کہ سنارگاؤں کو خالی کر دے چنانچہ حملہ آوروں نے 1611ء میں اس پر قبضہ کر لیا۔ موسیٰ خاں نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ اپنی شکست کا بدلہ لے لیکن کامیاب نہ ہوا اور اس کی ہمت پست ہو گئی۔ چنانچہ 1611ء میں وہ زیر ہو گیا۔

اب اسلام خاں نے عثمان خاں کا مقابلہ کیا جو قتلو خاں لوہانی کا بھتیجہ اور جانشین تھا۔ اسلام خاں نے شاہی کیمپ میں غداری کے باوجود حالات پر اس خوش اسلوبی کے ساتھ قابو پا لیا کہ نہ صرف بوکائی نگر پر قبضہ کر لیا بلکہ عثمان خاں کو جان بچا کر فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔

اس کے بعد پرتاپ ادیتہ پر جس نے مغلوں سے وعدہ خلافی کی تھی حملہ کیا گیا۔ اس کے بحری بیڑے کو ویران کر دیا گیا اور وہ خود مطیع ہو گیا۔ اس نے معافی کی درخواست کی جو منظور نہ ہوئی چنانچہ اس کو قید میں ڈال دیا گیا اور اس کا علاقہ ضبط کر لیا گیا۔

عثمان خاں نے سلہٹ کے بایزید کرانی کے پاس پناہ لی۔ اس سے مغلوں کی اطاعت کرنے کے لیے کہا گیا مگر اس نے انکار کر دیا لہٰذا دونوں افغان سرداروں پر حملہ کر دیا گیا۔ چوبیس پرگنہ میں دولباپور کے مقام پر خونریز جنگ ہوئی۔ مغل فوج تقریباً بکھر گئی اور ان کی شکست یقینی معلوم ہونے لگی لیکن عبدالجلیل نے بہت قریب سے نشانہ لگا کر ایک تیر چلایا جو عثمان خاں کی سیدھی آنکھ میں پیوست ہو گیا اور وہ وہیں گر کر مر گیا۔ اس بہادر افغان کی دلیرانہ سرداری اور رہبری کے ختم ہوتے ہی دشمن فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور مارچ 1612ء میں مغلوں کو غیر متوقع فتح نصیب ہوئی۔ مغلوں کو اس مرتبہ اتنا نقصان اٹھانا پڑا کہ ان کو افغانوں کے تعاقب کا ہوش نہ رہا۔ عثمان خاں کا سر کاٹ کر جہانگیر

کے پاس بھیج دیا گیا۔

عثمان خاں کی موت کے بعد افغانوں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ عثمان کا وزیر خواجہ ولی اور دوسرے لوگ صلح کے حامی تھے لیکن بعض دیگر سردار اس بات کے خواہاں تھے کہ آخری دم تک جنگ جاری رکھی جائے۔ خواجہ نے کئی سو معزز اشخاص کے ہمراہ اطاعت قبول کر لی۔ ان کے ساتھ بڑی مہربانی و سخاوت کا سلوک کیا گیا۔ عثمان کی جائداد ضبط کر لی گئی۔ اس طرح افغانوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ اب سلہٹ پر قبضہ کر لینا آسان تھا کچار بھی راجا سے چھین لیا گیا۔

مشرق میں مغل سلطنت کی توسیع اور کامروپ پر دباؤ ڈالنے کی سیاست کے مدنظر یہ ضروری ہو گیا تھا کہ مرکز کو راج محل سے ہٹا کر ڈھاکہ منتقل کر دیا جائے۔ یہ کام 1612ء میں شروع ہوا اور تیزی سے انجام پانے لگا۔

1613ء میں اسلام خاں نے کامروپ کے راجا پریکشت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ مغل شہنشاہ کے ایک مطیع حکمراں پر راجا پریکشت نے حملہ کر کے اس کے خاندان کو قید کر لیا تھا۔ مغلوں نے زبردست مقاومت اور مشکلات کے باوجود اپنا دباؤ قائم رکھا۔ آخر کار راجا نے صلح کی درخواست کی لیکن اسلام نے غیر مشروط اطاعت کی شرط لگائی۔ لہذا جنگ جاری رہی۔ یہاں تک کہ 1613ء میں کامروپ کو حاصل کر لیا گیا۔

اسلام خاں نے 1613ء میں وفات پائی۔ اس کا بھائی قاسم خاں اس کی جگہ صوبے دار مقرر ہوا لیکن وہ ایک معمولی شخص تھا اور اس میں اسلام خاں کی طرح فراست اور دور اندیشی نہ تھی۔ قاسم خاں کے کچار پر حملے کی ناکامی کے سبب اراکان کے بادشاہ اور پرتگالی بحری ڈاکوؤں کی ہمت بندھی اور انھوں نے مل کر مغل علاقوں پر حملے شروع کر دیے لیکن ان میں آپس میں ناچاقی پیدا ہونے اور پھوٹ پڑ جانے کی وجہ سے ان کی مہم ناکام ہو گئی۔ اس کے باوجود صوبے دار کو بدنامی کا سامنا کرنا پڑا۔

اراکان کے بادشاہ نے 1616ء میں ایک بار پھر سر اٹھایا لیکن اس کے نتائج مضر ثابت ہوئے بہر حال اس کو اس کی اجازت مل گئی کہ اپنے سارے افسروں اور سامان کو مغلوں کو سونپ کر واپس چلا جائے۔

قاسم خاں کی بے جا امنگوں نے اس کو آسام پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا لیکن یہ مہم نہ صرف زبردست طریقے سے ناکام ہوگئی بلکہ اس کے سبب مغل فوج اور بحری بیڑہ برباد ہوگیا۔ مغلوں کے وقار کو زبردست دھکا پہنچا۔ اس داغ کو اپنے دامن سے دھونے کی خاطر قاسم خاں نے اراکان کے خلاف ایک قوی مہم روانہ کی لیکن اس کا انتظام اس بری طرح کیا گیا کہ مغل توپ خانے کو سخت نقصان اٹھانا پڑا اور حملہ آور فوج شرم ناک زک اٹھا کر واپس آگئی۔

اب قاسم خاں کی نااہلی کے ثبوت کے لیے کوئی اور واضح تردیل درکار نہ تھی لہذا اس کو واپس بلا لیا گیا اور بنگال کی صوبے داری 1617ء میں ابراہیم خاں کو سونپ دی گئی۔ اب فوجی پیش دستی کی سیاست کو ترک کرکے مصالحت کی روش اختیار کی گئی ابراہیم خاں نورجہاں کا ماموں تھا اور اس کو شہنشاہ کا اعتماد حاصل تھا وہ دوراندیش مستعد، ایمان دار، صاحب اثر و رسوخ، عاقل، محتاط اور ٹھنڈے دل و دماغ کا مالک تھا۔ ابراہیم خاں نے اپنی لیاقت اور سمجھداری سے کام لے کر صوبے میں امن و امان قائم کر دیا اور اس کو اس کام میں زیادہ پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اس کے عہد بابرکت میں بنگال کا صوبہ طولانی پریشان حالی سے نکل کر خوش حالی کے دور میں داخل ہوا۔ چھ سال کے عرصے میں (1617-23) بنگال میں سرحدی شورشوں کے باوجود جو وقتاً فوقتاً سر اٹھاتی رہیں عام طور پر امن و امان کا دور دورہ رہا۔

ابراہیم کے مشورے کے مطابق شہنشاہ نے کئی بنگالی شہزادوں اور زمینداروں کو جو کہ دربار میں نظر بند تھے واپس وطن جانے کی اجازت دے دی۔ حتی کہ موسیٰ خاں کو بھی نظربندی سے آزاد کر دیا گیا اور اس کی جائداد واپس کر دی گئی۔ اس رویے کا بہت ہی مفید و اطمینان بخش اثر ہوا۔ لوگوں نے اس اقدام کو بہت پسند کیا اور وہ لوگ شہنشاہ کے احسان مند، گرویدہ اور وفادار ہو گئے۔

ابراہیم کی پالیسی نے جو اخلاقی اور مادّی اثرات پیدا کیے اس کے سبب وہ 1618ء میں آسانی سے تپیرہ کو فتح کر سکا اور شاہ اراکان کے حملے کو دفع کر کے ہجلی کے زمینداروں کے بلوہ کو کچل سکا۔

جنگ کے ان واقعات میں سے ایک واقعہ جس پر جہانگیر فخر کر سکتا ہے قلعہ کانگڑا کی

فتح ہے۔ یہ قلعہ پنجاب کے مضبوط ترین قلعوں میں شمار ہوتا ہے۔ کئی پہاڑی گزرگاہوں کے سلسلے سے یہ محفوظ تھا۔ اس زمانے میں بھی یہ قلعہ اتنا قدیم سمجھا جاتا تھا کہ "کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ کس زمانے میں تعمیر ہوا ہے۔" "جس زمانے سے اسلام کی آواز اور دین مبین محمدی کا چرچا ہندوستان میں پھیلا کوئی بھی سلطان عالی شان اس پر قبضہ نہ کر سکتا تھا۔"

جہانگیر کا یہ بیان اگرچہ پوری طرح درست نہیں تاہم اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنی فتوحات اور کامیابیوں کو بڑے مبالغے کے ساتھ بیان کرتا ہے خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہوں۔

1615ء میں جہانگیر نے مرتضیٰ خاں گورنر پنجاب کو حکم دیا کہ قلعہ کو فتح کرے۔ مئو کے راجا باسو کے لڑکے سورج مل کو حکم دیا گیا کہ مرتضیٰ خاں کی مدد کرے۔ یہ مہم شاید اس وجہ سے ناکام ہوئی کہ سورج مل پوشیدہ طور پر کانگڑہ کے حاکم سے ساز باز رکھتا تھا اور یہ نہ چاہتا تھا کہ قلعہ مغلوں کے قبضے میں آجائے۔

مرتضیٰ خاں کی موت کے بعد سورج مل کو سپہ سالاری عطا ہوئی لیکن اس نے اقتدار شاہی کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ جہانگیر نے خود قلعہ کی فتح کا بیڑا اٹھایا اور سندر داس کو جو راجا بکرماجیت بگھیلا کہلاتا تھا۔ قلعہ فتح کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اکتوبر 1620ء کے آغاز میں سندر داس نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور محصورین کو اس کامیابی کے ساتھ تنگ کیا کہ باہر کی دنیا سے قطع تعلق کر دیا گیا۔ چند ماہ کے اندر اندر فاقوں کی نوبت آگئی۔ "قلعہ میں ایک دانہ باقی نہ رہا جو وہ کھا سکتے۔ چار ماہ تک انھوں نے سوکھی گھاس کو نمک ڈال کر ابال ابال کر کھایا۔ جب بربادی یقینی اور راہ فرار مسدود ہوگئی تو انھوں نے پناہ طلب کی اور قلعہ سپرد کر دیا۔" یہ واقعہ 16 نومبر 1620ء کا ہے۔

جہانگیر نے اس فتح کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے شوق میں فروری 1622ء کے آغاز میں کانگڑہ کا سفر اختیار کیا۔ اس نے قاضی اور دوسرے مذہبی بزرگوں کو جو اس کے ہمراہ تھے حکم دیا کہ "قلعہ میں وہ ساری رسومات جو دین محمدی کے مطابق ہوں بجا لائیں ..... اور اللہ کے فضل سے میرے سامنے اذان دی گئی، خطبہ پڑھا گیا اور بیل کی قربانی کی گئی۔ یہ وہ باتیں ہیں کہ تعمیر قلعہ سے آج تک یہاں نہیں ہوئی تھیں۔" یہ رسمی نمائش نہ صرف غیر ضروری بلکہ ناپسندیدہ تھی۔ یہ سب کچھ جہانگیر کے دماغ کی اپج اور ایک استثنائی واقعہ تھا جس کو کسی طرح بھی اس کی

رواداری کی عام سیاست میں کسی قسم کی تبدیلی کا مظہر نہیں کہا جا سکتا۔

روشنیہ تحریک جو مغلوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی اور سنیوں کے غلبے کو سخت ناپسند کرتی مغلوں کو پریشان کرنے سے باز نہ رہی۔ 1611ء میں احداد نے جو اس تحریک کا سرغنہ تھا دوسرے باغی افغان قبیلوں کے ہمراہ کابل پر حملہ کیا لیکن معز الملک نے شہریوں کی پرجوش مدد کے ساتھ جن میں فرملی قبیلہ پیش پیش تھا ان کے حملے کو پسپا کر دیا۔

کابل کے افسر اپنے فرائض کی انجام دہی میں تساہلی برت رہے تھے اس لیے قلی خاں کو اعزاز و اکرام دے کر اس خاص مقصد کے لیے کابل بھیجا کہ "احداد اور اس کے ہموطن ڈاکوؤں کو مار بھگائے لیکن قلی خاں کابل کے افسروں اور خاص طور سے خان دوران کے ساتھ اچھی طرح نبھا نہ سکا چنانچہ اس کو پشاور منتقل کر دیا گیا۔ جہاں کچھ عرصے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

مغلوں کی ناکامی نے احداد کا حوصلہ بڑھایا کہ از سرِ نو حملے شروع کر دیے۔ لیکن خان دوران نے اس کو گھیر لیا اور چرخ کے مقام پر اس کو محصور کر لیا۔ احداد قندھار کی طرف بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

1617ء میں مہابت خاں کو کابل کا صوبے دار مقرر کیا گیا اور راجا ٹوڈر مل کے بیٹے راجا کلیان کو اس کا معاونِ خاص بنا کر بنگش بھیجا گیا۔ ان لوگوں کی آمد سے حالات اور بھی بگڑ گئے۔ کیوں کہ بایزید کا پوتا جس کو اس لیے بھیجا گیا تھا کہ افغانوں کو تسلی تشفی دے خود بھی باغی ہو گیا۔ جب اس کو اس کا احساس ہوا کہ اس کا بھائی اور لڑکا مغلوں کی سخت نگرانی میں ہیں اور مہابت خاں شدید دشمن ہے تو اس کو اپنی بغاوت پر افسوس ہوا اور معافی چاہی۔

اس شخص کی اطاعت نے باغی افغانوں پر کوئی اثر نہ ڈالا اور انھوں نے ہمیشہ کی طرح اپنی کارروائیاں جاری رکھیں۔ ایک مرتبہ تو انھوں نے مغلوں کے ایک دستے پر جو کہ بنگش میں مالگزاری وصول کرنے بھیجا گیا تھا پوری طرح قابو پا لیا۔ مہابت خاں نے جب یہ خبر سنی تو وہ غضب ناک ہو گیا اور ان لوگوں کو سخت ایذائیں پہنچائیں اور جہاں کہیں بھی ان بدبختوں کا نشان ملتا ان کو قتل و گرفتار کرنے میں دریغ نہ کرتا۔ مغلوں کی سخت رَدی بنگش قبائل کی باغیانہ روح کو کچل نہ سکی۔ البتہ وہ ایک معقول حد

کے اندر رہنے لگے اور ان کو پھر کوئی ایسا موقع نہ ملا کہ وہ اپنی طاقت بڑھا سکتے حالانکہ 1622ء میں مہابت خاں کو شاہجہاں کی بغاوت کے باعث واپس بلالیا گیا تھا بہرحال ظفر خاں نے سختی سے احداد کا تعاقب کیا اور وہ یالنگتوش ازبک کی مدد سے اس کی پناہ گاہ کو محصور کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ احداد ایک طولانی جنگ کے بعد مارا گیا اور شہنشاہ کے کابل پہنچنے پر اس کا سر پیش کر دیا گیا۔

ابھی افغانی قبائل پوری طرح زیر نہ ہو پائے تھے کہ قندھار میں شورش برپا ہوگئی۔ جہانگیر کی تخت نشینی کے شروع کے چند سالوں (7-1606) میں ہی ایرانی بادشاہ نے قندھار پر قبضہ کرنے کی کچھ کوشش کی لیکن وہاں کے صوبے دار شاہ بیگ خاں کی ترکیبوں اور دلیرانہ مدافعت اور شہنشاہ کے بروقت اقدام نے شاہ کے منصوبے کو ناکام بنا دیا۔ لیکن شاہ عباس کی آنکھیں قندھار پر لگی رہیں۔ اس نے وہاں کے صوبے دار مرزا غزنی خاں کو رشوت دینے کی بھی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی تب شاہ عباس نے اپنی ترکیب بدلی اور شہنشاہ کے ساتھ بہت ہی دوستانہ خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا تحفے تحائف بھیجے اور تھوڑے عرصے کے بعد چار سفیر بھی روانہ کیے۔

شاہ عباس کو توقع تھی کہ وہ اس طرح جہانگیر کو اس پر راضی کر سکے گا کہ قندھار ایرانیوں کو منتقل کر دے۔ شاہ عباس کے ان اقدامات سے اتنی کامیابی تو ضرور ہوئی کہ جہانگیر نے احتیاطی تدابیر میں ڈھیل ڈال دی۔ قندھار کے فوجی ساز و سامان کی طرف بے توجہی برتی جانے لگی اور وہاں کی فوج کی تعداد روز بروز کم ہوتی گئی۔ سب سے مہلک اقدام تو یہ تھا کہ 1621ء میں قندھار کی صوبے داری خواجہ عبدالعزیز نقشبندی کو دے دی جو ایک کم عمر افسر تھا۔

اسی سال یہ خبر گرم ہوئی کہ شاہ ایران نے قندھار فتح کرنے کے لیے ایک بڑی فوج جمع کر لی ہے۔ "حالانکہ ہمارے گذشتہ اور موجودہ تعلقات کے مدنظر یہ بات بالکل عجیب اور بعید از قیاس معلوم ہوتی تھی کہ ایک اتنا بڑا بادشاہ ایسے خام خیالات دل میں لائے اور میرے ایک کمترین غلام کے مقابل آئے جو قندھار میں تین چار سو ملازمین کے ساتھ مقیم تھا۔" تاہم شہنشاہ زیادہ پریشان نہ ہوا اور نہ اس نے اپنا سفر کشمیر ملتوی کیا۔ بہرحال احتیاطاً اس نے مارچ 1622ء میں شاہجہاں کو ایک فرمان کے ذریعے مع سپاہ،

ہاتھیوں اور توپ خانے کے دربار میں طلب کیا۔ اس زبردست فوج کی سپہ سالاری کے لیے شاہجہاں سے بہتر کسی اور شہزادے کا انتخاب نہیں ہو سکتا تھا۔ وہی سب سے لائق، مناسب ترین اور کامیاب سالار تھا لیکن ضروری کارروائی انجام پانے سے قبل ہی صوبے دار ملتان خان جہان لودی نے جس پر جہانگیر کو پورا اعتماد تھا یہ خبر دی کہ شاہ عباس نے بذاتِ خود آ کر قندھار کا محاصرہ کر لیا ہے اس نے شہنشاہ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ جلد ضروری اقدامات عمل میں لائے جائیں۔

شہنشاہ نے فوراً کشمیر سے واپسی کا فیصلہ کیا۔ دیوان اور بخشی پہلے سے لاہور روانہ کیے تاکہ وہ دکن گجرات بنگال و بہار کی فوجوں کی واپسی کا کام تیزی سے انجام دیں۔ خان جہاں لودی کو حکم دیا گیا کہ جب تک فوجیں جمع نہ ہو جائیں وہ انتظار کرے۔ سمرقند کے حاکم امام قلی خاں نے بھی وعدہ کیا کہ جس وقت مغل فوج قندھار کا رُخ کرے گی وہ خراسان پر حملہ کر کے شہنشاہ کی مدد کرے گا۔

جس وقت جہانگیر ایک "عظیم سپاہ" کی فراہمی کے کام میں مصروف تھا اس کو یہ خبر سُن کر سخت تعجب ہوا کہ شاہجہاں نے فوراً قندھار روانہ ہونے سے انکار کر دیا ہے کہا جاتا ہے کہ شاہجہاں کو اس کا خوف تھا کہ شاید نور جہاں اس کو قندھار جیسے دور دراز مقام پر بھیج کر اس کی طولانی عدم موجودگی سے فائدہ اُٹھا کر اس کے حق کو مزید کمزور بنا دے گی اور اس طرح اس کے رقیبوں اور شاہزادہ شہریار کی پوزیشن جس کی حمایت نور جہاں کر رہی تھی مضبوط ہو جائے گی۔ لیکن یہ خیال کچھ معقول نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ایک اتنی بڑی اور طاقتور فوج کی کمان جو جہانگیر قندھار کی مہم کے لیے بھیجنا چاہتا تھا شاہجہاں کو اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کا موقع فراہم کر سکتی تھی اور اگر حالات کا یہی تقاضا ہوتا تو وہ شاہ ایران سے صلح بھی کر سکتا تھا لیکن شاہجہاں نے قندھار جانے سے انکار کیا ہی نہیں بلکہ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ بارش ختم ہونے تک اس کو مانڈو میں رہنے کی اجازت دے دی جائے۔ اور یہ کہ اگر اس کو قندھار جانے کا حکم دیا گیا تو فوج کی پوری کمان اور پنجاب کا پورا قبضہ اس کے اختیار میں دیا جائے۔

شاہجہاں کو مغل فوج و امرا کا خوب تجربہ تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ آپس میں افسروں کے درمیان رنجشیں اور سوءظنی کس طرح فوجی مہم میں رکاوٹیں ڈال دیتی ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ وہ فوج کی پوری پوری کمان اپنے ہاتھ میں لینے کا خواہش مند تھا۔ اسی طرح وہ ان صوبوں کی غیر مشروط مدد کی اہمیت سے بھی پوری طرح واقف تھا جو اس کی فوجی مہم کے راستے میں پڑتے تھے یا اُن ہموار علاقوں سے متصل تھے۔ اسی وجہ سے وہ صوبہ پنجاب پر پورا تسلط چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس دور دور دراز اور دشوار گزار سفر کی تیاریوں کے لیے اس کے آدمیوں کو کچھ مہلت دی جائے ان شرائط کے ساتھ شاہجہاں برسات کا موسم ختم ہونے پر قندھار جانے کے لیے آمادہ تھا۔

بظاہر شہزادے کا یہ رویہ بالکل حق بجانب تھا لیکن شہنشاہ تو یہ چاہتا تھا کہ ان تمام وسائل کو جو مہیا ہو سکیں جمع کر کے جلد از جلد قندھار کو ایرانیوں سے واپس لے لے قبل اس کے کہ وہ پوری طرح اپنا قبضہ جما لیں۔

چنانچہ وہ شاہجہاں کی ان شرائط و تجاویز پر بہت برہم ہوا کہ بارش ختم ہونے تک انتظار کیا جائے۔ اس کے خیال میں یہ سب محض بہانے تھے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ شاہجہاں کے خیالات اچھے نہ تھے کیوں کہ اس نے نہ صرف جہانگیر کی راہ میں ہی رکاوٹیں ڈالیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس نے زاہد بیگ کو تحفے دے کر شاہ عباس کے پاس روانہ کیا اور اس کی کامیابی کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ شاہ ایران نے بھی زاہد کا پُرجوش استقبال کیا۔

ادھر جہانگیر فوج جمع کرنے اور شاہجہاں کے معاملات کو نبٹانے ہی میں لگا ہوا تھا کہ شاہ ایران نے قندھار کا محاصرہ کر لیا اور ۴۵ دن کے محاصرے کے بعد قلعہ اس کے قبضے میں آگیا۔

شہنشاہ نے خان جہاں لودی کے مشورے پر عمل نہ کر کے زبردست غلطی کی۔ خان جہاں نے قندھار کو فوری مدد کا مشورہ دیا تھا لیکن جہانگیر نے اس وقت تک توقف کیا جب تک کہ ایک عظیم سپاہ جمع نہ ہو جائے اور داخلی معاملات طے نہ پا جائیں۔ یقیناً جہانگیر کی اس نااہلی پر قبر میں اکبر کی پیٹھ نہ لگتی ہوگی کہ اس نے قندھار کو اپنے ہاتھوں سے کھو دیا جس کو اکبر اتنی اہمیت دیا کرتا تھا۔

جہانگیر اب بھی قندھار کو حاصل کرنے کا خواہش مند تھا کیوں کہ جب شاہ ایران

نے اپنے سفیر حیدر بیگ کو ایک خط دے کر روانہ کیا جس میں قندھار پر ایران کا حق جتایا گیا تھا اور اس خواہش کا بھی اظہار کیا گیا تھا کہ شاہ ایران دربار مغلیہ سے دوستانہ تعلقات رکھنے کا خواہاں ہے تو شہنشاہ نے جواب دیا: "آخر ایک ناچیز گاؤں (قندھار) میں کیا رکھا ہے کہ وہ اس کو حاصل کرنے کے لیے خود روانہ ہو اور دوستی و برادری کے جذبات کے مقابلے میں اپنی آنکھیں بند کر لے؟"

شہنشاہ لکھتا ہے: "میں نے اپنی پوری طاقت قندھار کی فوج کی فراہمی کی طرف مبذول کر دی۔"

شاید کچھ دلچسپ واقعات وجود میں آئے ہوں لیکن شاہجہاں کی اس کھلی بغاوت نے جہانگیر کو اتنا موقع ہی نہ دیا کہ وہ اپنی توجہ قندھار کی طرف مبذول کرتا۔ بہرحال قندھار اور زمینداور مغلوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔

انیسویں سال جلوس میں بلخ کے ازبک حاکم نذر محمد نے شاہجہاں کی بغاوت اور قندھار کے ہاتھ سے نکل جانے کے سبب مغل وقار کو جو دھکا پہنچا اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کابل اور غزنی کی فتح کے لیے ایک مہم کا آغاز کیا۔ ازبک سالار یالنگتوش نے غزنی کا کچھ علاقہ حاصل کر لیا اور ہزارہ کو زیر کرنا چاہا لیکن خان زادہ خاں نے جو کہ مہابت خاں کا لڑکا اور کابل کا گورنر تھا ہزاراؤں کی فوجی مدد کی اور ازبک سالار جنگ میں ہار گیا۔ اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے نذر محمد اپنے بھائی امام قلی خاں حاکم توران کی اجازت سے دس ہزار ازبک اور المان سواروں کے ہمراہ حملہ آور ہوا۔ خان زادہ خاں نے بھی مغل افواج کے افسروں کو مختلف فوجی چھاؤنیوں سے بلا کر جمع کیا اور جنگ کے لیے روانہ ہو گیا۔

غزنی سے بیس میل کے فاصلے پر شیر خیر کے مقام پر جنگ ہوئی جس میں ازبکوں کو پھر شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ مغلوں نے اس فتح کے بعد کچھ اور چھوٹی چھوٹی کامیابیاں حاصل کیں۔

ازبک اپنا مال و اسباب چھوڑ کر بھاگ گئے جو لوٹ لیا گیا۔ ازبکوں نے اب اس بات کا اندازہ کر لیا کہ ان کی کوششیں بے کار ہیں۔ نذر محمد نے ایک معافی نامہ ارسال کیا اور اس میں یہ تحریر کیا کہ یالنگتوش نے یہ سب کچھ اس کی

اجازت کے بغیر کیا تھا۔ اس نے شہنشاہ سے یہ بھی درخواست کی کہ وہ خان زادہ خاں کو واپس بلالے کیوں کہ کہا جاتا ہے کہ وہ طرح طرح کی مصیبتیں کھڑی کرتا ہے۔ لہذا جہانگیر نے خان زادہ خاں کو بنگال منتقل کردیا اور کابل کی صوبے داری خواجہ ابوالحسن کو عنایت کی۔

جہانگیر کے سب لڑکوں میں شاہجہاں بلاشک وشبہ سب سے لائق اور اولوالعزم تھا۔ اس کے سب سے بڑے بھائی خسرو کی بغاوت نے شاہجہاں کے لیے راستہ صاف کردیا تھا اور اس کو اس بات کی آس بندھ گئی تھی کہ وہ اپنے باپ کے بعد تخت کا وارث ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض امرا خسرو کے طرف دار تھے۔ لیکن وزیر اعظم اعتماد الدولہ کا پورا خاندان مع ملکہ نورجہاں کے شاہجہاں کا حامی و مددگار تھا۔

جب 1620ء میں نورجہاں نے اپنی بیٹی لاڈلی بیگم کو جو شیر افگن سے پیدا ہوئی تھی۔ جہانگیر کے سب سے چھوٹے بیٹے شہریار سے بیاہ دیا تو اس کے بعد ہی شاہ جہاں اور نورجہاں کے درمیان اختلافات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ یہ بات قدرتی طور پر فرض کرلی گئی کہ نورجہاں اب اپنا اثر ورسوخ اپنے داماد کی طرف داری میں استعمال کرے گی۔

شاہجہاں نے میواڑ اور دکن میں جو کامیابیاں حاصل کیں ان کے سبب اس کا وقار بلند ہوگیا تھا اور اس کے مزاج میں غرور اور غصے نے جڑیں پکڑلیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نورجہاں کی شاہجہاں سے ناراضگی اور دوری کا سبب یہ باتیں بھی ہوسکتی تھیں۔ دونوں کے درمیان ایک دوسرے کے لیے جذبۂ رشک وحسد پیدا ہوگیا۔ تقریباً 17-1616ء میں شاہجہاں نے کوشش کی کہ خسرو کو اس کی نگرانی میں دے دیا جائے لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوا۔

جوں جوں شہنشاہ کی تندرستی گرتی گئی شاہجہاں کو تخت کی فکر زیادہ لاحق ہوتی گئی۔ 1620ء میں جب شاہجہاں سے دوبارہ کہا گیا کہ وہ دکن کے حکمرانوں اور مرہٹوں کی متحدہ فوج کے مقابلے میں جو ملک عنبر جیسے لائق سالار کی سرکردگی میں منظم ہوچکی تھی۔ مغل فوجوں کی کمان سنبھال لے تو اس نے اس وقت تک روانہ ہونے

سے انکار کر دیا جب تک کہ شاہزادہ خسرو کو اس کی سپردگی میں نہ دے دیا جائے اس موقع پر جہانگیر نے اس کی درخواست کو مان لیا اور بدقسمت شہزادے کو اس کی تحویل میں دے دیا۔

شاہجہاں نے دکن کی مہمات میں نہایت شاندار کامیابی حاصل کی۔ اس کی عظیم کامیابی سے ہر شخص کو اطمینان حاصل تھا اور سلطنت میں اس کا وقار اور بھی بڑھ گیا۔

باب 18

بغاوتیں - شاہ جہاں - مہابت خاں

1620ء کے اواخر میں جہانگیر بیمار ہوا۔ شہزادہ پرویز پٹنہ سے باپ کی عیادت کے لیے آیا لیکن حکم ہوا کہ فوراً واپس جائے۔ جنوری 1621ء میں وزیر اعظم اعتماد الدولہ کا انتقال ہوگیا۔ شہنشاہ نے ازراہِ عنایت اعتماد الدولہ کے حقوق اور حکومت سے متعلق ہر چیز و امارت نور جہاں بیگم کو منتقل کردی۔" اور حکم صادر فرمایا کہ "ملکہ کے نقارے و نوبت بادشاہ کی نوبت کے بعد بجائے جائیں۔" دیوانِ کل کا عہدہ خواجہ ابوالحسن کو مرحمت ہوا حالانکہ عملی طور پر وزیر اعظم کے عہدے سے متعلق سارے کام خواجہ ابوالحسن انجام دیتا تھا تاہم وزارت عظمیٰ کے سازو سامان اور وقار کو نور جہاں کے نام منتقل کر دینے سے زبردست کھلبلی مچ گئی۔ مہابت خاں جیسے امراء مشکل ہی یہ بات سوچ سکتے تھے کہ عورت خواہ کتنی ہی لائق کیوں نہ ہو، اتنے بلند مراتب کی سزاوار ہو سکتی ہے۔

شاہجہاں بھی اس بات سے غیر مطمئن تھا اور نور جہاں کی اس ترقی کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ کم از کم ایک ہی رقیب کو اپنے راستے سے ہٹانے کا کام شروع کر دے۔ چنانچہ 22 فروری 1621ء کو اس نے شہزادہ خسرو کو گلا گھٹوا کر قتل کر دیا لیکن مشہور یہ کیا کہ وہ قولنج کے درد سے مر گیا۔ اسی سال ایرانی بادشاہ نے قندھار پر حملہ کیا۔

شاہجہاں کی تجاویز بظاہر کتنی ہی درست کیوں نہ ہوں اس بات میں مشکل ہی

سے کوئی شک ہو سکتا ہے کہ وہ محض بہانہ تھیں۔ اگر اس کی تجاویز مان لی جاتیں تو پنجاب، راجپوتانہ کا بیشتر حصہ، مالوہ، دکن اور گجرات کے صوبے اس کے اختیار میں آجاتے اور ممکن ہے کہ وہ کابل کے صوبے پر بھی ایسے ہی اختیار کا مطالبہ کرتا۔ اس کے علاوہ دوآب اور دہلی میں بھی اس کی جاگیریں تھیں۔

اس تجویز کے نتیجے میں دہلی، آگرہ، الہ آباد، بہار اور بنگال کے علاوہ سارا علاقہ اس کے زیر اثر آجاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بغاوت کی فکر میں تھا اور وہ یہ چاہتا تھا کہ شاہِ ایران نے قندھار پر حملہ کر کے جو حالات پیدا کر دیے تھے ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس کے باغیانہ عزائم کا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اتنی پستی پر اتر آیا کہ زاہد بیگ کو تحفے تحائف دے کر شاہ ایران کی خدمت میں روانہ کیا اور قندھار کی مہم میں ایران کی کامیابی کے لیے اپنی بہترین خواہشات ارسال کیں۔ اس نے "دکن کے حکمرانوں اور گونڈوانا کے زمینداروں سے کافی مقدار میں روپیہ مہیا کرنے کا" انتظام بھی کر لیا تھا۔ اس کی جارحانہ اور بے معنی تجاویز جس بے باکانہ اور گستاخانہ انداز میں شہنشاہ کے روبرو پیش کی گئیں وہ بہت ہی تکلیف دہ تھیں۔

شہنشاہ کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ یہی نتیجہ اخذ کرے کہ شاہجہاں شر پر تلا ہوا ہے۔ شاید جہانگیر کا ابھی تک یہ خیال نہ تھا کہ شاہجہاں اس حد تک بغاوت کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اس کو ایرانیوں سے قندھار واپس لینے کی فکر تھی چنانچہ اس نے اس عظیم فوج کی سپہ سالاری کے لیے اب پرویز کو منتخب کیا اور وہ ابتدائی منصوبہ جس کے ماتحت پرویز کو شاہجہاں کے ساتھ جانا تھا ترک کر دیا گیا۔

شاہجہاں نے شہنشاہ سے درخواست کی تھی کہ دھولپور کی جاگیرداری جو آگرہ سے زیادہ دور نہ تھی اس کو دے دی جائے لیکن یہ جاگیر پہلے ہی سے شہریار کو دی جا چکی تھی اور شہریار کے ملازمین کی نگرانی میں تھی۔ شاہجہاں نے اس بات کو اپنی بے عزتی سمجھا لہٰذا اس نے ایک دستہ بھیج کر شہریار کے ملازمین کو مار بھگایا اور جاگیر پر قبضہ کر لیا۔ جہانگیر شاہجہاں کے اس سلوک سے سخت ناراض ہوا لیکن غصہ پی کر رہ گیا۔ بہر حال شہنشاہ نے شہزادے کو بہت لعن طعن کی اور اس کو دھمکی دی کہ اگر آیندہ اس نے اپنے رویے کو ٹھیک نہ کیا تو اس کو سزا دی جائے گی۔

شہنشاہ نے اس کی دوآبہ اور حصار فیروزہ کی جاگیریں بھی ضبط کرلیں۔ حصار فیروزہ کی جاگیروں کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ یہ جاگیر انگلستان میں ڈچی آف کارنوال کی طرح ولیعہد کی ریاست سمجھی جاتی تھی۔ نورجہاں نے "بظاہر کوئی ایسی بات نہیں کی جس کے سبب شاہجہاں کو شکایت کا موقع ملتا"۔ اس کے برخلاف شاہجہاں نے بڑی آسانی سے سارے الزامات نورجہاں کے سر تھوپ دیے۔

شاہجہاں جو کہ ملکہ سے حسد کرتا تھا اور اپنے منصوبے تیار کر رہا تھا قندھار کے دفاع کے لیے کوئی کام انجام دینے کے لیے تیار نہ تھا بلکہ الٹا اُس نے ملکہ سے بے جا نفرت اور شہنشاہ کو نیچا دکھانے کے لیے زاہد کو شاہ ایران کی خدمت میں بھیجا۔ قندھار کے دفاع میں ناکامی کے سبب مغل حکومت کو دھکا لگ چکا تھا۔ اس کے علاوہ ملکہ کو وکیل کے اعلیٰ عہدے پر مقرر کرنے سے کئی طاقت ور امرار بھی ناراض ہوگئے تھے چنانچہ شاہجہاں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاکر ملکہ کے ساتھ جھگڑا شروع کیا اور اس کی ساری ذمے داری ملکہ کے کندھوں پر ڈال کر علم بغاوت بلند کر دیا۔

شاہجہاں نے دھولپور پر جو آگرے کے بالکل قریب شہریار کی جاگیر کا حصہ تھا حملہ کیا اور ملکہ کی جاگیر کے بعض علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ شہنشاہ نے بھی جوابی کارروائی کے طور پر قندھار کی مہم کی سالاری شہریار کو سونپ دی اور شاہجہاں کو اس کی دوآب اور حصار کی جاگیر سے محروم کر دیا لیکن اس سزا کو اس طرح بے اثر کر دیا گیا کہ جہانگیر شاہجہاں کو اسی قیمت کی جاگیر دکن میں دینے کے لیے رضا مند ہوگیا۔ اب شاہجہاں کو شکایت کا موقع باقی نہ رہا کیوں کہ جو وجوہ اس نے پنجاب کے شمالی صوبوں کو حاصل کرنے کے لیے بیان کی تھیں وہی وجوہ شہریار کے لیے بھی صادق آتی تھیں لیکن شہریار بلا تاخیر قندھار جانے کے لیے رضا مند ہوگیا تھا۔

شاہجہاں نے زبان شکایت دراز کی اور کھلے کھلے خوشامدانہ الفاظ میں اظہار معذرت کیا اور ساتھ ہی ساتھ معاندانہ طریقے سے نورجہاں پر پھبتے پھینکے۔ شاہی حکومت اس بات کا صحیح طور پر اندازہ کرچکی تھی کہ شہزادہ کسی قسم کی شرارت کے درپے ہے۔ نورجہاں نے اپنی عقل خداداد سے سمجھ لیا کہ شاہجہاں کا دکن کی فوج کو بھیجنے سے مستقل انکار کرنا کسی آنے والے خطرے کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ بات

بھی واضح ہو چکی تھی کہ آصف خاں کا سرد مہری کا رویہ اس امر کی دلیل ہے کہ اس کی ہمدردی اپنے داماد کی طرف ہے۔ لہذا نور جہاں نے یہ فیصلہ کیا کہ مہابت خاں کو اپنی طرف ملا لیا جائے۔ وہ اپنی ہوشیاری اور تدبر سے مہابت خاں کو اس بات پر راضی کرنے میں کامیاب ہوگئی کہ وہ فوج کی کمان سنبھال لے۔ اس اکھڑ سپاہی اور لائق سردار نے جو ابھی کچھ عرصے پہلے ہی جہانگیر پر کھلے بندوں یہ اعتراض کر رہا تھا کہ "اس نے ایک عورت کو اتنی چھوٹ دے رکھی ہے کہ اس کا اس پر اتنا گہرا اثر ہے" اب خود بخوشی اعلیٰ منصب قبول کر کے شاہجہاں کے خلاف لڑنے کو تیار تھا۔

قندھار بیشتر شاہجہاں کی بے عملی کے سبب ہاتھ سے جاتا رہا اسی نے شہریار اور ملکہ کی جاگیریں چھین کر اپنی طاقت کے مظاہرے کی پہل کی اور مانڈو میں اپنی فوج کو منظم کیا۔ چنانچہ مغل حکومت نے اس کا چیلنج قبول کر لیا۔ شاہی فرامین کی جن میں کہا گیا تھا کہ باغی شہزادے کے خلاف لوگ آمادہ ہو جائیں فوراً ہی تعمیل ہوئی۔

بہار کے مشرقی محاذ کی فوج شہزادہ پرویز کی سرکردگی میں جے پور، جودھپور، کوٹہ، بوندی اور اور کچھ کے راجا سب ہی تیزی سے شہنشاہ کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔ مہابت خاں بھی حکم ملتے ہی فوراً روانہ ہونے کے لیے تیار ہوگیا۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے حکومت نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی کہ شاہجہاں کو راہ راست پر لے آئے لیکن اس کے جواب میں شہزادے نے اپنے مطالبات اور بھی سخت اور بے ادبانہ و گستاخانہ طریقے پر پیش کیے۔ اس وقت تک شہزادے کی فوج جس کی تعداد ستر ہزار بتائی جاتی ہے۔ فتح پور سیکری پہنچ چکی تھی اور اس کا منصوبہ یہ تھا کہ یکایک آگرے پر حملہ کر کے اس سے پہلے کہ دفاع کی تیاریاں کی جاسکیں اس کو فتح کر لے۔

دھولپور کی فتح محض ایک ابتدائی قدم تھا۔ شاہجہاں آگرے کو لوٹنے میں پوری طرح کامیاب نہ ہوا۔ اگر اعتبار خاں ہمت و ثابت قدمی سے کام نہ لیتا تو آگرہ ہاتھ سے نکل جاتا۔ محمد امین نے ان واقعات کا جو ذکر کیا ہے وہ محض خیالی باتوں اور اظہار معذرت کا نمونہ ہیں۔

شہنشاہ نے ان واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "میرے دل پر جس چیز کا بوجھ ہے اور جس بات نے میری بے قرار طبیعت کو غم و غصے میں مبتلا کر دیا ہے وہ

یہ ہے کہ اس وقت جب کہ میرے فرزند ارجمند اور وفادار افسر قندھار اور خراسان میں خدمت بجالانے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں اس نامبارک شخص (شاہجہاں) نے اپنی سلطنت کے پیروں پر خود ہی کلہاڑی مار رکھی ہے اور اس مہم کی انجام دہی میں ایک زبردست روڑا بن گیا ہے۔ اب قندھار کے اہم معاملے کو ملتوی کرنا پڑے گا لیکن مجھے بھروسہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غم کے اس بوجھ کو میرے دل سے ہٹا دے گا۔"

جہانگیر غالباً یہ بھول چکا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کو اس کے سابقہ برتاؤ کی سزا دے رہا تھا جو اس نے اپنے شریف باپ کے ساتھ روا رکھا تھا اور غضب خداوندی اور انتقام الٰہی میں مبتلا تھا۔

دربار میں کئی اعلیٰ عہدیدار مثلاً آصف خاں معتمد خاں وغیرہ شاہجہاں کے حامی تھے۔ اس کو ان لوگوں سے یہ اطلاع مل گئی ہوگی کہ آصف خاں کو حکم ملا ہے کہ خزانہ آگرے سے لاہور منتقل کردے۔ شاہجہاں نے یہ منصوبہ بنایا کہ خزانے کو راستے میں روک لے اور آگرے پر قبضہ کرلے۔ لیکن اعتبار خاں نے خزانہ آصف خاں کو نہ دیا اور اس طرح وہ بچ گیا۔

جب شاہجہاں اپنے منصوبے میں کامیاب نہ ہوا تو اس نے دہلی کی طرف کوچ کیا۔ اس وقت تک مہابت خاں نے اپنی فوج منظم کرلی تھی اور شاہجہاں کی افواج سے بلوچ پور کے مقام پر اس کا مقابلہ ہوا۔ عبداللہ خاں فیروز جنگ کی غداری کے باوجود جو شاہی افواج کے ہراول دستے کا سالار تھا اور جس کے سبب دس ہزار سوار تتر بتر ہوگئے، فتح شاہی افواج کو ہی نصیب ہوئی اور شاہجہاں کا ایک حامی راجا وکرما جیت لڑائی میں کام آیا۔

اگر میواڑ کے شہزادے بھیم سنگھ نے ہمت و بہادری کا مظاہرہ نہ کیا ہوتا تو شاہجہاں کی فوج کو بھاگنے کا راستہ بھی نہ ملتا اور زبردست نقصان اٹھانا پڑتا۔ شاہزادے نے جب یہ دیکھا کہ اس کی ابتدائی تدابیر کارگر نہ ہوئیں اور اس کو سرنگون ہونا پڑا تو وہ تیزی سے مانڈو کی طرف فرار ہوگیا۔

شاہجہاں نے راجا باسو کے لڑکے جگت سنگھ کو ورغلایا۔ خود راجا باسو نے بھی

ایسے ہی حالات میں اکبر کے زمانے میں بغاوت کی تھی تاکہ شاہی افواج کی توجہ پنجاب کی طرف مبذول ہو جائے۔ لیکن اس وقت شاہی حکومت اس قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کو تیار تھی۔

مہابت خاں نے پرواہ کیے بغیر مانڈو پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ ایک دوسری فوج شہزادہ خسرو کے لڑکے داور بخش کی سرکردگی میں جو بلاقی کے نام سے مشہور تھا گجرات کی بازیابی کے لیے روانہ کر دی۔ شاہجہاں نے گجرات کی حکومت عبداللہ خان کو دے دی تھی۔ جہانگیر نے ان دونوں فوجوں کی ہمت بڑھانے اور ان کی نقل و حرکت پر نگرانی رکھنے کے لیے اپنا مرکز اجمیر منتقل کر دیا۔

اسی دوران شہزادہ پرویز بھی واپس آ گیا۔ ان تیز و تند اقدامات کے باعث شاہجہاں کی پوزیشن مانڈو میں ناقابلِ مدافعت ہو گئی اور اس کے کچھ لائق سردار مثلاً رستم خاں اور برق انداز خاں شاہی فوجوں سے آملے۔

یہ خبر سن کر شاہجہاں کے "ہاتھ اور دل دونوں ہی مفلوج ہو گئے۔" اس کے علاوہ عبداللہ خاں کو جس کو جہانگیر لعنت اللہ خاں کہا کرتا تھا اور جس کے قبضے میں شہر احمدنگر تھا صافی خاں نے شکست دے کر باہر نکال دیا اور شہر و صوبے پر شہنشاہ کی طرف سے قبضہ جما لیا۔ شاہجہاں کو مالوہ اور گجرات میں بھی پناہ نہ ملی۔ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے دریائے نربدا پار کیا۔ شہزادہ پرویز و مہابت کو حکم ملا کہ شاہجہاں کا تعاقب کریں۔

جب اسیر گڑھ کے صوبے دار نے یہ مشہور قلعہ شاہجہاں کے اختیار میں دے دیا تب کہیں جا کر اس کو سکون نصیب ہوا۔ گجرات سے نکالے جانے کے بعد عبداللہ خان اسیر گڑھ آ کر شاہجہاں سے مل گیا۔ اب شاہجہاں نے احمدنگر کے ملک عنبر سے بات چیت شروع کی چونکہ ملک عنبر بیجاپور سے مصروفِ جنگ تھا لہٰذا اس نے اس بات سے انکار کر دیا کہ ایک ہی وقت میں وہ دہلی کی طاقت ور حکومت سے بھی لڑائی چھیڑ دے۔ بیجاپور کے نئے حکمراں محمد عادل شاہ نے بھی شاہجہاں کے پیام پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔

جب شاہجہاں کو ہر طرف سے ناکامی ہوئی تو اس کے ہوش و حواس ٹھکانے

لگے اور اس نے مجبوراً شہنشاہ سے خط و کتابت کا آغاز کیا۔ عبدالرحیم خان خاناں کو جو قیدیوں سے کیمپ میں نظر بند تھا مہابت خاں کی تجویز پر پایۂ تخت روانہ کیا گیا تاکہ شہزادے کی وکالت اور معافی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ مہابت خاں کا اصل مقصد یہ تھا کہ خان خاناں کو شاہجہاں سے علیحدہ کر دیا جائے۔

اس سے پہلے کہ عبدالرحیم مہابت خاں کے پاس پہنچے شاہی افواج بیرم بیگ کی زبردست مخالف فوج کو روندتی ہوئی دریائے نربدا پار کر گئیں۔ مغل فوجوں کے نربدا پار کرنے اور خان خاناں کے شاہجہاں سے جدا ہونے کے سبب مہابت خاں کی ہمت بندھ گئی اور اس نے جنگ جاری رکھی۔ مہابت خاں کی جنگجویانہ سیاست نے شاہجہاں کو پوری طرح بے بس کر دیا اور اس کی حالت خستہ ہو گئی۔ اس میں شک نہیں کہ اس مرحلے پر شاہجہاں اپنے باپ سے صلح کرنے کے لیے بالکل آمادہ تھا۔ یہ خیال اس بات سے بھی پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ اس وقت شاہجہاں کی بیگم ممتاز محل اور اس کے لڑکوں نے بے حد عاجزی کے ساتھ شہنشاہ سے معافی کی فریاد کی۔

جہانگیر کے بیان کے مطابق شاہجہاں نے عبدالرحیم خان خاناں کی روانگی کے وقت اس سے کہا تھا: "مجھ پر کٹھن وقت آپڑا ہے اور میری حالت نازک ہے۔ میں خود کو تمھارے سپرد کرتا ہوں اور اپنی عزت و آبرو کا محافظ بناتا ہوں۔ تم اس طرح عمل کرو کہ میرے خلاف جو نفرت و غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے ختم ہو جائے۔" لیکن خان خاناں نے شاہجہاں سے عہد و پیمان کرنے کے باوجود اسے وفا نہ کیا اور شہزادہ پرویز سے ساز باز کر کے شاہجہاں کو نظر انداز کر دیا۔ اس طرح صلح کی تجویز بروئے عمل نہ آسکی۔

شہنشاہ نے یا تو شاہجہاں کے مخالفین کے کہنے میں آکر یا پھر اس خیال سے کہ اس کو بالکل ہی لاچار کر دیا جائے شہزادہ پرویز کو حکم دیا کہ "اپنے اقدامات کو سست نہ کرے بلکہ ہو سکے تو شاہجہاں کو زندہ گرفتار کرے یا پھر شاہی سرحدات سے باہر نکال دے۔"

شاہجہاں اب شکار کی مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ سر چھپاتا پھر رہا تھا۔ سخت بارش کے دوران اس نے دریائے تاپتی کو جس میں سیلاب آیا ہوا تھا پار کر کے اپنے بیوی بچوں اور ساتھیوں سمیت جن میں بھیم سنگھ بھی شامل تھا گولکنڈہ میں پناہ لی۔ اب

اس کی فوج پانچ ہزار سوار پانچ سو ہاتھی اور تقریباً دس ہزار پیادوں سے بھی کم ہو گئی تھی۔ اس مرحلے پر شاہی افواج نے تعاقب کرنا بند کر دیا کیوں کہ اب شاہجہاں ایک دکنی ریاست کی حدود کے اندر داخل ہو چکا تھا اور اگر اس ریاست کی حدود کے اندر تعاقب کیا جاتا تو یہ دکن کی ریاست میں مداخلت ہوتی۔ شہنشاہ کی واضح اجازت کے بغیر یہ خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔

جہانگیر اچھی طرح جانتا تھا کہ شاہجہاں گولکنڈہ میں زیادہ عرصے تک نہیں ٹھہر سکتا اور وہ اڑیسہ و بنگال ہو کر ہندوستان آنے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ اس نے مرزا رستم کو الہ آباد کا صوبے دار مقرر کیا۔ اڑیسہ اور بنگال میں کوئی خاص انتظام نہ کیا گیا کیونکہ بنگال میں نورجہاں کا ماموں ابراہیم خاں جو کہ ایک قابل شخص تھا صوبے دار تھا اور اڑیسہ ابراہیم بیگ کے بھتیجے احمد بیگ خاں کے ماتحت تھا۔ ان دونوں سے پوری امید تھی کہ وہ وفاداری سے کام کریں گے۔

شاہجہاں کو سلطان محمد قطب الملک والی گولکنڈہ سے سوائے کچھ نقد رقم اور تحفوں کے کوئی فوجی مدد نہ مل سکی تاہم سلطان نے ضروریات کے مہیا کرنے میں ہر قسم کی سہولت فراہم کی۔ شاہجہاں نے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی گولکنڈہ کے علاقے سے نکل جائے گا لہٰذا وہ آگے بڑھا اور مسولی پٹم ہوتا ہوا چستر دیور کی گھاٹی سے اڑیسہ میں داخل ہو گیا شاہجہاں کی ناگہانی آمد اور ہزاروں سوار اور پیادہ فوج دیکھ کر احمد بیگ حیران رہ گیا۔ وہ ہمت چھوڑ بیٹھا اور بنگال کی طرف فرار ہو گیا۔ جب شاہجہاں نے راستہ صاف دیکھا تو آگے بڑھا اور مدناپور ہوتا ہوا نوجدار مرزا صالح سے بردوان چھین لیا۔

شاہجہاں نے ابراہیم خاں کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کی کہ وہ شہزادہ اورنگ زیب کی برائے نام نیابت میں عملاً بنگال کی صوبے داری پر قابض رہے یا بنگال چھوڑ کر جہاں چاہے چلا جائے۔ ابراہیم نے ان میں سے کسی تجویز کو قبول نہ کیا باوجودیکہ افغانیوں اور پرتگالیوں میں کچھ غدار عناصر موجود تھے جن کے سبب اس کا پہلو کمزور تھا اس نے جنگ کا فیصلہ کر لیا۔

راج محل سے چند میل دور اکبر پور کے مقام پر ایک شدید جنگ ہوئی جس میں ابراہیم خاں کی فوج منتشر ہو گئی لیکن اس نے میدان جنگ سے ہٹنے سے انکار کر دیا۔ 20 اپریل 1624ء

کو شمشیر بکف میدان جنگ میں مارا گیا۔ شاہجہاں نے ڈھاکہ پر جو کہ صوبے کا مرکز تھا قبضہ کر لیا۔ یہاں اس کو تیس لاکھ روپیہ نقد پانچ سو ہاتھی اور ایک زبردست توپ خانہ اور بحری بیڑہ ہاتھ لگا۔

شاہجہاں کے اڑیسہ میں داخلے کی خبر شہنشاہ کو پہنچ چکی تھی۔ اس نے شہزادہ پرویز اور مہابت خاں کو حکم دیا کہ وہ تیزی سے صوبہ الہ آباد و بہار کی طرف روانہ ہو جائیں۔ انھوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور تیزی سے مشرقی صوبجات کی طرف روانہ ہو گئے۔ مانڈو چھوڑنے سے پہلے پرویز نے بیجاپور کے عادل شاہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کر لیے تھے۔ عادل شاہ نے پانچ ہزار سواروں کا دستہ مغل سالار کی خدمت کے لیے روانہ کیا۔ مہابت خاں نے ملک عنبر کو نظر انداز کر دیا۔

اب شاہجہاں کے قبضے میں بنگال کے وسیع وسائل آ گئے تھے چنانچہ اس کے لیے ان تمام وسائل اور اپنے سپاہیوں کی مدد سے بہار پر قبضہ کر لینا چنداں مشکل نہ تھا۔ ابراہیم خاں کی شکست کے سبب شاہی فوجوں کی ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ جب بھیم سنگھ پٹنہ کی طرف روانہ ہوا تو انھوں نے کوئی مقاومت نہ کی اور پٹنہ بغیر جنگ کے فتح ہو گیا۔ رہتاس کے قلعدار سید مبارک نے قلعہ کو سپرد کرنے میں پیش قدمی کی۔

شاہجہاں نے دو فوجیں ایک دریا خاں کی سرکردگی میں اور دوسری راجا بھیم اور عبداللہ خاں کے ماتحت الہ آباد کی طرف روانہ کیں۔ کچھ عرصے بعد شاہجہاں خود بھی روانہ ہوا اور اس نے جونپور فتح کر لیا۔

عبداللہ خاں دریائے گنگا کے اس پار قلعہ الہ آباد کے مقابل جھوسی نامی جگہ پہنچ گیا۔ یہاں پر بنگال کا دریائی بیڑہ بھی آ گیا لہٰذا عبداللہ خاں نے توپ خانے کی آڑ لے کر دریا پار کر لیا۔ خوش قسمتی سے الہ آباد پر اس وقت رستم خاں کا قبضہ تھا۔ رستم بہادر سالار تھا اور اس کو شکست دینا آسان نہ تھا۔

محاصرہ نے طول کھینچا اور یہ خبر گرم ہو گئی کہ مہابت خاں اور شہزادہ پرویز پہنچ گئے ہیں اور انھوں نے تقریباً اسی میل کے فاصلے پر بائیس راجپوتوں کی مدد سے دریا پار کر لیا ہے۔ بنگالی بیڑے اور بعض سپاہیوں نے شہزادے کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کی رسد منقطع ہو گئی اور اس کی حالت نازک ہو گئی۔ عبداللہ خاں نے شاہجہاں کو مشورہ دیا کہ

الہ آباد چھوڑ کر اودھ کے راستے دہلی پر دھاوا بول دے کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ باغی فوج تعداد کے لحاظ سے اتنی کمزور تھی کہ وہ کوئی مفید کام انجام نہ دے سکتی تھی۔ ان کی تعداد شاہی فوج کے چالیس ہزار سپاہیوں کے مقابلے میں صرف دس ہزار تھی۔ راجا بھیم نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "اس طرح بھاگتے پھرنا راجپوتوں کی آن کے خلاف ہے" اور یہ سلسلہ جاری رہا تو" وہ اس کی حمایت پر بھروسہ نہ کرے۔"

بھیم سنگھ شاید یہ سمجھتا تھا کہ دہلی پر حملے سے سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا کیونکہ مہابت خاں راستے میں ہے اور آگرے پر ایک اور بہادر افغان سردار خان جہاں لودی کا قبضہ ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ رستم خاں جو الہ آباد پر قابض تھا وہ ان پر واپسی کی راہ بند کر دے گا۔ آخر کار یہ فیصلہ کیا گیا کہ جان کی بازی لگا دی جائے۔ دریائے گنگا اور تونس کے سنگم پر بمقام دمدمہ جنگ ہوئی جس میں راجا بھیم چتوڑ کے خاندان کی روایتی بہادری دکھاتا ہوا مارا گیا۔ باغیوں کا توپ خانہ شاہی افواج کے قبضے میں آ گیا اور شاہجہاں کا گھوڑا زخمی ہو گیا۔ باغیوں نے شکست تسلیم کر لی اور پیچھے ہٹ گئے۔

شاہجہاں اپنی بیگم کو رہتاس چھوڑ کر بنگال چلا گیا۔ اس کو یہاں کسی خاص مدد کی امید نہ تھی کیوں کہ مہابت خاں نے اپنی حکمت عملی سے بنگال کے زمینداروں کو اس پر راضی کر لیا تھا کہ وہ شہزادہ کا ساتھ نہ دیں۔ ادھر داراب خاں صوبے دار بنگال جس کو شاہجہاں نے مقرر کیا تھا اب ایک مایوسانہ مقصد کے لیے جنگ پر آمادہ نہ تھا۔ شاہجہاں نے جب اپنی حالت کمزور دیکھی تو وہ جس قدر سامان اور گولہ بارود حاصل کر سکا اکٹھا کر کے جس راستے سے دکن سے آیا تھا اسی راستے سے فرار ہو گیا۔

جب شاہجہاں دکن پہنچا تو ملک عنبر نے بخوشی اس کا استقبال کیا۔ ملک عنبر اس وقت بیجاپور اور مغلوں سے برسرپیکار تھا اور اس نے ان پر قطعی برتری حاصل کر لی تھی۔ مہابت خاں نے ملک عنبر کی عاجزانہ تجاویز کو رد کر کے بیجاپور سے معاہدہ کر لیا تھا۔ لہذا ملک عنبر موقع کی تلاش میں تھا۔

جوں ہی مہابت خاں اور شہزادہ پرویز کو شاہجہاں کے مقابلے کے لیے بلایا گیا ملک عنبر نے بیجاپور پر حملہ کر کے کئی فتوحات حاصل کیں اور پائے تخت کا محاصرہ کر لیا۔ مغل افسر بیجاپور کی مدد کو آئے۔ پہلے تو ملک عنبر نے صلح کی درخواست کی لیکن اس میں ناکام ہو کر

اس نے جان توڑ کوشش کی اور اپنے زیرکانہ اقدامات سے مغلوں اور بیجاپور کی مشترکہ افواج کو احمدنگر کے قریب بھتوری کے مقام پر شکست دی۔ اس شکست سے مغلوں اور بیجاپور کی افواج میں ہل چل مچ گئی اور عنبر کی ہمت اس قدر بڑھی کہ اس نے بیجاپور و احمدنگر دونوں کا بیک وقت محاصرہ کر لیا۔ بیجاپوریوں سے شولاپور چھین کر عنبر نے برہان پور پر جو مغلوں کا فوجی مرکز تھا اور جہاں پرویز کے نائب سربلند رائے نے خود کو قلعہ بند کر لیا تھا ہلا بول دیا۔

ملک عنبر نے بڑی خوشی کے ساتھ شاہجہاں کو برہان پور کے محاصرے کا کام سونپ دیا۔ شہزادے نے قلعہ کو حاصل کرنے کے لیے دو مرتبہ دلیرانہ اقدام کیے لیکن کامیاب نہ ہو سکا اسی دوران میں مہابت خاں اور شہزادہ پرویز پھر وارد ہوئے لہذا شاہجہاں نے مجبوراً محاصرہ اٹھا لیا۔

اس ناکامی سے عبداللہ خاں و شاہجہاں دونوں پر بہت اثر پڑا۔ عبداللہ نے تو دنیا ہی ترک کر دی اور شاہجہاں بیمار ہو گیا۔ جب اس کو یہ پتہ چلا کہ اس کے ساتھی بڑی تعداد میں اس کو چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں تو وہ بہت ہی مایوس ہوا پھر بھی اس نے بالا گھاٹ میں اپنی قسمت آزمائی کرنا چاہی۔ جب اس کو پھر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو اس نے شہنشاہ سے معافی مانگی اور خود بالا گھاٹ چلا گیا۔

جہانگیر اپنے خجالت زدہ شہزادے کو اس سے زیادہ سزا دینا نہ چاہتا تھا۔ وہ خود ہی بہت دکھ اٹھا چکا تھا۔ اس نے ہر ممکن کوشش کر کے دیکھ لیا اور ہر دفعہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آخرکار اس نے خود کو شہنشاہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اس معاملے میں نور جہاں بیگم نے بھی کوئی رکاوٹ نہ ڈالی۔ شہنشاہ نے اس کو ان شرائط پر معافی دینے کا وعدہ کیا کہ وہ بہار میں رہتاس اور خاندیش میں اسیر گڑھ کے قلعے سپرد کر دے اور اپنے دو بیٹوں دارا اور اورنگ زیب کو بطور یرغمال دربار میں روانہ کرے۔ شاہجہاں نے یہ ساری شرائط قبول کر لیں اور اس کو معافی مل گئی۔ بالا گھاٹ کا علاقہ اس کو اخراجات کے لیے عطا ہوا۔

شاہجہاں کی ناکامی بیشتر اس کے غلط اندازے کے سبب عمل میں آئی اس کا خیال تھا کہ جہانگیر بیماری کے سبب کوئی فوری کارروائی نہ کر سکے گا اور آصف خاں دیوان

چونکہ شاہجہاں کا خسر تھا کوئی قدم ایسا نہ اُٹھائے گا جس سے شہزادے کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ شہزادے کو یہ بھی امید تھی کہ نور جہاں کو جسے اعلیٰ معاشرتی اور نیم سیاسی اختیارات دیے گئے تھے اس کی وجہ سے بہت سے اعلیٰ امرا اور فوجی افسران شہنشاہ سے بددل ہوکر اس کے پرچم تلے جمع ہوجائیں گے کیونکہ وہی سب سے لائق بادشاہ اور بزعم خود کامیاب ترین سیاست داں و فوجی سالار تھا۔ اس کو یہ خیال بھی تھا کہ اسی کی فوج سب سے بڑی اور بہترین جنگجو ہے۔ یہاں تک کہ شاید شہنشاہ بھی اتنی جلد اتنی زبردست فوج جو اس کی فوج کے مقابلے پر جم سکے اکٹھا نہ کرپائے گا۔ اس کو یہ بھی خیال پیدا ہوا کہ شمال مغرب میں ایران کے دباؤ کے سبب مغربی سرحدات سے فوجیں نہ بلائی جاسکیں گی۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر اس کو یقین سا ہوگیا تھا کہ بغیر کسی خاص مخالفت کے کامیابی یقینی طور پر اور جلد ہی اس کے قدم چومے گی۔

شاہجہاں کو شاید یہ بات یاد نہ رہی کہ سلطنت کے عوام کی زبردست اکثریت اور امرا کی بڑی تعداد شہنشاہ کی وفادار ہے۔ اکبر نے تاج مغلیہ میں وہ کشش پیدا کردی تھی کہ لوگ اس کے لیے بیک وقت محبت، احترام اور خوف کا جذبہ رکھتے تھے اس کے علاوہ جہانگیر نے اپنی علالت کے باوجود کافی مستعدی دکھائی اور اس معاملے پر پوری توجہ دی۔

شاہ ایران قندھار فتح کرنے کے علاوہ کوئی اور اقدام نہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات اس واقعے سے ثابت ہوتی ہے کہ شاہ نے قندھار کی فتح کے کچھ ہی عرصے بعد اپنا ایک سفیر جہانگیر کے دربار میں روانہ کیا اور اس کے ساتھ دوستی و تعلقات بڑھانے کے جذبات کا اظہار کیا۔ اس سے جہانگیر کی پریشانی بڑی حد تک دور ہوگئی اور اب وہ اپنے بہترین اور لائق ترین سالاروں مثلاً مہابت و خاں جہاں کو مع ان کی افواج کے واپس بُلاکر باغیوں سے مقابلہ کے لیے بھیج سکتا تھا۔

جہاں تک نور جہاں کا تعلق ہے ہر چند بعض ایسی ہستیوں کی شہ پر جنھیں ذاتی طور پر اپنے حصول مقاصد کے لیے دلچسپی تھی۔ کچھ لوگ اسے غیر ہردلعزیز کہہ کر رسوا کرتے اور بدگوئی کرتے بایں ہمہ وہ عوام میں محترم اور مقبول تھی اور لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے بے حد محبت تھی۔

جہانگیر کے عزم مصمم، کابل سے لے کر بہار تک شاہی امراء کا فرمان شاہی کی فوری تعمیل کے لیے کمربستہ رہنا اور شاہ ایران کے اخلاصات دوستی نے شاہجہاں کے حامیوں کو نہ صرف دربار شاہی میں غیر مؤثر بنا دیا بلکہ بہت سے لوگ اس کا ساتھ چھوڑ بیٹھے یا بددل ہو گئے۔ یہاں تک کہ دکن کی ریاستوں کو بھی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اس کی حمایت کر سکتیں۔ اس کے علاوہ حکومت مغلیہ کی فوری اور احتیاطی فوجی اور سیاسی کارروائیوں نے شاہجہاں کو اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اڑیسہ، بنگال، بہار اور اودھ میں جو کامیابیاں حاصل کر چکا تھا ان سے کسی قسم کا ٹھوس فائدہ اٹھا سکتا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جب اس کے مالی و مادی وسائل اور سپاہیوں کی تعداد میں کمی آگئی تو وہ کہیں سے بھی مؤثر مدد حاصل نہ کر سکا۔ مشرق میں بھی کوئی ایسی مضبوط حلیف ریاست نہ تھی جو اس کا ساتھ دیتی۔

ایک طرف تو شاہجہاں کے ہمدرد و وفادار اور اہم ساتھی مثلاً راجا وکرماجیت اور بھیم سنگھ جنگ میں کام آگئے اور دوسری طرف عبدالرحیم خان خاناں اور اس کے بیٹے نے شہزادے سے دغابازی کی۔ مختصراً جونہی شہنشاہ کا دست حمایت شہزادے کے سر سے اٹھا اس کی عظیم فوجی لیاقت اور فوجی سوجھ بوجھ کی سستی شہرت کا پول کھل گیا۔

جس وقت تک شاہجہاں بغاوت کرتا رہا اس کا خسر آصف خاں کوئی ایسا سنجیدہ قدم نہ اٹھا سکا جس سے اس کی پریشانی کا اظہار ہوتا۔ شہزادے کی بغاوت کے آغاز ہی میں آصف خاں پر شک و شبہ کیا جانے لگا تھا لہٰذا اس نے پوری کوشش کی کہ خود کو اس معاملے سے علیحدہ رکھے۔

جب اس نے یہ دیکھا کہ اس کا تیز و طرار دشمن مہابت خاں اس کے داماد کو جگہ جگہ بھگاتا پھر رہا ہے تو اس کو فکر لاحق ہوئی۔ اس نے اپنی معتمد بہن نور جہاں کے دل میں اپنے لیے محبت و عزت کا جذبہ پیدا کیا اور ایک بہت ہی نازک کھیل کھیلنا شروع کر دیا جس کو سمجھنا آسان نہ تھا۔ اس کا تنہا مقصد یہ تھا کہ مہابت خاں کی طاقت کو کم کر دیا جائے اور پھر اس کو پرویز سے علیحدہ کر کے دونوں کو کمزور بنا دے۔

شاہجہاں کی بغاوت نے اس بات کو واضح کر دیا کہ کسی بھی قوی فاتح فوج کو طویل عرصے تک ایک ہی زیرک فوجی سردار کے قبضے میں رہنے دینا اور شاہی خاندان کے شہزادے کا اس سالار سے اتنا قریب ہونا خطرے سے خالی نہیں۔ عبدالرحیم خان خاناں و خرم کے میل جول نے ایک خطرناک بغاوت کو جنم دیا اور کوئی تعجب نہیں کہ پرویز و مہابت خاں اپنی فتوحات کے نشے میں چور ہو کر ایسا ہی راستہ اختیار کریں اور پھر ان کو زیر کرنا سلطنت کے لیے دردِ سر بن جائے۔

اس خیال نے اس واقعے سے اور بھی تقویت حاصل کی کہ مہابت خاں نے بنگال و بہار سے جو مال غنیمت ہاتھ آیا تھا نہ تو اس کا حساب دیا اور نہ ہاتھی روانہ کیے اس کے علاوہ اس نے سرکاری مالگزاری اور باغی زمینداروں سے چھینی ہوئی جائداد سے جو کثیر رقم حاصل ہوئی اس کا بھی کوئی حساب نہ دیا۔ دیوان نے اس پر سخت اعتراضات کیے اور احتیاط یا سیاست کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہی مناسب سمجھا گیا کہ شہزادے کو مہابت خاں سے جدا کر دیا جائے۔ عبدالرحیم خان خاناں نے بھی اس کی تائید کی جو کہ پرویز اور مہابت خاں کے درمیان اختلاف پیدا کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

1625ء میں مہابت خاں کو حکم ملا کہ بنگال کی صوبے داری سنبھال لے اور پرویز کی وکالت خان جہاں لودی کو سونپ دے جو اس وقت گجرات کا صوبے دار تھا۔ بنگال کی مضرصحت آب و ہوا کے سبب وہاں کی صوبے داری کوئی قابل رشک عہدہ نہ سمجھا جاتا تھا بلکہ صوبہ کا محل وقوع ایسا تھا کہ اکبر کے زمانے ہی سے بہترین و تجربے کار امراء کو اس کی باگ ڈور سونپی جاتی۔

شہزادہ پرویز نے مہابت خاں کو چھوڑنے میں لیت و لعل کیا جس کی وجہ سے حکومت کے شبہات اور بھی مضبوط ہو گئے ہوں گے۔

جونہی پرویز و مہابت خاں نے شاہی احکام کی تعمیل میں تھوڑی سی تاخیر کی آصف خاں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر شہنشاہ کے کان بھرنے شروع کیے۔ ایک واجب التعمیل اور قطعی فرمان صادر ہوا۔ چنانچہ پرویز اور مہابت خاں نے اس کی تعمیل کا فیصلہ کیا۔ مہابت خاں نے اپنے عہدے کی ذمے داری خان جہاں لودی کو سونپی اور اطمینان سے برہانپور سے روانہ ہو گیا۔

مہابت خاں نے شہنشاہ سے درخواست کی کہ اس کے بیٹے خان زاد خاں کو کابل سے واپسی کی اجازت دے دے تاکہ وہ بنگال آکر اس کے نائب کی حیثیت سے کام انجام دے جس طرح وہ کابل میں انجام دیتا تھا۔ شہنشاہ نے اس بات کی اجازت دے دی۔ سرکاری طور پر مہابت خاں بنگال کا صوبے دار ہو گیا۔

اب آصف خاں نے تیسرا قدم اٹھایا۔ دیوان مملکت ہونے کی حیثیت سے اس نے ہاتھیوں، مال غنیمت اور اس رقم کے حساب کتاب کا مطالبہ کیا جو مہابت خاں کو دی گئی تھی۔ اسی وقت عبدالرحیم خان خاناں نے شہنشاہ کے حضور مہابت خاں کے خلاف اپنے لڑکے اور خاندان کے دوسرے افراد کو قتل کرنے اور مال و اسباب لوٹنے کے الزامات عائد کیے۔ نورجہاں اپنی نام نہاد سیاسی سوجھ بوجھ اور ہوشیاری کے باوجود آصف خاں کے گہرے خود غرضانہ مقاصد سے آگاہ نہ ہو سکی اور پورے اطمینان کے ساتھ اس پر بھروسہ کرتی رہی چونکہ مہابت خاں نورجہاں کا متوسل یا ہوا خواہ نہ سمجھا جاتا تھا لہٰذا ملکہ نے اس معاملے میں کوئی خاص دلچسپی نہ لی اور آصف خاں کے بظاہر معقول مطالبات میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔

مہابت خاں نے سارے ہاتھی واپس کر دیے اور اطمینان سے برہان پور سے رنتھمبور کی طرف روانہ ہو گیا جو کہ اس کی جاگیر تھی چونکہ وہ خود بنگال نہ پہنچا اور نہ اس کو کوئی خاص کام سپرد کیا گیا تھا لہٰذا دربار میں حاضری کا حکم ملا اور ایک افسر کو ایک ہزار احدیوں کے ساتھ اس کو لانے کے لیے روانہ کیا گیا۔

اس غیر معمولی برتاؤ سے مہابت خاں اور دوسروں کو یہ احساس ہوا کہ شہنشاہ مہابت خاں سے ناراض ہو گیا ہے لہٰذا بہت کم منصب دار اس کے ساتھ دربار جانے کے لیے تیار ہوئے۔ تاہم اس نے اپنے جھنڈے تلے چار ہزار راجپوت اور دو ہزار مغل سپاہی جمع کر لیے اور ان کو ہمراہ لے کر روانہ ہو گیا۔

مہابت خاں کو شہنشاہ نے اس وقت تک دربار میں حاضری کی اجازت نہ دی جب تک کہ وہ سارے حسابات اطمینان بخش طریقے پر دیوان کو سونپ نہ دے۔ مہابت خاں کے صبر کا پیمانہ اس وقت چھلک گیا جب کہ اس کے داماد برخوردار خاں کو زدوکوب کر کے قید کر دیا گیا اور مہابت خاں نے اس کو جو جہیز دیا تھا وہ چھین لیا گیا۔ اس کے خلاف

یہ الزام عائد کیا گیا کہ اس کی شادی شہنشاہ کی اجازت کے بغیر انجام پائی تھی ۔ امرا کے درمیان شادیاں شہنشاہ کے مشورے سے انجام پاتیں۔ یہ افواہ بھی گشت کر رہی تھی کہ آصف خاں مہابت خاں کو گرفتار کرانے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ اب مہابت خاں کو اس بات کا احساس ہوا کہ اس کے اور شہنشاہ کے درمیان اس کے بدخواہوں خاص طور پر آصف خاں نے ایک لوہے کی دیوار کھڑی کر دی ہے لہذا اس نے یہ دیوار توڑ دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

جب مہابت خاں کیمپ میں پہنچا تو شہنشاہ کابل جا رہا تھا۔ اس نے موقع کا انتظار کیا۔ ایک دن جب کہ شاہی ملازمین جمنا پار کر کے دریا کے اس طرف پہنچ گئے اور شہنشاہ ہنوز اس پار ہی تھا مہابت خاں زبردستی شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہو کر عرض کیا: "میں نے لاچار ہو کر اور اس خوف سے کہ آصف خاں پوری طرح مجھے ذلیل و خوار کرنے کے درپے ہے۔ خود کو شہنشاہ کی پناہ میں دے دیا۔ اگر شہنشاہ مجھ کو اپنی خدمت کے لائق نہیں سمجھتے تو قتل کر دیں۔"

جہانگیر کو جب علم ہوا کہ اس کا خیمہ مہابت خاں کے آدمیوں کے گھیرے میں ہے تو اس کو سخت تعجب ہوا۔ اب مہابت خاں نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر شہنشاہ اس کے ہمراہ اس طرح چلیں گویا شکار کھیلنے جا رہے ہیں تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ یہ سب کچھ اعلیٰحضرت کی خواہش و احکامات کے عین مطابق ہو رہا ہے۔ شہنشاہ نے یہ بات نہایت خاموشی سے مان لی اور اس کو مہابت خاں کے کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔

مہابت خاں اپنی بہادری اور غیر معمولی دلیری کے جوش میں نور جہاں کو اپنے قبضے میں کرنا بھول گیا۔ جب اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ شاہی کیمپ میں واپس آیا لیکن نور جہاں دوسرے کنارے پر جا چکی تھی۔

نور جہاں بڑی باہمت اور عاقل خاتون تھی۔ اس کو اس غیر معمولی برتاؤ پر غصہ ضرور تھا لیکن اس کے سامنے اصل مسئلہ شوہر کو نجات دلانا، اس کی زندگی کی حفاظت کرنا اور تاج شاہی کے وقار کو قائم رکھنے کا تھا۔ اس نے سارے بڑے بڑے امراء کو جن میں آصف خاں بھی شامل تھا طلب کیا اور ان کی غفلت اور بد انتظامی پر ان سب کو سخت سست کہا۔

ملکہ نے حکم دیا کہ وہ شہنشاہ کو رہا کرا کے کھوئی ہوئی عزت دوبارہ حاصل کریں۔ چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ وہ دریا کو پھر سے پار کر کے باغیوں سے لڑیں۔ جب جہانگیر کو اس منصوبے کا پتہ چلا تو اس نے اس کو رد کر دیا کیوں کہ اس طرح ایک خونریز جنگ اور خود اس کی جان کا خطرہ تھا لیکن جہانگیر کے مشورے پر توجہ نہ دی گئی اور منصوبے پر عمل درآمد کیا گیا۔ نورجہاں خود ہاتھی پر سوار ہو کر اپنے سپاہیوں کی نقل وحرکت دیکھتی رہی۔ بدقسمتی سے انھوں نے جو گھاٹ دریا کو عبور کرنے کے لیے منتخب کیا کہیں کہیں کافی گہرا تھا۔ جب دریا میں اترنے کی کوشش کی جا رہی تھی تو فوج کا نظم بگڑ گیا اور بدنظمی پیدا ہو گئی۔ مہابت خاں کے آدمیوں نے جو کہ دریا کے دوسرے کنارے پر قبضہ کیے ہوئے تھے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور قبل اس کے کہ شاہی سپاہ اور افسران کنارے پر پہنچ سکیں حملہ کر دیا۔ شاہی فوج منتشر ہو گئی۔ بڑی تعداد میں سپاہی قتل ہوئے اور بہت سے دریا میں غرق ہو گئے۔ نورجہاں کا ہاتھی بھاگا۔ آصف خاں نے راہِ فرار اختیار کی اور بھاگ کر قلعہ اٹک میں پناہ لی۔

فدائی خاں جو جہانگیر کے خیمے کے پاس تک پہنچ گیا تھا مجبوراً واپس آ گیا اور اس کو رہتاس کے قلعہ میں پناہ لینا پڑی۔ شاہی افواج کے تتر بتر ہو جانے کے بعد مقابلہ اور جنگ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ نورجہاں نے خود کو سپرد کر دیا اور اس کو شہنشاہ کے ساتھ رہنے کی اجازت مل گئی۔

اب جب کہ مہابت خاں کو سکون حاصل ہوا تو اس نے اپنے بیٹے بہزدر کو اٹک کی طرف روانہ کیا اور خود شہنشاہ کے ہم رکاب آہستہ آہستہ کابل کی طرف چل دیا۔ آصف اٹک کی حفاظت نہ کر سکا اور اس نے قلعہ سپرد کرنے کی پیش کش کی اس کو گرفتار کر لیا گیا۔ مہابت خاں مئی 1626ء میں کابل پہنچ گیا۔ اس کے ہمراہ شہنشاہ ملکہ اور سابق وزیر بھی موجود تھے۔ درباری امور حسبِ معمول انجام پا رہے تھے۔

مہابت خاں نے یا تو اپنے اعمال کے مہلک نتائج سے ڈر کر یا پھر غرور سے سرشار ہو کر بادشاہ و ملکہ اور آصف خاں کو مناسب نظربندی کی حدود میں رکھنے کے علاوہ کوئی نازیبا حرکت نہ کی۔ اس نے انتظامیہ معاملات میں زیادہ دخل نہ دیا البتہ

بعض صوبے داروں کے عہدے اپنے حامیوں کے لیے ضرور حاصل کر لیے۔ اس نے شہنشاہ کو تقریباً پوری آزادی دے رکھی تھی۔ دربار لگاتا، شکار کھیلنے جاتا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ توران کے سفیر کو بھی باریاب ہونے کا موقع دیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہابت خاں کا اس کے علاوہ کوئی اور مقصد نہ تھا کہ شہنشاہ کو اپنے مخالفین کے منحوس اثرات سے بچائے اور شہنشاہ اس کے مفاد کو مدنظر رکھے لیکن ملکہ اس بات کو کہ وہ اپنے منصب دار کے زیر اثر رہیں تاج شہنشاہی کے وقار کے منافی سمجھتی تھی۔ اس نے مہابت خاں کی قوت کو توڑنے کی سازشیں کی اور غیر مطمئن امراء کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس کے باوجود مہابت خاں نے اس کی آزادی پر نہ تو کوئی پابندی لگائی اور نہ ہی اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔

ملکہ نے مہابت خاں کو کمزور کرنے اور اپنے بھائی کو اس کی قید سے آزاد کرانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مہابت خاں آہستہ آہستہ عوام میں اپنی مقبولیت کھوتا جا رہا تھا۔ اس کا سبب یہ نہ تھا کہ اس نے کوئی ناپسندیدہ کام کیا ہو یا اپنی قوت کا ناجائز استعمال کیا ہو بلکہ سبب یہ تھا کہ راجپوتوں کا اثر روز بروز بڑھتا جا رہا تھا اور اس وجہ سے دوسرے افسروں کے دلوں میں رشک و حسد پیدا ہو گیا۔ ملکہ نے اس کا فائدہ اٹھایا۔

ادھر مہابت خاں چالبازی اور دوسروں سے میل ملاپ کے ڈھنگ سے بالکل ہی بے بہرہ معلوم ہوتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ بجائے اس کے کہ لوگ اس کے ساتھی اور ہمدرد ہوں اس کے حامیوں کی تعداد روز بروز کم سے کمتر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ دراصل ایک سپاہی پیدا ہوا تھا اور صلح کے زمانے میں چالاکی و حکمت عملی سے کام لینے کے ڈھنگ سے ناواقف تھا۔ بہرحال شہنشاہ نے چاہے مصلحتاً ہی کیوں نہ ہو اس سے ناراضگی کا اظہار نہ کیا

بدقسمتی سے احدیوں اور راجپوتوں کے درمیان گھوڑوں کی چوری کے معمولی سے جھگڑے پر لڑائی ہو گئی جس کی وجہ سے حالات اور ابتر ہو گئے۔ اس چھوٹی سی غیر اہم بات کے نتائج بہت ہی نقصان دہ برآمد ہوئے اور مہابت خاں کے کئی سو بہادر راجپوت اس لڑائی میں مارے گئے اور اس کو بدنامی کے سوا کچھ نہ ملا۔

اسی وقت 1626ء میں یہ خبر ملی کہ شاہجہاں دکن سے روانہ ہو کر پائے تخت

کی طرف روانہ ہوگیا ہے۔ چنانچہ شاہی کیمپ کو بھی کابل سے ہندوستان کی طرف کوچ کرنے کا حکم دے دیا گیا اور تازہ فوج کی بھرتی کا حکم صادر ہوا۔ نورجہاں کو اب موقع ہاتھ آیا۔ وہ پہلے ہی سے مہابت خاں کی غیر مقبولیت سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔ اس نے بہت سے افسروں کو رشوت اور ترقی کے وعدے دے کر اپنی طرف ملا لیا اور ایسی فوج بھرتی کی جو اس کی طرف دار ہو۔

لاہور میں دو ہزار کے قریب سپاہی ملکہ کے نام سے بھرتی کیے گئے اور ان کو ہدایت کی گئی کہ وہ شاہی کیمپ میں شریک ہوں۔ مہابت خاں نے اس پر کسی ناراضگی یا خفگی کا اظہار نہ کیا کیوں کہ شہنشاہ نے اس پر یہ اثر ڈال رکھا تھا کہ وہ پوری طرح اس سے راضی ہے۔ یقیناً آصف خاں ان حالات و واقعات سے خوش ہوگا جو اس کی طرف داری میں انجام پا رہے تھے اور جن کو اس کی بہن بروئے کار لا رہی تھی۔

جس وقت شاہی سواری رہتاس پہنچی، نورجہاں نے اندازہ کر لیا کہ مہابت خاں کی طاقت نسبتاً کمزور ہو چکی ہے اور اس کے مقابلے میں اس کی اپنی طاقت اتنی مضبوط ہو گئی ہے کہ ضروری اقدام کر سکے۔ ادھر شہنشاہ نے اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنی سوار فوج کا معائنہ کرنا چاہتا ہے اور مہابت خاں سے کہا کہ اس موقع پر نہ تو وہ خود آئے اور نہ اپنی فوج لائے کیونکہ ایسی صورت میں کسی ہنگامے کے اٹھ کھڑے ہونے کا خدشہ ہے۔

کچھ عرصے کے بعد دوسرا حکم صادر ہوا کہ مہابت خاں ایک منزل آگے کوچ کرے جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ شاہی خیمہ سے دور ہو جائے۔ اب مہابت خاں کو احساس ہوا کہ اس کی حالت کمزور ہے۔ اس نے حکم کی تعمیل کی لیکن اگلی منزل پر قیام کرنے کے بجائے تیزی سے ٹھٹھہ کی طرف فرار ہوگیا اور آصف خاں اور شہزادہ دانیال کے لڑکوں کو اپنے ہمراہ لیتا گیا۔ ایسا کرتے وقت مہابت خاں کو سوائے اپنی ذاتی حفاظت کے کوئی اور بات مدنظر نہ تھی لہٰذا جونہی شاہی افواج سے محفوظ فاصلے پر پہنچ گیا۔ اس نے ان سب کو چھوڑ دیا اور ان کو شاہی کیمپ میں واپس جانے کی اجازت دے دی۔ اس طرح مہابت خاں کی ڈرامائی بغاوت کا خاتمہ ہوگیا۔

آصف خاں پھر ایک مرتبہ شہنشاہ کی قسمت پر حاوی ہوگیا اور ملکہ کو یہ اطمینان

نصیب ہوا کہ وہ اپنے شوہر اور بھائی کو نجات دلانے میں کامیاب ہوگئی۔ اس کو ابھی تک اس کا احساس نہ ہوا کہ اس کو اپنے بھائی پر جو اعتماد تھا وہ غلط تھا اور اس نے نا سمجھی میں اپنے حق میں کانٹے بو لیے تھے۔

مہابت خاں ٹھنڈا نہ ہوا۔ کچھ عرصے تک تو وہ ہندوستان میں گھومتا رہا کیونکہ اس کو بنگال سے بائیس لاکھ روپے کی آمد کی امید تھی۔ شہنشاہ کو اس کا علم ہو گیا اور اس نے وہ خزانہ راستے میں ہی رکوا لیا۔ اب مایوس ہو کر مہابت خاں میواڑ کی پہاڑیوں میں پناہ گزیں ہوا اور شاہجہاں سے خط و کتابت شروع کی۔ شاہجہاں نے بخوشی اس کو اپنی ملازمت میں قبول کر لیا۔

حالانکہ شاہجہاں کو شہنشاہ نے معاف کر دیا تھا اور اس کے اور اس کے خاندان کے اخراجات کے لیے جاگیر بھی عطا کر دی تھی لیکن شاہجہاں اس حالت پر قناعت کرنے والا نہ تھا۔ اس کو دربار و مہابت خاں کے حالات کا پورا پورا علم ہو گیا ہوگا۔ اس کو شہنشاہ اور شہزادہ پرویز کی گرتی ہوئی صحت کی خبریں بھی ملتی رہیں۔ اس نے شاہ ایران سے بھی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی کہ اگر کچھ اور نہیں تو شہنشاہ سے اس بات کی سفارش کرے کہ شاہجہاں کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے لیکن شاہ نے اس کو یہی نصیحت کی کہ "وہ اپنے باپ کا مطیع و فرماں بردار رہے۔"

شاہجہاں نے یہ محسوس کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ وہ دکن سے روانہ ہو جائے اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ باغی مہابت خاں کو سزا دینے اور شہنشاہ و ملکہ کو اس کے پنجے سے نجات دلانے کے لیے شمال کی طرف روانہ ہو رہا ہے۔ اس کو امید تھی کہ خان جہان لودی اس کا ساتھ دے گا لیکن خان جہان نے علیحدہ رہنا ہی پسند کیا کیونکہ یا تو اس کو شاہی دربار کے حالات کی پوری اطلاع نہ تھی یا پھر وہ خود کو شہزادے کے مشکوک عمل سے وابستہ کرنا نہ چاہتا تھا۔

اجمیر میں شاہجہاں نہ تو لوگوں میں اپنے لیے جوش و خروش پیدا کر سکا اور نہ کافی تعداد میں سپاہی بھرتی کر سکا۔ راجا بھیم سنگھ کا بیٹا کشن سنگھ جو اس کے زبردست حامیوں میں سے تھا مارا گیا اور اس وجہ سے اس کی حالت بہت ہی کمزور ہو گئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے اپنے منصوبوں میں تبدیلی کی اور یہ فیصلہ کیا کہ سندھ چلا

جائے۔ وہاں سے وہ بہ آسانی شہنشاہ کے دربار اور شاہ ایران دونوں سے رابطہ قائم رکھ سکتا تھا اور اگر حالات موافق ہوتے تو تیزی سے آگے بھی بڑھ سکتا تھا۔ بصورت دیگر وہ ایران جاکر قسمت آزمائی کرسکتا تھا۔

شاہجہاں نے سندھ پہنچ کر اپنے چند ہزار سواروں اور پیادوں کی مدد سے ٹھٹھہ پر جو حکومت کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک آباد اور مال دار تجارتی مرکز تھا قبضہ کرنا چاہا لیکن وہ شرف الملک پر جوکہ قلعہ کا فوجدار تھا کسی قسم کا اخلاقی یا مادی اثر نہ ڈال سکا لہذا کامیابی کی امید چھوڑ کر بیماری کی حالت میں گجرات کی طرف روانہ ہوا جہاں اس کو پرویز کی موت کی خبر ملی جو تخت وتاج کے لیے اس کا رقیب ہوسکتا تھا۔ مہابت خاں اگرچہ پوری طرح باغی قرار نہ دیا گیا تھا تاہم دربار میں کوئی اس کا حامی نہ تھا۔ ان دونوں کے راستے سے ہٹ جانے کے سبب شاہجہاں کے دل میں ہمت و امید پیدا ہوگئی اور اس نے یہی فیصلہ کیا کہ دکن جاکر بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لیتا رہے۔

وہاں پہنچ کر اس کو مہابت خاں کا پیغام ملا کہ وہ اپنی خدمات شہزادے کو پیش کرنا چاہتا ہے۔ شاہجہاں نے یہ درخواست بخوشی منظور کرلی۔ نورجہاں کی حماقت اور آصف خاں و شاہجہاں کے بہی خواہوں کی عیارانہ چالوں سے مہابت خاں شاہجہاں کی حمایت میں پہنچ گیا۔

شاہجہاں اور مہابت خاں کے درمیان مصالحت سے شہنشاہ کا پریشان ہونا قدرتی بات تھی اس کے علاوہ اور کیا کیا جاسکتا ہے کہ دکن کی افواج کے سپہ سالار خان جہاں لودی کو یہ حکم دیا جائے کہ وہ ہوشیار رہے، ان دونوں اتحادیوں کی نقل و حرکت پر نگرانی رکھے اور اگر لازمی ہو تو ضروری اقدامات سے نہ چوکے۔

1627ء کے موسم گرما میں جہانگیر کی صحت خراب ہونا شروع ہوئی۔ ضیق النفس کا شدید حملہ ہوا اور بھوک ختم ہوگئی۔ وہ روز بروز کمزور ہوتا گیا۔ کشمیر سے لاہور واپس ہوتے ہوئے راجوری کے قریب راستے میں زبردست دورہ پڑا جو مہلک ثابت ہوا اور وہ ساٹھ سال کی عمر میں 28 اکتوبر 1627ء کو انتقال کرگیا۔

جہانگیر کو قدرت نے عمدہ ادبی و فنی ذوق مرحمت کیا تھا۔ وہ ہر خوب صورت چیز گل وگیاہ اور قدرتی مناظر سے جتنا لطف اندوز ہوسکتا تھا اتنی ہی لطافت کے ساتھ ان کو

بیان بھی کر سکتا تھا۔ اس کے تزک میں انفرادیت، علمی تفتیش و تحقیق کا سلیقہ اور قدرت سے عشق وعام لیاقت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس کی یہ تصنیف اپنی قسم کی بہترین اور تزکِ بابری کی ہم پلہ مانی جاتی ہے۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ تزکِ جہانگیری میں تزکِ بابری کی نسبت دوگنا مواد موجود ہے اور دونوں میں سے تزکِ جہانگیری کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔ یہ بیان کچھ مبالغہ آمیز ہے کیونکہ تزکِ جہانگیری میں تزکِ بابری کی طرح سادگی، دقتِ نظر، جدت پسندی اور استادانہ ملکہ و روانی موجود نہیں۔ تاہم تزکِ جہانگیری سے ہم کو اس کی خوبیوں اور برائیوں کا خاصہ اندازہ ہوجاتا ہے۔ اس میں بعض سیاسی حالات، اشخاص اور ان کی زندگی اور روزمرہ کے معاملات کا دلچسپ ذکر موجود ہے۔ تزکِ جہانگیری اس کے دور کی معلومات کا اگر تنہا نہیں تو کم ازکم سب سے زیادہ اہم معلومات کا سرچشمہ ضرور ہے۔

جہانگیر کو عدل و انصاف سے بہت محبت تھی اور وہ اپنی بیماری کے ایام میں بھی یہ فرض انجام دیتا۔ اس کے انتقال کے طویل عرصے بعد تک اس کو منصف اور عادل ترین بادشاہ سمجھا جاتا رہا۔ وہ کبھی کبھی تو انصاف کے جوش میں آکر مجرموں کو شدید ترین سزائیں دیتا۔ گو عام طور پر مہربان، انسان دوست، وسیع القلب اور درگزر کرنے والا تھا لیکن بعض اوقات تو وہ دل ہلا دینے کی حد تک شقی القلب اور سنگ دل ہوجاتا۔ وہ مذہبی عقائد میں تنگ دل نہ تھا اور دوسرے عقائد کے لوگوں کے ساتھ تبادلۂ خیال کرنے میں لطف لیتا۔ اس کا دل و دماغ صوفیانہ خیالات کی طرف زیادہ مائل تھا تاہم وہ اپنے باپ کی نسبت زیادہ اور خرم سے کم راسخ العقیدہ تھا۔ وہ کبھی کبھی محض متعصب مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے رواداری کی سیاست کے ان اصولوں کے خلاف عمل کرتا جن کو اکبر نے بنایا تھا اور عام طور پر ان پر گامزن رہا۔ اس کو اس بات کا اتنا زیادہ شوق نہ تھا کہ خود کو قانونِ اسلام کا علمبردار ظاہر کرے۔ تاہم اس کے رویّے نے رجعت پسند عناصر کو بڑھاوا دیا۔ بدقسمتی سے اس کے عہد میں غیرارادی طور پر مذہبی ایذا رسانی کی سیاست پھر سے ابھری۔ سکھوں کے گرو ارجن اور سیورا جینی طبقے کو محض اس وجہ سے ایذائیں نہیں پہنچائی گئیں کہ ان کے خلاف حکومت سے غداری کا الزام تھا بلکہ اس سبب سے کہ جہانگیر کے دل میں ان کے مذہب کے لیے نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ اس نے قمرخاں کے لڑکے کوکب، نقیب کے بیٹے عبداللطیف اور شریف کو ان کے نظریات کی بنا پر قید کرایا اور کوڑے لگوائے۔

مآثر جہانگیری کا مؤلف لکھتا ہے کہ یہ کام قانون شریعت کی حفاظت کی خاطر انجام دیے گئے۔ جہانگیر کے حکم سے اور اس کی موجودگی میں کانگڑہ کے ایک مندر میں بیل کی قربانی کی گئی۔ تاہم یہ نہ بھولنا چاہیے کہ جہانگیر کے عہد میں گاؤکشی ممنوع تھی چاہے ہندوؤں کو اس قسم کی مراعات کے لیے قیمت ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑتی ہو۔

یہ جہانگیر ہی تو تھا جس نے اجمیر کے قریب پشکر میں اپنے آٹھویں سن جلوس میں مندروں کی بے حرمتی اور بربادی کا حکم صادر کیا۔ بہرحال یہ بات ماننا پڑتی ہے کہ عام طور پر وہ ایذا رسانی کے حق میں نہ تھا اور اپنے باپ کی سیاست پر گامزن رہتا تھا وہ عملی طور پر ہندو، مسلمان یا سکھ رعایا و ملازمین کے درمیان کوئی فرق نہ برتتا اور دسہرہ، دیوالی، شوراتری و رکشا بندھن کے تیوہار منایا کرتا۔

جہانگیر فنون و ادبیات کا بھی مربی تھا۔ اس کے زمانے میں فن مصوری اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی اور فن تعمیرات کی تزئین و آرائش میں جدید عناصر شامل ہوئے۔ ادبیات نے اپنی توانائی قائم رکھی گو اکبر کے عہد کی نسبت اس میں تھوڑی سی کمی آگئی تھی۔

جہانگیر کی زندگی کے تاریخ وار واقعات

1	جہانگیر کی تخت نشینی	24 اکتوبر 1605
2	خسرو کا آگرے سے فرار	6 اپریل 1606
3	گرو ارجن کی وفات	30 اپریل 1606
4	ایرانیوں کا محاصرہ قندھار	1606
5	میواڑ پر حملہ	1606
6	ایرانی ایلچی حسن بیگ کی آمد	فروری۔ مارچ 1607
7	جہانگیر کی کابل میں آمد	3 جون 1607
8	نور جہاں سے عقد	1611
9	شہنشاہ کا گرو ہرگوبند کو بلانا	1612
10	بنگال کا پائے تخت راج محل سے ڈھاکہ منتقل ہونا	1612
11	کامروپ کا الحاق	1613
12	میواڑ کی فتح	1613-1615
13	خرم کا دکن کی طرف روانہ ہونا	نومبر 1616
14	بتیرہ کی فتح	1618
15	کانگڑہ کی فتح	16 نومبر 1620
16	جہانگیر کانگڑہ میں	فروری 1622
17	قندھار کی شکست	1622
18	شہزادہ خرم کی بغاوت	1622
19	غزنی و کابل پر ازبکوں کا حملہ	1623
20	مہابت خاں کی بغاوت	1626
21	جہانگیر کی وفات	29 اکتوبر 1627

مزید مطالعے کے لیے پڑھیے

فارسی :-

جہانگیر : تزک جہانگیری ۔ سرسید احمد خاں ایڈیشن ۔ انگریزی ترجمہ جلد دوم
از اے ۔ راجرز اینڈ ایچ بیوریج
محمد شریف معتمد خاں : اقبال نامۂ جہانگیری
نعمت اللہ : مخزن افاغنہ
خواجہ کامگار غیرت خاں : مآثر جہانگیری
شتاب خان : بہارستان غیبی ۔ انگریزی ترجمہ ڈاکٹر بوراہ
سجان رائے : خلاصۃ التواریخ
خافی خاں : منتخب اللباب

یورپین :-

ان کتابوں کے علاوہ جو اکبر کے سلسلے میں بیان کی گئی ہیں ۔ مندرجہ ذیل کتب کا بھی مطالعہ کریں :

De Laet's work translated into English by J.S. Hoyland ., 2 Vols. Hyklut Society

Thomas Roe: Journal, 2 Vols. Hyklut Society

Terry: Voyage to East Indies

Pelasaert: The Romanstraine, English translation by Moreland and Geyl

Elliot and Dowson: Relevant Volumes

جدید انگریزی کتابیں :-

Beni Prasad: History of Jahangir

Banarsi Prasad: History of Shah Jahan

Payne: Jahangir and the Jesuits

Banerji: Evolution of the Khalsa

ھندی:

اوجھا۔ جی۔ ایچ : راجپوتانہ کا اِتہاس

اُردو:

ذکاء اللہ : تاریخ ہندوستان

جہانگیر کی شہزادگی کے زمانے کے حالات کے لیے اُن کتابوں کا بھی مطالعہ کیا جائے جو اکبر کے دور سے متعلق ہوں۔

باب 19

شاہجہاں

تاجپوشی سے دوسری بندیلا جنگ تک

جہانگیر کی موت سے نور جہاں کو نہ صرف دلی صدمہ اور تکلیف پہنچی بلکہ اس کے لیے جہانگیر کی وفات کے سبب مصیبتیں آکھڑی ہوئیں۔ اس کو اپنے بھائی کے برتاؤ سے سخت صدمہ پہنچا۔ ملکہ نے آصف خاں کی ہمیشہ بڑی مدد کی لیکن اس نے متوفی شہنشاہ کی تجہیز و تکفین میں ہاتھ بٹانے اور اہم قسم کے امور سلطنت میں مشورہ دینے سے صاف انکار کر دیا اور اتنی توفیق بھی نصیب نہ ہوئی کہ بیوہ بہن کی بد قسمتی پر اظہار ہمدردی کرے آصف خاں کے اس طرز عمل سے اس لیے چشم پوشی کی جاتی ہے کہ اگر وہ بہن سے ملنے جاتا تو ممکن ہے اس کی چالاک بہن کوئی چال بچھا کر اگر اس کو قتل نہ کراتی تو گرفتار تو ضرور کرا دیتی۔ لیکن اگر وہ اپنی بہن سے اتنا ہی خائف تھا تو اپنی حفاظت کا بندوبست کر سکتا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ ملکہ کو بالکل الگ تھلگ کر کے ہر ایک پر اس بات کا اظہار کر دے کہ اس کو ملکہ سے کسی قسم کا تعلق نہیں اور سلطنت میں اس کی کوئی قدر و منزلت باقی نہیں رہی ہے۔ اس نے رسومات تعزیت میں وقت ضائع کرنے کے بجائے حالات سے فائدہ اٹھا کر اپنے منصوبوں کو بروئے کار لانے کے متعلق

سوچ بچار شروع کر دیا۔ ممکن ہے کہ اس کے برتاؤ سے ایک طرف تو نورجہاں کو یہ احساس پیدا ہو گیا ہو کہ اب اعلیٰ سیاست میں اس کا کوئی مقام نہیں اور دوسری طرف شاہجہاں بھی اس کے طرزِ عمل سے خوش ہوا ہوگا۔

جہاں تک نورجہاں کا تعلق ہے وہ بے حد افسردہ و غمزدہ تھی اور رو رو کر اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی بلکہ شہنشاہ کی نعش کو خود لاہور لے گئی اور اس کو اپنے باغ دلکشا میں دفن کیا۔

جہانگیر کی وفات کے وقت شہریار لاہور میں اپنے بالوں کے گرنے کا علاج کرا رہا تھا۔ شہریار نے لاہور جاتے ہوئے خسرو کے لڑکے شہزادہ داور بخش کو میر بخشی ارادت خاں کے حوالے کر دیا تھا جو آصف خاں کا پروردہ تھا۔ شاہجہاں کے تین لڑکے دارا، شجاع اور اورنگ زیب نورجہاں کے پاس تھے۔ اگر پایۂ تخت میں سلطنت کے لیے کوئی ہنگامہ ہوتا تو اس کا امکان تھا کہ یہ ہنگامہ ان شہزادوں کے درمیان ہی محدود رہتا جو وہاں موجود تھے۔

آصف خاں نے نورجہاں اور اس کی بہن کو شدید نگرانی میں رکھنے کے لیے ان کے مکانات پر پہرا بٹھا دیا۔ اس طرح وہ لوگ سرکاری قیدی بن گئے۔ ان کو نہ کسی سے خط و کتابت کی اجازت تھی اور نہ ملنے کی۔ شاہجہاں کے لڑکوں کو بھی خواجہ ابوالحسن کی مدد سے نورجہاں کے پاس سے ہٹا لیا گیا۔

آصف خاں نے بنارسی داس کو فوراً شاہجہاں کے پاس روانہ کر کے پایۂ تخت کے حالات سے آگاہ کیا اور کہلا بھیجا کہ جلد از جلد لاہور پہنچے۔ اس نے مہابت خاں کے پاس بھی پیغام روانہ کیا کہ شاہجہاں کی پوری پوری حمایت کرے۔

لیکن آصف خاں نے جو سب سے زیادہ اہم کام انجام دیا وہ یہ تھا کہ اس نے خسرو کے بیٹے داور بخش کو محض اس خلا کو پُر کرنے کی غرض سے جو شہنشاہ کی موت سے واقع ہوئی تھی تخت نشین کر دیا۔ شہزادہ بادشاہ کا لقب اختیار کرنے کے لیے قطعاً تیار نہ تھا کیونکہ اس کو اپنے دردناک انجام کا پہلے ہی سے احساس ہو گیا تھا لیکن اس کو پہلو تہی کرنے کا موقع ہی نہ دیا گیا۔ آصف خاں اور ارادت خاں نے قسمیں کھا کھا کر اس کو اطمینان دلایا۔ اگر ان امرار کی آنکھوں پر خود غرضی اور طرفداری کا پردہ نہ پڑا ہوتا تو وہ اس عمل

کے لیے تعریف کے مستحق ہوتے کیونکہ داور بخش جہانگیر کے سب سے بڑے لڑکے کا لڑکا ہی تو تھا۔ ان لوگوں کو اس کا فخر حاصل ہوتا کہ بابر، ہمایوں اور اکبر کی طرح انھوں نے بھی بحرانی وقت میں ایک صحت مند مثال کی تائید کی لیکن ان لوگوں میں نہ تو اتنی بصیرت تھی اور نہ ہی اس کی انجام دہی کا عزم۔ ان کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ شاہجہاں کی آمد اور تخت نشینی تک ان کے متحدین میں کسی قسم کی پھوٹ نہ پڑنے پائے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی قانون اولاد اکبر کے حق وراثت کے اصول پر زور نہیں دیتا اور جانشینی کے مسئلے کو انتخاب کے ذریعے حل کرنے کو ترجیح دیتا ہے لیکن اسلامی قوموں کی تاریخ کے رجحان نے یہ بات بلا تردید واضح کر دی ہے کہ انتخاب کا اصول بتدریج ختم ہو گیا تھا اور اس کی جگہ یا تو وراثت یا محض زور و زبردستی نے لے لی تھی۔

اس بات کا بڑا احتمال تھا کہ شاہجہاں تخت حاصل کرنے کے لیے ہتھیار اٹھاتا لیکن اس کے عمل کی ایک ایسے اصول کی خاطر حمایت کی جا سکتی تھی جو دوسرے عمل کے مقابلے میں کمتر معیوب تھا۔ اگر امرا اس موقع پر اٹھ کھڑے ہوتے تو وہ اس دفعہ بھی اتنے ہی کامیاب ہو سکتے تھے جتنے کہ وہ اس سے قبل شاہجہاں کی بغاوت کے موقع پر کامیاب ہوئے تھے یا بعد میں شہریار کی نافرمانی کے سلسلے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ ان کے اعمال سے بجائے تدبر، دور اندیشی و عقلمندی کے عیاری اور دغابازی صاف ظاہر ہوتی تھی۔

یہ بات مشہور کر دی گئی کہ جہانگیر نے مرتے وقت داور بخش کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ یہ کوئی ناممکن بات بھی نہ تھی۔ چنانچہ داور بخش کو شیر شاہ کا لقب دے کر تخت نشین کر دیا گیا۔ بھمبر کی مسجد میں 12 نومبر 1627ء کو اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور پھر اس کے نام کے سکے بھی مسکوک ہوئے۔

لاہور میں شہریار نے اپنی حماقت کے سبب خود کو شہنشاہ مشہور کر دیا اور اپنے نام کے سکے جاری کرا دیے۔ اس کو امرا اور سپاہیوں کی حمایت حاصل کرنے کا اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نظر نہ آیا کہ وہ ان پر سونے چاندی کی بارش کر دے۔ پندرہ دن کے مختصر عرصے میں ستر لاکھ روپیہ تقسیم کر دیا۔ شاید وہ صرف یہی ایک طریقہ اختیار کر سکتا تھا کیونکہ اس کی گنجی شخصیت، ناقص چال چلن، ناتجربہ کاری، غیر مستعدی اور

کوتاہ نظری کے سبب سارے امرا اس سے دل برداشتہ تھے۔ اس نے دانیال کے بیٹے مرزا بایسنغر کی سرکردگی میں آصف خاں اور اس کے کٹھ پتلی ساتھیوں کے غرور کو کچلنے کے لیے ایک فوج روانہ کی۔

دکیل آصف خاں جس کو دیوان خواجہ ابوالحسن اور افواج شاہی کے سادات بارھہ کی حمایت حاصل تھی مرزا بایسنغر کے لیے سخت دشمن ثابت ہوا۔ ابوالحسن جنگ کے لیے نکلا لیکن اس کو زیادہ زحمت نہ اٹھانی پڑی۔ پہلی ہی جھڑپ کے بعد شہریار کی فوجیں منتشر ہوگئیں کچھ لوگ تو بھاگ گئے اور کچھ آصف خاں کی فوج کے ساتھ آملے۔ شہریار نے دو تین ہزار آدمیوں کے ساتھ خود کو قلعہ میں بند کر لیا لیکن اس کے آدمیوں میں دغابازی پھیلی ہوئی تھی لہذا وہ قلعہ کو چند روز کے لیے بھی اپنے قبضے میں نہ رکھ سکا۔ فیروز خاں خواجہ سرا نے اس کو دشمنوں کے سپرد کر دیا۔ اس کو کٹھ پتلی شہنشاہ کے سامنے پیش کیا گیا اور اسے اندھا کرکے قید میں ڈالنے کا حکم صادر ہوگیا۔ دانیال کے لڑکوں طہورث اور ہوشنگ کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا گیا۔

بنارسی داس کشمیر سے بیس روز میں دکن پہنچ گیا۔ وہ اپنے مقصد میں خوب کامیاب ہوا۔ مہابت خاں اس خبر سے خوش ہوا اور اس نے یہ اطلاع شاہجہاں کو بھیج دی جو کہ جونیر میں خیمہ زن تھا۔ مشکل سے چار روز گزرے ہوں گے کہ شاہجہاں احمد آباد کی طرف چل دیا۔ بظاہر اس کا مقصد تھا کہ دہلی پر حملہ کرنے سے پہلے وہ اس صوبے پر قبضہ کر لے اس سلسلے میں محض یہ بدشگونی ہوئی کہ خان جہان لودی صوبے دار برہان پور اور سالار شاہی افواج (خان خاناں) نے اس کے ساتھ شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ شاہجہاں کے پاس نہ تو اتنے وسائل تھے اور نہ اتنا وقت ہی تھا کہ اس سے ٹکر لے لہذا اس نے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط روانہ کرنے پر قناعت کی جس میں نیک خواہشات کا اظہار کیا گیا تھا لیکن خان جہان نے اس خط سے بے اعتنائی برتی اور جواب بھی نہ بھیجا اس کی مایوسی اور ناراضگی کی وجہ یہ تھی کہ شاہجہاں نے مہابت خاں کو خان خاناں کا خطاب عطا کر دیا تھا۔

شاہجہاں نے گجرات شیر خاں کے حوالے کر دیا۔ شیر خاں نے فوراً ہی اطاعت قبول کر لی اور سیف خاں کو جو شدید بیمار تھا گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ شاہجہاں

نے ممتاز محل کی مداخلت پر شیر خاں کو خبردار کر دیا کہ سیف خاں کو جو کہ ممتاز کی بڑی بہن کا شوہر ہے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ تقریباً اسی وقت عیسیٰ خاں کو پنج ہزاری منصب دے کر ٹھٹھہ کا صوبے دار مقرر کر دیا گیا۔

اب شاہجہاں کو اصغر خاں کے ذریعے اس کی اطلاع مل چکی تھی کہ شہریار اور اس کے حامیوں کو شکست دے کر گرفتار کیا جا چکا ہے۔ شاہجہاں نے آصف خاں کی وفاداری کی تعریف کی اس کی کامیابی پر مبارک باد دی اور ہر ممکن رقیب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پانے کی اور آصف خاں کی وفاداری کو پرکھنے کی خاطر اس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ شہریار اور دانیال کے لڑکوں کو قتل کر دیا جائے۔

آصف خاں نے بخوشی شاہجہاں کی خواہشات کو جامۂ عمل پہنایا۔ اس نے شہزادوں کو قتل کرا دیا اور لاہور میں شاہجہاں کا خطبہ پڑھوایا۔ اس وقت شاہجہاں اور اس کے ساتھیوں کو اس بات کا احساس نہ ہوا کہ انھوں نے اپنے وحشیانہ اور شیطانی فعل قتل و غارت گری سے ایک ایسی خطرناک رسم کی بنیاد ڈال دی ہے جو بابر کے خاندان کی قوت کو پامال اور مغل سلطنت کی جڑوں کو کھوکھلا کر ڈالے گی۔ اگرچہ اور لوگ اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھنے کو زندہ نہ رہے لیکن شاہجہاں نے اپنے کیے کا پھل ضرور پایا۔

آگرہ جاتے ہوئے میواڑ کا راجا کرن سنگھ شاہجہاں کے پاس اظہارِ اطاعت کے لیے آیا۔ مہابت خاں کو اس کی سفارش پر اجمیر کا صوبہ جاگیر میں دے دیا گیا۔ شاہجہاں نے اس طرح راجپوتانہ اور گجرات میں خود کو مضبوط کرنے کے بعد فروری 1628ء میں آگرہ کی طرف کوچ کیا۔

آخرکار بھائیوں، عزیزوں اور بھتیجوں کے خون سے ہاتھ رنگ کر شاہجہاں ۶ فروری 1628ء کو مغلوں کی روایتی شان و شوکت کے ساتھ آگرے میں تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے باپ کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحبقران ثانی شاہجہاں بادشاہ غازی کا لقب اختیار کیا۔

شہنشاہ نے اپنی تخت نشینی کی یادگار میں سجدے کی رسم کو ختم کر دیا، اپنا نیا سنہ شروع کیا اور حکم دیا کہ نئے سکوں کے ایک طرف چاروں خلفائے راشدین کے نام اور دوسری طرف اس کا اپنا نام کندہ کیا جائے۔ خاندان کی بیگمات اور خونی رشتے

کے شہزادوں کو بیش بہا تحائف دیے گئے۔

کہا جاتا ہے کہ شاہجہاں نے اپنی تاجپوشی کے موقع پر ایک کروڑ ستر لاکھ روپیہ خرچ کیا۔ اس رقم میں سے تیس لاکھ روپیہ امرار کو ملا اور بقیہ روپیہ تحفوں کی شکل میں شاہی خاندان والوں کے حصے میں آیا۔ شاہجہاں نے اپنے حامیوں کو ترقیاں دیں یا جن کو ترقی نہ ملی وہ اپنے عہدے و منصب پر مستقل کردیے گئے اور ہمیشہ کی طرح جن امرا کی وفاداری میں کسی قسم کا شک و شبہ تھا اُن کی جگہ اپنے معتمدین کا تقرر کیا۔

شاہجہاں نے ازراہِ مہربانی نورجہاں کے لیے دو لاکھ روپیہ سالانہ کی پنشن مقرر کردی۔ یہ بات واضح نہیں کہ یہ رقم نورجہاں کی اُن عنایات کے صلے میں تھیں جو اس نے شاہجہاں سے اعتمادالدولہ کے زمانے میں کی تھیں یا اپنے ضمیر کو تسلی دینے کے لیے مقرر کی تھی تاکہ اس نے جو سیاسی چالیں نورجہاں کے خلاف چلی تھیں اور اس سلسلے میں اس خاتون پر گستاخانہ الزامات لگائے تھے اُن کا بدلہ چکایا جاسکے۔

نورجہاں عورت ہونے کی وجہ سے کسی ایسے ہم عصر وقائع نویس کو نہ پاسکی جو اس کے ساتھ انصاف کرتا۔ اس کے شوہر نے آدابِ معاشرت یا نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے بارے میں زیادہ نہ لکھا البتہ کہیں کہیں اس کی وفاداری اور شوہر پرستی و لیاقت اور فراخ دلی کی تعریف کی ہے۔ نورجہاں کے دل و دماغ کی خوبیوں، استعداد، ہنرمندی، ادبی لیاقت، ذکاوت، باوقار رویہ، شان و شوکت، جاذبیت، حوصلہ مندی، شکار اور دوسرے کھیلوں سے دلچسپی، تہذیب و شایستگی و ملنساری کے سبب 23-1622ء میں اس کو بادشاہ بیگم کا قابلِ رشک خطاب ملا جس کی وہ پوری طرح مستحق تھی۔ اس کا نام سکوں پر کندہ کرایا گیا۔ یہ ایک ایسا غیر معمولی اعزاز تھا جو اسی قسم کی محض ایک اور خاتون ترکان خانم والدہ سلطان علاءالدین تکش خوارزم (متوفی 1220ء) کو نصیب ہوا تھا۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک نورجہاں کو رسمی اور کھلے طور پر ملکہ کا رتبہ دیا جانا ایک بدعت سے کم نہ تھا اور اس کو بادشاہ کے عشق و فریفتگی کا مظہر سمجھا جاتا تھا۔ بعض لوگوں نے اس پر ناراضگی کا اظہار بھی کیا۔ اس زمانے کے ایک عام ہندوستانی کے لیے یہ خیال کہ ملکہ کو اس قدر اعزاز و احترام دیا جائے ناقابلِ تصور تھا۔ بہرحال یہ نہ تو کوئی غلط عمل تھا اور نہ ہی اس میں کوئی قابلِ ملامت بات تھی بلکہ اس کے

برخلاف یہ ایک وسیع النظر اور روشن خیال بادشاہ کا ترقی پسندانہ اقدام تھا۔ اس قسم کا کوئی ثبوت نہیں کہ نور جہاں نے اس اعزاز و اکرام کے لیے شہنشاہ سے درخواست کی ہو یا اس کے لیے ضد کی ہو اور شہنشاہ اس کی بات ماننے کے لیے مجبور ہو گیا ہو۔ نہ اس بات کی کوئی مثبت دلیل موجود ہے کہ نور جہاں نے اپنی شخصیت کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہو یا شاہی خاندان کی بیگمات یا مملکت کے ملازمین یا عام رعایا کو اپنے سے ناراض کیا ہو لیکن اگر کچھ لوگ رشک و حسد سے جلنے لگے ہوں تو اس میں اس کا کیا قصور۔

نور جہاں بہت ہی عاقل اور حاضر جواب تھی۔ قدرت نے اس کو عقل سلیم سے پوری طرح نوازا تھا اس کو نفاست و سلیقہ شعاری سے بڑا لگاؤ تھا۔ فنونِ لطیفہ و آرائش میں اس کا اور شہنشاہ کا ذوق یکساں تھا۔ وہ جس چیز کو چھو دیتی وہ سنور جاتی۔ انہی وجوہ کے سبب وہ ذوق، سلیقہ و تہذیب میں پیش پیش رہتی اور ہر چیز کو وقار، خوب صورتی و خوش سلیقگی بخش دیتی۔ اس کی کسی بات میں ہلکا پن، بدسلیقگی یا بے اعتدالی نہ پائی جاتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ایرانی تہذیب اور تمدّن کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔

نور جہاں کو قدرت نے زبردست قوتِ عمل ودیعت کی تھی۔ وہ اپنے دائرہ عمل میں جو کام بھی کرتی اس پر سخاوت و فیاضی کی مہر ثبت کر دیتی۔ اس کے مزاج میں خیرات، فراخ دلی اور رحم کے جذبات بدرجۂ اتم موجود تھے۔ وہ غریبوں، مظلوموں، بیواؤں اور یتیموں کی مدد کے لیے مشہور تھی۔ غریب لڑکیاں جن کی روپے پیسے کی کمی کے سبب شادی نہ ہو سکتی تھی اُن کی مدد کرتی۔ اس کا اثر نہ صرف لباسوں اور جوڑوں کی تراش خراش یا زیورات کی ساخت و عطریات کی پرداخت میں پایا جاتا تھا بلکہ درباری قواعد اور معماری کے اصولوں میں بھی اس کی جھلک پائی جاتی تھی۔ وہ ماہر شہسوار تھی اور خونخوار جانور کے شکار میں بھی اس کا نشانہ بے خطا تھا۔ اس کی معتدل مزاجی اور دلیرانہ ہمت کا بہترین مظاہرہ اس وقت ہوا جب اس نے اپنے شوہر کی رہائی کے لیے مہابت خاں پر حملہ کیا۔ لیکن یہ ساری صفات اس کی اس خوبی کے سامنے ہیچ ہیں کہ وہ اپنے شوہر کی دلدادہ تھی اور خود کو اس کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ یہی اس کی زندگی کا اصل مقصد تھا جس کی انجام دہی میں اس کو قلبی اور روحانی سکون میسّر تھا انہی دل موہ لینے والی عادتوں کے ذریعے وہ شہنشاہ کے دل پر حکومت کرتی اور وہ

بھی اس کا دل سے عاشق اور مداح تھا۔

نورجہاں کا اپنے شوہر پر جو اثر تھا اس کے بیشتر پہلو اخلاقی، جذباتی، روحانی اور شاید ذہنی تھے اس کے سبب بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ شاید شہنشاہ پر ملکہ کا اثر سیاسی معاملات میں بھی اتنا ہی تھا اور اس کے باپ اعتمادالدولہ کی موت کے بعد خاص طور پر سیاسی امور میں وہی حاوی رہتی اس شک کو ایسے خود غرض لوگ زیادہ ہوا دیتے جو یہ چاہتے تھے کہ اس بات سے اپنی اغراض کو پورا کر سکیں۔ کسی رائے کا قائم کرنا اور پھر اس کو لوگوں میں تشہیر کرنا آسان ہے لیکن اگر حقائق کو ان نظریات سے علیحدہ کر کے تجزیہ کیا جائے تو وہ نظریات جو عوام میں رائج ہیں مشکل ہی سے درست ثابت ہو سکیں گے۔ یہ دلیل پیش کرنا کہ ایک ایسی خاتون جو اتنی صاحب ہوش و ذکا، با استعداد و اثر انداز شخصیت کی مالک ہو کیونکر خود کو سیاست میں مداخلت سے باز رکھ سکتی تھی۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ خود ہی کوئی سوال کرے اور خود ہی غیر مدلل جواب دے لے۔

اس نے صرف ایک مرتبہ جنگ و سیاست میں ہاتھ ڈالا اور وہ بھی اس خاطر نہیں کہ اس کو اس بات کا شوق تھا یا وہ اپنے عزائم و شوق اور تجسس کو تسکین دینا چاہتی تھی بلکہ اس کا تنہا مقصد یہ تھا کہ اپنے شوہر کو مہابت خاں کے چنگل سے نجات دلا سکے۔ اس کے اس اقدام کی پشت پر شوہر اور بھائی کی محبت اور تاج شاہی کی کھوئی ہوئی عزت کو دوبارہ حاصل کرنے کا جذبہ کارفرما تھا کیونکہ وہ خود بھی تو اسی تاج کی آرایش کی ایک جز تھی۔

خرم یا مہابت خاں کی بغاوت کے لیے اس کو ذمے دار قرار دینا یا یہ کہنا محض خیال آرائی ہے کہ جانشینی کے لیے جو جنگ ہوئی تھی اس میں وہ شریک تھی اور اس خیال کی حقیقت ایک عام افسانہ اور اس داستان سے زیادہ نہیں ہے جس میں جہانگیر پر شیر افگن کے قتل کا الزام عاید کیا جاتا ہے۔

واقعات شاہد ہیں کہ بجائے اس کے کہ نورجہاں کو ایک بدروح تصور کیا جائے جو ہمیشہ جہانگیر کے اردگرد منڈلاتی رہتی تھی اس کو شہنشاہ کا محافظ فرشتہ سمجھنا زیادہ درست ہوگا۔

نورجہاں کی کمزوری یہ تھی کہ وہ اپنے خاندان والوں کا بڑا لحاظ کرتی اور اس کو اپنے بھائیوں پر بڑا اعتبار تھا۔ وہ بہت کم ان کے اغراض و مقاصد کو شک کی نگاہ سے

دیکھتی یا ان کے اعمال و افعال پر نگرانی رکھتی۔ اس کے بڑے بھائی آصف خان نے نورجہاں کے رتبے اور ترقی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اس کو اپنی اور اپنے داماد کی مقصد برآری کے لیے آلۂ کار بنایا۔ آصف خاں کی یہ عیارانہ و فریب کارانہ سیاست اور اس کے مکارانہ منصوبوں کو اس کی بہن بھی نہ سمجھ سکی کیونکہ یا تو وہ ایسی دغابازانہ سیاست کو سمجھنے سے قاصر تھی یا پھر اس کو اپنے بھائیوں پر اس قدر اتنا اندھا دھند اعتماد اور بھروسہ تھا کہ اس نے ان کی چالوں میں پوشیدہ باریکیوں کو سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ اس کے نام کے ساتھ ایسے معاملات کو وابستہ کیا گیا ہے جن سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

شہریار کی خوشدامن ہونے کی وجہ سے اس پر ہر قسم کے الزامات و اتہامات عائد کیے جاتے ہیں اور اس پر انگشت نمائی کی جاتی ہے۔ تاریخ کے مصدقہ واقعات ان الزامات کی تصدیق نہیں کرتے۔

عملی زندگی سے کنارہ کش ہونے کے بعد اس نے اپنی زندگی کے اٹھارہ سال بڑی سختی کے ساتھ خاموش طریقے پر غم و اندوہ میں گزارے۔ اس نے اپنے وقار اور اپنی عزت کو برقرار رکھا اور قسمت پر شاکر رہی۔ اس کی زندگی کا تنہا سہارا اس کی بیوہ بیٹی تھی جو بدقسمتی کا شکار ہو چکی تھی۔ نورجہاں 1645ء میں فوت ہوئی اور اپنے شوہر کے مقبرے کے قریب دفن کی گئی۔

راجا بیر سنگھ بندیلا نے ابوالفضل کو قتل کر کے جو شہزادہ سلیم کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ شہنشاہ جہانگیر کی نظروں میں بڑی وقعت اور بلند مرتبہ حاصل کر لیا۔ راجا نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور بڑی سی جاگیر اور کثیر مقدار میں دولت جمع کر لی۔ شہنشاہ کی مہربانی پر بھروسہ کرتے ہوئے اس نے دوسرے زمینداروں کی زمینوں پر بھی ہاتھ ڈالا اور اس کی غاصبانہ نگاہوں سے شاہی علاقہ جات بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ راجا بیر سنگھ 1627ء میں مر گیا اور اس کا سب سے بڑا بیٹا ججھر سنگھ اس کا وارث بنا۔

شاہجہاں کی تاجپوشی کے موقع پر ججھر سنگھ اظہار اطاعت کے لیے خود آگرے گیا۔ اس کی عدم موجودگی میں اس کے بیٹے وکرماجیت نے ریاست کا انتظام بڑی بددیانتی اور ظالمانہ طریقے سے انجام دیا۔ ریاست کے ایک قدیمی اور باعزت ملازم سیتارام نے جس کو وکرماجیت نے سخت اذیت پہنچائی تھی اور بہت ذلیل کیا تھا سخت شکایت کی چونکہ شاہجہاں

کو اورچھہ کے راجاؤں سے کوئی انسیت نہ تھی اور وہ وہاں کے حکمرانوں کی سختیوں اور مظالم سے چشم پوشی کے لیے تیار نہ تھا لہٰذا اس نے اس شکایت کے پیش نظر حکم صادر کیا کہ ان واقعات کی اور راجا کے پاس غیر معمولی دولت جمع ہونے کی پوری پوری تفتیش کی جائے۔ شہنشاہ نے جھجھر سنگھ کے خلاف کوئی غیر دوستانہ رویہ اختیار نہ کیا۔ اس کے برخلاف شاہجہاں نے اس کو چار ہزار ذات اور چار ہزار سوار کا منصب عطا کیا لیکن جب ریاست کے معاملات کے بارے میں تحقیقات کا حکم صادر ہوا تو راجا کو پریشانی لاحق ہوئی اور اس نے اسی میں خیریت سمجھی کہ بغیر اطلاع کیے دربار سے بھاگ کر اپنی ریاست کی پہاڑیوں اور گنجان جنگلوں میں پناہ لے۔

راجا کے یکایک دربار سے غائب ہوجانے کے سبب شہنشاہ آزردہ خاطر ہوا اور مخالفین نے اورچھہ کے خاندان کے خلاف جو شکایات تھیں ان میں اور نمک مرچ ملا کر پیش کیا۔ شاہجہاں نے جھجھر سنگھ کو اس کی بے ادبی کی سزا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ شاہجہاں نے اس کا درست اندازہ لگایا کہ اکبر کے زمانے میں بیر سنگھ کے خلاف جو فوجی مہم بھیجی گئی تھی وہ بندیلا ریاست کے جغرافیائی حالات کے سبب کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوئی تھی اور اب تو اس ریاست کے مالی وسائل اس چوتھائی صدی کے آخر میں اور بھی مضبوط ہوگئے تھے۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ جو فوجی مہم اس کے خلاف بھیجی جائے وہ نسبتاً بڑے پیمانے پر ہو اور اس کی خاص توجہ کی جائے۔

اس کے علاوہ چونکہ یہ مہم شاہجہانی عہد کی پہلی فوجی مہم تھی اور وہ بھی راجاؤں کے ایک نئے خاندان کے خلاف، اگر وہ کامیاب نہ ہوئی تو اس کے عہد کا آغاز ایک ناکام مہم سے ہوگا جس سے اس کے وقار کو صدمہ پہنچے گا اور اس کے عہد سلطنت کو بڑی بدشگونی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

مہابت خاں کو حکم ملا کہ وہ گوالیار سے دس ہزار سوار اور دو ہزار بندوقچی لے کر روانہ ہو ادھر سید مظفر خاں بارھہ و دیگر افسران کو حکم ملا کہ بندیلا ریاست میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیں۔ دوسری طرف خان جہان لودی صوبے دار مالوہ کو ہدایت کی گئی کہ وہ آٹھ ہزار سواروں کے ہمراہ مہابت خاں کی مدد کو پہنچے۔ اسی طرح عبداللہ خاں فیروز جنگ کو کالپی سے روانہ ہونے کا فرمان ملا۔ یہ بڑی زبردست مہم تھی اور اس پر

پوری سنجیدگی کے ساتھ ہاتھ ڈالا گیا۔ شہنشاہ نے کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے خود بھی شکار کے بہانے گوالیار میں ڈیرے ڈال دیے۔

اس ہمہ گیر مہم جس کی نگرانی ایک لائق ترین مغل بادشاہ کر رہا تھا بے نتیجہ ختم ہونے والی نہ تھی۔ ایرچ کے قلعے پر شدید حملہ کیا گیا اور وہاں پر مقیم تین ہزار فوج تہہ تیغ کر دی گئی۔ ججھر سنگھ نے اپنی نازک حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے یہ سمجھ لیا کہ وہ کامیابی سے شہنشاہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ادھر ججھر سنگھ ابھی تک اپنی ریاست کے معاملات کو سنبھال نہ پایا تھا۔ ادھر شاہی کیمپ میں اس کا مدمقابل حریف بھرت سنگھ بندیلا جو کہ خود کو ریاست کا وارث سمجھتا تھا للکار رہا تھا۔ ان حالات میں ججھر سنگھ نے اطاعت قبول کر لی۔ ایک ہزار اشرفی، پندرہ لاکھ روپیہ، چالیس ہاتھی بطور جرمانہ اور وہ علاقے جن پر اس کے باپ نے قبضہ کر لیا تھا واپس لے کر اس کو معاف کر دیا گیا۔ ججھر کو اس کے اصلی عہدے پر مستقل کر دیا گیا اور حکم ملا کہ دو ہزار سوار اور دو ہزار پیادہ لے کر دکن میں خدمت کے لیے پہنچ جائے۔

پیر خاں المعروف بہ خان جہاں لودی جہانگیر کا بہت ہی مقرب اور شہنشاہ کا مخصوص مصاحب تھا۔ عبدالرحیم کی موت کے بعد اس کو فوج کا سپہ سالار یعنی خان خاناں مقرر کیا گیا۔ اس کو دکن کی صوبے داری اس لیے سونپی گئی کہ وہ مہابت خاں کی ممکنہ بغاوت یا اس سالار اور شاہجہاں کے خطرناک اتحاد کی روک تھام کر سکے۔ ایسے وقت میں جب کہ جہانگیر کی تندرستی ہر طرح سے پریشان کن ثابت ہو رہی تھی اور شاہجہاں و مہابت خاں دربار سے غیر مطمئن اور بے راہ رو ہو رہے تھے یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں ایسے وقت میں سنگین پیچیدگیاں اور جھگڑے نہ اٹھ کھڑے ہوں لہٰذا خان جہاں نے ایسی روش اختیار کی جس پر شاہجہاں کی حکومت نے زبردست اعتراض کیا۔

خان جہاں کی سیاست یہ تھی کہ دکن کی ریاستوں کے ساتھ فوجی پیچیدگیوں سے پرہیز کیا جائے اور احمد نگر کی ریاست کے ساتھ اس قسم کا معاہدہ ہو جائے جس کی وجہ سے شاہجہاں یا مہابت خاں اس ریاست کے حکمرانوں کے ساتھ کسی اتحاد میں شریک نہ ہو سکیں۔ بالفاظ دیگر وہ یہ چاہتا تھا کہ دشمن کے اصل مقصد کا خاتمہ کر کے ہر قسم کی لالچ کو جڑ سے نکال پھینکے۔ اسی زمانے میں حامد خاں حبشی کی بیوی نے دکن کی سیاست میں

بڑی ہلچل پیدا کی تھی۔ اس نے اپنی ذاتی جاذبیت، تدبر اور دوسروں کو عمل کے لیے اُبھارنے کی صلاحیت کے ذریعے نظام الملک اور دکن کی ساری حکومت کو اپنے قابو میں کر لیا تھا فوج میں وہ بہت مقبول تھی اور جنگ میں بذاتِ خود فوج کی کمان کرتی۔ اس معاملے میں وہ چاند بی بی سے بھی سبقت لے گئی۔ اس کی سرکردگی میں احمد نگر کی فوج نے بیجا پور کے لشکر کو زبردست شکست دی۔

اس نے اپنے شوہر حامد خاں کے ذریعے خان جہاں کے ساتھ گفت و شنید کی اور اس کی ہمدردی حاصل کر لی۔ بعض واقعات نویسوں نے یہ لکھا ہے کہ خان جہاں کئی وجوہ کی بنا پر شاہجہاں سے خائف تھا اور اسی وجہ سے وہ احمد نگر کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتا تھا تاکہ اگر کسی قسم کا بحران وجود میں آئے تو وہ کہیں پناہ لے سکے۔ زیادہ امکان اس کا ہے کہ وہ اس بات کا یقین رکھنا چاہتا تھا کہ دکن میں امن و امان قائم رہے اور اگر اس کو کسی منظم بغاوت کے دبانے یا تخت نشینی کی جنگ میں حصہ لینا پڑ جائے تو وہ اگر ممکن ہو سکے تو احمد نگر کی مدد حاصل کرے۔ بہرحال خان جہان یہ چاہتا تھا کہ دکن میں امن قائم ہو اور وہ خود ہر موقع کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہے۔

چونکہ حکومت کے حالات واضح نہ تھے لہٰذا واقعات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا تھا اور نہ ہی اس بات کا یقین کر سکتا تھا کہ دہلی سے اس کو کوئی مؤثر مدد مل سکے گی۔ وہ جہانگیر کا مقرب ضرور تھا لیکن جہانگیر کچھ ہی دنوں کا مہمان تھا۔ فی الحال اس کی سیاست یہ تھی کہ خود کو ہر قسم کی ذمے داری اور پیچیدگی سے الگ رکھے، غیر طرف دارانہ رویہ اختیار کرے، اپنے وسائل کو منظم و بہتر بنائے اور آنے والے حالات کا انتظار کرے۔ اس کے ان نظریات کی دیوانِ دکن نے بھی تائید کی۔

لہٰذا خان جہان نے حکومت احمد نگر کے ساتھ گفت و شنید کی پذیرائی کی اور اس پر راضی ہو گیا کہ ایک مناسب رقم کی ادائیگی کے بدلے میں جو تین سے اڑتیس لاکھ روپے کے درمیان ہو سکتی ہے۔ بالاگھاٹ کو نظام شاہ کو واپس کر دے۔ بہرحال یہ بات معلوم نہ ہو سکی کہ آیا یہ رقم رشوت کی شکل میں وصول کی جا رہی تھی یا شہنشاہ کو دی جانے والی پیش کش کی رقم کا ایک معتدبہ حصہ تھا لیکن دوسری بات زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔

خان جہاں نے سلطنت مغلیہ اور شہنشاہ جہانگیر سے غداری کی ہو یا نہ کی ہو، یہ واضح ہے کہ وہ اس کے لیے آمادہ نہ تھا کہ وہ شاہجہاں کے حامیوں کی صف میں شامل ہو جائے حالانکہ اس کا رویہ شہزادہ کی طرف بہت محترمانہ تھا تاہم اس نے اس سے انکار کر دیا کہ اس کے ساتھ شمال کی طرف جا کر مہابت خاں کی نام نہاد بغاوت کو دبائے۔ اسی طرح اس نے بعد میں آصف خاں کے کہنے پر داور بخش سے تخت حاصل کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ اس کو اس بات سے بھی دکھ پہنچا ہو گا کہ شاہجہاں نے بڑی مستعدی کے ساتھ مہابت خاں کو خان خاناں کا خطاب عطا کر دیا۔ اس طرح اس پر یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ شاہجہاں کے دور میں اپنا وقار مشکل ہی سے قائم رکھ سکے گا۔ بہرحال اس نے یہ کوشش کی کہ خود کو شاہجہاں کی سرگرمیوں سے دور رکھے اور فرمانروائے وقت یعنی داور بخش کا خطبہ جاری رکھے۔

اس کے علاوہ جب شاہجہاں یا مہابت خاں دہلی پر حملہ آور ہوئے تو بھی اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ درحقیقت وہ کشمکش، پیچ اور غیر طرفداری کی حالت میں تھا اور اس نے بہتر یہی سمجھا کہ آیندہ حالات کا اندازہ لگاتا رہے۔

ابھی تک یہ بات پوری طرح واضح نہ ہوپائی تھی کہ شاہجہاں تخت حاصل بھی کر سکے گا یا نہیں۔ لہٰذا اس نے جو خطابات مہابت خاں اور دوسرے افسروں کو عنایت کیے وہ محض وعدے کی حیثیت رکھتے ہیں اور نہ ان کی کوئی قانونی حیثیت ہے۔ خان جہاں ابھی تک خان خاناں تھا اور مہابت خاں کی بغاوت کی سرکوبی کے احکامات واپس نہیں لیے گئے تھے۔

جب خان جہاں کو یہ پتہ چلا کہ شاہجہاں نے مہابت خاں کو مالوہ پر قبضہ کرنے کا حکم صادر کر دیا ہے تو اس نے اپنا فرض سمجھا کہ سلطنت کے ایک اہم صوبے پر ناجائز تصرف کو روکے کیونکہ یہ صوبہ جنگی اہمیت کے لحاظ سے بہت اہم تھا۔ دکن کی افواج کے سپہ سالار ہونے کی وجہ سے خان جہاں اس بات کی اجازت نہ دے سکتا تھا کہ شمال و دکن کے درمیان کوئی خلیج حائل ہو جائے کیونکہ یہ بات سلطنت کے لیے جتنی نقصان دہ تھی اتنی ہی اس کے اپنے مفاد کے لیے بھی مضر تھی۔ اس کے علاوہ اس کا اپنا خاندان مانڈو میں مقیم تھا لہٰذا اس کو ان کی حفاظت کی فکر تھی۔ وہ خاموش نہ بیٹھ سکا اور شمال کی

طرف بڑھ کر اس نے مالوہ پر قبضہ کر لیا۔ تاہم وہ اس وقت تک لڑائی کے حق میں نہ تھا جب تک کہ جنگ اس پر مسلط نہ کر دی جائے۔ حالات اتنے ہی غیر یقینی تھے کہ تمام اہم شخصیتیں اپنے اپنے منصوبے بنانے پر مجبور ہو گئیں۔ خان جہاں ابھی تک شش و پنج ہی میں تھا کہ اس کے بعض افسران مثلاً راجا جے سنگھ اور گج سنگھ نے اس کا ساتھ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

جس وقت شاہجہاں آگرے پہنچا تو یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ تخت پر وہی قابض ہوگا۔ اب خان جہاں نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے گزشتہ رویے کی معافی مانگے چنانچہ وہ بیش بہا موتیوں کا ایک ہار لے کر شاہجہاں کی اطاعت کے اظہار کے لیے تیزی سے روانہ ہوا۔ شاہجہاں نے اس کو برار اور خاندیس کی صوبے داری عنایت کی اور حکم دیا کہ اس نے جو علاقہ احمد نگر کو دیا ہے اس کو واپس لے لے۔ خان جہاں برہانپور لوٹ آیا اور حکومت کو از سرِ نو منظم کرنے میں لگ گیا۔ ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ دکن کی ذمے داری مہابت خاں کو سونپ دی گئی اور خان جہاں کو حکم ملا کہ وہ مالوہ کی صوبیداری سنبھال لے۔

ابھی خان جہاں مالوہ میں قدم بھی نہ جما پایا تھا کہ اس کو ججھار سنگھ بندیلا پر حملہ کرنے کے لیے بلایا گیا۔ اس کا بڑا امکان تھا کہ اس کو مہابت خاں کے ماتحت کام کرنے کا حکم دیا جائے پھر بھی اس نے شاہی حکم کی تعمیل کی۔ شاہجہاں نے خان جہاں کے جذبات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے مہابت خاں کو بندیل کھنڈ سے ہٹا لیا۔

بندیلا جنگ کے خاتمے پر خان جہاں کو دربار میں بلایا گیا۔ دربار میں سرد مہری اور ناموافقت کا ماحول تھا۔ چونکہ جہانگیر کے دربار میں اس کا مقام بہت بلند تھا لہٰذا اس نے اس ماحول میں اپنی بے عزتی محسوس کی۔ جو امراء اس سے حسد کرتے تھے وہ اس فکر میں تھے کہ اس کے وقار کو اور بھی گرا دیا جائے۔ جیسا کہ ہمیشہ کا قاعدہ ہے پرانے امراء کی جگہ وہ لوگ آ رہے تھے جو شاہجہاں کی شہزادگی کے زمانے میں اس کے ساتھی اور حامی رہے تھے۔ چنانچہ دربار میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے وہ خوش ہوتا یا آئندہ کے لیے پرامید ہوتا۔ اس کی ان غلط فہمیوں کو اس حکم نے اور ہوا دی کہ وہ اپنے آدمیوں کو برخاست کر دے اور اپنی چند جاگیریں واپس کر دے۔ جب اس کو یہ اطلاع ملی کہ اس کو نظر بند کیا

جانے والا ہے تو اس کو یقیناً خطرہ لاحق ہوا۔ اس نے دربار میں جانا بند کر دیا اور اپنے مکان پر زبردست پہرہ بٹھا دیا۔ جب شاہجہاں کو حالات سے باخبر کیا گیا تو اس نے خان جہاں کی درخواست پر اپنے دست خاص سے ایک عام معافی نامہ لکھ کر مرحمت فرمایا حالانکہ آصف خاں نے بھی صلح کی پیش کش کی لیکن گزشتہ حالات کو دیکھتے ہوئے خان جہاں کے دل میں جو شبہات تھے وہ رفع نہ ہو سکے۔

آٹھ مہینے کی مدت اس بات کے لیے کافی تھی کہ قسمت پر شاکر رہ کر حالات کا رُخ دیکھا جائے۔ اب خان جہاں کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ اکتوبر 1629ء میں وہ آگرے سے بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ ایک بہت ہی خطرناک اور مبہم اقدام تھا جو اس کو تباہی کی طرف لے گیا لیکن اس کے لیے کوئی اور چارۂ کار بھی تو نہ تھا کیونکہ اس کو پائے تخت سے باہر بھی کوئی کام نہ سونپا گیا جو وہ کسی بہانے وہاں سے نکل سکتا۔

خان جہاں کی فرار کی خبر آصف خاں نے شہنشاہ کو دی۔ اس کا تعاقب کرنے کے لیے فوراً فوج بھیجی گئی۔ دھولپور کے قریب شاہی افواج نے اس کو جا لیا کیونکہ دریائے چنبل پار کرنے کا انتظام بروقت نہ ہو سکا تھا۔ ایک چھوٹی سی جھڑپ میں شاہی افواج کے تقریباً سو افراد اور دوسرے افراد کام آئے اور باغیوں کے ساٹھ آدمی مارے گئے جن میں خان جہاں کا داماد اور دو بیٹے بھی شامل تھے۔

لڑائی اس قدر زبردست ہوئی اور شاہی افواج کو اس قدر نقصان اٹھانا پڑا کہ تعاقب کا خیال اس وقت تک کے لیے ترک کر دیا گیا جب تک کہ تازہ مدد نہ آ جائے۔ خان جہاں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر چنبل پار کیا اور اپنے کیمپ، خزانے اور بیشتر عورتوں کو پیچھے چھوڑ کر فرار ہو گیا اور گونڈوانہ و برار سے ہوتا ہوا ریاست احمد نگر میں داخل ہو گیا۔

مرتضیٰ نظام شاہ دوم نے خان جہاں کا دوستانہ استقبال کیا، اس کو شاہی گدی پر بٹھایا، نقد روپیہ پیش کیا اور بیر کا علاقہ جاگیر میں عطا کیا۔ اس کے ساتھیوں کو مغل علاقوں میں جاگیریں دی گئیں اور ان سے کہا گیا کہ ان پر قبضہ کر لیں اس طرح نظام شاہ نے خان جہاں کو وہ علاقے حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جو کہ مغلوں نے احمد نگر سے چھین لیے تھے۔

خان جہاں شمالی مغربی سرحد اور افغانستان کے افغانوں سے خط و کتابت کرتا

اور اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوا۔ کئی سرکش قبیلوں مثلاً خلیل، مھمند، داؤد زئی، یوسف زئی، لودی اور روہیلہ نے جو اس وقت مذہبی جوش میں تھے سرحد پار کرکے پشاور پر حملہ کر دیا۔ اسی طرح بہلول میانہ اور سکندر دوتانی نے بغاوت کا پرچم بلند کیا اور دکن میں خان جہاں لودی سے آملے۔

خان جہاں کی دکن میں آمد نے مغل حکومت، احمد نگر اور اس کے متحد بیجاپور کے تعلقات کو مزید پیچیدہ اور تلخ بنا دیا۔ نظام نے حملے کی شروعات کی اور مغلوں کو ان کی چھاؤنیوں سے مار بھگایا۔

شہنشاہ نے ابوالحسن کو حکم دیا کہ سیدھے دکن جاکر افغانوں اور ان کے دکنی متحدوں سے جنگ کرے جو مغل علاقے نظام نے چھین لیے ہیں ان کو حاصل کرے اور دشمن کا جتنا علاقہ چھین سکے اس پر قبضہ کر لے۔

خیال کیا جاتا تھا کہ ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی دکن کی لڑائی طول کھینچے گی لہذا گجرات کے صوبے دار شیر خاں کو حکم دیا گیا کہ وہ دکن کی طرف روانہ ہو اور خواجہ ابوالحسن کی مدد کرے۔ کچھ عرصے بعد وکیل سلطنت آصف خاں کو بھی دکن میں لڑنے والی فوج میں جوش اور جذبہ پیدا کرنے کے لیے اور اس لیے بھی بھیجا گیا کہ وہ مختلف سالاروں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر سکے۔ 1630ء میں شاہجہاں خود بھی برہان پور پہنچ گیا۔

خان جہاں کو جب سے وہ بھاگ کر دکن پہنچا آرام نصیب نہ ہوا۔ دکن پہنچ کر اس کو دکنی ریاستوں کے فوجی منصوبوں پر عمل کرنا پڑا۔ جلد ہی خان جہاں کو اس کا اندازہ ہو گیا کہ ایک طرف تو مغل سالار اعظم خاں بڑے غور سے اس کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہا ہے اور بڑی مستعدی سے اس کا پیچھا کر رہا ہے اور دوسری طرف سے نظام شاہی سالار مقرب خاں اس کی مناسب مدد نہیں کر رہا ہے۔

آخر کار اعظم خاں نے اپنی چالاکی اور ترکیبوں سے خان جہاں پر راہِ فرار مسدود کر دی اور اس کو بیر کے نزدیک گھیر لیا۔ حالانکہ خان جہاں کی فوج تعداد کے لحاظ سے کم تھی لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ اس نے اپنے دلیر بھتیجے بہادر کو مغلوں کے ایک دستے سے لڑنے کے لیے روانہ کیا۔ خود دوسرے دستے سے لڑنے لگا۔ جنگ برابر کی تھی اور بڑے گھمسان کا رن پڑا افغان بہت بہادری سے لڑے لیکن مغل فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ افغان فوج

منتشر ہو گئی اور بھاگ کھڑی ہوئی۔ بہادر گولی سے زخمی ہو گیا اور بھاگ نہ سکا۔ اس کا سر کاٹ کر اعظم خاں کے پاس بھیج دیا گیا۔ افغانوں کا سامان لوٹ لیا گیا لیکن وہ لوگ بھاگنے میں کامیاب ہو گئے کیونکہ مغل فوج اتنی تھک چکی تھی کہ ان میں تعاقب کرنے کی ہمت باقی نہ رہی۔

خان جہاں اور اس کے ساتھیوں نے ایک دفعہ پھر پہاڑیوں کی بھول بھلیوں میں پناہ لی لیکن ان کو دولت آباد کے قریب اپنی پناہ گاہ سے نکل آنا پڑا کیونکہ لڑائی اور قحط سالی کے سبب ملک میں بربادی پھیل گئی تھی اور غلہ و چارہ بہت کم ہو گیا تھا۔ جن وجوہ نے مغل فوجوں کو تعاقب کرنے سے باز رکھا تھا ان ہی اسباب نے افغانوں کی قسمت پر بھی اثر ڈالا ان میں اور نظام شاہیوں میں غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ رسد کی کمی اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس کے اصلی حمایتیوں یعنی نظام شاہی افسروں سے اس کے اختلاف نے خان جہاں کو مجبور کر دیا کہ وہ احمد نگر کو ترک کر کے نربدا کے شمالی علاقے میں قسمت آزمائی کرے لہٰذا وہ نومبر 1630ء میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ نظام شاہ کو خان جہاں کے چلے جانے سے کوئی صدمہ نہ ہوا کیوں کہ اس نے خان جہاں سے جو امیدیں لگا رکھی تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔

آخر کار خان جہاں نے دھرم پوری کے مقام پر دریائے نربدا کو پار کیا۔ شاہجہاں بڑے غور سے اس کی نقل و حرکت پر آنکھیں لگائے ہوئے تھا چنانچہ اس نے عبداللہ خاں اور دوسرے افسروں کو حکم دیا کہ خان جہاں کا پیچھا کیا جائے اور اس کو چین نہ لینے دیا جائے۔ اس کے باوجود خان جہاں نے سرونج پر کامیابی سے حملہ کیا اور پچاس شاہی ہاتھیوں پر قبضہ کر لیا۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ شاہی افواج نے ہر طرف سے اس کا راستہ بند کر رکھا ہے تو وہ ایک بار پھر بندیل کھنڈ میں داخل ہو گیا۔ اس مرتبہ اس کو وکرماجیت سے کوئی مدد نہ ملی بلکہ اُلٹے وکرماجیت نے اس پر حملہ کر دیا۔ وکرماجیت نے دریا خاں کے عقبی دستے پر حملہ کر کے اس کو لڑنے پر مجبور کر دیا۔ دریا خاں بہادری سے لڑا اور مارا گیا۔ اس لائق اور بہادر سالار کی موت (1631ء) سے خان جہاں کو اتنا صدمہ ہوا کہ وہ اس سے جانبر نہ ہو سکا۔

بُندیلا سردار یہ سمجھا کہ خان جہاں مارا گیا لہٰذا اس نے اپنے سپاہیوں کو افغان

کیمپ کو لوٹنے کی اجازت دے دی لیکن خان جہاں محو تھا اور فرار ہو گیا. مغل افسر مظفر خان بارہہ نے خان جہاں کو سکون سے نہ بیٹھنے دیا. جب خان جہاں بالکل مایوس ہو گیا تو اس نے اپنے ساتھیوں میں سے جتنوں کو وہ کم کر سکتا تھا کم کر دیا اور پانچ سو آدمی لے کر اپنے تعاقب کرنے والوں کے مقابلے کے لیے نکل آیا.

لودی افغانوں اور بارہہ سیدوں کے درمیان جو جنگ ہوئی اس نے ان کی روایت کو دوبارہ تازہ کر دیا. ہر فریق نے اپنے مدمقابل کی بہادری کو سراہا لیکن صرف دلیری سے کام نہ چل سکا. خان جہاں کا ایک بیٹا محمود جس سے وہ بے انتہا محبت کرتا تھا مارا گیا اور دوسرا بیٹا خطرناک حد تک مجروح ہوا. خود خان جہاں کو بھی کئی زخم آئے. جب اس نے یہ دیکھا کہ مزید مقابلہ کرنا بے سود ہے تو وہ پھر بھاگ کھڑا ہوا لیکن اس کی قسمت میں سکون نہ تھا.

خان جہاں کالنجر پہنچا. وہاں کے قلعہ دار سید احمد نے اس کے ہاتھیوں پر قبضہ کر لیا اور اس نے ایک بیٹے حسن کو مع اس کے کئی ہمراہیوں کے گرفتار کر لیا. مغل فوجیں قریب ہی پہنچ چکی تھیں لہذا خان جہاں نے ایک دفعہ پھر بھاگنے کی کوشش کی. اس نے اپنے ہمراہیوں کے ہمراہ تیز رفتاری سے چالیس میل کا راستہ طے کیا لیکن اس کا تعاقب کرنے والے بھی اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے.

آخر کار خان جہاں ان حالات سے خستہ اور مایوس ہو گیا. اس نے اپنے ساتھیوں کا ان کی بے غرضانہ وفاداریوں کا شکریہ ادا کیا اور ان سے کہا کہ وہ اس کو قسمت کے حوالے کر کے اپنی جان بچائیں. اب خان جہاں نے اپنے مٹھی بھر وفادار ساتھیوں کے ساتھ جنہوں نے اس کی پیہم درخواست کے باوجود اس کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا اور اپنے سب سے پیارے بیٹے عزیز کے ہمراہ ایک بار پھر ہاتھ میں تلوار لے کر مرنے کا فیصلہ کر لیا. اس میں شک نہیں کہ جنگ بہت ہی خوفناک طریقے پر ہوئی لیکن نتیجہ معلوم.

خان جہاں سیہونڈا کے مقام پر (جو ضلع باندہ میں ہے) مادھو سنگھ راجپوت کے نیزے سے زخمی ہو کر مارا گیا. یہ فروری [illegible] ء کا واقعہ ہے. خان جہاں کا سر کاٹ کر شہنشاہ کی خدمت میں بھیج دیا گیا.

شاہجہاں کے عہد کے آغاز میں سکھوں کے گرو کا شہنشاہ سے جھگڑا ہو گیا. اس جھگڑے کا سبب

بہت معمولی تھا۔ شہنشاہ امرت سر کے قریب شکار کھیل رہا تھا اس کا ایک دل پسند باز اڑ کر گرو کے کیمپ میں پہنچ گیا جو وہاں سے بہت دور تھا۔ سکھوں نے پرندے کو واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ مخلص خاں کی سرکردگی میں سکھوں کو سزا دینے کے لیے مہم روانہ کی گئی۔ کئی چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوئیں جن میں سکھوں کے قائد بھائی بھانو اور سکھا دلیری سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔

1628ء میں سکھوں کی فوج کے سردار پائندہ خاں نے دشمنوں کی فوج کو روکے رکھا اور آخری حملے میں جس کی سرداری خود گرو کر رہے تھے مغل فوج کو شکست ہوئی۔ یہ مغلوں اور سکھوں کی پہلی لڑائی تھی۔ شاہی دربار میں سکھوں کے بہی خواہ وزیر خاں وغیرہ نے شہنشاہ کا غصہ ٹھنڈا کیا اور معاملہ کو رفع دفع کر دیا۔

لیکن گرو کے دشمن بھی خاموش بیٹھنے والے نہ تھے۔ انھوں نے عبد اللہ خاں کو جو کہ جالندھر میں مغل افسر تھا بھڑکایا کہ وہ گرو کے خلاف دوسری مہم شروع کر دے اس وقت گرو دریائے بیاس کے کنارے ماجھا اور دوآب کے علاقوں کے درمیان پنجاب میں ایک نیا شہر تعمیر کرنے میں مصروف تھے جو کہ بعد میں سری ہرگوبند پور کے نام سے مشہور ہوا جنگجو کسانوں کے ملک کے بیچ میں ایک نئے شہر کے آباد ہونے سے مغلوں کو امرت سر کی ویرانی سے جو فائدے حاصل ہونے تھے وہ ختم ہو گئے۔ اس کے علاوہ صوبے دار کچھ اس وجہ سے بھی گرو کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا کہ گرو کے ساتھیوں نے ایک جھگڑے میں علاقے کے چودھری بھگوان کو جو نئے شہر کی بنیاد ڈالنے اور گرو کی تبلیغ کا مخالف تھا مار ڈالا چنانچہ گرو کے پاس یہ پیغام بھیجا گیا کہ وہ نئے شہر کے بسانے کے ارادے کو ترک کر دے لیکن گرو نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا اور اپنی کارروائی جاری رکھی۔ سکھوں پر حملہ کیا گیا لیکن گرو کو ہی غلبہ حاصل رہا۔

تیسری دفعہ بیدھی چند کی چوری کرنے پر جھگڑا ہوا۔ بیدھی کسی زمانے میں ایک مشہور ڈاکو تھا لیکن گرو کا ایک معتقد مرید تھا۔ اس نے شاہی اصطبل سے دو بہترین گھوڑے چرا کر گرو کو پیش کر دیے اور گرو نے بھی بد قسمتی سے ان کو قبول کر لیا۔ 1631ء میں ایک قوی مغل فوج گرو کے مقابلے کے لیے بھیجی گئی لیکن اس کو شکست ہوئی۔ فوراً ہی دوسری فوج کالے خاں کی ماتحتی میں روانہ کی گئی۔ اس دفعہ مغل فوج پہلے کی نسبت زیادہ قوی تھی۔

ادھر گرو کا ایک بہترین افسر پاینده خاں گرو سے جھگڑ کر مغلوں سے جا ملا تھا لیکن گرو نے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کرتار پور کے مقام پر خوف ناک جنگ ہوئی جس میں پاینده خاں مارا گیا۔ سکھوں کو بھی زبردست نقصان اٹھانا پڑا لیکن آخر میں فتح ان ہی کو نصیب ہوئی۔ اس لڑائی میں تیغ بہادر نے جو کہ بعد میں گرو ہوئے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔

مغلوں کے مستقل دباؤ کی وجہ سے سکھوں کی ابھرتی ہوئی قوت کو صدمہ پہنچا انھیں نہ صرف یہ کہ مذہبی تبلیغی کام کو روکنا پڑا بلکہ مغلوں کی مخالفت کے سبب سکھوں کو بہت تکالیف اٹھانی پڑیں۔ جس کی وجہ سے یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ سکھ برادری جو اپنے ہی پیروں پر کھڑی تھی اور پنجاب کی ہندو آبادی سے اسے بہت کم مدد ملی تھی کہیں برباد نہ ہو جائے۔ گرو نے اپنی سمجھ داری سے اس بات کا اندازہ لگا لیا کہ وہ اپنے محدود وسائل کے ذریعے مغل خاندان کے ایک سب سے زیادہ باا ثر شہنشاہ کے لامحدود دباؤ کا زیادہ عرصے تک مقابلہ نہ کر سکیں گے چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ برادری کو کچھ مہلت دی جائے اور گرو اپنا وقت گیان دھیان اور اپنی طاقت کو مضبوط بنانے میں صرف کریں۔ لہٰذا وہ کشمیر کی پہاڑیوں میں جا کر کرت پور کے مقام پر رہنے لگے اور انھوں نے اپنے آخری ایام خاموشی سے گیان دھیان اور تبلیغی کاموں میں گزار کر ہرگوبند کے سب سے بڑے لڑکے کے بیٹے ہر رائے کو اپنا جانشین بنا کر 1645ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد سکھوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچائی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ گرو ہرگوبند نے سکھوں کو گوشت کھانے کی اجازت دے دی۔

سلطنت مغلیہ اور بیجاپور و گولکنڈہ کی ریاستوں کے درمیان تعلقات پہلے ہی سے کشیدہ تھے اور حالت جنگ برقرار تھی۔ باقر خاں کی گولکنڈہ کے سالار شیر محمد پر فتح اور 1629ء میں منصور گڑھ کے قلعے کو سخت مخالفت کے باوجود فتح کر لینے پر بھی حالات میں زیادہ فرق نہ آیا۔ احمد نگر کے حاکم نے جب خان جہاں لودی کو خوش آمدید کہا تو حالات اور بھی بگڑ گئے۔ احمد نگر نے لڑائی چھیڑ کر مغلوں کی فوج کو ان کی چھاؤنیوں سے باہر نکال دیا۔

شاہجہاں ڈرنے والا نہ تھا۔ اس کو دکن کی فوج اور سیاسی حالات کا خوب علم تھا اس کو شاید اس کا احساس تھا کہ دکن کی تینوں ریاستیں بڑے کھوکھلی ہو چکی ہیں اس لیے

جلد یا بدیر ان پر قابو حاصل کرے گا۔ اس میں شک نہیں کہ احمد نگر، بیجاپور، گولکنڈہ میں سے کسی بھی ریاست کا حکمراں لائق اور مضبوط نہ تھا۔ ان میں سے ہر ایک ریاست خود غرض اور کوتاہ نظر جماعتوں کے نالائق اور ناقابل اعتماد افسروں کی خود غرضانہ سازشوں کا شکار بنی ہوئی تھی۔ دکنی ریاستیں مضبوط نہ تھیں اس لیے ان کے اور مغل سلطنت کے درمیان جو بھی سمجھوتے ہوئے تھے ان پر بھروسہ کرنا مشکل تھا۔ بہرحال یہ تینوں ریاستیں کم و بیش ایک بات پر متفق تھیں کہ ان کو مغلوں کا غلبہ پسند نہ تھا لیکن محض ناپسندیدگی اور نفرت سے تو کچھ ہو نہ سکتا تھا جب تک کہ وہ لوگ مل کر کسی سوچے سمجھے منصوبے اور متفقہ تجویز پر مغلیہ سلطنت کے خلاف عمل پیرا نہ ہو سکیں اور بدقسمتی سے 1629ء میں شاہی افواج ابوالحسن اور اعظم خاں کی سرکردگی میں میدان عمل میں آگئیں۔ ان دونوں افسروں کے کام میں ارتباط پیدا کرنے کے لیے وکیل سلطنت آصف خاں کو دکن بھیجا گیا۔ شہنشاہ خود آگے بڑھا اور اس نے برہان پور کو اپنا مرکز قرار دیا۔ مغل فوج نے احمد نگر کی ریاست پر تین طرف یعنی بالاگھاٹ، ناسک اور تلنگانہ سے حملہ کیا۔ اس حملے کا پہلا مقصد خان جہاں کو گرفتار کرنا تھا لیکن جب خان جہاں دکن سے فرار ہو گیا تو مغل فوج جنوبی ریاستوں سے نبٹنے کے لیے آزاد ہو گئی۔

سب سے پہلی کاری ضرب احمد نگر پر پڑی۔ یہ ریاست پہلے ہی سے آپس کی خانہ جنگی کے سبب کافی کمزور ہو چکی تھی۔ جادو رائے جو ایک مرہٹہ شریف خاندان کا سردار اور بااثر جاگیردار تھا اسے دغابازی سے قتل کر دیا گیا جس کی وجہ سے مراٹھوں کی جو ہمدردیاں احمد نگر سے وابستہ تھیں وہ قائم نہ رہیں اور جگ دیو، شاہ جی بھونسلا اور مالوجی جیسے لوگ مغلوں سے جا ملے اور مغلوں نے ان کے ساتھ فیاضی کا سلوک کیا۔ کچھ مسلمان افسر مثلاً سعادت خاں، خداوند خاں، یاقوت خاں اور شیر زہ خاں بھی شاہی فوج سے جا ملے۔ دکن میں زبردست کال پڑ گیا جس کی وجہ سے خوراک اور چارہ کمیاب ہو گیا اور ہر طرف موت کا بازار گرم ہونے لگا۔ اس میں شک نہیں کہ اس قحط کی وجہ سے کچھ عرصے کے لیے مغلوں کی پیش قدمی میں نہ صرف رکاوٹ پڑی بلکہ وہ بالکل رک گئی لیکن اصل میں سب سے زیادہ نقصان احمد نگر کو ہوا۔ 1630ء میں ابوالحسن نے نظام شاہی گورنر پر فتح حاصل کر لی اور بڑی تعداد میں مال غنیمت ہاتھ آیا۔ دوسرے مغل سردار اعظم خاں نے دھرور پر قبضہ کر کے

نظام شاہی فوجوں کو دولت آباد تک دھکیل دیا۔ بہت ممکن تھا کہ وہ دولت آباد کے قلعے کو بھی محصور کر لیتا لیکن قحط کی وجہ سے اس نے ایسا نہیں کیا۔ اعظم خاں نے پرینڈہ پر جو کہ بیجاپور میں تھا حملہ کیا کیوں کہ بیجاپور نے کھل کر نظام شاہیوں کی مدد کی تھی۔ اعظم خاں نے شہر کو اچھی طرح سے لوٹا اور مسمار کیا لیکن وہ قلعہ کو فتح نہ کر سکا۔ چنانچہ وہ لڑتا ہوا اپنے مرکز دھرواڑ واپس آ گیا۔

سپہدار خاں کی ستوندہ کی فتح اور ناصر خاں کی قابلِ تعریف معرکہ آرائی نے مغلوں کی عزت کو بچا لیا۔ اس دلیر اور بہادر افسر نے تلنگانہ میں کندھار نامی قلعہ کا محاصرہ کیا جس پر یاقوت کے لڑکے صادق کا قبضہ تھا۔ ناصر خاں نے صادق کو اطاعت پر مجبور کر دیا۔ یہ ایک زبردست کارنامہ شمار کیا جاتا ہے۔ قلعہ کے پاس پہنچنے سے پہلے ناصر کو سرفراز خاں کی فوج سے لڑ کر اسے شکست دینا تھا۔ جس وقت وہ قلعہ کا محاصرہ کر رہا تھا اس وقت بیجاپور اور احمد نگر کی متحدہ فوجوں نے رن دولہ اور مقرب خاں جیسے قابل سرداروں کی سرکردگی میں خندقوں میں سے حملہ کر دیا۔ حالانکہ ناصر خاں اس وقت قلعہ کی زبردست گولہ باری اور حبشی حملہ آوروں کے درمیان گھرا ہوا تھا مگر وہ ہمت نہ ہارا اور بغیر گھبرائے ہوئے بہادری سے لڑ کر دشمنوں پر فتح حاصل کر لی۔

اسی وقت احمد نگر میں ایک انقلاب آیا۔ نظام شاہ نے حبشیوں کی مدد حاصل کرنے کی غرض سے ملک عنبر کے لڑکے فتح خاں کو قید سے رہا کر کے ایک مرتبہ پھر وکیل اور پیشوا بنا دیا۔ فتح خاں کے عروج سے مقرب خاں کو جو کہ احمد نگر میں مغل دشمن تحریک کا سرغنہ تھا صدمہ پہنچا۔ وہ مایوس ہو کر مغلوں سے جا ملا۔ جنھوں نے اس کا بڑے جوش و خروش سے استقبال کیا اور اس کو رستم خاں کا لقب دیا۔ فتح خاں اپنے مستقبل کے بارے میں متفکر تھا۔ اس نے آصف خاں سے پوشیدہ طور پر گفت و شنید شروع کی اور شہنشاہ سے لطف و عنایت کی درخواست کی۔ اس نے اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لیے یا یوں کہا جائے کہ خود کو مضبوط کرنے کے لیے مرتضیٰ ثانی کو جو کہ کم عقل اور کٹھ پتلی بادشاہ تھا زہر دے کر قتل کرا دیا اور اس کی جگہ دس سال کے لڑکے حسین شاہ کو بادشاہ بنا دیا لیکن جالنا کے صوبے دار محمود خاں نے فتح خاں کے اختیارات کو ماننے سے انکار کر دیا اور 1631ء میں قلعہ مغلوں کو سونپ دیا۔

فتح خاں کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ مغل اس کی خواہشات کے مطابق عمل کرنے کے لیے تیار نہ تھے حقیقت یہ تھی کہ فتح خاں کو اس سے اور بھی شبہ ہوا کہ مغلوں نے اس کے رقیب مقرب خاں اور دوسرے دشمنوں کا گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا اب فتح خاں نے بیجاپور اور گولکنڈہ کی طرف مدد کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس وقت احمد نگر کے حالات خوش آیند نظر آرہے تھے۔ اوّل تو یہ کہ مرہٹہ سرغنہ شاہ جی اس بات سے ناراض ہو کر کہ اس کے بعض اضلاع فتح خاں کو دے دیے گئے تھے مغلوں کا ساتھ چھوڑ بیٹھا اور ان کے خلاف ہتھیار اٹھالیے۔ دوسرے یہ کہ بیجاپوریوں نے فتح خاں کی مدد کی درخواست کا پُرامید جواب دیا۔ تیسرے یہ کہ گولکنڈہ کی فصل زبردست سیلاب اور بارش کی وجہ سے برباد ہوگئی۔

شاہجہاں فتح خاں کے رویّے سے پوری طرح مطمئن نہ تھا اس نے فتح خاں سے مطالبہ کیا کہ وہ ہاتھی اور جواہرات سپرد کر دے۔ جب فتح خاں نے شہنشاہ کے اس حکم کی تعمیل میں تردد کیا تو دولت آباد کو فتح کرنے کے لیے دوبارہ فوجی مہم شروع کر دی گئی۔ دولت آباد نظام شاہی حکومت کی قلعہ بندی میں ایک اہم قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ فتح خاں نے اس قلعے کو مغلوں کے ہاتھوں سے نجات دلانے کے لیے آٹھ لاکھ روپے کی قیمت کے جواہرات ۲۰ ہاتھی اور چند گھوڑے تحفے کے طور پر پیش کیے۔ اس کے علاوہ شاہجہاں کے نام کا خطبہ بھی پڑھا گیا اور سکّوں پر اس کا نام مسکوک ہوا۔ شہنشاہ اس رویّے سے کافی مطمئن ہو گیا۔ وزیر خاں کی فوجی مہم کامیاب ہو چکی تھی اور برار مغل سلطنت میں شامل ہو گیا تھا شاہجہاں کی ملکہ ممتاز محل کی ۷ جون ۱۶۳۱ء کو وفات ہو گئی جس سے شہنشاہ کا دل ٹوٹ گیا اور کم از کم وقتی طور پر اس کو جنوبی مہم میں دلچسپی نہیں رہی۔

اسی دوران ایک طولانی قحط سالی اور اس کے غیر معمولی نتائج کے سبب شاہجہاں کا دل اچاٹ ہو گیا۔ مزید برآں اس کو یہ بھی احساس ہوا کہ احمد نگر کی ریاست کو ختم کرنے کا کام عملی طور پر ختم ہو چکا ہے لہٰذا اس نے مارچ ۱۶۳۲ء میں برہان پور سے اپنا ڈیرا اٹھالیا اور شمال کی طرف روانہ ہو گیا۔

بیجاپور کے حکمراں محمد عادل شاہ کا اپنا کوئی نظریۂ حکومت نہ تھا۔ اس کے دو طاقتور امیر رندولہ خاں اور مصطفیٰ خاں کے نظریات ایک دوسرے سے مختلف تھے۔

مصطفیٰ خاں کا رویہ مغلوں کی طرف دوستانہ تھا اور وہ یہ قطعاً نہ چاہتا
تھا کہ احمد نگر کی ریاست کے بارے میں مغلوں کا جو رویہ تھا اس میں کسی طرح دخل
دیا جائے۔ اس کے برعکس رن دولہ اس بات کے حق میں تھا کہ احمد نگر کو بچایا جائے
اور مغلوں کی جنوب میں پیش قدمی کو روکا جائے۔ فی الحال عادل شاہ نے مصطفیٰ خاں
کی سیاست پر عمل کرنا مناسب سمجھا۔

رن دولہ کو مغلوں کی مدد کرنے کا حکم ملا لیکن اس کام میں اس نے دل وجان
سے کوشش نہ کی۔ اس نے آصف خاں سے یہ درخواست کی کہ وہ دھرور کا قلعہ جو اس
نے احمد نگر سے فتح کیا تھا بیجاپور کو منتقل کر دے۔ آصف خاں نے اس بات کے ماننے سے
انکار کر دیا کیوں کہ یہ قلعہ کافی فوجی اہمیت رکھتا تھا۔

رن دولہ نے خود کو مغلوں کا دوست ہونا جتایا لیکن ان کی مدد کے سلسلے میں کوئی
کارروائی نہ کی۔ اس کے برعکس اس نے مغل دستے پر اچانک حملہ کر کے اس کے سالار
بہادر خاں کو گرفتار کر لیا۔ اب اس کی دوعملی سیاست پوری طرح کھل گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا
کہ مغلوں کا رویہ بیجاپور کی طرف سے سخت ہو گیا۔

فتح خاں کے مطیع ہونے اور احمد نگر کے معاملات کا فیصلہ ہونے کے بعد شاہجہاں
نے آصف خاں کو 1631ء میں یہ حکم دیا کہ وہ بیجاپور پر حملہ کرے۔ مغل فوج نے کندھار
پر قبضہ کر لیا، گلبرگہ کو لوٹا اور وہاں کے باشندوں کو بڑی تعداد میں قتل کر دیا لیکن گلبرگہ
کا قلعہ جہاں کافی آدمی اور وافر رسد موجود تھی مطیع نہ ہوا کیونکہ مغلوں کا یہ حملہ فوجی قوت کے اظہار
کا پہلو رکھتا تھا۔ اسی لیے آصف خاں اس قلعہ کو چھوڑتا ہوا بیجاپور کی طرف روانہ ہو گیا اور راستہ
میں اسے جو کچھ ملا اس کو لوٹ مار کر کے غارت کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ اس نے بیجاپور کے
پائے تخت کا محاصرہ کر لیا لیکن جلد ہی اس کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر قسم کی احتیاط اور
کوشش کے باوجود اس کو کافی رسد نہ ملی۔ اس کے فوجی دستوں کو جو چارہ وغیرہ حاصل
کرنے نکلتے اچانک حملوں کا سامنا کرنا پڑتا اور ان کا راستہ روک لیا جاتا۔

ادھر بیجاپور کے مطلق العنان حاکم خواص خاں نے اس کو صلح کی تجویز پیش کر کے بہلاوے
میں رکھا۔ بہرحال ایک قسم کا صلح نامہ گھڑا گیا جس کے مطابق بیجاپور نے وعدہ کیا کہ چالیس
لاکھ روپے کا خراج جواہرات، ہاتھیوں، قیمتی پتھروں اور نقدی کی صورت میں دیا جائے گا

لیکن یہ سب دھوکے بازی تھی۔ آصف خاں کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب اس کو اس کا علم ہوا کہ اس کے آدمی اور جانور بڑی تعداد میں بھوک سے مر رہے ہیں اور ادھر برسات کا موسم آنے والا ہے۔ آصف خاں پریشان اور متفکر ہو کر مغل علاقے میں واپس جانے لگا اور راستے میں اس کو جو کچھ ملا اس کو لوٹتا گیا یہاں تک کہ اس نے عورتوں اور بچوں کو بھی غلام بنانے سے پرہیز نہ کیا۔ بیجاپور کی فوج نے اس کا پیچھا کیا اور عملاً مغلوں کو اپنی ریاست سے مار بھگایا۔

شاہجہاں بیجاپور میں مغلوں کی ناکامی سے بہت مایوس ہوا۔ اس کو اعظم خاں اور آصف خاں کی کارروائیوں پر اطمینان نہ ہوا اور ان کی واپسی کے احکامات صادر کر دیے گئے۔ خان خاناں مہابت خاں کو جو کہ مشہور سپہ سالار تھا دکن کا صوبے دار مقرر کیا گیا اور اس کو فوراً روانگی کا حکم ملا۔

مہابت خاں کے تجربے، فوجی لیاقت اور قوت فیصلہ پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب دکن والوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ شاہجہاں کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونکی جا سکتی اور وہ دکن کے معاملے میں اتنا ہی سنجیدہ ہے جتنے اس کے وسائل وسیع ہیں۔

ریاست احمدنگر کی سیاسی حالت ناقابلِ اطمینان تھی۔ فتح خاں اپنے لائق باپ کی بالکل ضد تھا۔ اس کی ہردم بدلتی اور ناقابلِ اعتماد سیاست نے اس کو احمدنگر کے لوگوں کی نظروں سے گرا دیا اور مغل بھی اس پر بھروسہ نہ کر سکے گو فتح خاں نے ایک حد تک مغلوں کی اطاعت قبول کر لی تھی پھر بھی اس کے دل میں ان کی طرف سے شبہات تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مغلوں نے اس کے دشمن مرہٹہ سرداروں کو نوازا تھا۔

جب مرہٹہ سردار شاہ جی بھونسلا کو جو مغلوں سے آملا تھا اور جس کو منصب داری مل گئی تھی یہ حکم دیا گیا کہ وہ ان اضلاع میں سے جو اس کو منتقل کیے گئے تھے کچھ ضلعے فتح خاں کو واپس کر دے تو اس کو یہ بات ناگوار گزری۔ اس نے مغلوں کی ملازمت سے استعفا دے دیا اور نظام شاہی ریاست کی طرفداری میں، بیجاپور کے پرچم تلے مغلوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے۔ اسی نے عادل شاہ کو یہ مشورہ دیا کہ دولت آباد کے

قلعہ پر جو کہ فتح خاں کے قبضے میں تھا فوراً حملہ کر کے جیت لیا جائے۔ عادل شاہ نے اس تجویز کو مان کر ایک بڑی فوج اس کی سرکردگی میں روانہ کر دی۔

فتح خاں ڈر گیا اس نے مہابت خاں سے مدد کی درخواست کی اور یہ وعدہ کیا کہ قلعہ اس کو سونپ دیا جائے گا لہٰذا خان خاناں نے اپنے بیٹے کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج روانہ کی۔ اس سے رن دولہ خاں کو خطرہ لاحق ہوگیا۔ اس نے اپنی سیاست بدلی اور فتح خاں سے گفت و شنید شروع کر دی۔ اس نے یہ دلیل پیش کی کہ اگر قلعہ مغلوں کے ہاتھ لگ گیا تو احمد نگر کی ریاست برباد ہو جائے گی، اور یہ بات دکن کی دوسری ریاستوں کے لیے بھی تباہ کن ہوگی۔

فتح خاں کو یہ مشورہ دیا گیا کہ وہ بیجا پور کے ساتھ مل کر مغلوں کی پیش قدمی کو روکے۔ یہ شرط بھی پیش کی گئی کہ اگر فتح خاں اس تجویز کو منظور کرلے اور شولا پور اور اس کے ساڑھے پانچ اضلاع پر سے اپنا حق اٹھالے تو عادل شاہی حکومت کی پوری قوت اس کی مدد کے لیے پہنچ جائے گی اور اس طرح دولت آباد اس کے قبضے میں رہ سکے گا۔ مزید برآں اس کو تین لاکھ ہن نقد اور کافی مقدار میں سامان رسد فراہم کیا جائے گا۔ فتح خاں کا دل اس تجویز سے نرم پڑگیا اور اس نے مغلوں کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

بیجا پور اور احمد نگر کے درمیان اس وجہ سے اتحاد قائم تھا کہ وہ مغل شہنشاہ سے خائف تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ بیجا پور کی ایک اور غرض وابستہ تھی جس کے سبب کسی قسم کا مستقل اتحاد ناممکن تھا۔ کچھ عرصے سے بیجا پور اور گولکنڈہ کے حکمرانوں کو اس کا احساس ہوگیا تھا کہ احمد نگر کی ریاست اندرونی اختلافات اور مغلیہ سلطنت کے خارجی دباؤ کے زیرِ اثر جلد ہی ختم ہونے والی ہے۔ اس آشفتگی کی حالت میں وہ یہ چاہتے تھے کہ جتنا زیادہ ممکن ہو سکے وہ احمد نگر کا علاقہ اپنے قبضے میں کرلیں لیکن ان ریاستوں نے یہ کبھی نہ سوچا کہ وہ خود بھی تیزی کے ساتھ زوال کی طرف مائل ہیں اور بہت ممکن ہے کہ جو خطرہ احمد نگر کو ہے وہی خطرہ کسی نہ کسی دن ان کے اپنے سامنے آجائے۔

مارچ 1631ء کے آغاز میں مہابت خاں دکن پہنچ گیا۔ جب اس کو فتح خاں کی عیاری کا حال معلوم ہوا تو وہ غصّے سے دیوانہ ہوگیا۔ کیونکہ اس کی تیاریاں مکمل تھیں لہٰذا اس نے اپنی آمد کے دوسرے ہی دن عنبر کوٹ کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ دولت آباد کے قلعہ

کی حفاظت کے لیے دو دوسرے قلعے عنبرکوٹ اور مہاکوٹ تعمیر کیے گئے تھے. فتح خاں کی قلعے کو مضبوط بنانے اور بچانے کی ہر کوشش اور قلعہ کے محافظین کی زبردست بہادری کے باوجود قلعہ پر حملہ کرکے فتح کرلیا گیا. کندھار کے شہرت یافتہ نصیری خاں نے مہیش داس، بکھور وغیرہ کی مدد سے بیجاپوری سردار خیریت خاں کی زبردست اور جوشیلی مخالفت کے دانت کھٹے کردیے. اس طرح مغلوں کو جو فتح حاصل ہوئی اس سے فائدہ اٹھاکر انھوں نے رسد کی فراہمی کو بالکل منقطع کردیا. یہاں تک کہ محاصرین کو مردہ جانوروں کی ابلی کھال پر جینا پڑا. مہاکوٹ پر بھی قبضہ کرلیا گیا. اور فتح خاں کی ساری کوششیں جو وہ بیجاپوری ساتھیوں کے ساتھ قلعے کی نجات کے لیے کر رہا تھا بیکار ثابت ہوئیں. مغلوں کی حکمتِ عملی اور زبردست قحط اور غلے کی کمی نے دکن والوں کے حوصلے پست کردیے.

بیجاپور کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد قحط سے پریشان ہوکر مغلوں کی پناہ میں چلی گئی. جب فتح خاں کو جالنا کے قلعہ کی فتح کا حال معلوم ہوا تو اس کو خطرہ پیدا ہوگیا اور وہ ہمت ہار بیٹھا. اس نے مایوسی کی حالت میں اپنے سب سے بڑے بیٹے عبدالرسول کو یرغمال بناکر روانہ کیا اور اجازت چاہی کہ اپنے خاندان سمیت دولت آباد کا قلعہ خالی کردے. مہابت خاں یہ سن کر بہت خوش ہوا اور اس نے فتح خاں کے پاس ہاتھی، اونٹ اور ڈھائی لاکھ روپیہ نقد بھیجا مغلوں نے 17 جون 1633ء کو قلعہ پر قبضہ کرلیا اور بڑی مقدار میں سامانِ جنگ اس کے ہاتھ لگا.

ستمبر 1633ء میں فتح خاں اور نظام شاہی خاندان کا آخری بادشاہ حسن شاہ آگرہ میں شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیے گئے. شاہجہاں نے فتح خاں کو خلعت سے نوازا اور اس کو دو لاکھ روپیہ سالانہ کا عطیہ دیا اور اس کی ساری جائداد واپس کردی. دوسری طرف بے یار و مددگار غریب بے گناہ حسن شاہ کو گوالیار بھیج دیا گیا تاکہ وہ وہاں پر اپنی بدقسمتی پر آٹھ آٹھ آنسو روئے. شاہجہاں کی اس سیاست کا سبب شاید اس کی یہ خواہش تھی کہ احمدنگر کی ریاست کو اپنی سلطنت میں ملالے اور فتح خاں کے حامیوں کو اپنی طرف ملاکر بیجاپور کی ریاست کو ان سے علیحدہ کرلے.

شاہجہاں یوں تو عام طور پر اپنی سیاست میں کامیاب ہوگیا لیکن وہ شاہ جی کو اس سے نہ روک سکا کہ ایک دوسرے شہزادے کو دکن کا حاکم علی الاطلاق بنالے اور

اپنے ہتھیاروں کی مدد اس کو فراہم کرے۔ مغلوں نے جو فتوحات حاصل کی تھیں ان کو استوار کرنے کا کام رفتہ رفتہ ہی آگے بڑھ سکتا تھا۔

مغلوں کی شاندار کامیابیوں اور نظام شاہی ریاست کے زوال سے بیجاپور کی آنکھیں کھل گئیں۔ انھوں نے صلح کی درخواست کی لیکن فاتح مغلوں نے اس درخواست کو حقارت کے ساتھ رد کر دیا کیونکہ ان کو اب ہمیشہ سے زیادہ اپنی قوت کا احساس ہو چکا تھا۔ اب بیجاپور والوں نے مایوسی اور ڈر کے مارے دولت آباد پر حملہ کیا جو ابھی تک ٹھیک طور پر مضبوط نہ ہو پایا تھا لیکن نصیری خاں نے جو خان دوراں کہلاتا تھا اپنی ہوشیاری سے دولت آباد کے باشندوں کو مغل حکومت کا حامی بنا لیا اور اس کی شجاعت نے حملہ آوروں کو دور ہی رکھا۔ جب بیجاپوری محاصرین کو اس بات کا پتہ چلا کہ مہابت خاں نصیری خاں کی مدد کے لیے آ رہا ہے تو انھوں نے مجبوراً محاصرہ اٹھا کر راہ فرار اختیار کی۔

مہابت خاں کا اپنی کامیابیوں سے اتنا حوصلہ بڑھا کہ اس نے شہنشاہ کے نمایندے شہزادہ شجاع کو پرینڈہ فتح کرنے کا مشورہ دیا۔ قلعہ پرینڈہ کو بیجاپور والوں نے احمد نگر سے حاصل کیا تھا اور اس کو مغلوں کے خلاف اپنی کارروائیوں کا مرکز بنایا تھا۔ مغلوں نے اللہ وردی خاں کی سرکردگی میں قلعہ کا محاصرہ کیا لیکن مہابت خاں اور خان دوراں کے درمیان اختلافات اور جنگی طریقِ عمل کی ناکامی اور حملہ آوروں کے پاس رسد کی کمی نے بیجاپور والوں کو اپنا قلعہ کامیابی سے بچانے میں مدد دی۔ مغلوں کو محاصرہ اٹھانے اور برہان پور واپس جانے پر مجبور ہونا پڑا اور قبل اس کے کہ کوئی تازہ فوجی قدم اٹھایا جائے مہابت خاں اکتوبر 1634ء میں ناسور کے مرض میں مبتلا ہو کر مرگیا۔ اس کی جگہ کو پُر کرنے کے لیے اس جیسا لائق و تجربہ کار آدمی حاصل کرنا آسان کام نہ تھا۔ اس کے علاوہ بندیلا راجا کی بغاوت نے شہنشاہ کی توجہ کو دوسری طرف منتقل کر دیا۔ دکن کی مہم کا عملاً پہلا باب نظام شاہی ریاست کے زوال کے ساتھ ختم ہو گیا جس نے مغل سلطنت کا نصف صدی تک مقابلہ کیا۔ باوجودیکہ منصب [illegible] مرہٹہ [illegible] کچھ امرا ابھی تک مغلوں کی مخالفت پر کمربستہ تھے مگر [illegible] کی مخالفت [illegible] انفرادیت اور اہمیت ختم ہو چکی تھی۔

دوسری بندیلا جنگ

مہابت خاں کے انتقال کے بعد جوجھار جو کہ دکن میں مقیم مغل فوج میں مامور تھا اور مہابت خاں سے وطن جانے کی اجازت لے چکا تھا اپنی ریاست میں واپس آیا لیکن اپنے بیٹے جگ راج کو وہیں چھوڑ دیا۔ جوجھار کی بے چین طبیعت اور بندیلوں کی قدیمی خواہش کہ وہ گڑھا کتنگا پر قبضہ کرلیں دوبارہ ابھر آئی۔ جوجھار نے اس ریاست پر حملہ کر دیا۔ گڑھا کا راجا مارا گیا اور ریاست کا پائے تخت چوراگڑھ لوٹ لیا گیا۔ اس وقت پریم نارائن کا لڑکا دکن میں خان دوراں کی فوج میں ملازم تھا۔ اس کے لڑکے نے شہنشاہ کے حضور میں شکایت کی اور خان دوراں نے اس کی سفارش کی۔ [نوٹ :۔ جوجھار = جھوجھار = جھجر]

شاہجہاں نے اس کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ ایک راجا کا دوسری ریاست پر جب کہ وہ شاہی محافظت میں ہو حملہ کرنا سلطنت کے بنیادی ڈھانچے پر حملہ کرنے کے مترادف ہے۔ یہ شہنشاہی سیاست کا بنیادی اصول تھا کہ کوئی بھی دو سردار جو سلطنت کی پناہ میں ہوں شہنشاہ کی اجازت کے بغیر ایک دوسرے سے نبرد آزمائی کے مجاز نہ تھے۔ چنانچہ شہنشاہ نے درخواست قبول کرتے ہوئے جوجھار کو حکم دیا کہ وہ مفتوحہ علاقے سلطنت کو سونپ دے اور لوٹے ہوئے خزانے میں سے دس لاکھ روپے کی رقم شاہی خزانے میں جمع کرے ورنہ اپنی بندیل کھنڈ کی جاگیر میں سے اتنا علاقہ واپس کردے جتنا کہ اس نے گڑھا کتنگا کی ریاست میں سے اپنی ریاست میں ملا لیا ہے۔ ممکن ہے یہ تجاویز شہنشاہ کے لیے مفید ہوں لیکن ان سے گڑھا کتنگا کے راجاؤں کو تسلی نہ ہوئی۔ اس کا علم نہیں کہ شاہجہاں ان لوگوں کو کس طرح مطمئن کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ ان کے دعوے سے چشم پوشی کرنا چاہتا تھا تو یہ بہت ہی خود غرضانہ اور قابلِ اعتراض رویہ ہوتا۔ شاہجہاں کی شرائط میں سے جوجھار نے کسی شرط کو بھی منظور نہ کیا لہٰذا جنگ ناگزیر ہوگئی۔ قبل اس کے کہ شاہی فرمان جوجھار کو روانہ کیا جائے اس کو اپنے وکیل کے ذریعے جو شاہی دربار میں موجود تھا شہنشاہ کے مطالبات کا پتہ چل گیا اور اس نے اپنے بیٹے وکرماجیت (جگ راج) کو جو دکن میں ملازم تھا لکھ بھیجا کہ فوراً ہی بندیل کھنڈ واپس آجائے۔ چنانچہ وکرماجیت دکن کی چھاؤنی سے فرار ہوکر چلا آیا۔ باوجودیکہ خان دوراں نے اس کو

گرفتار کرنے کی کوشش کی مگر وہ اپنے باپ کے پاس پہنچ گیا۔

شاہجہاں نے جوجھار اور اس کے بیٹے کے طرز عمل سے ناراض ہوکر جنگ کا اعلان کردیا۔ شہزادہ اورنگ زیب کی نام نہاد سرکردگی میں بائیس ہزار سواروں کی فوج تین طرف سے حملے کے لیے روانہ کی گئی۔ شہنشاہ نے یہ ریاست راجا دیوی سنگھ کو عطا کردی جو اورچھا خاندان کی سب سے بڑی شاخ کا نمائندہ اور ریاست کے معاملے میں جوجھار سنگھ کا حریف تھا۔ جوجھار سنگھ کے پاس بھی پندرہ ہزار کی فوج تھی جس میں دو تہائی پیادہ تھے۔

جوجھار نے دیکھا کہ شہنشاہ اپنے ارادے میں مضبوط اور اٹل ہے اور دشمن کی فوج اس کی فوج سے زیادہ طاقت ور ہے تو اس نے آصف خاں کو آمادہ کیا کہ وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کرکے بات چیت کا دروازہ ازسرنو کھول دے۔ شہنشاہ نے اس شرط پر صلح کرنا منظور کیا کہ جوجھار تیس لاکھ روپے ادا کرے۔ چوراگڑھ کے بدلے میں اپنی سرکار بیاوان والی جاگیر سے دستبردار ہوجائے۔ وکرماجیت کو پہلے کی ملازمت کے لیے دکن روانہ کردے اور اپنے پوتے کو دربار میں بحیثیت یرغمال روانہ کرے۔ یہ شرطیں بظاہر سخت تھیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ جوجھار سنگھ نے ان شرائط کے ماننے سے انکار کردیا اور مغل فوج نے ازسرنو کارروائی شروع کردی۔

22 نومبر 1634ء کو مغلوں نے اورچھا پر سیڑھیاں لگاکر قبضہ کرلیا اور راجا بھرت بندیلے کے بیٹے دیوی سنگھ کو راجا بنادیا۔ جلد ہی ایک مضبوط قلعہ دھمونی بھی جیت لیا گیا۔ جوجھار سنگھ چوراگڑھ بھاگ گیا لیکن جب مغل وہاں پہنچے تو اس کو قلعہ خالی کرنا پڑا مگر اس نے پرانے محل اور ملکیت و جائیداد کو بارود سے پھونک کر مسمار کردیا۔ اب گونڈوانا کے مشکل گزار علاقوں میں جوجھار کا تعاقب شروع کیا گیا۔ مغل فوج نے اس سرگرمی اور مستعدی سے پیچھا کیا کہ انھوں نے سب کو قابو میں کرلیا مگر جوجھار اور وکرماجیت ہاتھ نہ آئے۔ جوجھار کے تین لڑکے ایک پوتا اور ایک بیوہ رانی گرفتار کرلی گئیں مگر جوجھار اور وکرماجیت جنگلوں میں فرار ہوچکے تھے۔ یہ دونوں تھکے ہارے سو رہے تھے کہ گونڈوں نے ان کو قتل کردیا اور ان کے سر 1635ء میں شہنشاہ کو بھیج دیے گئے۔

شہنشاہ دوسری بندیلا جنگ میں پوری طرح کامیاب ہوا۔ اس نے چھپرا کا پرگنہ جس کی مالگزاری آٹھ لاکھ روپیہ تھی سلطنت میں شامل کرلیا اور تھوڑی سی کوشش سے

بعد ایک کروڑ روپے کی پوشیدہ دولت بھی ہاتھ آگئی۔ بندیل کھنڈ کی ریاست دیوی سنگھ کو دے دی گئی لیکن بندیلوں کے درمیان بے چینی اور بے قراری جاری رہی۔ بدقسمتی سے متعصبانہ رویہ اختیار کرنے کے سبب جو اکبر کے پوتے کو زیب نہ دیتا تھا شہنشاہ کا وقار داغدار ہو گیا۔ راجپوت عورتوں کو جو زندہ بچ گئی تھیں مجبور کیا گیا کہ وہ شاہی حرم میں یا امراء کے یہاں شامل خدمت ہو جائیں۔ جوجھار کے دو کمسن لڑکوں اور ایک پوتے کو مسلمان بنا لیا گیا۔ اس کے بوڑھے وزیر شیام اور دوسرے لڑکے اودے بھان کو جنھوں نے اسلام لانے سے انکار کیا قتل کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ شاہجہاں کی اورچھ میں فاتحانہ آمد کے موقع پر بیر سنگھ کا عظیم الشان مندر مسمار کر دیا گیا۔ بتوں کی بے حرمتی کی گئی اور اس مندر کی جگہ مسجد تعمیر کی گئی۔

بندیلا جنگ کے بعد گونڈوانہ کا تعلق مغل حکمراں سے زیادہ قریب ہو گیا۔ چانداکے حکمراں کو مجبور کیا گیا کہ وہ پانچ لاکھ روپے کی پیش کش داخل کرے اور مغل افسروں کو ایک لاکھ روپے دے۔

باب 20

جنگِ دکن کا دوسرا مرحلہ اور بعد کے حالات

شاہجہاں بندیلا جنگ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد پورے اطمینان اور توجہ کے ساتھ دکن کے معاملات کی طرف متوجہ ہوا۔ بندیلا جنگ میں کامیابی کے سبب اس کے وقار میں اضافہ ہوگیا تھا۔ حالانکہ احمدنگر کی ریاست ختم ہوچکی تھی تاہم ابھی تک اس پر پوری طرح قابو نہ ہو پایا تھا۔ نہ ہی وہاں کی رعایا کے جذبات ٹھنڈے ہو پائے تھے۔ بیجاپور والے کچھ تو اپنے بچاؤ کی خاطر اور کچھ اس خیال سے کہ احمدنگر کی متزلزل ریاست کا جس قدر حصہ ہاتھ آسکے اس پر قبضہ کرلیں۔ احمدنگر والوں کو مغل حکومت کی طرف سے ورغلا رہے تھے اور بالواسطہ یا بلا واسطہ ان کی مدد کررہے تھے۔

شاہ جہاں اس بات سے آگاہ تھا کہ جب تک کہ بیجاپور پر قبضہ نہ کرلیا جائے اُس وقت تک جنوبی ہندوستان میں اس کی فتوحات کو مضبوط کرنا اور وہاں کے لوگوں کو اپنی طرف ملانا ممکن نہ ہوسکے گا۔

احمدنگر کی روبہ زوال ریاست میں مغلوں کا سب سے اہم دشمن مالوجی کا لڑکا شاہ جی بھونسلہ تھا۔ وہ احمدنگر کی ریاست کے پونا اور سوپا ضلعوں کا جاگیردار تھا۔ شاہ جی نے 1605ء میں نظام شاہ کے ایک طاقتور امیر لوکھاجی جادو راؤ کی لڑکی

سے شادی کرلی۔ مالوجی نے ملک عنبر کے زمانے میں ایک لائق فوجی افسر اور سیاست دان کی حیثیت سے شہرت حاصل کرلی۔ 1620ء میں وہ مرگیا۔ اس وقت شاہ جی 26 سال کا تھا۔ اپنی لیاقت مستعدی اور وفاداری کے سبب وہ ملک عنبر کا دست راس ہوگیا۔ اس کو اپنے اور مالوجی کے بھائی اور لڑکوں کا اعتماد حاصل تھا۔ یہ لوگ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شاہ جی سے آملے۔ 1624ء میں بھتاوادی کی مشہور جنگ میں ملک عنبر نے بیجاپور اور مغلوں کی مشترکہ فوج پر فتح حاصل کی اس لڑائی میں شاہ جی نے بڑا عملی حصہ لیا اور تجربہ و امتیاز حاصل کیا۔

جب شاہ جی میں آہستہ آہستہ اپنی قوت اور استعداد کا احساس پیدا ہوا تو اس نے اس بات کو ترجیح دی کہ بجائے اس کے کہ وہ ملک عنبر کو اپنا سہارا بنائے اپنے خود کے وسائل پر بھروسہ کرے۔ 1625ء میں اُس نے احمد نگر کی ملازمت کو ترک کرکے بیجاپور کی ملازمت کرلی۔ لیکن پونا کی جاگیر پر اپنا قبضہ باقی رکھا۔ 1626ء میں ملک عنبر کی وفات کے بعد اس کے بیٹے فتح خاں نے مغلوں کی دکن میں پیش قدمی کو روکنے کی خاطر شاہ جی کی خدمات حاصل کیں۔ شاہ جی نے خان جہاں لودی کی مدد کی۔ حالانکہ اس کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔

جب نظام شاہ نے لوکھاجی یادو اور اس کے بہت سے ورثاء کو دغا بازی سے مروادیا تھا تو شاہ جی کو خطرہ کا احساس ہوا۔ وہ مغلوں سے جاملا اور بیجاپور والوں کی ناراضگی کے باوجود دو سال تک مغلوں کی ملازمت میں رہا لیکن جب مغلوں نے فتح خاں سے گفت و شنید شروع کی اور شاہ جی سے یہ کہا گیا کہ وہ فتح خاں کی جاگیر کے اس حصے کو جو اس کے قبضے میں تھا واپس کردے تو اس کی دل شکنی ہوئی اور اس نے مغل منصب کو چھوڑا اُس پارٹی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا جو مغلوں کی مخالف تھی۔ اس نے فتح خاں کی سیاست سے مخالفت کی اور مغلوں سے لڑنے کی خاطر عادل شاہیوں سے جاملا۔

جب فتح خاں نے حسین نظام شاہی کو مغلوں کے سپرد کردیا تو یہ سمجھا جانے لگا کہ احمد نگر کی ریاست ختم ہوچکی اور وہ مغل سلطنت میں شامل ہوگئی ہے لیکن شاہ جی نے

یہ دونوں باتیں منظور نہ کیں اور کہیں نہ کہیں سے احمد نظام شاہ کا وارث حاصل کر کے اُس کو تخت پر بٹھا دیا اور اس کے بادشاہ اور اپنے اتالیق ہونے کا اعلان کر دیا۔ یہ نابالغ بادشاہ جس کے حسب نسب کا صحیح پتہ نہ تھا مرتضیٰ نظام شاہ سوم کے نام سے تخت نشین ہوا۔ بادشاہت کے اس دعوے دار کی طرف سے شاہ جی نے مغلوں کی مخالفت کی اور اُن کے علاقوں پر جوابی حملے کرتا رہا۔ شاہ جی کی اِن کارروائیوں میں بیجاپور نے اس کی مدد کی جس کے سبب مغل شہنشاہ ناراض ہو گیا۔

سیاست دکن کو زور و شور کے ساتھ جامۂ عمل پہنانے اور انتظام حکومت کو بہتر بنانے کی خاطر ایک نیا منصوبہ بنایا گیا جس میں احمد نگر اور دولت آباد کے ضلعے شامل کر دیے گئے۔ دکن کی سرحد پر اٹھاون ہزار کی ایک فوج مقرر کر دی گئی اور دولت آباد میں ایک شاہی چھاؤنی بنا دی گئی۔ شاہجہاں کے فوجی اور سیاسی منصوبے ایک وسیع اور جامع پیمانے پر تیار کیے گئے تھے۔ شروع شروع میں بیجاپور اور گولکنڈہ کو خبردار کیا گیا۔ بیجاپور کے حاکم سے یہ کہا گیا کہ اس نے احمد نگر کی ریاست کے جتنے علاقے بزور لے لیے ہیں ان کو واپس کرے اور ایسے تمام مرہٹہ اور دوسرے سرغنوں کو جو مغلوں کی حکومت کے دشمن ہوں اپنی ریاست سے نکال دے، مغلوں کا وفادار دوست رہے اور مغل شہنشاہ کو مرتب خراج ادا کرتا رہے۔

گولکنڈہ کے حاکم سے جو تیس سال سے زائد عرصے شاہ ایران کے اقتدار کو مانتا چلا آیا تھا یہ کہا گیا کہ وہ مغل شہنشاہ کی برتری کو قبول کرے کیونکہ یہ بات عجیب معلوم ہوتی تھی کہ وہ ہندوستان سے باہر کی کسی قوت کی طرف مدد کے لیے ہاتھ پھیلائے۔ علاوہ ازیں اس سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ پہلے تین خلفائے اسلام کو برا بھلا کہنے کی رسم تبرا کو ترک کر دے کیونکہ اس سے کوئی مفید مطلب بات حاصل نہ ہوتی تعصب و نفرت پھیلتی اور سنی رعایا کی دل شکنی ہوتی۔

اس تجویز کا مقصد یہ نہ تھا کہ شیعہ مذہب میں کوئی مداخلت کی جا رہی ہو کیونکہ اظہار تنفر شیعہ مذہب کا بنیادی اصول نہیں ہو سکتا تھا۔ شیعوں کا یہ طرز عمل حضرت علی

کو بُرا کہنے کے فعل کا ردعمل تھا جس کو معاویہ نے ہوا دی لیکن عمر سوم نے اس کو بند کرا دیا۔ شیعوں کے کچھ فرقوں نے مثلاً زیدی فرقے نے کم از کم پہلے دو خلفاء کو بُرا بھلا کہنا پسند نہ کیا۔ کیونکہ مغل شہنشاہ شیعوں کے کسی بھی امام کی بُرائی کی اجازت نہ دیتا تھا لہٰذا کوئی وجہ نہ تھی کہ ریاست گولکنڈہ کسی ایسی بات کی اجازت دے جس سے مغل شہنشاہ اور سنیوں کی دل شکنی ہو۔

جب گولکنڈہ کے حاکم نے مغل شہنشاہ کے اقتدار کو تسلیم کر لیا تو یہ بات بالکل منطقی تھی کہ جو خطبہ ساری سلطنت کے لیے منظور ہو چکا تھا وہی اس ریاست میں بھی پڑھا جائے اور شہنشاہ کا نام سکوں پر کندہ ہو۔ تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ گولکنڈہ بڑی مقدار میں پیش کش کی مطلوبہ رقم نقد و جنس کی شکل میں ادا کرے۔

گولکنڈہ کے حکمرانوں نے جہانگیر کے سارے عہد حکومت کے دوران مغلوں کے سربراہ ملک عنبر کی مدد کی لیکن بیجاپور کی طرح انھوں نے اس معاملے کو کبھی اچھالا نہیں۔ ان کی مدد بیشتر مالی حیثیت رکھتی تھی۔ 1621ء میں گولکنڈہ کو بیس لاکھ روپے کا خراج مغل شہنشاہ کو ادا کرنا پڑا۔ جب شاہجہاں نے جہانگیر کے خلاف بغاوت کی تھی تو محمد قطب شاہ نے اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا تھا۔ حالانکہ یہ مددگار ثابت نہ ہوئی تاہم اس بات سے باغی شہزادے کے دل پر گہرا اثر ہوا تھا۔

جب 1626ء میں عبداللہ نامی گیارہ سالہ لڑکا قطب شاہ ہوا تو امراء کے درمیان پارٹی بازی نے نازک صورت حال اختیار کر لی۔ پیشوا اور اس کا نائب ایک دوسرے سے اصولی باتوں میں متفق نہ تھے۔ حکومت کا مغلوں سے تعلق بالکل رسمی اور غیر واضح نوعیت کا تھا۔ بظاہر شاہجہاں گولکنڈہ کے خلاف کوئی بُرا ارادہ نہ رکھتا تھا۔ کیونکہ جب گولکنڈہ نے 31-1630ء میں گورنر اڑیسہ کے حملے کے خلاف شکایت کی تو شہنشاہ نے گورنر کو لعنت ملامت کی اور اس کو حکم دیا کہ وہ ریاست سے دور رہے۔

1631ء میں جب آصف خاں نے بیجاپور پر حملہ کیا تو شہنشاہ نے قطب شاہ سے ایک بڑی رقم بطور پیش کش طلب کی، لیکن قطب شاہ نے لیت و لعل کیا اور یہ چاہا کہ

مغلوں کے حملوں کا نتیجہ دیکھ لے۔ جب یہ حملہ ناکام رہا تو قطب شاہ نے شاہجہاں کے ایلچی کو بغیر پیش کش دیئے واپس کر دیا۔ بہرحال قطب شاہ نے اتنی عقل مندی کی کہ بیجاپور اور احمد نگر کے امرا کی مغلوں کے خلاف مشترکہ کوشش میں کوئی حصہ نہ لیا اس نے خواص خان کو جو مغل دشمن تھا عہدے سے ہٹا دیا اور جھجھار سنگھ کے رشتے داروں کو جنھوں نے گولکنڈہ میں پناہ لی تھی مغلوں کے سپرد کر دیا۔ یہ بات واضح تھی کہ وہ ایک طرف تو مغل شہنشاہ سے کسی قسم کا جھگڑا مول لینا نہ چاہتا تھا اور دوسری طرف وہ یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ پیش کش یا کسی قسم کا خراج ادا کرے یا مغلوں کی برتری کو کھلے بندوں اور واضح طور پر تسلیم کرے۔

شاہجہاں نے اس بات کا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ گولکنڈہ کو اس بات پر مجبور کرے گا کہ مغل سلطنت اور اس ریاست کے درمیان تعلقات کی نوعیت واضح ہو جائے۔ عبداللہ خان فیروز جنگ اور خان دوران کو اس بات کی اجازت دی گئی کہ وہ ریاست کی سرحد کے قریب ایک زبردست فوجی مظاہرہ کریں اور اگر گولکنڈہ کی ریاست مغل شہنشاہ کے مطالبات کو فوراً پورا نہ کرے تو بھرپور حملے کی دھمکی دی جائے۔ ان حالات میں عبداللہ قطب شاہ نے بھی مناسب سمجھا کہ مغل مطالبات کو مان کر اپنی وفاداری کا اعلان کر دے۔

مئی/جون 1636ء میں قطب شاہ نے مغل شہنشاہ کی مرضی کے مطابق ایک معاہدہ پر دستخط کر دیئے۔ اس معاہدے میں یہ بات بھی لکھی گئی کہ خلفائے راشدین کے نام کے ساتھ ساتھ مغل شہنشاہ کا نام بھی خطبے میں پڑھا جائے گا اور سکوں پر کندہ ہوگا۔ گولکنڈہ کے حاکم نے یہ وعدہ کیا کہ وہ ہمیشہ شہنشاہ کا تابعدار رہے گا۔ معاہدے میں یہ شرط بھی تحریر کی گئی کہ اگر حاکم گولکنڈہ نے بے وفائی کی تو ریاست کو فتح کر لیا جائے گا۔ قطب شاہ نے نئے سال جلوس (سال جاری) سے دو لاکھ ہن سالانہ بطور خراج دکن کے مغل وائسرائے کو ادا کرنا قبول کیا۔ خراج کی باقی ماندہ رقم 32 لاکھ کا چوتھائی حصہ نویں سال کے خراج کے ساتھ فوراً ادا کرنا قرار پایا کہ اگر خراج میں ہاتھی دیئے جائیں گے تو ان کی قیمت مغلیہ حکومت کے مرکز میں رائج قیمت کے حساب سے لگائی جائے گی اور جو فرق ہوگا اس کا تصفیہ کر لیا جائے گا۔ اس معاہدے کے مطابق مغل شہنشاہ نے

ریاست کو بیجاپور یا مرہٹوں کے حملوں و دست درازیوں سے بچانے اور ان کی وجہ سے جو نقصان ہو اس کی تلافی کرنے کا وعدہ کیا۔

جس وقت گولکنڈہ سے بات چیت چل رہی تھی مغل فوجیں مرہٹہ سردار شاہ جی اور بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کے خلاف زور و شور سے فوجی کارروائی کر رہی تھیں۔ حالانکہ شاہ جی بارہ ہزار سپاہی جمع کر کے مغل علاقوں پر چھاپے مار رہا تھا لیکن وہ زیادہ عرصے تک مغل فوج کا مقابلہ نہ کر سکا جو شائستہ خاں کی سرکردگی میں ترمبک کا قلعہ فتح کر چکی تھی۔

شاہ جی کی نگاہیں بیجاپور کی مدد کی طرف لگی ہوئی تھیں لیکن بیجاپور کی حکومت خود ہی اندرونی خلفشار اور بیرونی دباؤ کا شکار تھی۔

محمد عادل شاہ کا اپنے جھگڑالو امراء پر اثر باقی نہ رہا۔ خواص خاں نے اپنے رقیب مصطفیٰ خاں کو قید کر لیا اور مراری پنڈت کی مدد سے ریاست کے سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ ادھر رن دولہ خاں نے جو ایک طاقت ور فوجی سالار تھا سیدی ریحان کے ساتھ مل کر عادل شاہ کے اشارے سے حکومت کا تختہ پلٹ دیا اور خواص خاں و مراری کو قتل کر دیا۔ مصطفیٰ خاں کو قید سے رہائی ملی اور وہ پیشوا کی گدی پر بٹھا دیا گیا۔

بیجاپور میں مقیم مغل نمایندے حکومت خاں نے شہنشاہ کو یہ خبر دی کہ موجودہ حکمراں پارٹی کی سیاست خویش پرستی اور ظاہرا وطن پرستی پر مبنی ہے اور اس کی دوستی محض ظاہرداری ہے۔

اس اطلاع کے بعد شاہجہاں نے اپنی فوج کو آگے بڑھایا اور بیجاپور کی ریاست پر تین طرف سے حملہ کر دیا۔ اس شدید خونریز جنگ میں انسانی زندگی اور مال و متاع کا زبردست نقصان ہوا۔ ہر قسم کے خطرناک اور دشمن کش وسائل استعمال کیے گئے۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا اور سپاہی و غیر سپاہی، بوڑھے، جوان، بچے یا مرد و عورت کا کوئی فرق نہ برتا گیا۔ مغل افسروں نے تلوار اور بربادی کی مشعل ہاتھ میں لیے کر آگے قدم بڑھایا۔ اس لڑائی کا نفسیاتی اثر وہی ہوا جو مغل چاہتے تھے۔ شاہ جی

جان بچا کر بھاگا اور رن دولہ و مصطفیٰ خاں نے عاجزی کے ساتھ صلح کی درخواست کی۔ آخرکار شاہجہاں نے کچھ ہچکچاہٹ اور غصے کے اظہار کے بعد صلح کی شرائط پیش کر دیں۔

بیجاپور کے حکمرانوں نے مغل شہنشاہ کی برتری اور تفوق کو مان لیا اور اس بات کو بھی قبول کر لیا کہ اگر ان کے اور قطب شاہ کے درمیان کسی قسم کے منازع و مفاد کا ٹکراؤ ہوا تو مغل شہنشاہ کی حکمیت قابلِ قبول ہوگی، بیجاپور گولکنڈہ کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائے گا۔ بیجاپور نے بیس لاکھ روپیہ پیشکش نقد و جنس شہنشاہ کو ادا کیا۔ اس کے بدلے میں شہنشاہ نے پرینڈہ، بیدر، گلبرگہ اور شولاپور واپس دے دیے۔ اس کے علاوہ احمدنگر کی سابقہ ریاست کا ایک حصہ کوکن کی طرف جس میں سینا اور بھیما کے علاقے شامل تھے عادل شاہ کو دے دیا گیا۔ عادل شاہ نے وعدہ کیا کہ وہ احمدنگر کی ریاست کے تخت کے کسی دعوے دار کی حمایت نہ کرے گا۔

معاہدے کی شرائط کا بیان کہ وہ کس صورت میں پیش کی گئیں اور کس طور پر منظور کی گئیں بہت ہی غیر اطمینان بخش ہے بہرحال جہاں تک خراج کی رقم کا تعلق ہے یہ بات مشکوک ہے کہ محلاتِ شولاپور و ملحقہ علاقہ جات کے لیے بیس لاکھ ہن سالانہ تو کجا عادل شاہ سے نو لاکھ ہن بطور خراج بھی طلب نہ کیا گیا ہوگا۔

اس معاہدے میں یہ شرط بھی پیش کی گئی کہ ایک فریق دوسرے فریق کے افسروں کو نہ تو رشوت دے گا نہ ہی ورغلائے گا۔ بیجاپور نے یہ ذمے داری اپنے سر لی کہ اگر شاہ جی جُنتر اور ترمبک کے قلعوں کو تسلیم کرنے سے انکار کردے تو اس کو زیر کیا جائے گا۔

1636ء میں مغل شہنشاہ اور بیجاپور و گولکنڈہ کے درمیان جو معاہدے ہوئے وہ سلطنت مغلیہ اور دکن دونوں کی تاریخ میں اہمیت کے حامل ہیں۔ ان معاہدوں کے ذریعہ نظام شاہی خاندان کا خاتمہ ہوگیا اور بہمنی خاندان کے بعد کی دکنی مسلم ریاستوں کی تاریخ کا ایک اہم باب ختم ہوا۔ جنوب کا توازن طاقت بگڑ گیا جس کے سبب مراٹھوں اور مغلوں کو فائدہ پہنچا۔ اکبر نے خاندیش اور شاہجہاں نے احمدنگر کی ریاستوں کو جو کہ مغلوں کے

مقابلے میں سدِ فاصل بنی ہوئی تھیں سرنگوں کیا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں کو مغل شہنشاہ کی برتری، ادائیگی خراج اور دونوں ریاستوں میں اختلاف کی صورت میں حاکمیت کے حق کو قبول کرنا پڑا۔ گولکنڈہ میں شہنشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور سکوں پر اس کا نام کندہ کیا گیا۔ شہنشاہ نے دو لاکھ ہن سالانہ کے عوض اس ریاست کو ہمسایہ ریاستوں کے حملے سے بچانے کی ذمے داری اپنے سر لی۔ یہ رقم اس رقم کا نصف تھی جو ریاست گولکنڈہ ملک عنبر کو اسی کام کے لیے ادا کیا کرتی۔ یہ پورا سلسلہ ایک قسم کا امدادی نظام تھا۔

بیجاپور نے حفاظت کے لیے کوئی درخواست نہ کی تھی لہٰذا مغل بادشاہ کی گرفت دکنی ریاستوں پر سخت ہوگئی اور تکمیل الحاق کے لیے تیاریاں شروع کر دی گئیں جس کے لیے بادشاہ کے حکم کا انتظار تھا۔ اس کے علاوہ مرہٹوں پر قابو رکھنے کی ذمے داری بیجاپور پر ڈال دی گئی جس سے مغلوں کو بڑی نجات ملی۔ اس طرح جو صلح قائم ہوئی وہ تقریباً بیس سال تک برقرار رہی اور اس دوران ان دو دکنی ریاستوں نے اپنی حالت سدھار لی، اپنے اقتصادی حالات کو بہتر بنا لیا اور مشرق، مغرب اور جنوب میں اپنی سرحدات کو وسیع کر لیا۔ درحقیقت بیجاپور کی ریاست کے ساتھ تعلقات اس قدر اطمینان بخش تھے اور دکن میں شہنشاہ کی پوزیشن اس قدر مضبوط تھی کہ شاہجہاں نے اس ریاست کی توسیعی کارروائیوں پر نہ صرف کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ عادل شاہ کے خطاب سے نوازا۔

مغلوں اور دکن کی دو بڑی ریاستوں کے درمیان معاہدہ ہو جانے سے شاہ جی تذبذب میں پڑ گیا۔ بیجاپوری اور مغل افواج اس کو ایک قلعے سے دوسرے قلعے میں دوڑا رہی تھیں۔ مجبور ہو کر اس نے پرتگالیوں سے مدد مانگی لیکن وہ اس میں بھی ناکام رہا۔ جب وہ ماہولی کے قلعے میں گھر گیا تو اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ کٹھ پتلی نظام شاہ کے ساتھ ساتھ خود کو بھی مغل دولت کے سپرد کر دے۔ چنانچہ نومبر 1636ء میں اس نے جُنّار، تریمبک اور بہت سے دوسرے قلعے اور نظام شاہ کو مغل سالار خان زماں کے سپرد کر دیا۔

اس وقت تک شاہجہاں کو ہر طرف کامیابی حاصل ہو رہی تھی لیکن شمال مغرب

میں اُس کا تجربہ اس قدر خوش آیند نہ تھا۔ ہندوستان کے اندرونی دفاع کے لیے مغل، کابل و قندھار پر قبضہ رکھنا بہت ضروری سمجھتے تھے۔ یہاں ان کو سب سے زیادہ دشواری کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ شمال میں ازبک مغرب میں ایران اور جنوب میں افغانستان کے دباؤ کے علاوہ افغانستان اور بلوچستان کی رعایا سرحدی قبائیلوں کی طرح ہی سرکش ہو رہی تھی۔ اُن لوگوں کے مزاج میں خودمختاری اور کوہستانی آزادی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ حالانکہ مغل حکومت کی انتظامی سیاست یہ تھی کہ داخلی معاملات میں کم سے کم مداخلت کی جائے لیکن یہ لوگ طولانی مدت تک کسی کے زیر اثر رہنے کے لیے تیار نہ تھے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ دریائے کابل کے ساحل اور دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر بسنے والے قبائل میں ایک مذہبی تحریک نے جوش بھر دیا تھا۔ اس تحریک نے نہ صرف ان لوگوں کی غیر قانونی حرکات کو جائز قرار دیا بلکہ ان کو مغلوں کے خلاف اور کسی حد تک سنی شریعت کے خلاف بغاوت کرنے پر اُکسایا۔ شاہجہاں کے عہد کے ابتدائی دور میں کابل کے حاکم لشکر خاں نے شاہجہاں کو اس بات کی گذارش روانہ کی کہ افغان قانون شریعت کو توڑ رہے ہیں۔ جواباً شہنشاہ نے حکم دیا کہ قانون نافذ کیا جائے اور ہر قسم کی قانون شکنی یا بدامنی پیدا کرنے والوں کو سزا دی جائے لیکن یہ احساس موجود تھا کہ افغان کسی صوبائی حکومت سے دبنے والے نہیں اور وہ بابر کے زمانے سے ایسے ہی سرکش چلے آرہے ہیں۔ سرکش افغان قبائل نے سرنگوں ہونے کے بجائے بدلہ لینے کی خاطر پشاور پر حملہ کر دیا۔ مغل افسران بڑی مشکل سے پشاور کو باغیوں کے ہاتھوں سے بچا سکے۔ ملتان اور بلوچستان کی سرحدات پر بھی حالات اسی قدر ناقابل اطمینان تھے۔ ہوت اور نوہانی قبائل اور ان کے مختلف خیل سب ہی پُرامن رہنے پر آمادہ نہ تھے اور ہمیشہ اس تاک میں رہتے کہ مغل علاقوں پر مار دھاڑ کرتے رہیں۔

شاہجہاں نے دکن اور شمالی ہند میں اپنی فتوحات کے زعم میں استرخانیوں سے جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اس سلسلے میں نہ تو اپنی طاقت کا اندازہ لگایا اور نہ ہی شمال مغربی سرحد میں پیش آنے والی مشکلات اور کوہستانی جنگ کی دشواریوں کا

خیال کیا اور نہ ہی اس امر کو دھیان میں رکھا کہ قبائلی اس کے دشمن ہیں۔ یہ سچ ہے کہ شاہجہاں کی تخت نشینی سے قبل 1628ء میں ازبک قبائل کے حکمراں امام قلی کے بھائی نظر محمد نے کابل کا محاصرہ کر لیا تھا اور قلعہ ضحاک کو فتح کرنے کی ناکام کوشش کی تھی جس کے جواب میں مغلوں نے 1629ء میں بامیان جیت لیا۔ لیکن اس کے بعد سے حالات بدل گئے تھے اور سفارتوں کے تبادلے کے نتیجے میں عملی طور پر دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے لیکن بابر کے جانشینوں کے لیے ایشیائے مرکزی پر سے اپنے حق کو فراموش کر دینا اسی قدر مشکل تھا جس قدر کہ ازبکوں اور ان کے وارثوں کو کابل و قندھار پر اپنے منصوبوں کا ترک کرنا۔

بہرحال یہ سب باتیں احساسات اور جذبۂ جاہ طلبی سے متعلق تھیں۔ عملی مسئلہ تو بلخ و بدخشاں کا تھا جو کہ کابل اور ایشیائے مرکزی دونوں کے لیے اہمیت کے حامل تھے۔ مغلوں کی حکمتِ عملی اس بات میں ناکام ہو چکی تھی کہ وہ ان علاقوں کو اپنے قبضے میں رکھ سکیں لیکن وہ ہمیشہ کی طرح ان پر دوبارہ قابو حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔

1639ء میں شاہجہاں پچاس ہزار سواروں کی فوج لے کر افغان قبائل کو سرنگوں کرنے، افغانستان کی حکومت کو مستحکم کرنے اور ایشیائے مرکزی کی حالت کا مطالعہ کرنے کابل پہنچا لیکن اس نے شیبانیوں کے ساتھ جنگ نہ چھیڑی اور واپس ہو گیا۔

1640-41ء میں ایشیائے مرکزی میں افراتفری پھیل گئی 1641ء میں سمرقند کے حاکم امام قلی خاں کو اس کے جاہ طلب اور چنچل بھائی نظر محمد نے جو کہ بلخ کا گورنر تھا تخت سے اتار دیا۔ بہرحال نظر محمد کے ناجائز قبضہ، ظالمانہ حکومت اور غرور کے علاوہ جاگیرداری سسٹم کو ختم کرنے کی کوشش اور مذہبی اوقاف ٹیکس معاف اراضیات میں مداخلت کرنے کے سبب وہاں کے شرفاء میں بغاوت شروع ہو کر آہستہ آہستہ پورے ملک میں پھیل گئی۔ نظر محمد کے اپنے لڑکے بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس کے

ایک لڑکے عبدالعزیز نے خود کو بخارا کا گورنر اعلان کر دیا اور آس پاس کے علاقے فتح کرنے لگا۔ جب نذر محمد نے اپنی حالت خراب دیکھی تو شاہجہاں سے مدد کی درخواست کی۔ یہ موقع عمل شہنشاہ کی اولوالعزمی اور سیاست کے عین مطابق تھا۔ چنانچہ اُس نے ۱۶۴۶ء میں شہزادہ مراد اور علی مردان خاں کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج کی تیاری کا حکم دیا۔ جولائی ۱۶۴۶ء میں اس فوج نے قندز، خوست، بدخشاں اور بلخ پر قبضہ کر لیا۔ اس زبردست فوج کی پیش قدمی، فتوحات اور شاہجہاں کے کابل میں قیام نے ایشیائے مرکزی کے لوگوں کے درمیان خوف و ہراس کی لہر دوڑا دی۔ نذر محمد بھی اپنی جان بچا کر اور ساری دولت چھوڑ کر بھاگا جو اُس کے خود کے ساتھیوں یا مغلوں نے لوٹ لی۔

شاہجہاں اس مہم کی نگرانی کی خاطر کابل پہنچا۔ یہ بات کہ شہنشاہ نے ایسا زبردست کامیاب حملہ کرنے میں مستعدی دکھائی اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ دہلی اور بلخ کے درمیان رسل و رسائل کا سلسلہ فوجی ضروریات کے لیے پوری طرح کھلا رہا شاہجہاں کی بیسافت کا ثبوت ہے۔ اگر شہزادہ مراد شہنشاہ کی مرضی اور وزیر اعظم کی درخواست کا احترام کیے بغیر ہندوستان واپس نہ چلا جاتا تو شاید ایشیائے مرکزی میں اور بھی کامیابی نصیب ہوتی اور سب مفتوحہ علاقے مناسب طریقے سے سلطنت میں ملحق کر لیے جاتے۔

شاہجہاں نے بلخ کی گورنری اورنگ زیب کو سونپی اور پشاور سے کابل تک کے راستے میں ایک بڑی فوج جمع کی تاکہ وہ ضرورت کے وقت فوراً حرکت میں آ سکے۔ مئی ۱۶۴۷ء میں اورنگ زیب میدان جنگ میں پہنچا لیکن اس نے یہ دیکھا کہ اہم فوجی مقامات کے استحکام اور بچاؤ کے لیے اس کو جو فوج ملی ہے وہ شہزادہ مراد کی فوج سے صرف آدھی ہے۔ اسی دوران استرخانیوں نے مغل فوج سے تین گنا زیادہ فوج جمع کر لی تھی اس کے علاوہ ان لوگوں پر قابو پانا اس لیے بھی آسان نہ تھا کیوں کہ وہ لوگ ہمیشہ جم کر نہ لڑتے تھے اور اچانک حملوں دھاووں اور لوٹ مار کے ذریعے مخالفین کو پریشان کرتے رہتے تھے۔

مغل فوج نے شروع شروع میں کامیابی حاصل کی اور پہاڑیوں اور گھاٹیوں کو دشمن سے صاف کر کے بلخ پہنچ گئی۔ شاہجہاں نے اس مہم کو منظم اور تیز کرنے کی خاطر اپنا

پڑاؤ کابل میں جمادیا۔ اورنگ زیب نے اپنے سب سے بڑے لڑکے اور دوسرا پڑاؤ کوخ میں چھوڑا اور خود وہاں سے چالیس میل دور شمال مغرب میں آقچہ پہنچا جہاں ازبکوں نے اپنی فوجوں کو متمرکز کیا ہوا تھا۔ مغل فوج ازبکوں کی رکاوٹوں کو عبور کرتی تیمور آباد پہنچ گئی۔ یہاں استرخانیوں نے اس پر چاروں طرف سے حملہ بول دیا لیکن شکست انھیں کو ہوئی اور وہ پیچھے دھکیل دیے گئے۔ یہ لوگ اپنی پوری کوشش کے باوجود مغلوں پر مشکل ہی سے کوئی دباؤ ڈال سکے اور انھوں نے آگے بڑھ کر دشمن کے اصلی کیمپ کو بمقام پاشائی قابو میں کرلیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک بڑا جراءتمندانہ اقدام تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ غیرعاقلانہ بھی تھا کیوں کہ اس طرح فوج کا عقبی حصّہ اور بلخ کا دفاع کمزور ہوگئے تھے۔ پاشائی پہنچ کر اورنگ زیب کو علم ہوا کہ سُبحان قلی کی سرکردگی میں ایک فوج بلخ بھیجی جا رہی ہے لہٰذا اس نے واپسی کا فیصلہ کرلیا اور باوجودیکہ استرخانی حکمران عبدالعزیز بھی زبردست مدد لے کر آپہنچا تھا اور مشترکہ افواج نے مغل فوج پر بہت زور ڈالا تھا تاہم مغل فوج واپسی میں راستہ بھر لڑتی ہوئی بلخ پہنچ گئی۔ یہ واپسی کا سفر بہت ہی مہلک ثابت ہوا کیوں کہ اس عمل نے مغلوں کے کیے دھرے پر پانی پھیر دیا اور ان کے صبر و حوصلے کو بہت دھکا پہنچایا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ دشمن کو بھی اس بات کا پورا احساس ہوگیا کہ مغلوں میں اعلیٰ تنظیمی و جنگجویانہ خصوصیات اور فوجی سپہ سالاری کی خوبیاں موجود ہیں۔ انھوں نے کھلے طور پر یہ بات تسلیم کرلی کہ اگر ان کے فوجی جرنیل مغلوں کی طرح لائق ہوتے تو وہ جلد ہی ترکی سلطنت کو فتح کرلیتے۔ دونوں فریق جنگ سے تنگ آچکے تھے۔ ایک طرف تو مغل کیمپ میں نان ایک یا دو روپیہ کا ملتا اور پینے کا پانی بھی اسی قدر مہنگا تھا، دوسری طرف استرخانی بھی خوفناک قحط سالی سے دوچار تھے۔ بخارا کا خزانہ خالی ہوچکا تھا اور قبائلی دستے ناکامی کے بعد تیزی کے ساتھ بکھر رہے تھے۔ اگر مغل کچھ عرصہ اور صبر کرسکتے تو استرخانی سلطنت مالی بدحالی اور فوج میں بھگدڑ کے سبب نڈھال ہوجاتی۔ ان کی مشکلات اتنی زبردست تھیں کہ دولت کی کمی کے سبب ان کی فوج موسم گرما کے بادلوں کی طرح بکھر گئی۔ یہاں تک کہ ان کو اپنے گھوڑے بھی مغلوں کے ہاتھ بیچنے پڑے۔

یہ بات واقعتاً تعجب خیز ہے کہ اورنگ زیب نے استرخانیوں کی مصیبت زدہ حالت سے کیوں فائدہ نہ اٹھایا اور فوراً ہی دوسرا حملہ کیوں نہ کیا جس کی کامیابی کے امکانات بہت روشن تھے۔

شاید اس کا سبب یہ ہو کہ اورنگ زیب نے یہ محسوس کیا کہ اس کے ساتھی اس قدر پست حوصلہ ہو گئے تھے اور ان کو وطن کی یاد اتنا ستا رہی تھی کہ ان کو مزید اس غیر مہمان نواز ملک میں ٹھہرنے کے لیے آمادہ نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ ایشیائے مرکزی میں قحط سالی کے سبب بخارا کے باہر طولانی فوجی مہم مشکل ثابت ہوتی اور سمرقند پہنچنا مشکل ہو جاتا۔ یہ بات ماننا مشکل ہے کہ ماوراالنہر کے لوگ باغی ہو گئے تھے اور وہ چغتائیوں کو اپنے اوپر غلبہ کرنے کی اجازت نہ دیتے۔

اس میں شک نہیں کہ ایشیائے مرکزی کی آبادی کا بڑا حصہ استرخانیوں سے آباد تھا۔ اور یہ لوگ مختلف قبائل کا ایک مجموعہ تھے جو اکثر و بیشتر مل جل کر ایشیائے مرکزی کے لوگوں پر صرف دو نسل پہلے تک اپنا اقتدار جمانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ تیمور کے وارثوں کو ایشیائے مرکزی کے عوام کی ہمدردیاں حاصل رہیں اور اس بات کا امکان تھا کہ بخارا اور سمرقند کی فتح کے علاوہ مغلوں کی سخاوت اور مال و دولت نے یہ اثر کیا ہو کہ اس علاقے کے عوام نیم وحشی گنوار اور بد اخلاق قبائلی حکمرانوں پر چغتائیوں کو ترجیح دینے لگے ہوں۔

ازبک اپنے آپ کو مکمل بربادی سے بچانے کی خاطر مغلوں سے صلح کرنے کے خواہشمند تھے۔ عبدالعزیز نے اورنگ زیب سے درخواست کی کہ بخارا اس کے چھوٹے بھائی سبحان قلی خاں کو دے دیا جائے ادھر نذر محمد نے بھی صلح کی درخواست کی اور بلخ و بدخشاں کے علاقے واپس مانگے۔ اتفاق سے شاہجہاں بھی اس قسم کی درخواست پر غور کرنے پر آمادہ معلوم ہوتا تھا۔

شاہجہاں کی افغانستان میں متعدد بار آمد اور طویل عرصے تک قیام اور فوجی کارروائیاں جو ایک بڑی جنگ کی شکل اختیار کر گئی تھیں اور جس کے سبب ازبکوں کی

مغل فوج کو زک اٹھانی پڑی۔ ایرانی دربار کے لیے زبردست تشویش کا باعث بن گئیں۔ شاہِ ایران جو کہ نذر محمد کا حامی تھا اور قندھار پر حملہ کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا ایشیا سے مرکزی میں مغل اقتدار کا استحکام بالکل پسند نہ آیا۔ ان کے علاوہ سب سے زیادہ پریشان کن مسئلہ تو آدمیوں کے لیے غذا اور مویشیوں کے لیے چارا حاصل کرنے کا تھا کیونکہ لڑائی کے سبب اراضیات اُجڑ چکی تھیں اور مرکزی ایشیا کے ان علاقوں کی جو مغلوں کی دسترس میں تھے۔ زرعی و اقتصادی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ حالانکہ ازبک میدانی لڑائیوں میں ہار چکے تھے تاہم خانہ بدوش قبائلی دستے ابھی تک گوریلا جنگ لڑ رہے تھے جس کے سبب رسد کا مہیا کرنا اور بھی مشکل ہو گیا۔ قبائلی لیٹروں کی ٹولیوں کو سرنگوں کرنے اور مفتوحہ علاقوں پر قبضہ جمانے کا کام دیرطلب اور وسیع انتظامی کارروائیوں کے ذریعے ہی انجام پا سکتا تھا۔

شہزادہ اورنگ زیب نے گزارش بھیجی کہ مغل فوج کے افسر اور سپاہی گھبرا چکے ہیں اور جوں جوں موسم سرما قریب آتا جا رہا ہے ان کی بے قراری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے شاہجہاں نے نذر محمد کی درخواست کو قبول کر لیا اور یہ حکم دیا کہ وہ خود اظہارِ اطاعت کے لیے حاضر ہو۔ نذر محمد اپنے لڑکوں کے ہاتھوں نقصان اٹھا چکا تھا اور مغلوں سے بھی خوف زدہ تھا لہذا کسی نہ کسی بہانے وہ خود تو نہ گیا البتہ اپنے ایک پوتے قاسم سلطان کو کفش قلماق کے ساتھ روانہ کر دیا۔

عام حالات میں اس رویے پر اعتراض کیا جا سکتا تھا لیکن شہزادے کو یہ مشورہ دیا گیا کہ وہ نذر محمد کی اطاعت کے اس بالواسطہ طریقے کو قبول کر لے کیوں کہ موسم سرما کی برف کابل کا راستہ بند کر دے گی۔ اور فوجی نقل و حرکت ناممکن ہو جائے گی۔ لہذا شہزادہ نے شہنشاہ کی ہدایات کا مزید انتظار کیے بغیر بلخ قاسم خان کو سونپ دیا اور خود اکتوبر 1647ء میں کابل کے لیے روانہ ہو گیا۔

بلخ کی جنگ میں شاہجہاں کے چار کروڑ روپے خرچ ہوئے۔ یہ رقم دہلی اور آگرہ کی ایک سال کی آمدنی سے کچھ کم تھی اور اس مہم میں پانچ ہزار جانیں تلف ہوئیں۔ اس کے مقابلے میں ازبک تو مالی طور پر بالکل برباد ہو گئے۔ دریائے آمو کے جنوب کا علاقہ ویران

ہوگیا اور اُن کے چھ ہزار آدمی کام آئے ۔ حالانکہ اس لڑائی سے مغل سلطنت میں کسی نئے علاقے کا اضافہ نہ ہوا تاہم ازبکوں کو ایک ناخوشگوار تجربہ ہوا اور ان کی روایتی غلط فہمی کہ وہ بحیثیت سپاہی کے مغلوں سے بہتر ہیں خاک میں مل گئی اور اسی کے ساتھ ساتھ مغلوں کے ہتھیاروں کی افادیت اور ان کے نظم و نسق اور رہنمائی کی لیاقت کا سکہ اُن کے دلوں پر جم گیا۔

مغل شہنشاہ کو اس بات کا پورا احساس ہوگیا کہ حالانکہ اُس میں اتنی طاقت ہے کہ وہ سلطنت کی سرحدوں کو محفوظ رکھ سکے تاہم ان سرحدوں کی مزید توسیع خطرناک سیاسی فوجی اور انتظامی پیچیدگیوں سے خالی نہ ہوگی ۔ گذشتہ زمانے میں ہندوستان کے کسی بھی حکمراں نے ملک کی اس طول طویل تاریخ میں ایشیائے مرکزی پر فوجی مہم کی ہمت نہ کی تھی اور اس کام کو شاہجہاں نے ہی پہلی اور آخری دفعہ انجام دیا۔

جہانگیر کے زمانے میں شاہجہاں کی بغاوت قندھار کے ہاتھ سے نکل جانے کا سب سے بڑا سبب بنی لیکن جب اُس کے کاندھوں پر شاہی ذمے داریوں کا بوجھ آن پڑا تو اُس نے بھی قندھار کو واپس لینے کے لیے اسی قدر اشتیاق کا اظہار کیا جتنا کہ اُس کے اسلاف نے کیا تھا۔ شاہجہاں نے اُس کے باوجود کہ شاہ ایران کے ساتھ دوستانہ خط و کتابت و سفارتوں کا تبادلہ ہوچکا تھا کابل کے گورنر قلیچ خاں کو حکم دیا کہ وہ قندھار کے واپس لینے کے لیے کسی بھی مناسب موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دے اور اس مقصد کے حصول کے لیے علی مردان خاں سے جو ایران کی طرف سے حکومت کررہا تھا بات چیت شروع کردے۔ علی مردان کو ایرانی دربار میں اس بات کی وضاحت کے لیے طلب کیا گیا کہ اس کے علاقے کی مال گزاری طویل عرصے سے کیوں شاہی خزانے میں جمع نہیں کی گئی۔ علی مردان نے کیوں کہ حاضری کے حکم کی فرماں برداری نہیں کی لہٰذا اس کو حکم دیا گیا کہ وہ گورنری سیاوش کے حوالے کردے۔ ادھر سیاوش کو ایک بڑی فوج کے ساتھ شاہی حکم کے نفاذ کے لیے روانہ کردیا گیا۔ علی مردان نے شاہ ایران کے خوف سے مغلوں کی تجویز مان لی اور فروری 1638ء میں قندھار مغلوں کے سپرد کردیا۔ شاہجہاں نے

اس کو شش ہزاری منصب عطا کر کے کشمیر کا گورنر بنا دیا۔ کابل کے گورنر قلیچ خان نے بھی بڑی مستعدی دکھائی۔ سید خان اور جگت سنگھ کی سرکردگی میں مغل فوج نے ایرانیوں کو مار بھگایا اور قندھار، بُست اور زمینداور کے علاقے جو شاہ ایران نے فتح کر لیے تھے۔ از سر نو مغل سلطنت میں شامل کر لیے گئے۔ شہزادہ شجاع کو کابل بھیجا گیا اور ایک بڑی فوج اس لیے روانہ کی گئی کہ اگر ایرانی حملہ کریں تو قندھار کو بچایا جا سکے۔

ایرانی قندھار کو اس آسانی سے چھوڑنے والے نہ تھے۔ شاہ ایران نے شاہجہاں کو واضح الفاظ میں لکھ دیا کہ وہ قندھار کو کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ 1638ء میں ایک ایرانی فوج نے قندھار پر حملہ کیا اور بُست کے نزدیک خانشی کا قلعہ فتح کر لیا لیکن شاہ صفی ترکوں کے خلاف جنگ اور مغربی محاذ کی پریشانیوں کی موجودگی میں اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکا کہ اس نے خراسان میں ایک بڑی فوج جمع کر لی۔

1642ء میں صفی فوت ہو گیا۔ گیارہ سالہ عباس دوم اس کا جانشین ہوا۔ اس وقت انتظام مملکت پریشان حالی کا شکار تھا۔ 1648ء میں شاہ عباس دوم نے جو اب سترہ سالہ اولوالعزم جوان ہو گیا تھا فتح قندھار کا کام پورے جوش و خروش کے ساتھ بڑے وسیع پیمانے پر شروع کر دیا۔ حالانکہ اس نے ہرات کا راستہ بند کر دیا تھا تاہم شاہجہاں کو ان تیاریوں کا پتہ چل گیا۔

چنانچہ شاہجہاں نے مختلف جگہوں سے فوجی سالاروں کو بلا بھیجا اور خود اس بات کی تیاری شروع کر دی کہ اپنے دربار کو زیادہ سے زیادہ اگلے موسم بہار تک کابل منتقل کر دے۔ ادھر کابل کے گورنر نے قندھار کے قلعے کے استحکام کی خاطر پانچ ہزار سپاہی اور پانچ لاکھ روپیہ بھیج کر ضروری اقدامات شروع کر دیے۔

پہلے تو شاہ ایران نے قندھار کو اپنے تدبر سے اور بہلا پھسلا کر حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن جب اس میں کامیابی نصیب نہیں ہوئی تو پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب قندھار کو بزور فتح کرے۔ ایرانی حکومت نے ہوشیاری سے کام لے کر اس بات کا پتہ چلا لیا کہ مغل شہنشاہ اور اس کے درباری کچھ تو سردی سے ڈر کر اور کچھ اس خیال سے

کہ ایرانی موسم سرما میں حملہ نہ کریں گے اپنے کابل جانے کے پروگرام کو اگلے موسم بہار تک ملتوی کر دیا تھا۔ چنانچہ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ فوراً اقدام کیا جائے۔ لہٰذا ۱۶ دسمبر ۱۶۴۸ء کو قلعہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ ایرانی حملہ آوروں نے ساتھ ہی ساتھ بُست اور زمینداور پر حملہ کر دیا۔ مغل گورنر نے حیرت انگیز غفلت یا یوں کہا جائے کہ دفاعی مسائل سے ناواقفیت کے باعث اپنی بہترین فوج کو ارگ میں روک لیا اور ایرانیوں کو ان دو برجوں اور ان جگہوں پر قبضہ کر لینے دیا جو خاص طور سے دفاع کی غرض سے بنائے گئے تھے اور جہاں سے کہ شہر کے اوپر کامیابی کے ساتھ گولہ باری کی جا سکتی تھی۔ تاہم مغلوں نے ڈیڑھ مہینے تک مدد کی امید میں قلعے کو دشمن کے ہاتھ سے بچائے رکھا۔

اسی دوران میں ایرانیوں نے سپاہیوں کو رشوت دی اور بعض شرارتیوں نے جن کے سرغنہ شادی خان اور قچاق خان تھے سپاہیوں کو ورغلایا کہ مغل گورنر کا ساتھ چھوڑ کر ایرانیوں کے ساتھ بات چیت شروع کر دیں جس کے سبب مغل سپاہیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔

دولت خاں نے زبردست غلطی یہ کی کہ باغیوں کو سزا دینے کی بجائے اُن کے ساتھ بحث کرنا چاہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باغی اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب ایرانیوں نے بُست بھی فتح کر لیا تو مغلوں کے حوصلے پست ہو گئے اور شاہِ ایران نے دولت خاں کو بھی ڈرا کر تسلیم ہونے پر مجبور کر دیا اور اس کو دھمکی دی گئی کہ اگر اُس نے زیادہ عرصے تک مقاومت کی تو بُرے نتائج کا وہ خود ذمے دار ہو گا۔ مغل فوجوں کی کافی تعداد ایرانیوں سے جا ملی۔ آخرکار دولت خان نے ۱۱ فروری ۱۶۴۹ء کو اپنی جان و زندگی کی امان پا کر قلعہ ایرانیوں کو سونپ دیا۔

دولت خاں خوف و پریشانی کی حالت میں اس بات کو بھول بیٹھا کہ مغل فوج فرار کے باوجود اتنی کمزور نہ ہوئی تھی جتنا کہ وہ سمجھتا تھا۔ ادھر ایرانیوں کے بھی بہت سے آدمی مارے گئے تھے اور سامان رسد ختم ہوتا جا رہا تھا لیکن قوت فیصلہ کی کمزوری، قوت عمل کی کمی، فوجی حالت کو سمجھنے کی عدم لیاقت اور سب سے زیادہ اس کی بزدلی

اور کم ظرفی قندھار کے اور بالواسطہ زمینداور کے ہاتھ سے نکل جانے کا سبب بنیں۔
قندھار کے محاصرہ کے ایک ماہ بعد جنوری کے مہینے میں شاہجہاں کو اس واقعے کا علم ہوا۔ اس نے فوراً سعد اللہ وزیر اعظم اور شہزادہ اورنگ زیب کو پچاس ہزار سواروں کے ساتھ بالترتیب لاہور و ملتان سے مشترکہ حملے کے لیے روانہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد شہنشاہ نے خود اپنا کیمپ لاہور سے کابل منتقل کر دیا۔ فوجیں مئی کے دوسرے ہفتے میں قندھار پہنچ گئیں اور اس کا محاصرہ کر لیا لیکن یہ محاصرہ توپوں کی غیر موجودگی کے سبب کچھ زیادہ مؤثر ثابت ہوا۔ ساڑھے تین مہینے بعد رسد کی کمی، موسم سرما کی آمد کے خوف اور ایرانی کمک کے پہنچنے کے سبب اُن کو مجبوراً واپس ہونا پڑا۔
شاہ ایران ہرات میں بیٹھا مغلوں کی پیش قدمی کو دیکھ رہا تھا۔ حالانکہ مغلوں کی قندھار کو فتح کرنے کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ تاہم انھوں نے میدانی جنگ میں اپنی برتری ثابت کر دی۔ رستم خاں اور قلیچ خاں نے شاہ میر کے مقام پر ایرانی فوج کا جو مرتضیٰ قلی کی سرکردگی میں تھی مقابلہ کیا۔
ایرانی فوج مغل فوج سے تعداد میں دوگنی تھی اور ان کے سالار نے یہ قسم کھا رکھی تھی کہ جب تک وہ اپنے دشمنوں کو ہرا نہ دے گا روزہ نہ کھولے گا۔ ایرانیوں نے مغل فوج پر پیچھے اور دائیں بائیں تینوں طرف سے حملہ کیا تاہم مغلوں کو ہرا نہ سکے۔ وہ حملے میں ناکام ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے جس کے نتیجے میں ان کی کچھ توپیں اور بندوقیں مغلوں کے ہاتھ آ گئیں۔ شاہ میر کی جنگ مغل سلطنت کی فوجی تاریخ میں ایک شاندار کارنامے کی حیثیت رکھتی ہے۔
بلخ اور قندھار کی لڑائیوں کے بوجھ کے سبب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ کچھ مہلت ملے اور پھر سے تیاری کی جائے۔ 1652ء میں شاہجہاں نے ایک مرتبہ پھر سعد اللہ خاں کو پچاس ہزار سوار، دس ہزار بندوقچی، آٹھ بھاری اور بیس ہلکی توپیں دے کر کابل و غزنی کے راستے سے روانہ کیا۔ ادھر اورنگ زیب ملتان کے راستے قندھار روانہ ہوا۔ جنگ فوراً شروع ہو گئی لیکن قندھار کا قلعہ اب خوب مضبوط ہو چکا تھا۔ اس میں کافی مقدار میں رسد اور دوسرا ضروری سامان موجود تھا اور قلعے کے محافظ پوری طرح چوکنے ہو چکے تھے

محاصر فوج نے قلعے کی دیوار میں سوراخ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن توپوں نے کام نہ دیا۔ آٹھ توپوں میں بال پڑ گئے۔ دوسری توپوں سے صحیح طور پر کام نہ لیا جا سکا۔ اور گولہ بارود و رسد کم ہو گئی۔ علاوہ ازیں مغلوں کی حالت اس وجہ سے اور بھی نازک ہوتی جا رہی تھی کہ غزنی کے قریب ازبکوں اور آلامانوں کی ایک بڑی فوج دشمنانہ سرگرمیوں میں مشغول تھی اور اس بات کا خوف پیدا ہو گیا تھا کہ وہ مغلوں کے رسل و رسائل کا سلسلہ منقطع کر دے گی۔ دو مہینے آٹھ دن کی ناکام کوشش کے بعد مغل فوج کو ایک مرتبہ پھر قندھار سے مایوس لوٹنا پڑا۔ شاہجہاں خشمناک ہو گیا اور اس نے اورنگ زیب کو دکن منتقل کر دیا۔

شاہجہاں کے سب سے بڑے بیٹے پرنس دارا نے فوجی مہم کی مشکلات کا اندازہ کیے بغیر قندھار فتح کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ چنانچہ شہنشاہ نے کابل اور ملتان کے صوبے اس کو منتقل کر دیے۔ اور اس کو قندھار کی تیسری مہم کا سالار نامزد کر دیا گیا۔ دارا نے تین مہینے تک اپنی بہترین استعداد صرف کر کے وسیع پیمانے پر تیاریاں کیں۔ گولہ بارود کی بڑی مقدار جمع کی گئی اور غلے کے سوداگروں کو دل کھول کر کھانے کے سامان کی متواتر فراہمی کے ٹھیکے دیے گئے۔ اس بات کی کوشش بھی کی گئی کہ عمدہ قسم کی توپیں حاصل کی جائیں۔

اب دارا ملتان کے راستے روانہ ہوا کیوں کہ اس راستے پر خوراک اور چارہ کافی مقدار میں دستیاب ہو سکتا تھا۔ 28 اپریل 1653ء کو شہزادہ ستر ہزار سپاہی، سات بڑی اور 47 مختلف دھاتوں کی ہلکی توپوں کے ہمراہ قندھار پہنچا۔

شہنشاہ کے مجوزہ منصوبہ کے مطابق قندھار کا زبردست محاصرہ کیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے قلعوں پر بھی دباؤ ڈالا گیا۔ امید یہ تھی کہ بُست اور زمینداور کے قلعوں کے فتح ہو جانے پر قندھار کی فوج کے حوصلے پست ہو جائیں گے اور وہ تسلیم ہو جائے گا۔ رستم خاں نے بہادری کا مظاہرہ کر کے بُست اور گرشک کے قلعے فتح کر لیے لیکن ان فتوحات نے قندھار کے مدافعین پر مغل توپ خانے کی طرح ہی بہت کم اثر ڈالا۔ ایرانیوں نے غیر معمولی جرات اور ہمت کا ثبوت دیا اور محاصرین کی اس کوشش کو کہ وہ مخالفین کی قوت کو اپنی طاقت یا انعام کے وعدوں سے کمزور کر دیں ناکام بنا دیا۔ محاصرہ پانچ مہینے اور چلتا رہا اور محض اُس وقت

اُٹھایا گیا جب بارود یا توپ کا ایک گولہ بھی باقی نہ بچا۔ چارا مفقود ہو گیا اور سپاہی زبردست سردی اور فاقہ کشی کے سبب بڑی تعداد میں مرنے لگے۔ مغل فوج اپنی کوشش میں ناکام ہو کر ملتان کی طرف واپس ہوئی اور راستے میں اس کو اپنے عقب میں ایرانیوں اور افغانیوں کے حملوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔

قندھار کو فتح کرنے کی مغلوں کی ساری کوششیں ناکام رہیں حقیقت تو یہ ہے کہ قندھار کے قلعے کو نہ تو ایرانیوں نے اور نہ ہی مغلوں نے لڑکر فتح کیا۔ قندھار کا قلعہ ناقابلِ تسخیر تصور کیا جاتا تھا۔ مغلوں کا توپ خانہ قلعہ کی فتح کے لیے ناکافی تھا۔ مزید برآں موسم کی سختی بھی اس مہم کو زیادہ عرصے تک جاری رکھنے میں مانع ہوئی۔ پانچ مہینے سے زیادہ تک رُکنا ممکن نہ تھا۔ اب قندھار ہمیشہ کے لیے مغلوں کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ جب شاہجہاں کی فتح قندھار کی آخری کوشش بھی ناکام ہو گئی تب اس کو اس بات کا احساس ہوا کہ اس نے اپنے باپ کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا تھا وہ سخت ناقابلِ افسوس تھا۔

قندھار کی فتح کی کوششوں میں تقریباً گیارہ کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔ اس کے علاوہ شاہجہاں کو اس بات کا بھی اندازہ ہو گیا کہ مغربی علاقے میں فوجی مہمات اور فتوحات کا شوق کس قدر مشکل اور تکلیف دہ ہے۔ ادھر ایرانی اگرخود کو قندھار کے دفاع اور اپنے عمدہ توپ خانے پر جو شاہ عباس نے بڑے مؤثر طریقے سے یوروپین ماہرین کی نگرانی میں عثمانیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا تھا خود کو مبارک باد دے سکتے تھے تو ان کو اس بات کا بھی احساس ہو گیا ہو گا کہ شمال میں ان کی ملک گیری کی آرزوئیں قندھار سے آگے پوری نہیں ہو سکتی تھیں اور اگر وہ کھلے میدان میں مغلوں سے زور آزمائی کرتے تو ان کو یقیناً ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔

جنگ دکن کا تیسرا مرحلہ

بلخ اور قندھار کی سرحدی جنگوں کے سبب شاہی وقار اور خزانے پر جو

دباؤ پڑا اُس نے اِس بات کو لازمی قرار دیا کہ مال گزاری کی وصولیابی میں سختی برتی جائے اور اگر ممکن ہوسکے تو آمدنی کے دوسرے ذرائع بھی تلاش کیے جائیں۔ شمالی ہند میں اب سوائے مرکزی صوبوں (مدھیہ پردیش) کے پچھڑے ہوئے اور دست ناخوردہ وسیع علاقوں کے کوئی اور جگہ فتح کرنے سے باقی نہ رہی تھی۔ لیکن اُس علاقے کی خام تہذیب اور ختم نہ ہونے والے جنگلات نے یہاں کے قدرتی وسائل کے مناسب استعمال میں رکاوٹ ڈال رکھی تھی۔

دیوگڑھ، چندا اور مانڈلا کی ریاستیں بھی مال دار نہ کہی جاسکتی تھیں۔ ان سب میں دیوگڑھ کی ریاست ترقی یافتہ تھی۔ یہاں کا راجا مغلیہ سلطنت کا حامی تھا لیکن کچھ عرصے سے وقت پر خراج ادا نہ کرسکا تھا۔

1656ء میں شہنشاہ نے اورنگ زیب کو شدید اقدامات کا حکم دیا۔ راجا کے خلاف مہم بھیجی گئی اور اُس کو اس بات کے لیے مجبور کردیا کہ بقیہ خراج کا کچھ حصہ فوراً ادا کرے اور آئندہ خراج وقت پر دیا کرے۔

دکن ایسا منطقہ تھا جس کو شمالی ہند والے سونے اور جواہرات کی کان سمجھتے تھے چنانچہ یہ قدرتی بات تھی کہ مغل حکومت مالی پریشانی کے وقت دکن کی طرف رُخ کرے۔ شاہجہاں نے دکن کے وائسرائے، اورنگ زیب پر دباؤ ڈالا کہ مفتوحہ علاقوں میں مالگذاری کے منابع بڑھائے۔ اس ملک سے وہاں کے انتظام کے اخراجات وصول کرے اور اگر ہوسکے تو کچھ رقم شاہی خزانے کے لیے بھی بھیجے۔ لیکن شہزادے سے جو خود بھی بے حد ضرورت مند تھا اُس بات کی مشکل ہی سے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ مرکزی خزانے کے لیے روپیہ روانہ کرے گا۔

دکن کے حالات کے سدھار، وہاں کی مال گذاری کی از سرِ نو تنظیم اور ایک مضبوط سرحدی فوج کی برقراری کے اخراجات نے شہزادے کے وسائل کو بڑی حد تک زیربار کیا یہاں تک کہ ان وجوہات کے باعث شہنشاہ اور شہزادے کے درمیان غلط فہمی بھی پیدا ہوگئی۔

اورنگ زیب کی خوش قسمتی سے اس کی خدمت میں مرشد قلی خاں خراسانی جیسا افسر موجود تھا۔ مرشد قلی علی مردان خاں کے ساتھ قندھار سے مغلوں کی خدمت میں پہنچا تھا۔ مرشد نے پنجاب میں بڑی امتیازی خدمات انجام دیں اور پھر بالاگھاٹ اور اس کے بعد پایان گھاٹ کے دکنی مغل علاقوں میں دیوانی کی خدمات انجام دیں۔ اُس کی لیاقت، تجربہ اور جوشِ عمل نے اس کو اس لائق بنا دیا تھا کہ وہ دکن کی از سرِ نو آبادکاری کا کام اپنے ذمے لے لے۔

دکن میں جلد جلد ہونے والی طویل لڑائیوں کے باعث وہاں کی سماجی اور زرعی معیشت بُری طرح برباد ہو چکی تھی۔ کسان اپنا گھر بار چھوڑ کر فرار ہو چکے تھے اور گاؤں ویران اور زمینیں غیر آباد پڑی تھیں۔ ان لڑائیوں کے نتیجے میں بہت ہی خطرناک قسم کا قحط پھوٹ پڑا اور اس طرح حالات اور بھی نازک ہو گئے۔

مرشد قلی نے اپنی پوری کوشش دیہاتی اور معاشی زندگی کی تعمیرِ نو کے لیے وقف کر دی اس کام میں جس قدر مرشد قلی کے انسانی جذبات کو دخل تھا اسی قدر اس جذبے کو بھی کہ وہ صوبے اور سلطنت کے لیے ایسی خدمات انجام دے جو ہمیشہ بطور یادگار باقی رہیں۔ وہ زمینوں کی پیمایش اور مالگذاری کی رقم مقرر کرنے کے کام کی سخت نگرانی کرتا اور ضرورت کے وقت اس بات سے بھی نہ کتراتا کہ پیمایش کی زنجیر یا رسّی کو اپنے ہاتھ میں لے کر خود پیمایش کرے۔ اس کا نام دکن میں ایک ایسے مال گذاری سسٹم کے ایجاد کرنے کے سبب مشہور ہو گیا جس میں کافی مستعدی، تعاون، ہمدردی اور سوجھ بوجھ پائی جاتی تھی۔ اور اُس کا نام بھی اتنا ہی مشہور ہوا جتنا کہ ٹوڈرمل کا شمالی ہند میں۔ مرشد قلی کے اس طریقۂ کار کو ذرعِ مرشد قلی خاں کہا جاتا ہے۔

مرشد قلی خاں نے جو مال گذاری کا طریقہ ایجاد کیا اس کے بنیادی اصول ٹوڈرمل اور ملک عنبر کے طریقۂ کار سے ماخوذ تھے۔ سرکاری عاملوں کے ذریعہ آراضیات کی پیمایش کا کام انجام دیا گیا۔ زمین کو تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا۔ میدانی علاقہ، پہاڑی علاقہ اور گھاٹیاں اور ندی نالے۔ ان آراضیات کو زمین کی قسم اور پیداوار کی بنیاد پر مزید تقسیم کیا گیا۔

مال گذاری کے تقرر کے تین طریقے مقرر کیے گئے۔ پہلا تو وہی پرانا طریقہ تھا جس کے مطابق ہلوں اور بار برداری کے جانوروں کی تعداد پر مال گذاری عاید کی جاتی۔ اس کو تشخیص سرلستہ کہتے تھے۔

دوسرا طریقہ پیداوار کی تقسیم کا مشہور طریقہ تھا جس کو باٹ یا بٹائی کہتے تھے۔ تیسرا طریقہ یہ تھا کہ مال گذاری زمین کی پیمایش کے مطابق لگائی جاتی اس کو جریب کہتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے طریقے میں کوئی مداخلت نہیں کی گئی۔ عام طور پر حکومت کا حصہ چاہی زمینوں میں ثلث اور بارانی زمینوں میں نصف ہوتا تھا۔ غلے کی فصل کو چھوڑ کر دوسری پیداواروں کے لیے مثلاً انگور، گنا، کیلے، لوبیا، سبزی، ترکاری وغیرہ میں حکومت کا مطالبہ $\frac{1}{9}$ سے لے کر $\frac{1}{4}$ تک ہوتا اور اس میں وقت، اخراجات، مزدوری اور ایسی دوسری سہولتوں کا خیال رکھا جاتا جن کا ذکر اسلامی قانون میں مال گذاری کے سلسلے میں کیا گیا ہے۔ اُن علاقوں سے جہاں پر کہ جریب کا سلسلہ رائج تھا حکومت $\frac{1}{4}$ فی بیگھہ وصول کرتی۔ اس پیداوار میں حکومت کا جو حصہ ہوتا اُس کو بازار بھاؤ سے نقد روپے کی شکل میں وصول کیا جاتا۔

زراعت کو ترقی دینے کے لیے کاشت کاروں کو مویشی اور کاشت کاری کی دوسری ضروری چیزوں کو خریدنے کے لیے حکومت تقاوی یعنی پیشگی رقم دیتی۔ تقاوی کی رقم فصل پر قسطوں میں وصول کی جاتی۔ جس گاؤں میں کوئی مناسب مکھیا نہ ہوتا وہاں پر مکھیا مقرر کیا جاتا۔ مرشد قلی خاں کی مستعدانہ زرعی اصلاحات کے نتیجے میں کاشت کاری کو ترقی ہوئی اور رعیت و صوبے کی آمدنی میں کافی اضافہ ہوا۔

آمدنی کا دوسرا اہم ذریعہ گولکنڈہ کی دکنی ریاست سے خراج کی وصول یابی تھی۔ بیجاپور تو ایک معاہدے کے ذریعے سالانہ خراج دینے سے مستثنیٰ تھا لیکن گولکنڈہ نے دو لاکھ ہن دینے کا وعدہ کیا تھا جو اُس زمانے کے مروجہ حساب کے مطابق آٹھ لاکھ چاندی کے روپیے کے برابر ہوتا۔ حالانکہ گولکنڈہ کی ریاست مال دار اور ثروت مند تھی تاہم وہاں کے حاکم نے اُس زمانے کے سرداروں اور نوابوں کی پیروی کرتے ہوئے خراج کی

رقم وقت پر ادا نہ کی اور اس طرح خراج کی رقم بڑھتی رہی۔ اُس کے علاوہ اس نے شاہی حکومت کے متواتر تقاضوں پر دھیان نہ دیا۔ اس دوران ہن کی قیمت چار روپیہ سے بڑھ کر پانچ روپیہ ہوگئی۔ مغلوں نے تقاضا کیا کہ ساری بقایا رقم کو موجودہ حساب یعنی پانچ روپیہ فی ہن کے حساب سے ادا کیا جائے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ گولکنڈہ کی ریاست کو بیس لاکھ روپیہ اضافہ ادا کرنے ہوں گے۔ لہٰذا صورت حال یہ ہوئی کہ ایک طرف تو مغلوں نے اپنے مطالبے کو بڑھادیا اور دوسری طرف گولکنڈہ خراج کی ادائگی میں تاخیر کرتا رہا۔

بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں نے ادھر تو اپنے قرضے کی ادائیگی میں جان بوجھ کر تاخیر کی اور دوسری طرف وہ کرناٹک پر بتدریج اپنا قبضہ جماتے جارہے تھے۔ کرناٹک کے ہندو راجا نے مغل شہنشاہ سے مدد کی درخواست کی اور وہ اس کے بدلے میں پچاس لاکھ ہن دینے کے لیے تیار ہوگیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام قبول کرنے پر بھی آمادہ تھا۔ اورنگ زیب کا یہ رویہ کہ راجا کی یقیناً مدد کی جائے بالکل درست تھا۔ کیوں کہ راجا کی شرائط کے علاوہ اس سودے میں واضح سیاسی اور فوجی مفاد پوشیدہ تھے۔

دکنی ریاستوں کا کرناٹک میں بڑھ آنا اس بات کی دلیل تھی کہ وہ ریاستیں اپنی طاقت بڑھا رہی تھیں۔ اور اس طرح مرہٹوں کی طاقت مضبوط ہوتی جارہی تھی لیکن اس بات سے مغلوں کو کوئی فائدہ نہ تھا۔ کرناٹک سے دوستی کرکے جنوب میں ایک دوست ریاست کے قیام سے نہ صرف مرہٹوں اور دکنی ریاستوں کی توسیع رک جاتی بلکہ اس طرح مغلوں کے لیے جنوب کے دور دراز علاقوں میں ایک طرح سے مستقل فوجی اور سیاسی چھاؤنیاں قائم ہو جاتیں جس کے نتیجے میں بیجاپور اور گولکنڈہ پر اُس کی گرفت اور مضبوط ہوسکتی تھی۔ شاہجہاں نے راجا کے مذہب بدلنے پر زیادہ توجہ نہ دی البتہ وہ اورنگ زیب کی تجویز کو قبول کرنے پر آمادہ تھا۔ دراصل اُس نے دکن کی ریاستوں سے یہ کہہ دیا تھا کہ وہ کرناٹک سے دستبردار ہو جائیں۔ تاہم شاہجہاں یہ چاہتا تھا کہ استرخانیوں اور ایرانیوں سے جنگ کے بعد جس کے سبب مغلیہ سلطنت کو بڑا مالی نقصان اُٹھانا پڑا۔ اب وہ کسی اور بڑی جنگ میں اس قدر جلد ملوث نہ ہو جائے۔ لیکن دکنی ریاستوں نے ایک طرف تو

کرناٹک کی فتح کو مکمل کرنے کے لیے تیزی سے قدم اٹھانے شروع کیے اور دوسری طرف شہنشاہ کو بھاری بھرکم تحفے تحائف دیتے رہے۔ سارا قیمتی وقت مسئلے کی جانچ پڑتال اور تحقیقات میں ضائع ہوگیا اور کرناٹک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور راجا کی کوئی اہمیت باقی نہ رہی۔

یہ بات بھی ممکن ہے کہ اورنگ زیب اور دارا نے مسئلہ کرناٹک کو اپنے اپنے زاویۂ نظر سے دیکھا ہو۔ درآنحالیکہ اورنگ زیب مستقبل میں ممکن الوقوع حوادث کے پیش نظر دکنی ریاستوں پر رکاوٹیں عاید کرنا چاہتا تھا۔

دارا اس بات کا خواہش مند تھا کہ دکنی ریاستیں اور زیادہ مضبوط ہوں تاکہ وہ اورنگ زیب کی پیش قدمی کو روک سکیں لیکن شہنشاہ کا مطمع نظر شہزادوں کے نقطۂ نظر سے بالکل علیحدہ تھا لہٰذا جب کرناٹک کی تقسیم نے حقیقت کی صورت اختیار کر لی تو اس نے اس مسئلے کو نظر انداز کر دیا۔

بہرحال اس بات کی کوئی وجہ نہ تھی کہ دکن کی ریاستیں اپنے قرضے چاہے وہ تحفے تحائف کی شکل میں ہوں یا خراج کی صورت میں ادا نہ کرتیں لہٰذا شاہجہاں نے اورنگ زیب کو مشورہ دیا کہ ان رقوم کی وصولیابی کے لیے ضروری قدم اٹھائے لیکن ابھی تک اس کے دماغ میں جنگ کا خیال نہ آیا تھا۔ شہزادے نے حکم کے مطابق سختی سے باقی ماندہ خراج اور تحفوں کی ادائیگی کا مطالبہ کیا۔

گولکنڈہ اور بیجاپور کے حکمرانوں کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ مرکزی حکومت سے بطور مستقیم خط و کتابت کر سکتے تھے۔ دراصل ان کو نیم آزاد حکومت تصور کیا جاتا تھا۔ اورنگ زیب کو بحیثیت دکن کے گورنر ہونے کے یہ بات پسند نہ تھی کیوں کہ کئی دفعہ ایسا ہوتا کہ ریاستوں اور شاہی حکومت کے درمیان جو کچھ واقع ہوتا اس کی اس کو خبر نہ ہو پاتی۔ اورنگ زیب نے اس بات کی طرف شہنشاہ کی توجہ بھی مبذول کرائی لیکن شہنشاہ نے اس کی دلیل کو قبول نہ کیا۔

گولکنڈہ کے حاکم نے شہزادے سے چشم پوشی کر کے مرکزی حکومت کو طول طویل

درخواستیں بھیجنے کی سیاست جاری رکھی تاکہ اس طرح خراج کی ادائیگی میں تاخیر ہوتی رہے۔ بظاہر وہ اپنے ارادوں میں سچا نہ تھا اس نے نہ صرف یہ کہ 1636ء کے معاہدے کی بعض شرطوں کو پورا نہ کیا بلکہ کئی شرطوں کو توڑ بھی دیا۔

شاہ عباس ثانی بادشاہِ ایران کی کامیابیوں نے اس کو شاہِ ایران کی اس تجویز پر دوبارہ توجہ دینے کی ترغیب دی کہ وہ مغل شہنشاہ کی زوال پذیر طاقت پر بھروسہ نہ کرے بلکہ ایران کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو مضبوط بنائے۔ ممکن ہے گولکنڈہ کے وزیرِاعظم میر جملہ نے اس سلسلے میں میانجی گری کر کے گولکنڈہ کے حکمراں کو اس بات کے لیے آمادہ کیا۔

کہا جاتا ہے کہ گولکنڈہ کے حاکم نے اپنی ریاست میں معاہدے کی شرائط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے شیعی خطبے کو از سرِ نو جاری کر دیا۔

گولکنڈہ کا حاکم اس بات کو درک نہ کر سکا کہ خراج کی ادائیگی میں تاخیر کے سبب اورنگ زیب کو اپنی اُس حرص کو جو دکن کے سلسلے میں اُس کے دل میں جوش مار رہی تھی، پورا کرنے کا بہانہ ہاتھ آجائے گا۔ بلخ اور قندھار میں اپنی شکست کے باعث اورنگ زیب اس بات کا خواہاں تھا کہ اگر ممکن ہو سکے تو کسی دوسرے اور زیادہ سود مند علاقے میں اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ کر اس داغ کو دھو دے۔ اُس کی مالی مشکلات اور آیندہ ہونے والی ناگزیر تخت نشینی کی جنگ کے خیال نے اس میں مال و دولت اور اسلحہ و گولہ بارود کے جمع کرنے کی حرص کو ہوا دی۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کے پاس ایک بڑی اور جنگ آزمودہ فوج موجود رہے۔ اُس کے یہ دونوں مقصد اُسی وقت پورے ہو سکتے تھے جب کہ اُس کو اس بات کی اجازت مل جاتی کہ وہ گولکنڈہ سے جنگ کر کے اُس کی دولت پر قبضہ کر لے۔

اورنگ زیب یہ فیصلہ کیے ہوئے تھا کہ گولکنڈہ اور بیجاپور کی ریاستوں کے غیر یقینی اور لیت و لعل کے مشکوک رویے سے فریب نہ کھائے گا۔ اگر مرکزی حکومت نے اُس کو ریاست پر حملے کی اجازت نہ دی تو اُس میں اُس کا کوئی قصور نہ تھا۔

اورنگ زیب کی خوش قسمتی سے میر محمد سعید مشہور "میر جملہ" جیسا آدمی مل گیا۔ یہ لائق ایرانی صرف ۲۵ سال پہلے گولکنڈہ آیا اور اس عرصے میں اُس نے بحیثیت جواہر فروش و سیاست داں کے غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ وہ عبداللہ قطب شاہ کا منظورِ نظر ہوگیا اور وزیرِ اعظم مقرر کر دیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اُس نے سارے انتظامی اداروں پر اپنا قبضہ جما لیا اور کرناٹک کے ہندو راجا سری رنگا رایل سے اُس کا علاقہ چھین کر اپنی طاقت اور بڑھالی۔ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ کرناٹک کو اپنی ذاتی جاگیر بنالے لیکن قطب شاہ اس علاقے کو اپنی ریاست میں شامل کرنا چاہتا تھا۔

میر جملہ کی نافرمانی اور ضدی پن نے قطب شاہ کی آنکھیں کھول دیں اور اُسس کو اس بات کا احساس ہوگیا کہ دولت کی فراوانی، اعلیٰ سیاسی اقتدار اور بے انتہا اقتدار پسندی میر جملہ کی خواہشات کو بھڑکا رہے تھے۔ میر جملہ اپنی ہوشیاری سے اس بات کو سمجھ چکا تھا کہ گولکنڈہ میں اُس کی پوزیشن جلد ہی کمزور ہو جائے گی چنانچہ اسس نے ایک ساتھ بیجاپور، اورنگ زیب، دربارِ دہلی اور شاہِ ایران سے بات چیت شروع کر دی۔

اسی دوران میں میر جملہ کے مغرور اور بے پرواہ لڑکے محمد امین نے اپنے سرکش رویے اور مغرورانہ چال چلن کے سبب قطب شاہ کو مجبور کر دیا کہ وہ اُس کو اور اُس کے خاندان کو حراست میں لے لے۔ میر جملہ نے جلد ہی فیصلہ کر لیا اور خود کو شاہجہاں کی پناہ میں دے دیا۔

شہنشاہ نے میر جملہ کو پانچ ہزار ذات اور سوار اور اُس کے لڑکے کو دو ہزار ذات اور ایک ہزار سوار کا منصب دیا اور قطب شاہ کو لکھ بھیجا کہ وہ اُس کو دہلی روانہ ہونے کی اجازت دے دے۔ مغلوں نے میر جملہ کو اپنی طرف ملا کر اور اُس کو بیجاپور یا شاہ ایران کے ہاتھوں میں پڑنے سے روک کر بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا۔ بہرحال اس بات کو گولکنڈہ والوں نے اپنے داخلی حالات میں دربارِ دہلی کی ناجائز مداخلت سمجھا۔

قطب شاہ عجب شش و پنج میں تھا اور اسس بات کا فیصلہ نہ کر سکا کہ شہنشاہ کے خط کا کیا فوری جواب دے۔ شاہی اقتدار کی اسس بے حُرمتی کو اورنگ زیب نے

بہانہ بنایا تاکہ وہ گولکنڈہ کے خلاف جنگ کر سکے اُس نے اپنے بیٹے محمد کو حکم دیا کہ فوراً گولکنڈہ پر دھاوا بول دے۔ ابھی محمد زیادہ آگے نہ بڑھ پایا تھا کہ عبداللہ کو شاہجہاں کی دوسری تحریر ملی کہ میر جملہ کے خاندان کو رہا کر دیا جائے۔ قطب شاہ نے فوراً حکم مان لیا اور اُس کو چھوڑ دیا لیکن اورنگ زیب اس معاملے کو ادھورا چھوڑنے کے حق میں نہ تھا۔ اب جب کہ اس نے اپنی تلوار میان سے باہر نکال لی تھی تو وہ یہ چاہتا تھا کہ گولکنڈہ سے سارے حسابات چکا دے جس میں میر جملہ اور امین کی ساری جائداد کی واپسی کا مسئلہ بھی شامل تھا۔

گولکنڈہ اورنگ زیب کے اس برتاؤ پر حیران رہ گیا۔ باوجودیکہ وہ لوگ جنگ کے لیے قطعاً آمادہ نہ تھے تاہم راہ فرار مسدود تھی اور حملہ بالکل ناگہانی طور پر ہوا تھا۔ قطب شاہ نے خود کو قلعہ میں بند کر لیا اور شہزادہ محمد کو حیدر آباد پر قبضہ کرنے اور محل کو لوٹنے دیا۔

قطب شاہ نے اورنگ زیب سے کئی دفعہ صلح کی درخواست کی لیکن اس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ خود اورنگ زیب مہم کی نگرانی کے لیے میدان میں نکل آیا۔ یہ افواہ بھی اُڑ گئی کہ بیجا پور نے پندرہ ہزار سواروں کا مضبوط دستہ قطب الملک کی درخواست پر افضل خاں کی نگرانی میں بھیجا ہے۔ ادھر اورنگ زیب نے شہنشاہ کے اوپر اپنا پورا زور ڈالا کہ وہ صلح کی کسی تجویز پر اُس وقت تک غور نہ کرے جب تک کہ معاملات کا قابلِ اطمینان طریقے پر فیصلہ نہ ہو جائے۔

قطب الملک شاہ گھبرا گیا اور اُس نے شہزادہ محمد سلطان سے وعدہ کیا کہ اگر وہ اپنے باپ سے صلح کی سفارش کرے تو سلطان چالیس لاکھ روپیہ پیش کش ادا کرنے، اپنی بیٹی کو شہزادہ محمد سے بیاہنے اور سالانہ پیش کش بروقت ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔ ایک طرف تو حملہ آوروں کے ساتھ صلح کی بات چیت جاری تھی دوسری طرف قطب الملک بے چینی سے شاہجہاں کو بھیجی ہوئی عرضداشت اور بیجاپور سے مدد کی درخواست کے نتائج کا منتظر تھا۔ مغل اور گولکنڈہ کے سپاہیوں میں اکثر و بیشتر

جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں جس کے سبب حالت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ اورنگ زیب • فروری کو خود گولکنڈہ پہنچا اور محاصرہ کر لیا۔ اگر اس کو اپنی من مانی کرنے کی اجازت ہوتی تو وہ گولکنڈہ فتح کر کے اس کو سلطنت میں شامل کر لیتا اور اس طرح دکن کے پیچیدہ مسائل میں سے ایک مسئلہ حل ہو جاتا۔ لیکن شاہجہاں اس حد تک جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ بہرحال ان دونوں نظریات کی طرفداری اور مخالفت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن آخری فیصلہ شاہجہاں کے اختیار میں تھا اور اس نے اورنگ زیب کو یہ حکم دیا کہ لڑائی بند کر کے صلح کر لے۔

اگر قطب الملک کو اس بات کی خبر ہو جاتی تو وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لیے صلح کی شرائط اس طرح پیش کرتا جو ان کے لیے مفید یا نسبتاً آسان تر اور اورنگ زیب کے لیے مضر ثابت ہوتیں۔ چنانچہ اورنگ زیب نے ان احکامات کو کسی پر فاش نہ کیا اور فوجی دباؤ جاری رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ التجا و التماس سننے کے لیے آمادہ ہے۔

قطب الملک نے اپنی بوڑھی ماں کو اورنگ زیب کے پاس روانہ کیا جس کا شائستہ خاں نے اورنگ زیب سے تعارف کرایا۔ یہ بات طے ہو گئی کہ شہزادہ محمد کی شادی قطب الملک کی لڑکی سے ہوگی اور ایک کروڑ روپے کی قیمت کے جواہرات، ہاتھی، قیمتی اشیاء اور نقد روپیہ قبول کر لیا جائے گا۔ ان شرائط کے منظور ہونے کے پورے امکانات تھے لیکن جونہی شہنشاہ کا فرمان اورنگ زیب کے نام اس بات کے لیے پہنچا کہ وہ فوراً اپنی افواج کو گولکنڈہ کے علاقے سے باہر نکال لے اس کے سارے منصوبوں پر پانی پھر گیا اور واپسی کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار نہ رہا۔ اورنگ زیب کا گولکنڈہ کے الحاق کا منصوبہ یا کم از کم یہ خیال کہ وہ بقایا واجبات اور جرمانے کی مناسب رقم وصول کرے گا خاک میں مل گیا۔

اورنگ زیب کو اس کا بہت افسوس ہوا جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ گولکنڈہ کی ریاست کو جیت کر سلطنت مغلیہ اور دکن کے درمیان قدیمی مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے گا اور اس طرح دکن میں مغلوں کی وہ سیاست جس کو اکبر اعظم نے شروع

کیا اور اس کے دو جانشینوں نے مستعدی کے ساتھ جاری رکھا اپنے قدرتی انجام کو پہنچ جائے گی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ایسا کرنے سے اس کی پوزیشن اپنے بھائیوں کے مقابلے میں سیاسی، فوجی اور مالی اعتبار سے بہت مضبوط ہو جاتی۔ اگر ریاست کا الحاق ممکن بھی نہ ہوتا تو بھی جرمانے کی بھاری رقم اور پچھلی رقوم کی وصولیابی سے اس کو نہ صرف مالی پریشانیوں سے نجات مل جاتی بلکہ وہ اس سارے قرضے کو ادا کر سکتا تھا جو اس نے گولکنڈہ سے لڑائی کی تیاریوں کے لیے لیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ آئندہ کے لیے اس کے وسائل اور بھی مضبوط ہو جاتے۔

شاہجہاں کے اورنگ زیب کی تجویزوں کو نہ ماننے کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس بات کی بڑی وجہ یہ تھی کہ شاہجہاں دارا اور جہاں آرا کی باتوں میں آگیا۔ گولکنڈہ کے مسئلے میں دربار مغلیہ میں دو گروہ تھے۔ ایک گروہ جو صلح کا خواہاں تھا اس کی لیڈرشپ دارا اور جہاں آرا کے ہاتھوں میں تھی درآنحالیکہ وزیر اعظم سعد اللہ خاں اورنگ زیب اور میر جملہ اس گروہ کے سرغنہ تھے جو جنگ چاہتا تھا۔ ممکن ہے اس بات میں کچھ سچائی ہو لیکن پھر بھی بہت مبالغہ آمیزی سے کام لیا گیا ہے۔

اگر یہ بات مان لی جائے تو یہ فرض کرنا ہوگا کہ شاہجہاں کی قوت اور جوش و خروش ختم ہو چکا تھا اور وہ دوسروں کے ہاتھوں میں محض کھلونا بن کر رہ گیا تھا لیکن کوئی وجہ نہیں کہ اس مفروضہ کو تسلیم کر لیا جائے۔ شہزادے نے چاہے کچھ بھی سوچا ہو لیکن اس پالیسی کو اختیار کرنے کی وجوہات شاہجہاں کے نزدیک کچھ اور ہی تھیں۔ وہ بلخ اور قندھار کی لڑائیوں کے بعد خود کو کسی بھی طویل جنگ میں ملوث کرنے کے خیال سے کتراتا تھا۔ اس کو دکن کے معاملات کا کافی طولانی اور گہرا تجربہ تھا۔ اس کو دکن کی [illegible]ت کی پیچیدگیوں، جنوب ہند میں فوجی مہم کی مشکلات اور حملہ آور اور بچاؤ کرنے وا[illegible] دونوں پر لشکر کشی کے حوصلہ شکن اثرات کا بخوبی اندازہ تھا۔ وہ اورنگ زیب کے جو[illegible] اُمید افزا رویے کا حامی نہ تھا اور نہ ہی خود کو اس بات کے یقین کرنے پر آمادہ کر سکتا تھا کہ گولکنڈہ کے قلعے کی فتح سے دکن کا پیچیدہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ دوسری طرف ممکن تھا کہ یہ

مسئلہ کبھی حل نہ ہونے والی مشکل صورت اختیار کر جائے جیسا کہ 1636ء سے پہلے ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے یہی فیصلہ کیا کہ گولکنڈہ کے خلاف شدید فوجی مظاہرہ کرے تاکہ مال گزاری کی بقایا رقوم وصول ہو جائیں دکن کی ریاستوں پر اس کی گرفت سخت تر ہو جائے اور کرناٹک کا سودمند معاملہ بھی اس کے حق میں طے پا جائے۔

شاہجہاں کافی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ اس کو گولکنڈہ سے خراج مل گیا اور اس نے رام گیر کا ضلع جو بڑی فوجی اہمیت کا حامل تھا سلطنت میں ملا لیا۔ شہنشاہ نے قطب الملک کو نہ صرف میر جملہ کی کرناٹک والی جاگیر کو ریاست میں شامل کرنے سے باز رکھا بلکہ ہوشیاری سے اس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا جس کے واضح معنی یہ ہوئے کہ وہ علاقہ سلطنت میں ملحق کر لیا گیا لیکن یہ معاہدہ کیونکہ مشکوک نوعیت کا تھا لہٰذا آئندہ چل کر جھگڑے کا باعث بن گیا۔

حالانکہ اورنگ زیب کے اصل مقاصد پورے نہ ہو سکے تھے تاہم وہ عبداللہ قطب الملک کی لڑکی کو اپنے بیٹے شہزادہ محمد سلطان سے محض اس وعدے پر بیاہنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ اس کو اپنا جانشین مقرر کر دے گا۔ امید تو یہ تھی کہ یہ ازدواجی معاہدہ کم از کم سیاسی طور پر مفید ثابت ہوگا لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اس سے کوئی مالی فائدہ بھی حاصل ہوا یا نہیں۔

یہ بات بھی واضح طور پر معلوم نہ ہو سکی کہ آیا اورنگ زیب اور محمد سلطان کو جو تحفے شادی میں ملے تھے وہ انھوں نے شہنشاہ کو بھیج دیے یا خود رکھ لیے کیونکہ ایک مرتبہ پہلے بھی اورنگ زیب کو جو تحفے بحیثیت وائسرائے دکن ملے تھے وہ اس کو شہنشاہ کو دینے پڑے۔

گولکنڈہ کے واقعات کا بیجاپور اور مغلوں کے تعلقات پر اثر انداز ہونا یقینی تھا۔ گولکنڈہ کی طرح بیجاپور نے بھی کرناٹک پر اپنا قبضہ جما لیا تھا اور اس کے بہت سے علاقے اپنی ریاست میں شامل کر لیے تھے۔ اس طرح بیجاپور کی ریاست بحر عرب سے خلیج بنگال تک پھیل گئی۔

شاہجہاں نے پہلے ہی بڑی چالاکی سے کرناٹک کے اس علاقے پر جو میر جملہ اپنی ذاتی جائداد کے بطور رکھنا چاہتا تھا قبضہ کر لیا تھا لہذا کوئی وجہ نہ تھی کہ کرناٹک کے اس علاقے کو جس پر بیجاپور کا قبضہ تھا حاصل نہ کیا جائے۔ مختصر یہ کہ جو چیز بھی بیجاپور اور مرہٹوں کے لیے مفید ہوتی وہ مغلوں کے لیے مضر ثابت ہوتی پہلے تو شاہی حکومت کی دلیل یہ تھی کہ دکنی ریاستیں مغلوں کی سر پرستی میں ہونے کے باعث ان کو یہ اختیار نہ تھا کہ شہنشاہ کی اجازت کے بغیر اپنے علاقوں میں توسیع کریں لیکن اب جب کہ انھوں نے اپنے علاقوں میں توسیع کر ہی لی تھی تو وہ یا تو مفتوحہ علاقہ جات کو شہنشاہ کے ساتھ بانٹ لیں یا پھر ایک معتنا بہ رقم بطور پیش کش ادا کریں۔

گولکنڈہ اور بیجاپور دونوں نے اور خاص طور پر موخرالذکر ریاست نے شہنشاہ کے اس قسم کے اختیار کو ماننے سے انکار کر دیا کیوں کہ خود کو خارجی سیاست کا حق دار سمجھتی تھیں۔ سلطنت مغلیہ اور بیجاپور کے تعلقات کا دار و مدار 1636ء کے معاہدے پر تھا لہذا دونوں فریق اس معاہدے کی تعبیر و تفسیر اپنی مرضی کے مطابق کرتے تھے۔ شاہجہاں نے اپنی سیاست اور رویے کا مظاہرہ اس طرح کیا کہ 1643ء میں اس نے محمد عادل شاہ کو اس کی مرضی کے خلاف اس بات پر مجبور کر دیا کہ مصطفیٰ خاں کو جیل سے رہا کر کے دوبارہ پیشوا کے عہدے پر برقرار کر دے۔ اس کے علاوہ شاہجہاں نے عادل شاہ کو ہاتھیوں کی لڑائی سے اور افسران کو اعلیٰ خطابات مثلاً خان خانان کے خطاب عطا کرنے سے بھی منع کر دیا۔

ایک مرتبہ شہنشاہ نے عادل شاہ کو اس بات پر بھی تنبیہہ کی کہ وہ شاہی فرمان کے استقبال کے لیے جیسا کہ اس زمانے کا رواج تھا اپنے مرکز سے چل کر چار میل تک کیوں نہ آیا۔ لیکن جب بیجاپور نے اپنی سرحدوں کو کرناٹک میں بڑھا لیا اور اس کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا گیا تو عادل شاہ بڑی حد تک یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ اس میں اور راجپوتانہ کی جاگیردارانہ ریاستوں میں جن کو عملاً سلطنت کا جزو لاینفک بنا لیا گیا تھا بہت فرق ہے۔ سلطنت مغلیہ اور بیجاپور کے درمیان تعلقات

کی نوعیت وضاحت طلب تھی۔ شاہجہاں کھلے طور پر جنگ کے حق میں نہ تھا کیونکہ محمد عادل شاہ کا رویہ عام طور پر مناسب اور فرماں بردارانہ ہی رہا تھا لیکن شہنشاہ کی گولکنڈہ میں کامیابی اور بیجاپور کے حالات نے اس سوال کو سامنے لا کھڑا کیا۔ ادھر دکن کے گورنر اورنگ زیب نے بھی شہنشاہ کی توجہ اس طرف بڑی سختی سے مبذول کرائی۔ محمد عادل شاہ 1656ء میں فوت ہوگیا اور اس کا نام نہاد بیٹا علی عادل شاہ ملکہ بڑی صاحبہ کی مدد سے جو قطب الملک کی بہن تھی تخت پر بیٹھا۔

کہا جاتا ہے کہ محمد شاہ کے کوئی بیٹا نہ تھا اور بڑی صاحبہ نے علی کو جس کے حسب ونسب کا کوئی پتہ نہ تھا متبنیٰ کر لیا۔ اورنگ زیب نے ان حالات کی رپورٹ شہنشاہ کو دی اور محمد شاہ کی موت کے بعد بیجاپور میں جو بدامنی اور افراتفری پھیل گئی تھی اس پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

شاہجہاں نے یہ محسوس کیا کہ اب وقت آگیا ہے جب کہ وہ گولکنڈہ کی طرح ریاست بیجاپور پر بھی اپنا اقتدار قائم کرکے اس کو اپنا مطیع بنا لے۔ اس سلسلے میں بیجاپور کی ریاست کے خلاف تین الزامات عاید کیے گئے۔ پہلا الزام خراج کی رقم کی ادائیگی میں تاخیر، دوسرا گولکنڈہ کی مدد کے لیے فوج تیار کرکے دشمنانہ رویّے کا واضح ثبوت دینا اور تیسرا یہ تھا کہ انھوں نے کرناٹک کے اس علاقے پر جو میر جملہ کی جاگیر تھا دست درازی کی تھی۔

اورنگ زیب کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی فوج بیجاپور کی سرحد کی طرف بڑھائے اور ریاست کو فتح کرلے۔ بشکل دیگر وہ ان علاقوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرے جو پہلے احمد نگر کی ریاست کا حصہ تھے لیکن بعد میں بیجاپور کو منتقل کر دیے گئے تھے۔ اگر دوسرا طریقۂ کار اختیار کیا جائے تو بیجاپور شہنشاہ کو ایک کروڑ روپیہ پیش کش کے علاوہ جواہرات اور ہاتھی پیش کرے۔ اس کے علاوہ پچاس لاکھ روپیہ دکن کے وائسرائے کو ادا کرنا ہوگا اور جس طرح کہ گولکنڈہ میں شہنشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور اس کے نام کے سکے جاری تھے اسی طرح بیجاپور میں بھی عمل کیا جائے۔ اس طرح شہنشاہ نے 1636ء کے معاہدے

کو فسخ کر دیا اور اس بات کا واضح عزم کر لیا کہ اگر وہ بیجاپور کو اپنی سلطنت میں شامل نہ بھی کرے تو بھی اس کو اپنا مطیع بنا کر ہی رہے گا۔

شاہجہاں نے اورنگ زیب کو یہ حکم دیا کہ جب تک کہ میر جملہ اور دوسرے فوجی افسر اس سے نہ آملیں آخری حملہ نہ کرے۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ اورنگ زیب کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ بیجاپور کے معاملات کو حتی الامکان بہتر طریقے پر حل کرے۔

اورنگ زیب کے خفیہ ارادے کچھ بھی ہوں بظاہر وہ بیجاپور پر حملہ کرنے کا بہت مشتاق نہ تھا۔ گولکنڈہ کے تلخ تجربے اور شاہی حکومت کی مذبذب پالیسی اور دربار میں ہونے والی دشمنانہ سرگرمیوں کے خوف نے اورنگ زیب کے جوش و خروش کو بڑی حد تک ٹھنڈا کر دیا۔ بہرحال اس بات سے اورنگ زیب کے دل میں بڑی امیدیں بندھ گئیں کہ دربار کے دو بااثر امراء میر جملہ و شائستہ خاں جو اس کے طرف دار بھی تھے مدد کے لیے بھیجے جا رہے تھے۔

بیجاپور کی جنگ میں جو دکن کی سب سے بڑی اور دولت مند ریاست تھی کامیابی کے امکانات نے اورنگ زیب کو اس بات کی امید دلائی کہ اس کے فوجی وقار میں اضافہ ہوگا اس کا خزانہ بھر جائے گا اور اس کے سپاہیوں کو جنگ کا تجربہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی جیبوں کو مالِ غنیمت سے بھرنے کا موقع ہاتھ آئے گا۔ آخرکار اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔

1657ء میں جونہی میر جملہ شہزادے کے ساتھ آملا مغل فوج حرکت میں آگئی۔ بیدر کا قلعہ جس کی حفاظت کی ذمے داری سیدی مرجان کے سپرد تھی مغل توپ خانے کے سامنے نہ ٹھہر سکا اور آخرکار ایک تیز و تند حملے کی زد میں آکر تسلیم ہو گیا۔ سیدی لڑتا ہوا مارا گیا۔ مغل فوج کو لوٹ میں گولہ بارود کی زبردست مقدار کے ساتھ ساتھ بارہ لاکھ روپیہ بھی ہاتھ آیا۔ بیدر کا نام بدل کر مظفر آباد کر دیا گیا۔

مغل فوج خوشی سے لبریز راستے میں جو کچھ ملتا اسے لوٹتی اور جلاتی کلیان کی طرف بڑھی۔ بیجاپور کے بہترین سالاروں افضل خاں و خان محمد نے مغلوں کی پیش قدمی کو روکنے

کی ناکام کوشش کی۔ مغل افواج بیجاپوری فوج کو دھکیلتی ہوئی کلیانی پہنچ گئیں اور اس کا محاصرہ کرلیا۔ قلعہ کا دفاع کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ محصورین نے مغلوں کے رسل و رسائل اور رسد قطع کرنے کی کوشش کی اور یہ چاہا کہ مختلف طریقے سے مغلوں کی توجہ کو ہٹایا جائے۔ شیواجی سے مغل علاقوں پر لوٹ مار کرائی گئی اور محاصرین پر حملے کیے گئے لیکن یہ سب کوششیں بیکار رہیں اور کلیانی کا قلعہ فتح ہوگیا۔

بیدر اور کلیانی کے فتح ہوجانے کے بعد بیجاپور کا راستہ کھل گیا۔ اب اورنگ زیب پورے اعتماد سے آگے بڑھا اور اس نے بیجاپور کا محاصرہ کرلیا۔ بیجاپوری بہادری سے لڑنے کے علاوہ سیاسی فعالیت میں بھی مصروف تھے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ مغلوں کی تمام شرائط کو بجز ریاست کے الحاق کے ماننے کو تیار ہیں۔

انھوں نے ایک سو پچاس لاکھ نقد اور قیمتی اشیاء کی شکل میں دینے اور ان سارے علاقہ جات کو چھوڑنے کا وعدہ کرلیا جو مغل لینا چاہتے تھے اور جس میں بیدر کلیانی اور پرینڈہ شامل تھے۔ چنانچہ شاہی حکومت نے خراج سے پچاس لاکھ کی رقم جمع کرکے اورنگ زیب کو جنگ معطل کرنے اور مغل افواج کو بیجاپور سے ہٹانے اور میر جملہ کو واپس دہلی بھیجنے کا حکم دے دیا۔ اگر جنگ بندی کے شاہی فرمان کے سبب واپس جانے والے افسران کی کوششوں میں ڈھیل نہ پڑتی اور شاہجہاں کی بیماری کی خبر پاکر دہلی کے تخت کے لیے چھڑ جانے والے زبردست جوے کی طرف اورنگ زیب اپنی توجہ مبذول کرنے پر مجبور نہ ہوگیا ہوتا تو بیجاپوریوں کو ان شرائط کے پورا کرنے کے لیے مجبور کردیا جاتا۔ لیکن ان حالات میں اورنگ زیب کو بیجاپوریوں سے جو کچھ ہاتھ آیا اُسے لے کر بادل نخواستہ جنوری ۱۶۵۸ء میں اورنگ آباد واپس آگیا۔

باب 21

جنگِ وراثت

• ستمبر کو شاہجہاں یکایک حسر البول اور قبض میں مبتلا ہو گیا۔ تکلیف اس قدر تیزی سے بڑھی کہ کچھ ہی عرصے میں اس نے اپنی خواب گاہ سے باہر نکلنا اور دربار میں آنا بند کر دیا۔ ہر شاہی نظام کا طریقہ ہے کہ اگر مقتدر اعلیٰ عوام کی نظروں سے اوجھل ہو جائے تو بڑی بے چینی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں جب بھی ایسا واقعہ پیش آتا تو بڑی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتیں اور مختلف قیاس آرائیاں کی جاتیں۔ اس کی وجوہات چنداں پوشیدہ نہیں۔ بادشاہ سلطنت کی علامت تھا وہی ساری طاقت اور امن و امان کا مرکز و منبع سمجھا جاتا تھا۔ مقتدر اعلیٰ کی تبدیلی پر عام طور سے وراثت کی جنگ شروع ہو جاتی جس کے سبب نظم و ضبط معطل ہو جاتا، بد امنی پھیل جاتی اور کاشتکاروں، تاجروں اور سرکاری ملازموں کے روزمرہ کے کاموں میں خلل پڑتا۔ ہر چیز کی کایا پلٹ ہو جاتی کسی چیز کا توازن برقرار نہ رہتا اور اس تبدیلی سے ہر طبقے کے لوگ چوکنا ہو جاتے۔ شہزادے تخت کے خواہاں ہوتے اور امراء کے دستے اپنے اپنے امیدواروں کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے۔ ہندو یہ چاہتے کہ رواداراور آزاد خیال حکومت برسراقتدار آئے۔ متعصب مسلمان قانونِ شریعت کے تحفظ کے خواہاں تھے۔ مختصر یہ کہ غیر قانونی عناصر کے علاوہ سب ہی یہ چاہتے کہ امن و امان جلد ہی بحال ہو جائے۔

عوام کی بے چینی کو دور کرنے کی خاطر شاہجہاں کو دو دفعہ درشن دینے کے لیے جھروکے میں آنا پڑا۔ ٦٥ سال سے زیادہ کی عمر میں شاہجہاں نے یہ محسوس کیا کہ اس کی حالت تیزی سے گرتی جا رہی ہے لہذا اس نے امرا و درباریوں کو جمع کر کے ان کی موجودگی میں دارا کو اپنا جانشین مقرر کیا اور ان کو ہدایت دی کہ شہزادے کی پوری پوری اطاعت کریں۔

صرف یہی نہیں کہ دارا شاہجہاں کی بیاہتا قانونی بیوی سے اس کا بڑا لڑکا تھا بلکہ مزید برآں شہنشاہ نے خود اس کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ حالانکہ اسلامی قانون وراثت بادشاہ کے حق انتخاب کو معتبر مانتا ہے تاہم اس قانون کے مطابق ہر ایک لڑکے کو حتیٰ کہ کنیز کی اولاد کو بھی وراثت کا حق حاصل ہے۔
حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی قانون وراثت بادشاہت کے لیے نہیں بلکہ جمہور کے لیے تھا۔ اسی طرح مسلم رائے عامہ بھی وراثت کے معاملے میں اسی قدر غیر واضح اور مبہم تھی جس قدر کہ اسلامی قانون۔ چنانچہ ہر شہزادہ خود کو اس کا مجاز سمجھتا تھا کہ اپنے دعوے کو مستحکم بنائے اور اس کی حمایت میں فوجی طاقت کی مدد بہم پہنچائے۔ تلوار ہی حق وراثت کے مسئلے کو حل کرتی تھی۔

یہ خیال کہ اس طریقے پر وہی شخص تخت نشین ہوتا جو واقعتہً اس کا اہل ہوتا محض گمراہ کن ہے کیوں کہ جنگ میں کامیاب ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ شخص سیاسی اور انتظامی امور میں بھی اتنا ہی لائق ہوتا جتنا کہ امور جنگ میں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کامیابی کے سبب اس کو لائق فوجی لیڈر یا بہتر مدبر سمجھا جا سکتا تھا۔

دارا کو جو اب تخت کا وارث مقرر ہو چکا تھا بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کو دوہرے کردار ادا کرنے پڑے۔ ایک تو شہنشاہ کے نائب کی حیثیت سے اور دوسرے تخت کے دعوے دار کی انفرادی حیثیت سے۔ اگر شاہجہاں مر چکا ہوتا تو اس کو بیک وقت دو مختلف کردار ادا کرنے کی زحمت سے نجات مل جاتی۔ وہ اس

صورت میں اپنے منصوبے بغیر کسی تاخیر یا تبدیلی کے انجام دے سکتا تھا۔ بحیثیت حاکم کے اس کا فرض تھا کہ امن و امان قائم رکھے اور ایسے پروپیگنڈے کو جو لوگوں کے دلوں میں دہشت پیدا کرتے روکے۔ کیوں کہ اس قسم کی افواہیں ملک میں افراتفری پیدا کرتیں، حکومت کے نظم و نسق میں رخنہ ڈالتیں اور خانہ جنگی پھوٹ پڑتی۔ اس کو اس بات کا بھی خیال تھا کہ مختلف شہزادوں کے جو نمایندے دربار میں موجود تھے ان کے اور ایسے ہی دوسرے جاسوسوں اور گذارش نویسوں کے خود غرضانہ اور غیر ذمّہ دارانہ مکاتبات کو باہر جانے سے باز رکھے۔

اس بات کی پیش بینی کے لیے کہ مختلف شہزادے مخالفانہ فوجی سرگرمیاں شروع کردیں گے اور بدامنی پھیل جائے گی کسی غیر معمولی عقلمندی یا ہوشیاری کی ضرورت نہ تھی تاہم یہ بات ضروری تھی کہ دارا انتظام مملکت پر اپنی گرفت مضبوط رکھے، امورِ مملکت ایسے لوگوں کو سونپے جن پر بھروسہ ہو اور فوج کو اس بات کے لیے تیار رکھے کہ ہر قسم کے مظاہرہ قدرت کو فوراً کچل دیا جائے۔ لیکن اس کے انہی اقدام نے چاہے اس کی غرض کچھ بھی ہو اس کے رقیبوں کے شبہات کو تیز تر کردیا اور وہ اس بات پر مجبور ہوگئے کہ اس سے پہلے کہ مرکزی حکومت کے مضبوط ہاتھ ان کو روک سکیں ہتھیار اُٹھالیں۔ بہ الفاظ دیگر ان کا خیال یہ تھا کہ دارا دہلی میں اپنی پوزیشن سے فائدہ اٹھاکر اپنی قوت کو بڑھا رہا ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ وہ لوگ بھی وقت ضائع کیے بغیر ضروری قدم اُٹھائیں۔

تخت کے چار دعوے داروں میں سے دارا سب سے بڑا تھا وہ فلسفہ تصوف اور مختلف مذاہب کے مطالعہ کا شوقین تھا وہ وسیع النظر بھی تھا اور یہ صفت ہندوستان جیسے وسیع ملک پر حکومت کرنے کے لیے جہاں کہ مختلف مذہبی اور سماجی گروہ بستے ہیں ازحد ضروری تھی۔ اس کے بے داغ کردار، آزاد خیالی، رحم دلی، ہمدردی، انسان دوستی اور سخاوت و فیاضی اور باپ کی خدمت کے جذبے نے اس کو عوام میں بھی اتنا ہی ہر دلعزیز بنادیا تھا جتنا کہ باپ کی نظروں میں۔

اس میں شک نہیں کہ باپ کے لاڈ پیار نے اس کو کبھی اس بات کا موقع نہ دیا کہ وہ مقامی انتظامی امور میں جن کا تعلق روز مرہ کی زندگی سے تھا دلچسپی لیتا۔ تاہم اس بات کا امکان موجود ہے کہ حکومت کے اہم مسائل اور انتظامی دشواریوں کے بارے میں اس کے تجربات کافی وسیع ہوں گے۔ کیوں کہ اس نے شہنشاہ کے نائب کی حیثیت سے کام کیا اور اس دوران بہت سے سرکاری امور اس کے ہاتھوں انجام پائے۔

اس کی دربار میں موجودگی اور سلطنت کی کارکردگی سے واقفیت کے سبب وہ انتظام مملکت کے مختلف شعبوں سے پوری طرح آگاہ ہو گیا ہوگا اور اس طرح اس کو ہمہ گیر سوجھ بوجھ، شاہانہ سلیقہ، ترتیب امور اور اعلیٰ سیاست کا اچھا تجربہ حاصل ہو گیا ہوگا۔ سلطنت کے مرکز میں رہ کر وہ ہر اس شخص سے نزدیکی رابطہ برقرار کر سکتا تھا جو کسی بھی اہمیت کا حامل ہو اور اس طرح اس کو لوگوں کے مختلف و متضاد اعمال اور ان کے اغراض کے مطالعے اور ان کی شعبدہ بازیوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا اچھا موقع ہاتھ آیا لیکن سیاسی انتظام اور معاملات میں انہماک کے سبب وہ فوجی تربیت حاصل نہ کر سکا اور اس طرح دارا فن شمشیر زنی اور ڈسپلن سے محروم رہا جو تخت کے ہر دعوے دار کے لیے ازحد ضروری ہے کیوں کہ مروجہ قانون کے مطابق شمشیر ہی جانشینی کا قطعی فیصلہ کر سکتی تھی۔

یہ بات مشکوک ہے کہ اس میں جنگی صلاحیت قطعاً نہ تھی کیوں کہ جس جوش و خروش کے ساتھ اس نے قندھار کی تیسری مہم کو ترتیب دیا اور اس کے لیے فوجی تیاریوں میں جس قدر مستعدی دکھائی وہ اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ اس میں ولولہ، شجاعت اور تحمل و بردباری سے حالات کا مقابلہ کرنے کی پوری پوری صلاحیت موجود تھی۔ ان میں سے بعض خوبیوں کا مظاہرہ اس نے بعد میں ساموگڑھ اور دیورائے میں بھی کیا۔ قندھار میں اس کی ناکامی کسی طرح بھی اس کی عدم استعداد کا ثبوت نہیں کہی جا سکتی کیوں کہ کوئی اور شہزادہ حتیٰ کہ خود شہنشاہ بھی ان حالات میں کامیابی کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ اورنگ زیب کے ہاتھوں دارا کی شکست اول الذکر کی فوجی برتری کو ثابت کرتی ہے لیکن اس کے

یہ معنی نہیں کہ موخرالذکر میں صلاحیت نہ تھی۔ میدانِ جنگ میں کامیابی اکثر ایسی باتوں پر مبنی ہوتی ہے جو انسان کے اختیار سے باہر ہوتی ہیں۔ اُس کے فلسفیانہ مطالعات اور زبردست سیاسی اختیارات کے استعمال نے اس میں اعلیٰ وجدان کا احساس اور معمولی وغیر اہم چیزوں سے نفرت اور امیروں کے متکبرانہ رویے سے دلبرداشتگی پیدا کردی ہوگی۔ ممکن ہے یہ باتیں غرور کی حد تک پہنچ گئی ہوں لیکن اصل بات کا کوئی ثبوت نہیں اور بہت کم امکان ہے کہ وہ لاعلاج حد تک بدمزاج اور زود رنج ہوگیا ہو۔ عام طور پر اس کا رویہ با اخلاق، باوقار اور ہمدردانہ ہوتا لیکن کبھی کبھی اس کے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہوجاتا اور وہ بے تکلفی میں شیخی بگھارنے لگتا یا لوگوں کے متعلق طنز آمیز باتیں کہہ دیتا لیکن اس کے رویے کو کسی طرح بھی میر جملہ یا بے سنگھ جیسے امراء کی حرکات کا جواز نہیں سمجھا جاسکتا۔ بہرحال اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ عوام میں محبوب تھا۔

شاہجہاں کا دوسرا لڑکا شجاع تھا وہ باسلیقہ لیکن آرام طلب تھا۔ حالانکہ قدرت نے اس کو سوجھ بوجھ بہادری اور عقل سلیم عنایت کی تھی تاہم وہ لاپرواہ عیش طلب اور کسی حد تک کاہل بھی تھا۔ بنگال کے آرام طلب ماحول نے جہاں کی سرزمین، امن، فراوانی اور دولت کے لیے مشہور ہے اس کی خواہشات کو بڑی شہ دی اور اس کی جسمانی طاقتیں آہستہ آہستہ کمزور ہوتی گئیں۔ شہزادہ شجاع ایک پسندیدہ شخصیت کا مالک اور عمدہ سپاہی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی طاقت کا راز ایرانیوں کی حمایت میں پوشیدہ تھا جن کو خوش کرنے کے لیے اس نے شیعہ عقیدہ اور رسم ورواج قبول کرلیے۔

اورنگ زیب شاہجہاں کا تیسرا لڑکا تھا۔ وہ اپنے نظریات میں متعصب اور راسخ العقیدہ تھا۔ یہ باتیں اس کے کردار کی کمزوری بھی تھیں اور مضبوطی بھی۔ ان خصوصیات کی وجہ سے اس کے نظریات و منصوبوں میں ایک قسم کی قاطعیت پائی جاتی تھی۔ عقیدہ کی پختگی اور سادہ مزاجی کے سبب اس کے عزائم میں مضبوطی و استحکام، ارادوں میں پائداری اور ان کو بروئے کار لانے کا عزم صمیم پیدا ہوگیا۔ دوسری طرف ان خصوصیات کے سبب اس میں تنگ نظری، محدود بصیرت، غلط اندازِ فکر اور ایک ہی طرح سوچنے کی عادات نے

جنم لیا۔ لہٰذا اگر کسی حکمراں کے اندر اس قسم کے نظریات کے سبب کٹرپن اور تعصب پیدا ہو جائے تو ملک میں بسنے والے مختلف فرقوں کے درمیان خلیج حائل ہو جاتی ہے اور حاکم کے اس رویّے سے مختلف مذاہب کے پیروؤں میں دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے لئے نفرت کا جذبہ پیدا ہو جاتا اور اس طرح شہنشاہ بھی عدالت کی ترازو کے دونوں پلڑوں کو اپنے ہاتھوں میں متوازن نہ رکھ سکتا۔

اورنگ زیب ماہر ادیب اور لائق فوجی لیڈر تھا۔ وہ قلم و شمشیر دونوں پر یکساں مہارت رکھتا تھا۔ اس کو قدرت نے تحمل، عزم مصمم اور پختہ ارادہ کے علاوہ انسانی کمزوری کی پرکھ اور سیاسی چالاکی ودیعت کی تھی۔ اس کی بہادری اور حوصلہ مندی میں احتیاط اور ضبط نفس کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

اورنگ زیب میں زبردست قوت برداشت، آزمائش کے لمحات میں صبر و تحمل سے کام لینے، انتھک محنت کرنے اور ہر معاملے کو اچھی طرح پرکھنے کی یکساں صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس کے سنجیدہ اور متین اخلاق، قدرتی کم اختلاطی اور پرہیزگاری کے سبب لوگوں کے دلوں میں رعب پیدا ہو جاتا اور اس کی گہری حکمت عملی اور درشت سیاست سے لوگ خوف زدہ ہو جاتے۔ وہ لوگوں کے دلوں میں رعب، خوف اور احترام تو پیدا کر سکتا تھا، لیکن ان کے دلوں میں محبت کا جذبہ نہ ابھار سکتا تھا کیوں کہ وہ لوہے کی طرح سخت اور سرد تھا۔ تدبّر اور فوجی معاملات میں بلا شبہ اپنے رقیبوں سے بہت آگے تھا۔ اس کے متعلق کچھ بھی کہا جائے لیکن اس پر کسی قسم کی کمزوری کا چاہے وہ جسمانی ہو یا جذباتی یا فکری الزام عاید نہیں کیا جا سکتا۔ وہ آسانی سے نہ تو کسی پر بھروسہ کرتا اور نہ ہی دوسروں کے دلوں میں اپنے لیے یہ جذبہ ابھار سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود جانتا تھا کہ لوگوں سے کس طرح خدمت لی جا سکتی ہے۔ اس کا تجربہ زیادہ سے زیادہ صوبائی انتظام تک محدود تھا۔ اس کو شاید ہی کبھی دارا کی طرح شاہی حکومت کے اہم مسائل سے نبٹنے کا موقع ملا ہو۔

شاہجہاں کا سب سے چھوٹا اور چوتھا لڑکا شہزادہ مراد تھا وہ جلد باز اور بے فکرا تھا۔

قرونِ وسطیٰ کے امراء کی طرح وہ عیش و عشرت میں اسی قدر شدت سے غرق رہتا گویا کہ گھمسان کی لڑائی میں۔ مراد بہادر حوصلہ مند فیاض لیکن ساتھ ہی ساتھ عشرت پسند اور لاپرواہ بھی تھا اس میں بھلے بُرے کی تمیز کا احساس نہ تھا۔ ان کمزوریوں کے ساتھ وہ احمق، کوتاہ نظر، لالچی اور مغضوب الغضب بھی تھا۔ اس کی معلومات عالمی سیاست میں بہت محدود تھیں اور وہ ان میں اضافہ کا خواہش مند بھی نہ تھا۔ خود خواہ خود غرض جھگڑالو اور ضدی ہونے کے سبب وہ قطعاً اس لائق نہ تھا کہ حکومت کا بوجھ اس کے کاندھوں پر ڈالا جائے۔ اس میں نہ تو دارا و شجاع کا سا اخلاق اور وسیع النظری تھی اور نہ ہی اورنگ زیب جیسی دیانت داری اور معتدل مزاجی پائی جاتی تھی۔ وہ بچوں کی طرح ہر ایک پر بھروسہ کر لیتا اور ہر ایک سے جھگڑ لیتا۔ اس نے کبھی حکومت یا فوجی قیادت کے فن کو سیکھنے کی کوشش نہ کی لیکن شہنشاہ ہند کہلائے جانے کی خواہش میں سب سے سبقت لے گیا۔

شروع شروع میں دارا اور شہنشاہ نے کوشش کی کہ بے بنیاد افواہوں کو جو ہر روز گشت کرتی رہتیں اور جن کو مختلف شہزادوں کے پایۂ تخت میں رہنے والے ملازمین رنگ و روغن چڑھا کر مبالغہ آمیزی کے ساتھ پھیلاتے روکا جائے لیکن وہ دونوں اپنی ساری کوششوں اور سخت احتیاط کے باوجود اس منصوبے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اس کام کا انجام دینا واقعی سخت تھا کیوں کہ روشن آرا اور گوہر آرا جیسی شہزادیاں اورنگ زیب اور مراد کے لیے بالترتیب جاسوسی کر رہی تھیں۔ جب دارا نے خط و کتابت پر پابندی لگانی چاہی تو اس کے بھائیوں کے شکوک اور بھی مضبوط ہو گئے اور وہ ہر افواہ کو سچ سمجھنے لگے۔

ان کوششوں کے ناکام ہونے پر شہنشاہ نے اپنے زندہ ہونے کا یقین دلانے کی خاطر اپنے ہاتھ سے خط لکھے اور اپنی مہر لگا کر تینوں بیٹوں کو روانہ کیے لیکن انھوں نے نہ تو شہنشاہ کے خطوط کی صحت کا اعتبار کیا اور نہ ہی اپنے معتمد ایجنٹوں کی بات کا۔ تینوں شہزادوں نے اعلان کر دیا کہ جب تک وہ خود شہنشاہ کو اپنی آنکھوں سے

نہ دیکھ لیں اس کے زندہ ہونے کا اعتبار نہیں کر سکتے۔ لیکن سلطنت کے تین سب سے بڑے صوبوں کی فوجوں کا پایۂ تخت میں جمع ہونا ہر لحاظ سے چاہے وہ فوجی ہو یا سیاسی یا اقتصادی بہت ہی نامناسب تھا۔

اگر شہزادے اکیلے یا زیادہ سے زیادہ ہر ایک اپنے چند ملازمین کے ساتھ آتے تو بات دوسری تھی لیکن ایسا کر کے وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا نہ چاہتے تھے کیوں کہ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ پایۂ تخت میں دارا کا اقتدار قائم ہے اور وہ ان کو ہر ممکن نقصان پہنچا سکتا ہے۔ چنانچہ حالات نے بہت ہی نازک اور مفسدانہ صورتِ حال اختیار کر لی اور کوئی شخص بہ تنہائی اس پر قابو نہ پا سکتا تھا۔ اس صورتِ حال کو شہزادے ہی اپنی نیک نیتی سے سدھار سکتے تھے اور جنگِ برادر کشی کو روک سکتے تھے لیکن افسوس کہ یہ احساس کسی میں موجود نہ تھا۔

سب سے پہلے مراد اور شجاع نے شاہجہاں کی موت کی خبر پر یقین کیا اور وقت ضائع کیے بغیر اپنے قانونی حکمراں ہونے اور اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لینے کا اعلان کر دیا۔ تاجپوشی کی رسومات ادا کیں اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوا کر سکّے بھی جاری کرا دیے۔ مراد نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اپنے نام کا سنہ جاری کرایا۔ وہ دونوں پایۂ تخت پر حملہ کر کے دارا کو اس سے پہلے کہ وہ اپنی پوزیشن مضبوط کر سکے نکال دینا چاہتے تھے۔ اورنگ زیب کا معاملہ مختلف تھا۔ مقصد یہ نہیں کہ وہ اپنے دوسرے دو بھائیوں سے کسی طرح کم مشتاق تھا لیکن اس کی بردباری اور عقلمندی نے اس کو احتیاط سے قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنے دوسرے دو بھائیوں کی طرح عجلت پسند نہ تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کو شاہجہاں کی موت کا پورا یقین نہیں تھا اور نہ ہی اس نے یہ مناسب سمجھا کہ دکن کے ملکی انتظامات اور دفاعی امور ادھورا چھوڑ کر روانہ ہو جائے۔

اورنگ زیب، مراد اور شجاع تینوں بھائی آپس میں خط و کتابت میں مصروف تھے اور انھوں نے دارا کو کچلنے کے لیے مل کر قدم اٹھانے کا معاہدہ کر لیا۔ شجاع کے ساتھ جو شرائط طے پائیں وہ مبہم تھیں کیوں کہ فاصلے کی زیادتی کے سبب اس کے

ساتھ خط وکتابت آسان نہ تھی لیکن مراد اور اورنگ زیب کے درمیان ایک باضابطہ تحریری معاہدہ ہو گیا جس میں سلطنت کی تقسیم کا ذکر تھا۔ اس معاہدے کے مطابق کابل کشمیر، لاہور، ملتان اور سندھ کے صوبے ملا کر ایک علیٰحدہ سلطنت قائم کی جاتی جس پر مراد قابض ہوتا۔ اس کے علاوہ مراد کو لڑائی میں حاصل شدہ مال غنیمت کا تہائی حصہ دیا جانا قرار پایا۔ باقی ماندہ علاقوں کے بارے میں یہ طے پایا کہ اورنگ زیب اور شجاع آپس میں معاملہ طے کر لیں گے یا شاید وہ علاقے اورنگ زیب کو مل جائیں گے۔ یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ جنگ کے لیے کوئی مؤثر نعرہ منتخب کر لیا جائے اور اس مقصد کے لیے یہ بات قرار پائی کہ شاہجہاں زندہ ہو یا مردہ وہ یہ نعرہ بلند کریں کہ ان کا مقصد قانونِ اسلام کو دارا کی کافرانہ گرفت سے محفوظ رکھنا ہے۔ اگر شہنشاہ اب بھی زندہ ہے تو وہ شہنشاہ کو اس بُت پرست کی غلامی اور ظلم سے نجات دلائیں گے۔ انھوں نے اپنے لیے محافظ اسلام کا پُرافتخار لقب منتخب کیا۔

اس نعرے نے یقیناً لوگوں کے دلوں میں جوش پیدا کر دیا ہوگا لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ اس نعرے کے سبب ہندو اور مسلمان دو مختلف گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ہندو اور مسلمان افسر ہمیشہ کی طرح مخالف شہزادوں کے جھنڈے تلے لڑنے کے لیے کمربستہ تھے۔ اس نعرے کا فائدہ یہ ہوا کہ خانہ جنگی نے انفرادی جنگ کے بجائے اصولی جنگ کا جامہ پہن لیا۔

شہزادہ شجاع سب سے پہلے میدان میں اترا۔ جنوری 1658ء میں وہ بغیر کسی مخالفت یا روک ٹوک کے بنارس پہنچ گیا۔ فروری میں مراد اور اورنگ زیب بھی دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ لوگ ایک مہینہ دیر سے پہنچے۔ کیوں کہ مراد کو سورت سے قرض حاصل کرنا تھا اور وہ اس وقت تک نہ مل سکا جب تک کہ اس نے شہر کو فتح کر کے قلعے پر قبضہ نہ کر لیا۔ اس نے صوبے کے دیوان علی نقی کو جس کا سب سے بڑا گناہ ایمان داری اور شہنشاہ وقت سے وفاداری تھا محض اس موہوم اور بے بنیاد الزام پر کہ وہ اس کے خلاف غداری کر رہا ہے قتل کر کے اپنا راستہ صاف کر لیا۔ اورنگ زیب کو اس لیے دیر ہوئی کہ اس کو بھی

روپے کی سخت ضرورت تھی لہذا وہ بیجاپور اور گولکنڈہ سے وعدوں اور دھمکیوں کے ذریعے جو بھی ہاتھ آئے وصول کرنا چاہتا تھا۔ اس تاخیر کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اِن ریاستوں اور مغل سلطنت کے درمیان سرحدات کا مسئلہ 57-1656ء کی قراردادوں کے مطابق حل و فصل کرنا چاہتا تھا۔ بدقسمتی سے اِن ریاستوں کو سلطنت کے صحیح واقعات کا علم ہوگیا لہذا وہ ہر قسم کے مطالبے کو تاخیر میں ڈال رہے تھے اور اس کی راہ میں روڑے اٹکا رہے تھے اور اپنی کوششوں کو ناکام ہوتے دیکھ کر اورنگ زیب نے میر جملہ کے مال و دولت اور جائداد کو جو کہ اس کے کیمپ میں سب سے زیادہ مال دار آسامی تھا لوٹ لیا۔

جس وقت یہ شہزادے تیزی سے تیاریوں میں مصروف تھے دارا بھی غافل نہ تھا اُس نے ان واقعات کو شاہجہاں سے اس لیے چھپائے رکھا تھا کہ مبادا اس کی خراب صحت پر مضر اثر پڑے۔ اور بہت ممکن ہے اس کی بیماری شدت اختیار کرلے۔ آخرکار جب حالات نے نازک صورت اختیار کرلی اور دو شہزادوں نے اپنی بادشاہت کا اعلان بھی کردیا تو اس نے یہ خبر شاہجہاں کو پہنچائی۔ بوڑھا شہنشاہ بہت ہی پریشان و متفکر ہوا۔ اُس نے اپنے حریص لڑکوں کے خدشات کو دور کرنے کے لیے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی مہر اور دستخط سے ان کو خط ارسال کرے۔ لیکن آخر میں شہنشاہ نے تین فوجیں بھیجنے کا فیصلہ کیا پہلی فوج دارا کے بیٹے سلیمان شکوہ کی سرکردگی میں مشرق کی جانب، دوسری فوج راجا جسونت سنگھ کے ماتحت دکن کو اور تیسری قاسم خاں کی سالاری میں گجرات کی طرف۔ یہ فوجیں اس لیے روانہ کی گئی تھیں کہ وہ شہزادوں کی پایۂ تخت کی طرف پیشقدمی کو روکیں۔

شہنشاہ نے احتیاطاً ان کو یہ ہدایت بھی دی کہ از خود جھگڑا شروع نہ کریں بلکہ پہلے تو شہزادوں کو سمجھا بجھا کر لوٹانے کی کوشش کریں لیکن اگر یہ ترکیب کارگر ثابت نہ ہو تو پھر اس طرح جنگ کریں کہ کسی شہزادہ کا خون نہ بہے۔

شجاع نے ناصرالدین تیمور سوم کا لقب اختیار کرکے اپنی بادشاہت کا اعلان

کیا اور اپنے نام کا خطبہ اور سکّے رائج کر دیے۔ وقت ضائع کیے بغیر وہ ایک بڑی فوج اور مضبوط بیڑا و کافی تعداد میں توپیں لے کر روانہ ہوگیا۔ شاہجہاں نے شجاع کے مقابلے کے لیے جے سنگھ اور دلیر خان روہیلہ کی سالاری اور دارا کے بیٹے سلیمان شکوہ کی سرکردگی میں ایک مضبوط فوج بھیجی۔

بنارس سے پانچ میل کے فاصلے پر بہادر پور میں دونوں فوجیں 14 فروری 1658ء کو ایک دوسرے کے سامنے آموجود ہوئیں۔ شاہی افواج نے علی الصبح ایک ناگہانی حملہ جو پوری طرح کامیاب رہا۔ شجاع نے بڑی بہادری اور حوصلہ مندی کا مظاہرہ کیا لیکن اس کے باوجود فرار کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہا۔ اس کا کیمپ اور مال و دولت بڑی بے رحمی سے لوٹ لیے گئے اور فوج بکھر گئی۔ شجاع نے ایک فوری تیار شدہ دیوار کے پیچھے پناہ لی۔ سلیمان شکوہ کی فوج چودہ میل کے فاصلے پر رک گئی۔

اسی اثنا میں دربار سے سلیمان شکوہ کے نام حکم صادر ہوا کہ وہ جلد از جلد شجاع سے صلح کر کے تیزی سے واپس لوٹ آئے کیونکہ دھرمٹ کے مقام پر جسونت سنگھ کی فوج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور مراد اور اورنگ زیب کی مشترکہ افواج شمال کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھیں لہٰذا جلدی سے مئی 1658ء میں ایک معاہدہ کر لیا گیا جس کے مطابق اڑیسہ، بنگال اور بہار میں مونگھیر کا مشرقی علاقہ شجاع کو دے دیا گیا اور یہ طے پایا کہ وہ راج محل کو اپنا مرکز مقرر کرے۔

کہا جاتا ہے جے سنگھ کو دارا سے کوئی دیرینہ شکایت تھی کیونکہ دارا نے ایک مرتبہ اس کی تضحیک کی تھی۔ جے سنگھ نے یہ بات دل میں رکھی اور اب اس موقع پر بدلہ لینا چاہا۔ جے سنگھ دارا کی متعدد اور منکسرانہ درخواستوں کے باوجود جلد واپس نہ ہوا۔ دراصل بہادر پور کی فتح کے بعد اس نے ٹال مٹول کی کارروائی شروع کر دی۔ جب راجا الہ آباد سے ایک سو پانچ میل دور کوڑہ کے مقام پر پہنچا تو اس کو پتہ چلا کہ دارا ساموگڑھ کی لڑائی میں ہار گیا۔ چنانچہ راجا جے سنگھ سلیمان شکوہ اور دلیر خاں کو پیچھے چھوڑ کر تیزی سے آگرے کی طرف روانہ ہوگیا تاکہ اورنگ زیب سے جا ملے۔ ممکن ہے اس نے یہ سیاست اس

مقصد سے اختیار کی ہو کر فاتحین کو بیجا پور پر حملہ کرنے سے روکا جاسکے۔ اس نے دلیر خاں سے بھی یہی کہا کہ شہزادہ کو اس کی قسمت پر چھوڑ کر اس کے ساتھ آملے۔ وہ یہ بھی کر سکتا تھا کہ سلیمان کو اپنے قبضے میں لے کر اس کو اورنگ زیب کے سامنے بطور تحفہ پیش کر دے اس کے اس ناجوانمردانہ برتاؤ سے شجاع پر جو فتح اس نے حاصل کی تھی وہ کالعدم ہوگئی۔ اگر وہ شاہجہاں اور دارا کے ساتھ وفاداری کرتا اور شجاع کو بھی اس بات پر راضی کر لیتا کہ وہ بھی شاہی افواج میں شریک ہو جائے تو شاید حالات مختلف صورت اختیار کر لیتے۔

مراد اور اورنگ زیب شہنشاہ کے خطوط اور شاہی فوجوں کی پیش قدمی سے متاثر ہوئے بغیر آگے بڑھتے گئے اور اپریل 1658ء میں دیپالپور کے مقام پر ایک دوسرے سے آملے۔ اورنگ زیب کی حرکات اس قدر رازدارانہ تھیں کہ جسونت سنگھ کو ان کا علم بھی نہ ہوا۔ اس کو تو یہ گمان تھا کہ اس کو صرف مراد سے لڑنا ہے لیکن جب اس بات کی اطلاع ملی کہ دونوں بھائی متحد ہو گئے ہیں تو اس کو بڑا دھکا پہنچا۔ وہ گجرات اور دکن کی مشترکہ افواج کے مقابلے کے لیے جن کی سرکردگی مراد اور اورنگ زیب جیسے بہادر فوجی سالار کر رہے تھے تیار نہ تھا۔ اس نے ان دونوں سے تبادلۂ خیال کرنا چاہا لیکن اورنگ زیب اس بات کے لیے تیار نہ تھا کہ متحدہ افواج نے جو برتری جسونت سنگھ پر حاصل کر لی تھی اسے ہاتھ سے جانے دیا جائے۔ وہ دراصل غیر مشروط اطاعت سے کم کسی بات کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا لیکن جسونت سنگھ ایک مغرور جنرل تھا اور اس کے لیے باغی شہزادوں کے سامنے بلا قید و شرط تسلیم ہو جانا ناقابلِ تصور بات تھی۔ باوجودیکہ قاسم خاں اور اس کے درمیان تعلقات اچھے نہ تھے اور شہزادوں کے نعروں نے کچھ مسلمان افسروں کی ہمدردیاں بھی حاصل کر لی تھیں جسونت سنگھ کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ رہا کہ وہ آخری فیصلہ جنگ پر چھوڑ دے اس نے ایک دلیر راجپوت کی طرح شبخون مار کر شہزادوں کے توپ خانے پر قبضہ کرنے کی تجویز کو رد کر دیا۔

تقریباً اپریل کے وسط میں دھرمٹ کے مقام پر جو اجین سے چودہ میل شمال مغرب

میں واقع ہے فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ ابتدا میں اورنگ زیب خائدہ میں رہا کیوں کہ جسونت سنگھ نے جو میدان منتخب کیا تھا وہ ناہموار اور تنگ تھا جس کے سبب فوج کی حرکت میں دقت پیش آئی اور مختلف دستوں میں ہم آہنگی و مطابقت پیدا ہونا مشکل ہوگیا۔ اس کے علاوہ اس کے ہراول دستے کے ایک بازو نے مجہول تماشائی کی طرح عمل کرنے کا فیصلہ کیا لیکن ہراول کے دوسرے دستے نے مکند سنگھ کی سرداری میں اورنگ زیب کے توپ خانے پر بھاری حملہ کیا۔ اس حملے میں مکند کے آدمیوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا تاہم وہ توپ خانے کے سردار کو قتل کرنے اور اس کے آدمیوں کو مار بھگانے میں کامیاب ہو گئے۔ اب مکند کے سپاہی اکٹھے ہو گئے اور دشمن کے ہراول دستے پر سامنے سے حملہ کیا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی اور مکند کے آدمی آگے بڑھتے ہوئے اورنگ زیب کی فوج کے قلب پر حملہ آور ہوئے۔

اگر قاسم خاں بھی اسی جوش و خروش سے ان کی مدد کرتا یا جسونت سنگھ کی فوجیں ان کا ساتھ دیتیں۔ تو وہ دشمن کے ہراول دستے کو نیست و نابود کر دیتے لیکن قاسم خاں کی غداری اور تنگ میدان جنگ کے باوجود جو جسونت نے منتخب کیا تھا مکند کے سپاہی شیروں کی طرح لڑتے رہے اور انھوں نے آخری دم تک اورنگ زیب کے ہراول اور مرکزی و احتیاطی دستوں کا بہادری سے مقابلہ کیا۔

اسی دوران مراد نے بائیں بازو میں رخنہ کر دیا اور توپ خانے نے ایک مرتبہ پھر وحشتناک آتش فشانی شروع کر دی۔ اس کے علاوہ سسودیا راجپوت رائے سنگھ اور دیبی سنگھ بندیلہ اور ان کے سپاہیوں کے علاوہ کئی اور راجپوت سرداروں نے جسونت سنگھ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس نازک موقع پر جب کہ دشمن کی فوجیں چاروں طرف سے حملہ آور ہو رہی تھیں۔ قاسم خاں بھی فرار ہوگیا۔ جسونت سنگھ لڑائی میں زخمی ہوا اور اس کو بادل نخواستہ میدانِ جنگ سے بھاگنا پڑا۔ اورنگ زیب فتحیاب ہوا اور اس طرح پہلی شاہی دفاعی صف ٹوٹ گئی۔

فاتح افواج کیوں کہ بہت تھک چکی تھیں اور شاہی خیموں میں لوٹنے کے لیے کافی سامان موجود تھا لہذا دشمن کا پیچھا نہ کیا گیا۔ اورنگ زیب و مراد آگے بڑھے۔ جب

وہ گوالیار پہنچے تو نصیری خاں جو شاہی افواج سے منہ موڑ کر بھاگ آیا تھا ان کے ساتھ مل گیا۔ اس وقت دربار شاہی میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ شاہجہاں یہ چاہتا تھا کہ دونوں فاتح لڑکوں کو آگرے آنے دیا جائے اور پھر ان کو کھا بجھا کر سارے معاملات خوش اسلوبی سے حل کر دیے جائیں لیکن دارا یہ بات ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ آگرہ میں ایک بڑی فاتح فوج کا داخلہ خالی از خطر ہوگا۔

اس کا کہنا تھا کہ ایک تو کسی معاہدے کے خوش اسلوبی سے حل ہونے کا یقین نہ تھا دوسرے اس اقدام سے یہ خطرہ لاحق ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے فوجی سالار دل اور سپاہیوں کے حوصلے پست ہو جائیں اور وہ بڑی تعداد میں اس کا ساتھ چھوڑ بیٹھیں۔ علاوہ ازیں اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ مبادا سپاہیوں کے درمیان فساد ہو جائے اور یہ جھگڑا بڑھ کر جنگ کی صورت اختیار کر لے۔ لہٰذا بہتر یہی تھا کہ دشمن کی افواج کو دریائے چنبل پار کرنے سے باز رکھا جائے اور اسی دوران پر امن طریقے پر معاملات کو طے کرنے کے لیے بات چیت جاری رہے۔

دھرمٹ کی لڑائی میں شکست کھانے کے بعد دارا نے یہ چاہا کہ اس بات کی نگرانی کی جائے کہ کشتیاں مؤثر طریقے پر دشمن افواج کو دریا پار کرنے سے باز رکھ سکیں لیکن کچھ ہندو زمینداروں کی مدد سے اورنگ زیب کو بھدوار یا بھدرول کے قریب ایک غیر محفوظ گھاٹ مل گیا جو جنوبی فوج نے زبردست پریشانیوں کا سامنا اور بہت سی جانیں قربان کر کے پار کر لیا اور اس طرح اورنگ زیب نے دوسری فتح حاصل کر لی۔

خونریز جنگ کو روکنے کے لیے آخری کوششیں ابھی جاری تھیں۔ جہاں آرا نے اورنگ زیب کو مشورہ دیا کہ وہ باپ کی نافرمانی نہ کرے اور بڑے بھائی سے لڑائی مول نہ لے، اپنی جگہ قائم رہے اور اپنی شکایات کو شہنشاہ کے حضور پیش کرے تاکہ ان کا تدارک کیا جا سکے۔ جب دکن کی فوجیں پہنچ گئیں تو جہاں آرا بیمار شہنشاہ کی طرف سے اورنگ زیب کو اس بات کے لیے راضی کرنے کو گئی کہ فساد برپا کرنے سے

گریز کرے اور وعدہ کیا کہ اس کو تخت کا وارث بنوا دے گی۔ اس نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ دارا کو پنجاب اور دوسرے مغربی صوبے دے دئے جائیں۔ مراد کو گجرات، شجاع کو بنگال اور اورنگ زیب کے لڑکے معظم کو دکن دے دیا جائے۔ یہ بات چیت اس امر کی دلیل تھی کہ شہنشاہ اور اس کے طرفدار گھبرا گئے تھے اور ان کی حالت کمزور تھی۔ اس مسئلے کو چاہے جہاں آرا و شاہجہاں اور شاید دارا بھی خاندانی یا انفرادی مسئلہ سمجھتے ہوں لیکن اورنگ زیب اس مسئلے کو ایک بے رحم سیاست داں اور مذہبی متعصب کے نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ کسی قسم کی مروّت کے لیے تیار نہ تھا اور یہ ارادہ کر چکا تھا کہ دارا سے قطعی فیصلہ کر کے رہے گا۔ اس وقت اورنگ زیب کی سیاسی برتری اور اس کے دل میں دارا کی طرف سے جو مذہبی کینہ تھا دونوں ہی مل کر اس کو اس بات کے لیے اُبھار رہے تھے۔

متذکرہ بالا آخری کوششوں سے پہلے خود اورنگ زیب ایک خط کے جواب میں جو صلح کی شرائط کے بارے میں بھیجا گیا تھا یہ تجویز کر چکا تھا کہ "کیوں کہ دارا میرے مقابلے میں نہیں جیت سکتا لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ وہ پنجاب میں اپنی جاگیر پر واپس چلا جائے اور اعلیٰحضرت کی خدمت کا کام مجھ کو سونپ دے۔"

یہ تجویز دریائے چنبل عبور کرنے سے پہلے کی تھی لیکن سامو گڑھ پہنچ کر اس نے اپنا نظریہ بدل دیا۔ اس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ اس کی پہلی تجویز منظور نہیں کی گئی یا شاید اس وجہ سے کہ اس کو دریا پار کرنے کی اجازت نہ ملی تھی لیکن جب سامو گڑھ کی لڑائی سے قبل ان تجاویز کو مان لیا گیا تو اس وقت اورنگ زیب نے ان کو رد کر دیا جس کے سبب جہاں آرا اور شاہجہاں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اب یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ جنگ ناگزیر ہو گئی ہے۔

دارا کو پیچھے ہٹنا پڑا وہ آگرے سے آٹھ میل مشرق کی طرف سامو گڑھ کے مقام پر ٹھہر گیا اور پچاس یا ساٹھ ہزار سواروں کے ساتھ اپنے بھائیوں کے حملے کا انتظار کرنے لگا۔ یہ اس کی زبردست غلطی تھی کہ اس نے دشمن کی فوج پر جو کہ تیزی سے چل کر آ رہی

تھی اور تھک چکی تھی فوراً حملہ نہ کیا۔ یا تو دارا کو اپنی جیت کا پورا پورا یقین تھا یا پھر وہ یہ چاہتا تھا کہ جب تک دشمن خود پہل نہ کرے لڑائی نہ چھیڑی جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ فوری حملہ کرنے میں اُس کا مفاد مضمر ہے۔ شاید ان تینوں ہی وجوہات نے مل کر اُس کو اس بات پر آمادہ کیا اور یہ بات اُس کے مفاد کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوئی۔ دارا کے اس اقدام کے سبب اس کے سپاہیوں کے دلوں میں اس کی لیاقت کے بارے میں شبہات پیدا ہو گئے۔

آخرکار 31 مئی کو ساموگڑھ کے ریتیلے میدان میں تاریخ ہند کی ایک فیصلہ کن جنگ جو تخت نشینی کی جنگوں میں سب سے زبردست شمار کی جاتی ہے چھڑ گئی۔ دارا کی فوج اُس کے دشمنوں کی افواج سے کئی باتوں میں بہتر تھی۔ دارا کی فوج میں بارھہ کے مشہور سیّد موجود تھے جو کہ شاہی مغل فوج کا ستون تصوّرات سمجھے جاتے تھے۔ اُس کے ساتھیوں میں بوندی خاندان کے راجپوت شامل تھے۔ جو ہندوستان بھر میں اپنی بہادری اور موت سے بے خوفی کے لیے مشہور تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے دلیر اور لائق فوجی سردار مثلاً رستم خان، چترسال ہاڈا جس نے دکن اور دکن میں اپنے بہادری کے جھنڈے گاڑ دیے تھے اور مشہور دلیر خاں افغان شامل تھے۔ دارا کے پاس ایک موثر توپ خانہ بھی تھا اور زبردست سوار فوج بھی۔ اُس کی فوج کے نکات ضعف بھی واضح تھے۔ سب سے پہلا اور اہم نکتہ تو یہ تھا کہ اورنگ زیب کے مقابلے کا کوئی لائق اور مستقل مزاج سپہ سالار موجود نہ تھا۔ فوجی لیاقت میں اورنگ زیب و دارا کے درمیان کوئی مقابلہ نہ تھا۔ دوسری بات یہ کہ شاہجہاں کی فوج خود کو دارا کی فوج سے علیحدہ سمجھتی اور ہونے والی جنگ میں پوری طرح شرکت کے لیے تیار نہ تھی۔ سب سے آخری اور اہم نکتہ یہ تھا کہ دارا کی توپیں بھاری تھیں اور اُن کو جنگ کی ضروریات کے مطابق اِدھر اُدھر ہٹانا آسان نہ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب کی طرف نصیری خان اور بہادر خان کے علاوہ دارا کے افسروں جیسی شہرت کا کوئی افسر نہ تھا۔ لیکن اورنگ زیب اور مراد خود بڑے جانباز سپاہی اور عمدہ سالار تھے اور وہ دونوں مل کر کئی اچھے فوجی سرداروں پر حاوی

تھے۔ علاوہ ازیں اورنگ زیب کی فوج زیادہ منظم و تربیت یافتہ تھی اور اُس کے احکامات کو پوری طرح بجا لاتی۔ اُس کی توپیں ہلکی تھیں جو آسانی سے منتقل ہو سکتی تھیں۔ اُن کے چلانے والے بھی لائق و باتجربہ لوگ تھے۔

دارا نے جنگ کے شروع میں زبردست گولہ باری کی لیکن وہ مؤثر ثابت نہ ہوئی کیونکہ دشمن توپوں کی زد سے باہر تھا۔ جب اورنگ زیب نے اُس بے فائدہ گولہ باری کا زیادہ دیر تک جواب نہ دیا تو دارا کو یہ خیال ہوا کہ دشمنوں کو کوئی زبردست نقصان پہنچا ہے لہٰذا اُس نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے بائیں بازو کو رستم خان کی سرکردگی میں دشمن کے توپ خانے پر حملہ کرنے بھیجا۔ جب رستم خان کے سپاہی توپ کی زد میں آ گئے تو اُن کو زبردست اور مؤثر آتش باری کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ مجبوراً اپنا رُخ بدل کر اورنگ زیب کے ہراول دستے پر دوڑ پڑے۔ بیچ میں بہادر خان ان کے آڑے آیا۔ وہ ہار کر بھاگ جانے والا ہی تھا کہ دشمن کے دائیں بازو سے مدد پہنچ گئی۔ رستم خان کو گھیر لیا گیا اور وہ شیر کی طرح لڑتا ہوا مارا گیا۔

دارا جو قلب کی کمان کر رہا تھا رستم کی نجات کے لیے آگے بڑھا لیکن یہ اُس کی زبردست غلطی تھی کیوں کہ اب وہ دشمن اور اپنے توپ خانے کے درمیان آ گیا اور اس طرح توپ خانہ غیر مؤثر ہو کر رہ گیا۔ اُس کی اس حرکت سے نہ صرف یہ کہ بائیں بازو کو نہ بچایا جا سکا بلکہ فوج کا قلب بھی ضعیف و پراگندہ اور توپ خانہ بیکار ہو گیا اور اُس کے سپاہی بری طرح مارے گئے۔

دارا کے ہراول دستے کا حشر بھی اسی قدر افسوسناک ہوا۔ دارا کے ہراول دستے نے چھتر سال ہاڈا کی بہادرانہ قیادت میں دشمن کے بائیں بازو پر جس کی کمان شہزادہ مراد کے ہاتھ میں تھی زبردست حملہ کیا اور ایک خونریز جنگ کے بعد جس میں دونوں طرف سے بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ کیا گیا وہ دشمن کی فوج کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہوا۔ اب چھتر سال کی فوج دشمن کے قلب کی طرف متوجہ ہوئی جس کی کمان اورنگ زیب کے ہاتھ میں تھی۔ یہاں اُن کو بہت سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ راجپوت اب تھک چکے تھے اُن کی تعداد بھی کم

ہوگئی تھی اور اس وقت وہ مدد کے بہت ہی ضرورت مند تھے لیکن دارا کے دائیں بازو کے کمانڈر اور تورانی فوجوں کے سالار خلیل اللہ خاں نے غداری کی۔ وہ بے دلی سے کام لیتے ہوئے تماشا دیکھتا رہا۔ بہرحال راجپوت اس وقت تک لڑتے رہے جب تک کہ دشمن کی کثیر مقدار نے اُن کو کھلیان کے اناج کی طرح نہ کچل ڈالا۔ اس طرح دارا کا ہراول دستہ اور بایاں بازو برباد ہوگئے اور دائیں بازو نے غداری کی۔ اس کی یہ کوشش کہ پہلے وہ بائیں بازو اور پھر ہراول دستے کی مدد کرے بے فائدہ ثابت ہوئی۔ وہ دونوں میں سے کسی کو بھی فائدہ نہ پہنچا سکا۔

اس نازک وقت پر دشمن کا ہراول دستہ سلطان محمد کی سرکردگی میں جو کہ ابھی تک میدان میں نہ اُترا تھا حرکت میں آیا اور اس نے دارا کے قلب پر توپ خانے کی مدد سے حملہ کر دیا۔ گولہ باری اس قدر زبردست اور ہمہ گیر تھی کہ دارا کے بہی خواہوں نے اُس سے درخواست کی کہ وہ حوضہ پر اتر آئے کیوں کہ وہی اس وقت دشمن کی گولہ باری کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ اس نے بڑی حماقت سے اُن لوگوں کے مشوروں کو مان لیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے پراگندہ ساتھیوں کو اپنے گرد جمع کرنے لگا۔ جب سپاہیوں نے اس کا حوضہ خالی دیکھا تو انھیں یقین ہوگیا کہ دارا مارا گیا۔ اُن کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑگیا اور وہ فرار ہوگئے۔

دارا نے ہرچند اُن کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ دارا مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ میدان جنگ میں رہ گیا اور آخرکار اُس کو بھی اپنے بیٹے سپہر شکوہ کے ساتھ جو کہ بُری طرح رو رہا تھا بھاگنا پڑا۔ وہ بڑی مشکل سے آگرہ پہنچ پایا۔ اس جنگ میں جو 29 مئی 1658ء کو ہوئی دارا کی شکست قطعی اور اُس کی ناکامی بڑی دردناک تھی۔

دارا زیادہ دیر آگرے میں نہ رکا۔ شاہجہاں یہ چاہتا تھا کہ شہزادہ کہیں جانے سے قبل اُس سے بات کرے لیکن دارا شہنشاہ کو منہ دکھانے کے لائق نہ تھا۔ چنانچہ وہ اپنے خاندان اور بچوں کے ہمراہ اور جس قدر سونا و جواہرات لے جا سکتا تھا لے کر دہلی چلا گیا۔

اورنگ زیب نے شاہجہاں کو خط لکھا جس میں سارا الزام دارا پر تھوپا گیا کہ وہ یہ نہ چاہتا تھا کہ اورنگ زیب اپنے باپ سے مل کر اس کے خلاف جو شکایات تھیں اُن کو شہنشاہ کے حضور پیش کرسکے۔ اب کیوں کہ کوئی رکاوٹ اور مخالفت باقی نہ تھی لہذا فاتح شہزادے آگے بڑھے اور آگرے کے قریب آکر رک گئے۔

شہنشاہ نے اورنگ زیب کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کہ وہ باپ سے ملنے آئے تین مرتبہ کوشش کی۔ یہ بات تو واضح تھی کہ شہنشاہ دارا کو تہ دل سے چاہتا تھا لہذا اورنگ زیب کو اپنے حواریوں کا یہ مشورہ درست معلوم ہوا کہ ممکن ہے اس بلاوے میں کوئی گہری سازش پوشیدہ ہو۔ لہذا اس نے سارے بلاوے رد کردیے اور قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ شاہجہاں نے جہاں تک ہوسکا آگرے کا دفاع کیا۔ کیوں کہ قلعہ فتح کرنا آسان نہ تھا لہذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ دریائے جمنا کا پانی جو قلعہ میں جاتا ہے بند کردیا جائے۔ یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور اس کا نتیجہ جلد ہی برآمد ہوگیا۔ تین ہی دن میں مخالفت ٹھنڈی پڑگئی۔

شاہجہاں نے اورنگ زیب سے بڑے جذباتی انداز میں یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ مغلیہ سلطنت کے وقار کو ٹھیس نہ پہنچائے لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ آخرکار 8 جون 1658ء کو شاہجہاں نے قلعے کے دروازے کھول دیے۔ قلعہ مخالفین کے ہاتھ آگیا اور شاہجہاں کا دور ختم ہوگیا۔ شاہجہاں شاہی قیدی بناکر زنانہ محل میں نظربند کردیا گیا۔ 10 جون کو اورنگ زیب نے دربار کیا اور بغیر کسی ہنگامے یا رسمی تاجپوشی کے حکومت شروع کردی۔ اُس نے رسومات کو اس وقت تک کے لیے ملتوی کردیا جب تک کہ وہ اپنے رقیبوں سے نہ نبٹ لے۔

آگرے کی فتح کے بعد اورنگ زیب نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ دارا کا تیزی سے تعاقب کیا جائے۔ ابھی اس کو کم از کم سلیمان شکوہ کے روکنے کے لیے جس کے پاس 22 ہزار فوج تھی اور جس نے شجاع کو فروری میں ہرا دیا تھا مناسب انتظام کرنا تھا۔ علاوہ ازیں اس کو مراد سے بھی نبٹنا تھا جس نے آزادانہ رویہ اختیار کرلیا تھا۔ مراد نے اورنگ زیب کے سپاہیوں کو بڑی بڑی تنخواہیں اور عہدے و جاگیریں دے کر اپنی طرف ملا لیا اور خود ہی اعلیٰ القاب و خطابات جاری کرنا شروع کردیے۔

شہزادہ مراد نے شاہجہاں سے اپنے سلوک کی معافی چاہی اور اپنے برتاؤ کے سلسلے میں اپنی مجبوری ظاہر کرکے معافی کا خواستگار ہوا۔ بظاہر وہ اپنے باپ کو تخت سے اتار کر حکومت چھین لینے کا ارادہ نہ رکھتا تھا۔ اس کا طریقۂ عمل اورنگ زیب سے مختلف تھا۔ اورنگ زیب آگرے سے آہستہ آہستہ دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے پیچھے مراد بھی اپنی علیحدہ اور آزاد فوج لے کر جس کی تعداد 20 ہزار تھی چل دیا۔ اورنگ زیب مراد سے اس لیے نہیں لڑ سکتا تھا کہ اس نے ابھی تک دشمنی کا کھلم کھلا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ مراد سے جنگ مول لینا مصلحت کے خلاف بھی تھا۔ اورنگ زیب کے پاس مراد سے نپٹنے کے لیے دو ذریعے تھے۔

اورنگ زیب نے مراد کو اس کی صحت یابی کی خوشی میں کئی مرتبہ ضیافت کی دعوت دی لیکن ہر دفعہ مراد نے اس کو نرمی اور اخلاق سے رد کردیا۔ اب اورنگ زیب نے مراد کے ایک مصاحب نورالدین کو ورغلایا۔ ایک روز جب کہ مراد شکار میں زبردست دوڑ دھوپ کرنے کے بعد متھرا کے قریب سے تھکا ہارا واپس آ رہا تھا نورالدین نے اس کو راستے میں اس بات کے لیے راضی کرلیا کہ وہ اورنگ زیب کے ڈیرے میں آرام کرے۔

اورنگ زیب نے شہزادے کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا، اس کو عمدہ کھانا کھلایا اور شاید شراب بھی پلائی اور مراد سے کہا کہ وہ تھکن اتارنے کے لیے سو جائے۔ شہزادہ جال میں پھنس کر سو گیا۔ چپکے سے اُس کی ڈھال اور تلوار ہٹالی گئی اور جب شور کی آواز سن کر اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے خود کو قیدی پایا۔ اُس کی دلیل و حجت کارگر واقع نہ ہوئی اور اُس کو قیدی بنا کر دہلی بھیج دیا گیا تاکہ وہ سلیم گڑھ کے قلعے میں بند کردیا جائے۔ مراد کے ساتھی حیران و پریشان تھے انھیں اس بات کا علم نہ تھا کہ ان کے آقا کو کہاں بھیج دیا گیا ہے۔ بہرحال ان لوگوں کو اورنگ زیب کی ملازمت میں لے لیا گیا اور وہ خاموش ہوگئے۔

اورنگ زیب اپنے قریب ترین دشمن سے چھٹکارا پاکر اور اپنی فوج میں مراد کی فوج ملاکر اس قدر قوی ہوگیا کہ اس نے ناصری خان کو الہ آباد فتح کرنے اور سلیمان شکوہ

سے نپٹنے بھیج دیا۔ اورنگ زیب نے سلیمان کو اس بات سے روکنے کے لیے کہ وہ اپنے باپ سے نہ جا ملے احتیاطاً دو مضبوط دستے بھیج دیے تاکہ وہ دریائے گنگا یا جمنا پار نہ کر سکے۔

اورنگ زیب اب اطمینان سے دارا کا تعاقب کر سکتا تھا۔ اورنگ زیب جب دہلی کی طرف بڑھا تو دارا خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے مشرق کی طرف جانے اور سلیمان سے ملنے کی کوشش نہ کی کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ خود کو اورنگ زیب اور شجاع کے درمیان ڈال دینا غیر عاقلانہ فعل ہوگا۔ سلیمان شکوہ کی آمد کا انتظار کیے بغیر وہ لاہور کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ دہلی بغیر لڑے اورنگ زیب کے قبضے میں آ گئی اور اس نے پایۂ تخت کی فتح یابی کی خوشی میں شالامار باغ میں اپنی تاج پوشی کی رسم ادا کی اور مزید وقت ضائع کیے بغیر دارا کے تعاقب میں چل دیا۔

دارا اب اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ باوجودیکہ اس کے پاس کثیر مقدار میں نقد، جواہرات، لڑائی کا سامان اور چودہ ہزار فوج تھی تاہم وہ مقابلے کی ہمت نہ کر سکا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دارا اپنی شکست کے جھٹکے کو دل سے نکال نہ سکا تھا۔ جب اورنگ زیب کی فوج نے دریائے بیاس پار کیا تو وہ لاہور سے ملتان کی طرف فرار ہو گیا۔ دارا کی اس کمزوری اور قوتِ فیصلہ کی کمی کے سبب اس کے ساتھیوں پر برا اثر پڑا اور ان کی بڑی تعداد دارا کو چھوڑ کر علیحدہ ہو گئی۔

اورنگ زیب نے بغیر کسی خاص مشکل کے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ وہ آگے بڑھ کر ملتان پہنچا لیکن دارا وہاں سے چند روز قبل ہی بھاگ کر بھکر جا چکا تھا۔ اب اورنگ زیب کو دارا کی مایوسانہ حالت کا پورا اندازہ ہو گیا۔ چنانچہ اس نے تعاقب کا کام اپنے دو لائق افسروں شیخ میر اور دلیر خان کو سونپا اور خود ستمبر 1658ء میں دہلی کی طرف لوٹا تاکہ شجاع کے ساتھ جو کہ الٰہ آباد کی طرف بڑھ رہا تھا نبٹ سکے۔

جونہی سلیمان شکوہ نے اپنی پیٹھ موڑی شہزادہ شجاع کو اورنگ زیب کا خط ملا جس میں تحریر یہ تھا کہ بہار کا صوبہ اس کو عطا کیا گیا۔ دارا کی شکست سے شجاع کا کھویا ہوا وقار واپس مل گیا۔ اور جب اس نے یہ سنا کہ اورنگ زیب آگرے میں موجود نہیں تو اس کو یہ

ہمت ہوئی کہ وہ اس شہر پر قبضہ کرلے۔

ان باتوں کو سوچ کر شجاع بہار سے چل کر الہ آباد پہنچ گیا۔ اس کو کسی مخالفت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ الہ آباد کا قلعہ جیتنے کی کوشش میں وقت ضائع کیے بغیر وہ آگے بڑھ گیا لیکن اورنگ زیب کے سب سے بڑے بیٹے سلطان محمد نے کھوا کے مقام پر شجاع کی پیش قدمی کو روک دیا۔

جب شجاع کو یہ معلوم ہوا کہ اورنگ زیب جو کہ اپنے بیٹے سے ایک یا دو منزل دور تھا 2 فروری 1659ء کو اس سے آملا ہے اور میر جملہ بھی دکن سے پہنچ گیا ہے تو اس کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اورنگ زیب نے وقت ضائع کیے بغیر 3 جنوری کو اُکسانے کے لیے حرکات شروع کیں۔ پانچ کی رات کو جسونت سنگھ نے جو فوج کے دائیں بازو کا سالار تھا اورنگ زیب کی فوج میں بھگدڑ مچادی۔ جسونت سنگھ شجاع کے ساتھ چھپا چوری رابطہ قائم کیے ہوئے تھا۔ اس نے منصوبہ بنایا تھا کہ وہ اورنگ زیب کی فوج پر پیچھے سے حملہ کرے گا اور شجاع اسی لمحہ آگے سے حملہ آور ہوگا۔ اس تجویز کے مطابق جسونت سنگھ حملہ آور ہوا۔ اور کیمپ کو لوٹ لیا لیکن شجاع نے کوئی حرکت نہ کی۔ کیوں کہ اس کو جسونت سنگھ کے متعلق شبہ تھا۔ اس طرح اورنگ زیب بچ گیا اور اُس نے کامیابی سے بھگدڑ پر قابو پاکر امن و امان قائم کرلیا۔ جسونت سنگھ کا مقصد لڑنا نہ تھا وہ تو محض یہ چاہتا تھا کہ اورنگ زیب کی فوج میں بدامنی پیدا ہو جائے تاکہ شجاع اس کا فائدہ اُٹھاسکے۔ لیکن جب شجاع نے کوئی حرکت نہ کی تو جسونت سنگھ مال غنیمت لے کر اپنے وطن کی طرف روانہ ہوگیا۔

جسونت سنگھ کے فرار کے باوجود اورنگ زیب کے پاس اب بھی شجاع سے تقریباً دوگنی فوج موجود تھی۔ اس نے اپنی فوج کو از سر نو تنظیم کرکے لڑنے کی تیاری کرلی شجاع نے بڑے زور و شور سے حملہ کیا اور اس کا بایاں بازو توڑ کر داہنے بازو اور قلب کی طرف بڑھا لیکن شجاع کی پیش قدمی کو اورنگ زیب کے توپ خانے کی متواتر گولہ باری اور بندوقچیوں کی گولیوں نے روک دیا اور وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اس لمحہ

اورنگ زیب نے عام حملے کا حکم دیا۔ جب گولہ باری بہت تیز ہوگئی تو شجاع کو یہ مشورہ دیا گیا کہ وہ اپنے ہاتھی پر سے اتر آئے اس نے یہی کیا لیکن جب اُس کے ساتھیوں نے اُن کا حوضہ خالی پایا تو ان کی ہمت ٹوٹ گئی اور وہ گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ شجاع اپنے بیٹوں اور بعض ساتھیوں کے ساتھ تیزی سے بنگال کی طرف بھاگا۔

کہا جاتا ہے کہ شجاع کی شکست کی وجہ اُس کے دو اہم سالاروں مرادخاں اور عبدالرحمان کی دشمن سے ساز باز تھی۔ اورنگ زیب نے اپنے بیٹے محمد اور میر جملہ کو شجاع کے تعاقب میں بھیجا۔ شجاع نے الہ آباد پر قبضہ کرنا چاہا لیکن گورنر نے اطاعت سے انکار کر دیا۔ چنانچہ وہاں سے وہ پٹنہ اور مونگھیر کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے مقابلہ کرنا چاہا لیکن میر جملہ اس کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔ شجاع بھاگتا رہا اور میر جملہ و شہزادہ برابر اس کا تعاقب کرتے رہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ سارا ملک ہگلی تک میر جملہ کے تصرف میں آگیا۔

شجاع خشکی کی لڑائی میں ہار کر اس فکر میں تھا کہ اپنی بڑی توپوں اور پرتگیزی توپچیوں کی مدد سے بحری لڑائی میں قسمت آزمائی کرے۔ میر جملہ کے پاس نہ تو اعلیٰ قسم کا بحری اسلحہ موجود تھا اور نہ کافی مقدار میں کشتیاں تھیں لہٰذا وہ مناسب موقع کی تلاش میں رہا۔ ایک دفعہ اس نے ناعاقبت اندیشانہ تجربہ کیا جس میں اس کے ساتھیوں کو شکست اٹھانا پڑی اور بہت سی جانیں ضائع گئیں۔

اس کامیابی سے شجاع کا حوصلہ بڑھ گیا اور اُس نے حملہ کر کے راج محل فتح کر لیا۔ شجاع راج محل کو زیادہ عرصے تک اپنے پاس نہ رکھ سکا اور آخر کار اُس کو وہاں سے نکلنا پڑا۔

اسی دوران میر جملہ کو تازہ کمک مل گئی اور اُس نے بڑی شدت سے حملے شروع کر دیے۔ دریائے مہاندی کے کنارے میر جملہ نے شجاع کے آدمیوں کو زبردست شکست دی اور ان کی توپیں چھین لیں۔ آگے بڑھ کر میر جملہ نے ٹانڈہ پر قبضہ کر لیا۔ شجاع ڈھاکہ ہوتا ہوا مئی 1660 میں ارکان کی طرف بھاگا اور خود کو

ارکان کے بحری ڈاکوں کی پناہ میں دے دیا۔ اس کے بعد سے شجاع کا کہیں پتہ نہ چلا۔ کہا جاتاہے کہ اس نے ارکان کے بادشاہ کے قتل کے منصوبے میں حصّہ لیا۔ لیکن یہ سازش پکڑی گئی اور شجاع کو قتل کر دیا گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ مکّہ چلا گیا۔

بھکر کا قلعہ بہت مضبوط تھا اور صرف چند ہزار سپاہی اچھی طرح سے اس کی حفاظت کر سکتے تھے لیکن دارا اس قدر خوف زدہ تھا کہ وہ اس قلعے میں بھی پانچ دن سے زیادہ نہ ٹھہرا۔ اس نے اپنے سب سے زیادہ لائق اور وفادار افسر داؤد خاں کو جس پر کہ وہ لاہور ہی میں شبہ کرنے لگا تھا برخاست کر کے زبردست غلطی کی۔ اس کے اس شک کی وجہ یہ تھی کہ اورنگ زیب نے ایک جعلی خط داؤد خاں کو لکھا اور یہ انتظام کرایا کہ دارا کے آدمی اس خط کو بیچ ہی میں حاصل کرلیں

داؤد نے اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور کہا جاتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں اس حد تک بڑھ گیا کہ اس نے اپنے یہاں کی عورتوں کو اس وجہ سے قتل کر دیا کہ کوئی چیز اس کی وفاداری میں مخل نہ ہو اور وہ یکسو ہو کر خود کو دارا کی خدمت کے لیے وقف کر دے۔ لیکن دارا اپنا دماغی توازن کھو چکا تھا اور آخرکار اس نے داؤد کو اپنی خدمت میں رکھنے سے انکار کر دیا۔ اگر دارا کی بیویوں نے بلوچستان ہو کر جانے سے انکار نہ کیا ہوتا تو وہ ایران بھاگ جاتا۔

اب وہ سہوان کی طرف مڑا۔ یہاں بھی قبل اس کے کہ وہ سہوان کے قلعے پر قبضہ کر سکے اس کے دشمن پہنچ گئے لہذا وہ مشتعل ہوتا ہوا کچھ کی طرف بھاگا۔ رانا نے دارا کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور اپنی ایک بیٹی کی شادی سپہر شکوہ سے کر دی۔ یہاں سے وہ جام نگر پہنچا اور یہاں بھی اس کا استقبال کیا گیا۔ جب وہ احمدآباد کی طرف روانہ ہوا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کیوں کہ وہاں کے صوبے دار شاہنواز خاں نے اس کو خوشی سے شہر میں داخل ہونے دیا اور مدد دینے کا وعدہ بھی کر لیا۔ یہاں پر جنوری 1659ء میں دارا نے 22 ہزار فوج جمع کرلی۔

اب دارا کے لیے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ دکن جائے اور وہاں کی ریاستوں

کو آمادہ کرے کہ وہ اس کا اسی طرح ساتھ دیں جس طرح اس نے اورنگ زیب کے خلاف ان کا ساتھ دیا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ شمال کی طرف روانہ ہو جائے۔ وہاں پہنچ کر اپنے راجپوت ساتھیوں کی کمک حاصل کر کے ایک دفعہ پھر آگرے پر حملے کی کوشش کرے۔ اس نے دوسرا طریقہ کار اختیار کیا کیوں کہ اوّل تو اس کو اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ اورنگ زیب شجاع سے نبٹنے مشرق کی طرف گیا ہوا ہے اور دوسرے اس سبب سے کہ جسونت سنگھ نے ایک بار پھر اس کی حمایت میں لڑنے کا وعدہ کیا۔ ان امیدوں کے ساتھ دارا اجمیر کی طرف روانہ ہو گیا۔

دارا کو جب یہ پتہ چلا کہ اورنگ زیب شجاع کو شکست دے کر جسونت سنگھ سے لڑنے کے لیے واپس آ گیا ہے تو اسے کو سخت مایوسی ہوئی۔ ایک طرف تو راجا جے سنگھ نے یہ کوشش کی کہ جسونت سنگھ اورنگ زیب سے آملے۔ دوسری طرف اورنگ زیب نے راٹھور راجکمار کو ڈرانے کے لیے فوجی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ ان وجوہ سے جسونت سنگھ نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اورنگ زیب نے جسونت سنگھ کو مارواڑ کا حکمراں تسلیم کر لیا اور اس کو گجرات کا صوبے دار مقرر کر دیا۔ راجپوتانہ کا ایک اور اہم حکمراں رانا راج سنگھ جو اودے پور کا راجا تھا پہلے ہی اورنگ زیب کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا چکا تھا جس کے بدلے میں اس کو چھ ہزار ذات اور چھ ہزار سوار کا منصب اور ڈونگر پور و بانس واڑا کے کئی پرگنے جاگیر میں مل گئے تھے۔ اس طرح راجپوتانے کے تینوں اہم حکمراں اورنگ زیب سے مل گئے۔ دارا نے ہر چند رانا سے داد و فریاد اور درخواست کی اور یہ بات یاد دلائی کہ جب رانا سے شاہجہاں ناراض ہو گیا تھا تو دارا نے کس طرح اس کی طرفداری کی تھی لیکن رانا کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔

اب دارا کے لیے واپس جانا یا اپنے منصوبے کو بدلنا ممکن نہیں تھا۔ کیوں کہ اورنگ زیب اتنا قریب آ چکا تھا کہ واپسی کا سوال ہی نہ رہا تھا۔ اورنگ کے مقابلے میں دارا کی فوج بہت کم تھی اس لیے وہ کھلے میدان میں جنگ نہ کر سکتا تھا۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اجمیر کے قریب دیورائے گھاٹی میں ڈیرے ڈال دیے۔ دارا نے جو فوجی ترتیب

اختیار کی وہ آہنی مضبوط تھی کہ اورنگ زیب کی فوج کی کثیر تعداد مفید ثابت نہ ہو سکی۔
تین دن کی جنگ کے بعد دارا کا بایاں عقبی بازو جس کی سرکردگی جو کا غدار راجا' راجا روپ
کر رہا تھا باغی ہو گیا اور اس کے سپاہی پہاڑیوں کے اوپر کمند ڈال کر چڑھ گئے۔
اس کا بایاں بازو جس کی سرکردگی شاہنواز کے ہاتھ میں تھی ایک خونریز دست بدست
جنگ کے بعد بالکل ختم ہو گیا۔ حالانکہ ابھی تک دایاں بازو صحیح حالت میں تھا لیکن وہ بھی
اتنا کمزور ہو گیا کہ دارا نے ایک مرتبہ پھر مارچ 1659ء میں بھاگ کر جان بچانے کا فیصلہ
کیا۔ وہ پسپا ہو کر احمد آباد گیا لیکن وہاں پہنچ کر اس کو یہ پتہ چلا کہ اس نے احمد آباد
سے چلتے وقت جو صوبے دار مقرر کیا تھا اُس کو اورنگ زیب کے وفادار افسروں
نے گرفتار کر لیا۔ چنانچہ اس کو احمد آباد میں داخلہ نہ ملا۔ ادھر راجا جے سنگھ پوری شدت
کے ساتھ اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

دارا ایک مرتبہ پھر کچھ کی طرف بھاگا۔ اس کے ساتھ کوئی کا ایک ٹاکو کان ہوک جی
بھی تھا لیکن جے سنگھ کے خوف سے راؤ نے دارا کو مدد دینے سے انکار کر دیا۔ دارا بڑی
مایوسی کی حالت میں ایک مرتبہ پھر مئی 1659ء میں سندھ کی طرف روانہ ہوا اور یہ فیصلہ
کیا کہ قندھار کے راستے ایران چلا جائے گا۔ بدقسمتی سے اس کی بیوی نادرہ بیگم بیمار تھی۔
لہٰذا جب تک کہ اس کو کسی محفوظ جگہ چھوڑنے کا انتظام نہ کر دے جا نہ سکتا تھا۔ اس وقت
دارا کا ایک غلام بسنت ایک پرانے غدار ملازم خلیل اللہ خاں کے مقابلے میں بھکر کے
قلعے کی حفاظت کر رہا تھا لہٰذا دارا نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ کچھ بلوچ سرداروں کی مدد سے
بھکر کو نجات دلائے۔ اس کی نظرِ انتخاب ملک جیون پر پڑی جس کو اس نے ایک مرتبہ
شاہجہاں کی دی سزائے موت سے بچایا تھا۔ ملک جیون نے بظاہر بڑی گرم جوشی
سے اس کا استقبال کیا۔ یہاں 6 جون 1659ء کو نادرہ بیگم جو دارا کی خدمت گزار
بیوی' دوست اور غمگسار بھی تھی فوت ہو گئی اور یہ وصیت کر گئی کہ اس کو سرزمینِ
ہند میں دفن کیا جائے۔ اس کے جسدِ خاکی کو دارا نے اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے
ایک محافظ دستے کے ہمراہ لاہور بھیج دیا۔ نادرہ بیگم کی وفات سے دارا کو سخت

صدمہ پہنچا اور وہ اپنے مٹھی بھر ساتھیوں سے بھی بہت بر زار ہوگیا جو اس آڑے وقت میں بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ اب دارا پوری طرح ملک جیون کے رحم وکرم پر تھا ملک جیون نے اس کے احسان کا بدلہ اس طرح چکایا کہ اس کو لوٹ کر بہادر خاں کے سپرد کردیا اور دارا ایک قیدی کی حیثیت سے اگست 1659ء میں دہلی لے جایا گیا۔ دارا کو بے عزت کرکے شہر کی گلیوں میں گشت کرایا گیا اور پھر قید میں ڈال دیا گیا۔ عوام نے دارا سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ وہ روئے۔ آہیں بھریں اور غداروں کو گالی کوسنے دیے اور 24 گھنٹے بعد ملک جیون اور اس کے ساتھیوں پر شدید حملے کی صورت اختیار کرلی جس میں کچھ بلوچی مارے گئے اور اگر پولیس بروقت ملک جیون کی مدد کو نہ پہنچ جاتی تو وہ بھی یقیناً مارا جاتا۔ اس مصیبت سے بچ کر جب ملک جیون اپنی جاگیر واپس جا رہا تھا تو اس کو راستے میں ہی قتل کردیا گیا۔

عوام نے دارا کی موافقت میں جو مظاہرے کیے ان کے سبب دارا کی قسمت کے فیصلے میں عجلت کی گئی۔ شاید اورنگ زیب کے علاوہ اس کی چھوٹی بہن روشن آرا بھی دارا کے قتل کی بہت خواہش مند تھی۔ یہ مسئلہ اراکین شریعت کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور انھوں نے "امن وامان کے برباد کنندہ" دارا کو "مذہب اور مقدس قانون کی حفاظت اور بہبود کی خاطر" سزائے موت تجویز کی۔ دارا کو اس فیصلے کا علم ہوگیا اور اس نے اورنگ زیب سے بڑی عاجزی کے ساتھ رحم اور جان بخشی کی درخواست کی اور یہ وعدہ کیا کہ اپنی زندگی کے بقیہ ایام گوشہ نشینی میں گزارے گا۔ لیکن یہ سب کچھ بے کار ثابت ہوا۔ اورنگ زیب نہ تو بابر تھا اور نہ ہی ہمایوں۔ وہ شاہجہاں کا لڑکا اور سردمہر انسان تھا اس سے رحم کی امید کرنا ایسا ہی تھا جیسے سنگ خارا کے سامنے آہ وزاری کرنا۔

30 اگست 1659ء کو شاہجہاں کا محبوب اور سب سے بڑا لڑکا جلادوں کے خنجروں کا شکار ہوگیا۔ اس کا سر کاٹ کر شہنشاہ کے حضور میں پیش کیا گیا لیکن اس نے دیکھنے سے انکار کردیا۔ اس کا بے سر اجسم شہر کے گلی کوچوں میں گشت کرایا گیا اور پھر ہمایوں کے مقبرہ میں بغیر کسی رسوم کی ادائیگی کے دفن کردیا گیا۔

اب اورنگ زیب کے دشمنوں میں صرف ایک ہی جوان نبٹنے کے لیے باقی رہ گیا تھا یہ دارا کا بڑا لڑکا سلیمان شکوہ تھا۔ ساموگڑھ کی شکست سے سلیمان پر بڑا اثر پڑا۔ اس کی 22 ہزار کی فوج گھٹتے گھٹتے محض 6 ہزار رہ گئی۔ ساتھ چھوڑنے والوں میں امبر کا راجا جے سنگھ اور دلیر خاں بھی تھے۔ ان لوگوں کے فرار نے سلیمان کو مجبور کردیا کہ وہ الٰہ آباد کے قلعے میں پناہ لے۔ اس نے بارھہ کے سیدوں کے کہنے پر پنجاب جاکر اپنے باپ سے ملنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور آخر کار مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ گڑھوال میں پناہ لی۔

اورنگ زیب نے راجا پرتھوی سنگھ کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا جو شہزادہ سلیمان کو سپرد کرنے پر آمادہ نہ تھا اور جے سنگھ سے کہا کہ وہ اپنا اثر و رسوخ اس ہندو راجا پر ڈالے۔ راجا اب بھی اس کمینہ حرکت کے لیے تیار نہ تھا کہ ہندو روایت مہمان داری کو توڑ کر اپنے پاس پناہ لینے والے کو دشمن کے سپرد کردے لیکن اس کا لڑکا میدنی رائے جے سنگھ کے جال میں پھنس گیا اور 12 دسمبر 1660ء کو شہزادے کو دشمنوں کے سپرد کردیا۔ شہزادے کو قیدی بناکر دہلی اور پھر آگرہ اور پھر وہاں سے جنوری میں گوالیار بھیج دیا۔ جہاں وہ مئی 1662ء میں تھوڑا تھوڑا افیون کے زہر سے جو اسے دیا جارہا تھا اور خود اپنے غم کے اثر سے :: دارالبقا میں اپنے باپ سے جا ملا۔ ازراہِ مہربانی اورنگ زیب نے سپہر شکوہ کو بارہ سال کی قید کے بعد رہا کردیا۔

اس واقعے سے صرف چھ مہینے قبل دسمبر 1661ء میں قلعہ گوالیار نے سلیمان کے بدبخت چچا شہزادہ مراد کے قتل کا بھی مشاہدہ کیا تھا۔ اس کو علی نقی دیوان، گجرات کے قتل کے جرم میں سزائے موت دے دی گئی۔

علی نقی کے ایک لڑکے نے اورنگ زیب کے ورغلانے پر مراد کے خلاف یہ الزام لگایا تھا۔ اورنگ زیب مراد کے ختم کرنے کے لیے کسی قانونی جواز کا منتظر تھا کیوں کہ بعض مغل سپاہی اب بھی مراد کو پسند کرتے تھے اور انھوں نے اس کو رہا کرانے کی کوشش بھی کی تھی جو کسی حد تک کامیاب بھی رہی۔ اس سازش میں

صرف اتنی کسر رہ گئی تھی کہ مراد نکل نہ سکا۔ باغیوں نے ریشوں کا زینہ بنا کر اس کو قلعہ کی دیوار سے لٹکا دیا تاکہ مراد اُتر سکے اور نیچے کھڑے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو کر فرار ہو جائے۔ مراد قلعہ کی دیوار سے اترنے ہی والا تھا کہ اس کی محبوب داشتہ نے رنج و غم سے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔ قلعہ کے محافظ جاگ گئے اور راز فاش ہو گیا اور ساری محنت اکارت گئی۔

اس طرح چار سال کے عرصے میں اورنگ زیب نے اپنے سب حریفوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ اورنگ زیب نے بڑی مہربانی اور کشادہ دلی سے شاہجہاں کو زندہ چھوڑ دیا کہ اپنی مصیبت زدہ زندگی کے آخری چند سال اور کاٹ لے۔ شہزادی جہاں آرا کو موقع دے دیا کہ وہ اپنے بوڑھے باپ کی خدمت کرے اور اس کا غم بٹائے۔
انتقام کے دیوتا نے شاہجہاں سے اس کے بھائیوں اور بھتیجوں کے قتل کا بڑا بے رحمانہ انتقام لیا۔ شاہجہاں کو اس بڑھاپے میں اپنے بیٹے اور پوتوں کے قتل کا صدمہ اُٹھانا پڑا۔ جہانگیر اس قسم کی بدقسمتی سے جو کہ شاہجہاں کا مقدر بن چکا تھا بچ گیا۔

یہ سچ ہے کہ بادشاہت کسی رشتے داری یا عزیز داری کو نہیں مانتی لیکن خدائے بزرگ و برتر کے نزدیک بادشاہت کی اہمیت اس سے بھی کم ہے کوئی تعجب نہیں کہ اورنگ زیب نے شاہجہاں کو یہ لکھا "آپ کو اب اپنے بھائی خسرو اور شہریار کی یاد تو آتی ہو گی جن کو آپ نے اپنی تخت نشینی سے پہلے قتل کرا دیا حالانکہ انہوں نے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچایا تھا۔"

شاہجہاں نے اپنی زندگی کے آخری ایام ایک طرح سے نظر بندی میں گزارے اس کی نقل و حرکت پر سخت نگرانی رکھی جاتی۔ اس کے متعلق ہر دم یہ خوف لگا رہتا کہ کہیں وہ پوشیدہ طریقے سے اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے دوبارہ قوت حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔ کسی کو شاہجہاں سے تنہائی میں ملنے کی اجازت نہ تھی۔ ساری ملاقاتیں اورنگ زیب کے لڑکے محمد کی موجودگی میں ہوتیں۔ شاہجہاں کے ہر قول و فعل کی

طلاع فوراً اورنگ زیب کو دی جاتی۔ شاہجہاں کو خط و کتابت کی اجازت نہ تھی۔ آہستہ آہستہ اس کے سارے جواہرات اس سے لے لیے گئے اور کبھی کبھی تو اس کو چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے بھی پریشانیاں اٹھانی پڑتیں۔

کامبو کا قول ہے "بوڑھے شہنشاہ پر جو مصیبت پڑی اس کا ذکر بہت دردناک ہے۔ شاہجہاں کو یا تو قنوج کے ایک خدارسیدہ بزرگ اور عالم سید محمد کی گفتگو اور وعظ سے اطمینانِ قلب نصیب ہوتا یا پھر اپنی ہمدرد و غمگسار خوبصورت اور درویش منش بیٹی جہاں آرا کی محبت بھری خدمات سے تسکین ہوتی۔ بوڑھا شہنشاہ بڑے استقلال سے آخرت کی تیاریوں میں مصروف رہتا۔ مذہبی فرائض کو پوری احتیاط سے انجام دیتا۔ آخرکار دوشنبہ 22 جنوری 1666ء کو شاہجہاں تسلیم و رضا کا پتلا بڑی پُرسکون حالت میں تاج محل پر آنکھیں جمائے اس دنیا سے رخصت ہو کر اپنی بیوی سے جا ملا اور اس کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

شاہجہاں کا دورِ حکومت بڑی خوش حالی کا دور تھا۔ تخت طاؤس اور جواہرات کی چمک دمک غیر ملکی سیاحوں کی آنکھوں کو چکا چوندھ کر دیتیں۔ تاج محل، موتی مسجد اور شاہجہاں آباد کی جامع مسجد و قلعہ آج تک شاہجہاں کے عہد کی شان و شوکت اور سلطنت مغلیہ کی عظمت کی شہادت دے رہے ہیں۔ دہلی، لاہور اور کشمیر کے باغات اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس کو اشجار و انہار و گلہائے رنگارنگ سے کتنی دل چسپی تھی۔ اسی کے زمانے میں علی مردان خان اٹھانوے میل لمبی ایک نہر دریائے راوی سے نکال کر لاہور تک لایا۔ اسی بادشاہ کے عہد میں نہر شہاب یا قدیم فیروز نہر جس میں ریت بھر گیا تھا نہ صرف صاف کرائی گئی بلکہ اس کو مزید ساٹھ میل طویل کر کے نہر بہشت کا نام دیا گیا۔

خافی خان کا کہنا ہے کہ تیموریوں کی پوری نسل میں ایسا کوئی بادشاہ نہ ہوا جو تعلیم، اصلاح خزانہ، انتظام مملکت اور افسروں و سپاہیوں کی قدر شناسی میں شاہجہاں کا مقابلہ کر سکتا۔ وہ ہمیشہ رعیت کی حفاظت کرتا اور ظلم کو کچلنے کے لیے تیار رہتا۔ اس کے

عہد میں مکمل امن و امان تھا۔ کسانوں کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔ سخت گیر اور رشوت لینے والے صوبے داروں کو کئی مرتبہ رعایا کی شکایت کرنے پر برخاست کر دیا گیا" وہ "ظالم عمال کو سزا دینے میں سختی برتتا اور اسی طرح ان لوگوں کو بھی سزا دیتا جو غیر معمولی نرمی دکھاتے"۔

شاہجہاں شان و شوکت و اظہار اجلال کا دلدادہ تھا اور وہ سلطنت ہند کے وقار کو دنیا والوں کی نظروں میں محفوظ رکھنے اور بڑھانے کا ہر ممکن طرح سے اہتمام کرتا۔ دل بادل نام کا زرق برق عظیم الشان خیمہ اس قدر زبردست تھا کہ اس کے لگانے کے لیے دو مہینے سے زیادہ کا وقت اور ہزاروں آدمی اور کئی ہاتھی درکار ہوتے۔ سب سے بہتر و برتر تو تخت طاؤس تھا جو کہ ہنرنمائی، صنعت و شان و عظمت کا اعلیٰ اور نادر نمونہ تھا لیکن شاہجہاں نہ تو عیش پسند تھا اور نہ آرام و آسائش کا دلدادہ۔ شہزادگی کے زمانے ہی میں اس نے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ وہ بہت مستعد اور باعمل انسان ہے۔ وہ اپنے عہد حکومت کے اختتام تک ان صفات سے متصف رہا۔ اس کا اخلاق اعلیٰ اور پُروقار تھا۔ اس کا قول و فعل سوچا اور پرکھا ہوا ہوتا۔ وہ اپنے فرائض اور ذمے داریوں سے پوری طرح آگاہ رہتا۔ جب تک اس کی صحت نے اجازت دی وہ خود امور سلطنت کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ اس کا کوئی افسر چاہے وہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو اور نہ کوئی شہزادہ اس کی حکم عدولی کر سکتا اور نہ ہی اس پر اثر انداز ہو سکتا۔ اس کی صحت خراب ہونے کے بعد مفسد عناصر نے زور پکڑا۔

مذہبی معاملات میں شاہجہاں اپنے باپ کی نسبت زیادہ راسخ العقیدہ تھا حالانکہ اس پر یقینی طور پر کٹر پن کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ پھر بھی کبھی کبھی اس کی بعض باتوں سے ایسی علامات ضرور ظاہر ہوتی ہیں۔ 1632ء میں اس نے اپنی پوری سلطنت میں ان سارے مندروں کے مسمار کرانے کا حکم دیا جو اس کے باپ کے عہد میں تعمیر ہونا شروع ہوئے تھے۔ صرف بنارس میں 76 مندر مسمار کیے گئے۔ بندیلا جنگ کے دوران اس کا کٹرپن پھر ابھر آیا اور اس نے ہندوؤں کے مندروں کو

مسمار کرایا اور ججھار سنگھ بندیلا کے لڑکوں کو مسلمان بنا لیا۔ اسی قسم کا سلوک 1637ء میں پرتاپ سنگھ کی رانی اور کچھ کے راجا کے ساتھ کیا۔ ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کے عہد میں جن رجعت پسند عناصر نے زور پکڑنا شروع کر دیا تھا وہ شاہجہاں کے عہد کے نصف اوّل میں کافی شدّت اختیار کر گئے۔ بعد میں اس کا رویہ بدل گیا۔ اس کا برتاؤ نرم ہو گیا اور اس کا کٹر پن جاتا رہا۔ یہ بات اس رویے سے ظاہر ہے کہ اس نے مندروں کو مسمار کرنے اور تبدیلیٔ مذہب کے طریقے کو ترک کر دیا تھا۔ اس کا عہد کسی طرح بھی ایک عام مذہبی ایذا رسانی، کٹر پن یا غیر رواداری کا دور نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اکبر کے عہد کی روشن خیالانہ رواداری کی سیاست کو آہستہ آہستہ خیرباد کہا جا رہا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک مسلم حکومت میں جس کی بنیاد عباسی و مابعد عباسی دور کے قانون دانوں کے نظریات پر مبنی ہو رواداری کا امکان تو تھا لیکن مکمل رواداری ممکن نہ تھی۔ اکبر کا دور استثنائی دور تھا اور خسرو و دارا فکری اعتبار سے اس سے بہت نزدیک تھے مگر تخت نشین نہ ہو سکے۔ گو جہانگیر و شاہجہاں اکبر کی رفعت و بلندی کو نہ پہنچ سکے۔ پھر بھی وہ اس کی سیاست کو بالکل ترک بھی نہ کر سکے۔

شاہجہاں کے زمانے میں بھی ہندو اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے اور ان کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اگر شاہجہاں نے ہندوؤں کے دل میں اعتماد پیدا نہ کیا ہوتا تو ہندو شہزادے اکٹھے ہو کر سلطنت کے دفاع اور شاہی وقار کی حفاظت کے لیے سینہ سپر نہ ہوتے۔ اس کے زمانے میں بھی یہ بات ممکن تھی کہ ولیعہد سلطنت مختلف مذاہب کا مطالعہ و موازنہ کر کے اور بغیر کسی قسم کی مداخلت کے مذہبی امور میں آزاد خیالانہ جذبات کا اظہار کر سکے۔

شاہجہاں کا عہد اس بات کے لیے مشہور ہے کہ سنسکرت کے ادب میں کیفیت و کمیت کے لحاظ سے ترقی ہوئی۔ آصف خاں اور دارا مذہبی ثقافتی اور علمی اہمیت کے سنسکرت ادب کے مربّی تھے۔ یوگ وششٹ، رامائن، بھگوت گیتا، نیدانگا

اور ساہتیہ درپن کی سرپرستی اسی عہد میں کی گئی۔ اس کے زمانے میں ہندی اور سنسکرت کے شعرا کو دربار میں اعزاز دیے جاتے۔ شاہجہاں کے متعلق اس بیان میں بڑی سچائی ہے کہ وہ نہ محض تاریخی حیثیت سے بلکہ ثقافتی اعتبار سے بھی "دارا اور اورنگ زیب کا امتزاج تھا۔"

شاہجہاں کے واقعات بسلسلۂ تاریخ

نمبر	واقعہ	تاریخ
1	شاہجہاں کی تخت نشینی	6 فروری 1628
2	خانجہاں لودی کا آگرے سے فرار	اکتوبر 1629
3	شاہجہاں دکن میں	1630
4	خانجہاں کے سر کا شہنشاہ کو پیش کیا جانا	فروری 1631
5	ممتاز محل کی وفات	7 جون 1631
6	بیجاپور پر حملہ	1631
7	شاہجہاں کی برہان پور سے واپسی	مارچ 1632
8	مہابت خاں کا دکن پہنچنا	1633
9	شاہی افواج کا دولت آباد کے قلعہ پر قبضہ	17 جون 1633
10	نظام شاہی خاندان کا خاتمہ	ستمبر 1633
11	مہابت خاں کی وفات	اکتوبر 1634
12	شاہی افواج کا اورچھہ پر حملہ	22 نومبر 1634
13	ججھر اور وکرماجیت کا قتل	1635
14	گولکنڈہ و بیجاپور سے معاہدے	1636
15	شاہجی کی گرفتاری	نومبر 1636
16	علی مردان قندھار مغلوں کے حوالے کر دیتا ہے	فروری 1638
17	شاہجہاں کا سفر کابل	1639
18	ایرانیوں کا قندھار پر پہلا حملہ	1639
19	ہرگوبند کی وفات	1645
20	بلخ کی مہم کی تیاری	1646

21	مغلوں کی فتح بلخ	جولائی	1646
22	بلخ کی مہم کا خاتمہ	اکتوبر	1647
23	ایرانیوں کا محاصرہ قندھار	16 دسمبر	1648
24	قلعہ پر ایرانیوں کا قبضہ	11 فروری	1649
25	فتح قندھار کے لیے مغل مہم کی ناکامی		1652-53
26	محمد عادل شاہ کی وفات		1656
27	بیدر کی فتح اور مغلوں کا محاصرہ بیجاپور		1657
28	شاہجہاں کی ناگہانی علالت	6 ستمبر	1657
29	شجاع کی شکست بمقام بہادر پور	14 فروری	1658
30	شجاع کا شاہی افواج سے معاہدہ	اپریل	1658
31	اورنگ زیب و مراد کا دیپالپور کے مقام پر متحد ہونا	اپریل	1658
32	دھرمٹ کی فتح	مئی	1658
33	دارا کی شکست بمقام ساموگڑھ	29 مئی	1658
34	شاہجہاں کا قلعہ آگرہ اورنگ زیب کو سونپنا	8 جون	1658
35	اورنگ زیب دربار آگرہ	10 جون	1658
36	جسونت سنگھ کا فرار بحق شجاع	5 جنوری	1659
37	شجاع کا اراکان کی طرف فرار	مارچ	1660
38	دیوراٹے میں دارا کی شکست	مارچ	1659
39	دارا کا سندھ پہنچنا	مئی	1659
40	دارا کی بیوی نادرہ بیگم کی وفات	6 جون	1659
41	دارا کا دہلی لے جایا جانا	اگست	1659
42	دارا کا قتل	30 اگست	1659
43	سلیمان شکوہ شاہی افواج کے قبضے میں	12 دسمبر	1660

44	قلعہ گوالیار میں مراد کا قتل	دسمبر 1661
45	سلیمان کی وفات	مئی 1662
46	شاہجہاں کی وفات	22 جون 1666

مزید مطالعے کے لیے

فارسی:

بادشاہ نامہ	عبدالحمید لاہوری
عمل صالح	محمد صالح کنبوہ
خلاصۃ التواریخ	سجان رائے
منتخب اللباب	خافی خاں
فتوحات عادل شاہی	قزوینی استرآبادی
تاریخ شاہ شجاعی	محمود معصوم
ماثر الامراء	شاہنواز خاں
مراۃ الخیال	شیر خاں لودی
حقیقت العالم (گولکنڈہ کے واقعات کے لیے)	ابوالقاسم
بساطین السلاطین (بیجاپور کے واقعات کے لیے)	غلام مرتضیٰ

انگریزی:

Elliot and Dowson: Relevant Volumes

Francois Bernier: Travels in the Moghal Vols.
Empire, 2 Vols. English translation
by A. Constable

Tavernier, J.B.: Travels in India

English translation by D. Ball

Manucci, N.: Storia Do Mogor, 4 Volumes

English translation by W. Irwine

Sarkar, Sir J.N.: Aurangzeb, Vols. I & II

Dr. B. Prasad: History of Shah Jahan of Delhi

Qanoongo, Dr. K.K.: Dara

ھندی:

راجپوتانہ کا اتہاس۔ اوجھا، جی۔ ایچ

میواڑ اور مغل۔ جی۔ این۔ شرما

اردو:

تاریخ ہندوستان (جلد ہفتم) ۔ ذکاء اللہ